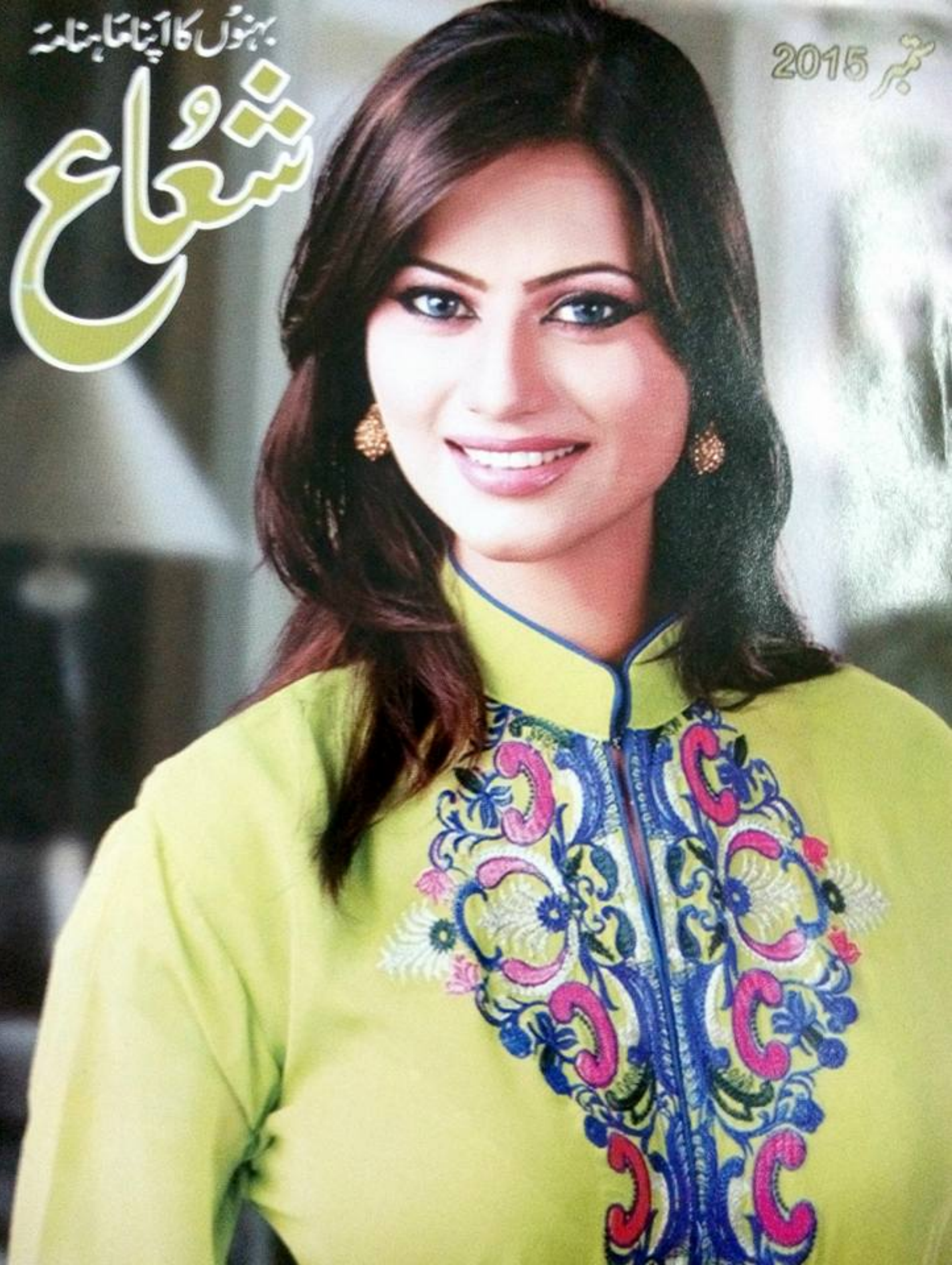


بہنوں کا اپنا معاہدہ

ستمبر 2015

شعاع





142	سیاہ حاشیہ صائمہ اکرم	10	رضیہ جیل	پہلی شعاع
62	زندگی تعاقب میں عتیقہ ایوب	11	کوثر خالد	جسٹ
		11	مولانا محمد شفیع	نعت
		12	اجارہ	نئی کی باتیں



134	دُر زایاں اہل رضا	17	آہنہ مفتی	توبہ جلدی نا
174	منصب ولایت فائزہ زالبہ	280	شاہین رشید	دستک
54	آب اور نیل حیرا زین	24	شاہین رشید	عام قریشی
58	کرامی منش مسموۂ صدف	28	الف سہ	جب تجھ سے نا
130	نیاز عشق ثرو شکر			
252	اتری ہیں شاہیں ملیحہ صدیقی			
84	محبت سے آگے تنزیلہ زالبہ			



264	نظم جوش ملیح آبادی			
264	غزل علامہ الحق قاسمی	180	ہوش افکار	جسام آرزو
265	غزل غزلہ جاوید قریشی	214	مباح خادم	ریت کی دوار
265	نظم خوشی گیلانی	88	نارباہ احمد	محبت روشنی ہے

اعتماد: ہمارے قلم کاروں کے علاوہ حقوق محفوظ ہیں۔ بلاشرکی تحریری ادارات کے علاوہ ہر سال کی کسی بھی کتابی، ناول، سلسلہ کی کسی بھی جلد سے شائع کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی کتابی، ناول، سلسلہ کی کسی بھی جلد سے شائع کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی کتابی، ناول، سلسلہ کی کسی بھی جلد سے شائع کیا جاسکتا ہے۔



زینت اللہ بک کی نئی جلدیں

پاکستان (مالان) ----- 700 روپے
ایشیا و افریقہ، اوسٹریلیا ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے



287	امت الصبور	تاریخ کے جھوکے	272	رضیہ جیل	خط آپ کے
288	خالد جیلانی	سوئم کے یگانہ	266	ادارہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بننے	284	وصفہ آئیں	آئینہ خالے میں
			268	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
			271	خالد جیلانی	کھلتا کسی پتہ

ستمبر 2015

30 مارچ 1
بک 08 روپے

مخاطب کتابت کا پتہ: ناہارہ شجاع، 37 - آروو بازار کراچی۔

رضیہ جیل میں حبس شدہ سنگ پریسر سے چھپا کر شائع کیا - مخبر: ایم ایچ ٹی وی سی ایچ ایس کا کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32706872

Email: shusa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



طرح پر ہیں آیا۔
جس کا تار پر بھی خیر معلوم جوں وہ بڑے کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ لوگوں کے چہروں پر خوشی و مسرت کے
وہ رنگ نظر آئے جو کوئی سالوں سے ناپید ہو چکے تھے۔ شہرہ نشینوں سے جنگ کا تار ادا ہوا۔ بزرگ بانی پر چروں کی بہار
میں ملی تھیں ادا تاروں کی کواڑیں گونجتی رہی۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ ملک اللہ یہ شہر ہمیشہ شاد و آباد رہے۔ آمین۔

غیبِ نمبر۔ قارئین سے سروے،

شاعر کا اکثر یہاں تلامذہ عبدالغنی سے پہلے آئے گا۔ اس لیے جید مہر ہوگا۔ جید مہر میں جید لافنی کے حوالے سے
تقریباً نوادہ سلسلے شامل ہوں گے اور سبب روایت فارغین کی شخصیت کے لیے سروے میں شامل ہوگا۔
سروے کے سوا یہ ہیں۔

- 1- حیدر اعلیٰ کا دل تیسے گز بنا ہے، کیا آب قربانی کے گوشت کی مضافی، تقسیم اور دیگر کاموں میں حصہ لیتی ہیں؟
2- ہر گھر کی ایک روایتی دوش بھڑ ہے جو خامیوں و نقول پر بنائی جاتی ہے۔ گوشت کی وہ کون سی خامی دوش ہے جو ہر بھڑ پر آب کے گھر میں منعقد ہوتی ہے۔ تادم دوش کے لیے اسی کی ترکیب بھی لکھیں۔
3- حیدر اعلیٰ کے موقع پر مہمانوں کی ترافیع کے لیے آب کیا اہتمام کرتی ہیں؟ پیسے میں کیا بناتی ہیں؟
4- ان حالات کے حالات اس طرح ابھور دوش کہ 6 ستمبر تک ہمیں بومل ہو جائیں۔

جب ہم ملے،

تاریخیں ساز و رشا کی نواں کو تو انہیں بھولے ہیں گے۔ بظاہر شروع لاپرواہ اور بے نیاز۔ اندر سے حساس، سحر طواف و شوق کا یاس کرنے والی۔
تاریخیں کے لیے غوغا خیزی ہے کہ محفلے دو سالہ کی طرح اسی بار بھی ساز و رشا آپ کے لیے عید کا مضمی کا عقد
ہوئی ہیں۔ نواں کی ایک ادھ کاہنی آپ انہی کے شمارے میں مذکور نہیں کی۔

اس شمارے میں:

- ۱۔ مہوش انتہا کا مکمل ناول۔ جام آؤند،
 ۲۔ مسلح خادم کا مکمل ناول۔ ریت کی دیوار،
 ۳۔ عاشق کرم اور بیقرار بک کے ناول،
 ۴۔ بیخود صدف، ایکل رضا، حسرت بڑا، میر انوشین، امانتہ راہد، ثمر و شکر اور علم و ہمتی کے ناول،
 ۵۔ اصول و نفاذ، مسرتار و مرقیعی سے ملاقات، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
 ۶۔ آہ مہنتی کا ستر بارہ جلد، پیادہ نیلی، علی و علیہ و سلم کی بیانیہ باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
 شعاع نے کئی ناولوں سے مزید ناول لکھے ہیں۔

پھر پیش نظر گنبدِ خضرا ہے عزم ہے
پھر نامِ خدا و رضہ جنت میں قدم ہے

پھر شکرِ خدا ماننے محرابِ بنی ہے
پھر ہے برا اود ترا نقشِ قدم ہے

محرابِ بنی ہے کہ کوئی طورِ تجمل
دل شوق سے لبریز ہے ادا کو بھی غم ہے

پھر منتِ درہاں کا اعزاز ملا ہے
اب ڈر ہے کسی کا نہ کسی چیز کا غم ہے

یہ قدرِ ناچیز ہے خود رشیدِ بدامان
دیکھان کے غلاموں کا بھی کیا جاہ و حشم ہے

برہمنے بدن بھی جو زباں بن کے کرے شکر
کہ ہے بخدا ان کی عنایات سے کہ ہے

عالمِ توحید کا منظر ہے کہ جس میں
مشرق ہے نہ مغرب ہے، عرب ہے نہ غم ہے

دل نعتِ رسولِ عربی کہنے کو بے چین
عالم ہے تجر کا زباں ہے نہ قلم ہے
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع

اک حمد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشمِ دل
یا حمد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشمِ دل

رحمان تو رحیم تو، عظیم تو، کریم تو!
خود کو عبد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشمِ دل

آدم کا خطا پوش ہے تو ازل سے مولا
تجھے ابد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشمِ دل

جبرائی و قہاری سے محفوظ مجھے رکھا
رحمن و رحیم لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشمِ دل

میں نے تیرے سوا مدد کسی اود سے نہ مانگی
المدد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشمِ دل

رضاؤں میں رہی خوش طے مگر انوکھے سے
الحمد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشمِ دل

اپنی آغوش کی چھاؤں میں تونے رکھا ہے ہر بل
اپنا مرقد لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشمِ دل

کوثر تیری یادوں میں فنا ہو میرے سحان
تجھ کو اعلا لکھوں پھر سے تنہائی میں بچشمِ دل
کوثر خالد

سایہ خنک

بالوں کو سیاہ خنک سے رنگنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ فتح مکہ والے دن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو جعفر رضی اللہ عنہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں) پیش کیا گیا اور بن کا سر اور داڑھی سفیدی میں ثقافت (بلی) کی طرح تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اس کے سفید بالوں کو بیل دے لیکن ان کو سیاہ کرنے سے بچو۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل : ابو جعفر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد کی کنیت ہے۔ ان کا نام عثمان بن عامر ہے۔ انہوں نے فتح مکہ والے دن اسلام قبول کیا۔

ثقافت پھاڑوں میں پیدا ہونے والی ایک بلی ہے جو بالکل سفید ہوتی ہے۔ ان کے بال بھی سفید تھے اس لیے آپ نے انہیں رنگنے کا حکم دیا لیکن سیاہ کرنے سے منع فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ کسی ناگزیر صورت کے علاوہ سر یا داڑھی کے بالوں کو سیاہ کرنا منع ہے۔

قزع کی ممانعت یعنی سر کے کچھ بیل موٹہ لینا اور کچھ چھوڑ دینا اور مرد کے لیے سر کے بالوں کا موٹہ ناجائز ہے لیکن عورت کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قزع (کچھ بالوں کے

موٹہ) سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)
قاعدہ : قزع کے معنی ہیں : کچھ بیل منڈوا لینا اور کچھ چھوڑ دینا۔ یہ منع ہے۔ آج کل بیاہکت اس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

کچھ بیل موٹہ نا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچے کو دیکھا کہ اس کے سر کے کچھ بیل موٹے ہوئے ہیں اور کچھ چھوڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمایا اور حکم دیا۔

”اس کے سارے بیل موٹے یا سارے بیل چھوڑ دے۔“ (اسے ابو داؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو کہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل : کہتے ہیں کہ یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے منع فرمایا تاکہ اہل کتاب سے مشابہت نہ ہو کیونکہ بعض اخبار و روایات اس طرح کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اہل شرافت کی بھی یہ عادت تھی۔ تاہم کسی بیماری یا عذر کی وجہ سے ایسا کرنا جائز ہے۔

بہر حال یا تو سارے بیل منڈا دیے جائیں یا پھر سارے بیل اس انداز سے رکھے جائیں کہ عورتوں سے مشابہت نہ ہو۔

بین کرنا

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر

بل رکھنا جنہیں بے کہا جاتا ہے، لفظ ہے یہی کہ
خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بے بل رکھے ہوئے
تھے۔

عورت کے بل منڈوانا

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اپنے سر کے بل
منڈوانے سے منع فرمایا ہے۔ (مسائل)

فائدہ : عام حالات میں تو مردوں کی مشابہت سے
بچنا عورت کے لیے ضروری ہے البتہ علان جو غیو کے
لیے ضرورت پڑنے پر اس کی اجازت ہوگی۔

مصنوعی بل (وگ) جوڑنے اور گودنے اور
وشریعہ رانٹوں کو باریک کرنے کی حرمت کا

بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”یہ اللہ تعالیٰ کے سوا مومن چیزوں ہی کو پکارتے
ہیں اور صرف سرکش شیطان کی پوجا کرتے ہیں جس
پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور شیطان نے (اللہ سے) کہا
میں ضرور تم پر بندوں میں سے ایک مقرر حصہ لوں
گا اور انہیں ضرور گمراہ کر دوں گا اور ان کو آرزوؤں میں
جٹا کر دوں گا اور میں انہیں حکم دوں گا کہ وہ (بتوں کے
نام پر) جانوروں کے کٹوں کو چیریں اور میں انہیں حکم
دوں گا تو وہ اللہ کی بتائی ہوئی صورتوں میں ضرور تبدیلی
کریں گے۔“

فائدہ آیات : اس میں ایک تو مشرکوں کی اس
عادت کا بیان ہے کہ وہ جن بتوں کی پوجا کرتے تھے ان
کے نام مومنوں والے ہوتے تھے یا مونث قسم کی
چیزوں کی عبادت کرتے تھے جیسے فرشتوں کی جن کو وہ
اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے ان کے متحدہ بتوں کے
نام بھی مونث ہی تھے جیسے عزلی، صاف، ناکہ وغیرہ۔
بتوں کی عبادت کو شیطان کی عبادت قرار دیا اس لیے
کہ وہی اس کا باعث تھا اور ہے۔ پھر اس کے دوسروں
سے وہ لوگ جو اور غلط کام کرتے تھے انہیں بیان فرمایا

رضی اللہ عنہ کے گھروالوں کو (ان کی شہادت پر رونے
کی) تین دن مہلت دی پھر ان کے پاس تشریف لائے
اور فرمایا :

”آج کے بعد میرے بھائی پر مت رونا۔“ پھر فرمایا

”میرے پیچوں کو میرے پاس بلاؤ۔“ چنانچہ ہمیں
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا گویا کہ
ہم چوڑے ہیں۔

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔“ ثانی کو
میرے پاس بلاؤ۔“ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے
اسے حکم دیا اور اس نے ہمارے سر موٹا دیے۔ (اسے
ابو دلوڈ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو کہ
بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔)

فوائد و مسائل : 1۔ حضرت جعفر رضی اللہ
عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔

یہ جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تھے۔ شہادت اگرچہ
ایک اعزاز ہے لیکن گھروالوں کو وقتی طور پر دائمی
جدائی کا صدمہ تو بہر حال ہوتا ہے اس لیے آپ صلی
اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھروالوں کو بھی تین دن تک
سوگ منانے کی اجازت دی۔

2۔ رونے کا مطلب یہ نہیں کہ تین دن تک نوحہ و
جہن کرنے کی اجازت دی۔ یہ تو مینوع ہے بلکہ
مطلب وہ رونا ہے جو ان ایام میں تعزیت کے لیے
آنے والوں سے گفتگو کے دوران میں فطری طور پر
ہوتا ہے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو روں ہو
جاتے ہیں جس طرح کا رونا اگرچہ تین دن کے بعد بھی
جائز ہے اس لیے اس میں تین دن کے بعد رونے سے
جو منع فرمایا گیا ہے تو یہ نمی تیزی ہے۔ تحریری نہیں۔
چھوٹے بچوں نے اپنے آپ کو چونہ اس لیے کہا کہ
والد کی جدائی نے انہیں بے حال کر دیا تھا۔

3۔ اس حدیث کو یہاں لانے سے اصل مقصد سر
کے بالوں کے موٹنے کا اثبات ہے جس کا اس میں
ذکر ہے خاص طور پر چھوٹے بچوں کا۔ اگرچہ پورے

میا ہے۔ اور میں سے ایک اللہ کی پیدا کردہ صورتوں میں وہ نہدیلیاں ہیں جن کی تفصیل احادیث میں بیان کی گئی ہے۔

مصنوعی بیل لگانا

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میری بیٹی کو حصہ (جلدی بیماری) لگی جس سے اس کے بیل جھڑ گئے ہیں۔ اور میں نے اس کی شادی کر دی ہے۔ کیا میں اس میں مصنوعی بیل جوڑ سکتی ہوں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے بیل جوڑنے والی پر اور اس پر جس کے بیل لے کر جوڑے جائیں“ لعنت فرمائی ہے۔“ (بخاری و مسلم)

اور ایک روایت میں ہے: ”بیل جوڑنے والی اور بیل جوڑنے کی خواہش کرنے والی۔“ (پر لعنت فرمائی ہے۔)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح کی ایک روایت منقول ہے۔ (بخاری و مسلم)

قائدہ :

1- اس میں تین قسم کی عورتوں کا بیان ہے۔ بیل جوڑنے یا ملاسنے والی۔ دوسری اس کی خواہش کرنے والی۔

تیسری جس کے بیل لے کر کسی عورت کے بیلوں میں ملائے جائیں۔ یہ تینوں ملعون ہیں۔ آج کل ان مصنوعی بیلوں کو دوک کہا جاتا ہے۔ بیلوں پاروں کے ذریعے سے دیکس وغیرہ لگائے اور دیگر بے حیائی کے کاموں کو خوب فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

ہلاکت

حضرت حمید بن عبد الرحمن بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حج کے سال منبر پر حضرت معلوہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا اور انہوں نے بیلوں کا ایک گھالہ ہاتھ میں پکڑا جو ایک پرستار کے ہاتھ میں

تھا انہوں نے فرمایا: ”اے اہل مدینہ! تمہارے علماء کہاں ہیں؟ (جو تمہیں برائی سے روکتے نہیں۔) میں نے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے کام سے منع کرتے ہوئے سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ”بنی اسرائیل اس وقت ہی ہلاک ہوئے جب ان کی عورتوں نے ان کاموں کو اختیار کر لیا۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1- حضرت معلوہ رضی اللہ عنہ کا اٹھان عورتوں کے ایسے کاموں کی طرف تھا جن کا ذکر پچھلی حدیث میں گزر رہا اس سے معلوم ہوا کہ ارباب اختیار کسی برائی کو چھپتے ہوئے دیکھیں تو خود بھی اس پر تنقید کریں اور لوگوں کو اس سے روکیں اور علماء کو بھی اس طرف متوجہ کریں۔ مگر وہ بھی اس کے خلاف اپنی آواز بلند کریں۔

2- لوگوں میں منکرات کی اشاعت کے خلاف آواز بلند نہ کرنا ہلاکت اور غضب الہی کا باعث ہے۔

3- اس میں آج کل کے مسلمانوں کے لیے بھی سخت تنبیہ ہے کہ مسلمان عورتوں میں بے پردگی، بازاری عورتوں کی طرح سولہ سنگھار کر کے اور مجسم دعوت نگاہ بن کر گھر سے باہر نکلتا اور اپنے حسن و جمال کا مظاہرہ عام کرنا وغیرہ جیسی باتریاں عام ہو گئی ہیں جو بیلوں کو جوڑنے اور جڑوانے سے کہیں زیادہ شدید جرم اور بے حیائی کا ارتکاب ہے۔

گدوانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیل جوڑنے والی اور جڑوانے والی اور گدوانے والی اور گدوانے والی پر لعنت فرمائی ہے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1- واشتمتہ و ستم کرنے والی۔ دشمن کا مطلب ہے کہ

ہے اور اللہ کی کتب میں موجود ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”رسول تمہیں جو (حکم) کہے گا لے لو اور جس سے تمہیں روک دے اس سے روک جاؤ۔“ (فقاری و مسلم)

۱۔ عورت جو اپنے دانوں پر رتی بھجاتی ہے تاکہ وہ ایک دو سرے سے ندرے دور ہو جائیں اور حسین ہو جائیں۔ اور کسی دُشربے (دانتوں کو خوب صورتی کے لیے باریک کرنا)۔

۲۔ عورت جو دوسری عورت کی مٹھوں کے بالوں کو اکھڑ کر باریک کرتی ہے تاکہ وہ خوب صورت ہو جائیں۔

۳۔ عورت جو کسی کو کہہ کر یہ کام کرائے یعنی بال اکھڑوانے والی۔

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے حسن میں (بزعیم خویش) اضافہ کرنے کی نیت سے اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت میں کمی بیشی کر کے رد و بدل کرنا ممنوع اور حرام ہے جیسے وشم (بدن گدوانا) و شر (دانتوں کو باریک کرنا) تفلج (دانتوں میں فاصلہ پیدا کرنا) نصص

(مٹھوں کے بالوں کو اکھڑنا) وغیرہ۔ تاہم مندی لگانا جائز ہے کیونکہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ عورت اس کا اظہار اجنبی مردوں کے سامنے نہ کرے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حجت کے اعتبار سے حدیث رسول کو بھی قرآن ہی کی طرح سمجھتے تھے اور یہی حق ہے۔

واڑھی اور سروغیرو کے سفیدیل اکھاڑنے کی اور بلع لڑکے کا واڑھی کے آغاز و واڑھی کے بال اکھاڑنے کی ممانعت کا بیان

حضرت عمرو بن شیبہ اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما) سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

جلد میں سونے وغیرہ چھو کر خون نکالنا اور پھر اس جگہ پر سرمہ یا نیکل وغیرہ بھرنے تاکہ وہ جگہ سیاہ یا سبز ہو جائے اسے گونا گوتے ہیں۔ عمد رسالت کے عرب معاشرے میں حسن و جمال کے اخلانے کے لیے عورتوں میں یہ طریقہ رائج تھا جیسے کسی کے بال لے کر اپنے بالوں میں جوڑنے کا رواج تھا اور مستوشستہ عورت ہے جو کسی عورت سے وشم کرنے کا مطالبہ کرے۔ یہ اللہ کی پیدائش میں تبدیلی کرنا ہے اس لیے یہ کام کرنے اور کرائے والیاں سب ملعون ہیں۔

2۔ آج کل بھی عورتوں میں اس قسم کے بعض فیشن رائج ہیں جیسے آنکھوں کی مٹھوں کے بال فوج کر ان میں رنگ اور میک اپ کی بعض چیزیں وغیرہ بھرتا یا ہندو عورتوں کی طرح حنک اور میندور بھرتا وغیرہ۔ فیشن اور میک اپ کے جدید طریقے جو آج کل عورتوں میں عام ہیں اور جن پر قوم کا گروٹوں اور اربوں روپیہ بہاؤ ہو رہا ہے یہ سب اسی ذیل میں آتے ہیں جن پر لعنت فرمائی گئی ہے اس لیے مسلمان عورتوں کو زیب و زینت کی ان تمام چیزوں سے بچنا چاہیے کہ اس میں

دین اور دنیا دونوں کی بربادی ہے۔ اسی طرح ناخنوں کی پالش ہے جس سے وضو بھی اکثر علماء کے نزدیک نہیں ہوتا علماء ازیں ناخنوں کو خوب پرہایا جاتا ہے اور من میں پھر سرخ پاش لگائی جاتی ہے۔

صورت میں تبدیلی کرنا

حضرت امین مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بدن کو دینے والیوں اور گدوانے والیوں اور پلکوں کے بال اکھڑوانے والیوں اور خوب صورتی کے لیے دانتوں کے درمیان فاصلہ کرنے والیوں پر جو اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت میں تبدیلی کرتی ہیں لعنت فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک عورت نے اس کی بابت حضرت امین مسعود رضی اللہ عنہ سے بحث کی تو انہوں نے فرمایا: مجھے کیا ہے میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی

میں نہ ہو تو اس سے ایک تو لوگوں کو استہزا کرنے کا موقع ملتا ہے دوسرے یہ شرف و تقار کے منافی ہے تیسرے اس طرح چلنے میں بھی دقت ہوتی ہے اور انسان کی چال میں توازن نہیں رہتا اس لیے حکم دے دیا کہ دونوں جوتے پہن کر چلویا دونوں ہی اتار کر ننگے پاؤں چلے ننگے پاؤں چلنے میں بھی شرعاً قباحت نہیں ہے تاہم عرف میں یہ ناپسندیدہ ہے۔

جس بات کا علم نہ ہو

حضرت مسوق (تلمیذ) بیان کرتے ہیں کہ ہم عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا:

اے لوگو! جس کو کسی بات کا علم ہو تو اسے بیان کرے اور جسے کسی چیز کا علم نہ ہو تو (وہاں) کہہ دے:

اللہ اعلم (اللہ ہی بہتر جانتا ہے) اس لیے کہ جس چیز کی بات علم نہ ہو وہاں اللہ اعلم کہنا ہی علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

”کہہ دے! میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگا اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں۔“

(بخاری)

فائدہ: جس چیز کی بات علم نہ ہو وہاں محض تلمیذ و تلمیذین اور انکل پچو سے گفتگو کرنا بھی تکلف ہے جو ممنوع ہے اس لیے علماء سے جب کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کا انہیں علم نہ ہو تو وہاں اپنی طرف سے انکل پچو جواب دینے کے بجائے لاعلمی کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ گویا بغیر علم و تحقیق کے فتویٰ دینے اور رائے کے اظہار سے اجتناب کرنا چاہیے۔



”سفید بالوں کو نہ اکھیڑو اس لیے کہ قیامت والے دن یہ مسلمان کے لیے نور ہوں گے۔“ (یہ حدیث حسن ہے۔ اسے ابو داؤد، ترمذی اور نسائی نے حسن سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ لہذا ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ: سفید بال جو بالعموم سن رسیدگی اور بڑھاپے کی علامت ہیں انہیں اکھاڑنے سے بچنا چاہیے کیونکہ اس کے حدیث میں بیان کرنا اخروی فائدے کے علاوہ دنیا میں بھی وہ ایک مسلمان کے لیے وقار و احترام کا باعث ہیں۔

بدعت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے ایسا کام کیا جس کی بابت ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ (کلم) مروجہ ہے۔“ (مسلم)

1۔ اس کی بابت ہمارا حکم نہیں ہے کا مطلب ہے: اس پر کوئی شرعی دلیل نہیں ہے نہ اس پر شریعت کی کوئی اصل ہی دلالت کرتی ہے۔

2۔ اس سے واضح ہے کہ بدعت اور خلاف شرع کلم مروجہ ہیں۔ ایک مسلمان کا کلم لتباع ہے نہ کہ امتداد (بدعت سازی) اور عدل حکمی۔

بغیر غفر کے ایک ہی جو تپایا ایک ہی موزا پہن کر چلنے اور کھڑے کھڑے جو یا اور موزا پہننے کی گراہت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص ایک جو تپا پہن کر نہ چلے چاہیے کہ دونوں جوتے پہنیا دونوں ہی اتار دے۔“ اور ایک حدیث میں ہے:

”یادوں بیوں کو ننگا کر لے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: ایک پاؤں میں جو تپا یا مونہ ہو اور دوسرے

توبہ و جدائی

آمنہ مفتی

مشاعرہ

کے بارے میں چار ایک سوال اور پھر پھٹ سے کہہ دو۔

”ڈر اساحر کا کوئی گیت تو گنگنا دس۔“
انہوں نے تو گنگنا ہی کہا تھا مگر مجھے غنیمت ہی لگ۔
نزلے سے ناک کان تو بند ہی تھے۔ لیکن خیر وہی
تنبیہ کھنکھار جس میں چون سوسل کی عظمت
رفتہ اور گواروں کی جھنکاریں ہیں ملام آئی۔
”نہیں معذرت چاہوں گی۔ ہاں تحت الفظ میں
حاضر ہے۔“

پھر جو ساسر کی تاج محل سنی شروع کی تو پورے
چارے کو جھپٹیں آنے لگیں۔ بھلے کیا کریں۔ ایسی
جھکار فرمائشیں کرے گا تو یہ ہی انجام ہو گا۔
پاکستان اور ہندوستان سے کلنی شاعر جمع کیے گئے
تھے۔ ہمارے گروپ کا تعارف تو ہو چکا ہے ہندوستان
سے ساغر سیالکوٹی تھے حبیب سوز، معین شلواب،
قلیل اعظمی، محسن کاظمی، اشتیاق حسین، زغم ریاض
اور برکیلو کاس، تقریب کا آغاز شش کشی دیا جلا کر کیا
کیا۔

تعارف کے بعد سب کو فردا فردا ۱۰ منٹ پر بلایا گیا
اور اپنی نسیان کی علوت کے باعث ہم ایک بار پھر کسی کو
یہ نہ بتا سکے کہ بخدا ہم ملی یا غیر ملی قطعاً کسی قسم
کے ڈاکٹر نہیں ہیں۔ نہایت ڈھٹائی سے ڈاکٹر آمنہ
مفتی بن کے اسٹیج پر چڑھ گئے۔

باہر بارش جو حجم کے پرسی ہے اس کا انداز ہمیں
آنے والے لوگوں کے بھیگے حیرانوں سے بخوبی ہوا
تھا۔ چاکن کا بابل میرے سب امدادوں کو دھوکا دے
گیا اور سلون کی جھڑی بن کے برسنے لگا۔
معین شلواب ایک پاکستانی۔ ایک ہندوستانی شاعر

مشاعرہ ”شہو سعادت کینڈر ٹرسٹ“ کے
آئیو ایم میں تھا۔ یہ ٹرسٹ شری ست پل منل نے
1983 میں قائم کی تھی تیار ہو کے لالی میں آئے
تو ہوٹل کے دونوں ہالز میں مغلنی اور شادی کی تقریبات
جاری تھیں۔ وہی جالی کی ساڑھیاں ملام دار روپے
لینگے، بے جھون اور میک اپ وہی گانے گاندی بات
گندی بات گندی بات“ کچھ بھی تو فرق نہیں تھا۔
سودی لگتا تھا آج کچھ مر نکال کے رہے گی۔ سرو
ہوا میں بھالے کی طرح لگ رہی تھیں۔ یا ہر نکلے تو
دروازے پہ کھڑے گاڑنے کڑک کے کہا ”ست سری
اکھل“ جواب حلق میں ہی اٹک گیا اور ٹھنڈ کی لہروں
نے کیکیا کے رکھ دیا۔

مشاعرہ گاہ میں کھلیش ور پگتا اور ان کے شوہر
ملے۔ یہ پروگرام کی کپیٹر تھیں۔ سنہری کٹی کی سفید
ساڑھی، اتھے یہ سفید بندی اور اجبالی مسکراہٹ۔
رخسانہ تالوث تھیں۔

”آپ کی ساڑھی۔ لدھیانہ سلی ہے؟“
ظلمتالی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔ اتھے کی بندی
سے شعا میں ہی پھوٹیں۔

”ارے نہیں لدھیانہ میں کچھ نہیں ملتا یہ تو میں
سلو تھ سے لائی ہوں۔“

اور ہم قی موس کے رو گئے ہندوستان کا سارا جادو
تو ساوتھ میں ہے یہ لدھیانہ تو اپنا فیصل آباد ہی ہے۔

خیر کھلیش ور نے مجھ سے میرے بارے میں
اتنے سوال کیے کہ میں چکر اسی گئی۔ جلنے کیا جھوٹ
بچ گھر اتنی دیر میں ایک رپورٹر صاحب نے کسی چینل
کے لیے انٹرویو ریکارڈ کرنا شروع کیا۔ ساڑھ لدھیانوی

کو باری باری دعوت کلام دیتے رہے۔ اسٹیج کے درمیان سے غلطی پڑی رہی۔ شعراء کو شرم پہ کلام پڑھتے رہے اور شائقین بلبلیں بجا بجا کے داد دیتے رہے۔

فرحت پور کی تعظیم، نیل کا شعر کہ

دنوں کی محسوس میں سرور دا پوتا

نیل کھلوتے جیسے تھی

اور عزیز کی تعظیم، لیکن جو مشاعرہ لوٹ کے لے

میرا حسن کا بھی کا شعر تھا۔

سب میرے چاہتے والے ہیں، میرا کوئی نہیں میں بھی اس ملک میں اردو کی طرح رہتا ہوں باہر پرستی ساری بارش سامین اور شعرا کی آنکھوں میں آہی۔ سب نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دھکے دے کر جابجا بارگاہِ اردو سے دھکی

میں کا شعر

گرمی اور سردی کے عذر نہیں چلتے

موسم دیکھ کے صاحب، عشق نہیں ہوتا

حسبِ حال تھا اشتیاق حسین صاحب کی نظم

ہمت ہی خوب صورت تھی، بالکل دروازہ درخت کا سا

اندازِ مشاعرے کے درمیان ہی میں ایوارڈ دیے گئے

میں برس تین لوگوں کو ساڑھے ایوارڈ کا گلیپا کسٹن سے

صرف میں بھی بھروسہ کسٹن سے دلی یونیورسٹی کے

اور نقی کریم اور کینڈا سے اشتیاق حسین صاحب۔

ایوارڈ دینے کے لیے "ایئر نیل" کے راکیش

بھارتی منڈل صاحب موجود تھے۔ پہلی مبارکباد قاسمی

صاحب تھی۔

"مبارک ہو آتم، پورنٹل ڈیز رولٹ۔" مسافر

سیالکوٹی اسٹیج کے کونے سے سگرائے وہ جج جج

سے یہ بتاتے جا رہے تھے کہ قاسمی صاحب کی والدہ

سے من کے بچے کہتے تھے کہ املن آن جو بہت بارش ہو

رہی ہے، کبھی تھیں۔

"پتہ ڈال دے امر سر ہو گیاں لودی کوئی بدش اسے

ان کی معصوم مسکراہٹ میں، امر تسمی ساری

بارشیں صحن اور آنکھوں میں "دو اس کنڈ" کی ہنک۔

قاسمی صاحب صدر مشاعرہ تھے، حسبِ روایت

آخر میں آئے اپنے مخصوص انداز میں محفل کو کثرت

و عفران کیا اور اپنے مقبول عام اشعار سنائے۔

روشنیوں کا آگ جہل کیا ہونا چاہیے

اس نظام زر کو اب برباد ہونا چاہیے

عظم بیچ جن رہا ہے کوچہ و بازار میں

عقل کو بھی صاحب اولاد ہونا چاہیے

مشاعرہ ختم ہوا تو ایک بار گروپ فوٹو بننے شروع

ہوئے۔ میں، مشاعرے کی ایک قابل ذکر ہستی، ابھری

ہوئی شاعرہ برگیو کا س آئشی گھانی ساڑھی میں آنکھ

بار تا کلن پور کا حسن، اراکین کا انداز ہمارے درجائی

انداز سے کچھ فرق تھا لیکن بوجہ زمانہ تھا۔

جسے بھٹکانے کو یہ سگر شیں جلاتی ہوں

اسی کی شکل بنانا ہے یہ دھول اکڑا

گروپ فوٹو ہو ہی رہے تھے کہ ایک معصوم

صورت سکھ بچہ سڑا اٹھا برس کا، ایک ایجوکٹر

صاحب کے ساتھ آیا کہ آپ کے ساتھ تصویر بنوائی

ہے نہ صاحب مسلسل معذرت خواہ انداز میں کہے

جا رہے تھے لوہے وقف سا کہ رہا تھا کہ میز پر ناراض

ہوں گی میں نے کہا میری تو سب سے چھوٹی بچی سے

بھی چھوٹی ہیں اور میری بیٹی کا ہم بھی آئے ہے تو بیٹا

مجھے اپنا تو یا ماما سمجھ کے تصویر کھینچ رہے ہیں۔"

اتنی طوالتی تمہید، میں گھبرا گئی۔ بعد ازاں معلوم

ہوا کہ ڈاکٹر کیل ڈیجر کی حکمت کہ تقریبات میں لوگوں

کو آؤ گراف و فیو لینے کی اجازت نہیں ہوتی اسی لیے

وہ صاحب بتاتا گھبرا رہے تھے۔

خیر، تصویر میں ان نرم کا کہو پھر مردش میں آیا اور

کس سے بھی چھو لیں کا جملہ پھر سب کو ہنسا گیا

خدا کہ یہ حقیقت تھی کہ تصویر لینے کے لیے کمرے

کو کس سے بھی رجوعا جاسکتا تھا۔

رات و بجے ڈنر کے لیے اکٹھے ہوئے باتیں اور
عورتیں کھلے شور مچاتا ترنم پر گیا فرحت نازیم
ار تھنی کریم اور ذکریا کستلی ڈرائے گا۔

میں نے خوب معتبری جھاڑی لورنی الغور "رسالہ
اسباب بکوت ہند" کے دور پہ ایک تقریر "اسباب
نوال پاکستانی فلم ایڈمنسٹری" کر ڈالی جس میں اس مسئلے
کے اس قدر خوفناک لسانی اور تہذیبی پہلو اور باریکیاں
بیان کیں کہ رخصانہ آیا بھی حیرت سے مجھے دیکھ کے رہ
گئیں کہ ساری عمر فلمی صنعت میں گزار کے بھی ان
بوالعجبیوں کا تذکرہ ان کے لیے حیران کن تھا۔

میں نے جلدی سے اپنے دریائے فصاحت کو سمیٹا
اور اپنی کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ جملہ حاضرین میں
سے اب کسی کی ہمت نہیں بڑھی تھی کہ کسی
موضوع کو چھیڑ کے میری ہیبت ناک گفتگو سنیں۔

پر گیا سب کے لیے گلاب جامن لائی لور جانے
اسے گیا سو جی کہ کہا۔

"کسی جگہ بیٹھیں؟ یہاں کس کو انکار تھا۔
سب لوگ فرحت اور ناز کے کمرے میں اکٹھے
ہوئے کوئی صوفے پر بیٹھا کوئی بیڈ پہ بیٹھا کوئی کرسی
گھسیٹ لایا اور موضوع چھڑا "عشق آ"۔

کوئی عشق کو لافانی بنا رہا تھا کسی کے نزدیک عشق نا
ہے کسی کو عشق سخت سستا جذبہ لگتا ہے اور کسی
کے تئیں عشق خدا سے ملنے کا ذریعہ تھا۔

درمیان میں شاعری کا دور بھی چلا میں بڑی مشکل
سے چپ بھی۔ آخر معین سے نہ رہا گیا کہا کہ آپ
بھی تو تلخے عشق کیا ہے؟

ہجرا منع کیا اتنے بہت سے شاعروں کے درمیان
میں واحد غیر شاعرانہ انسان تھی لیکن وہ تو تلخے ہوئے
تھ اپنے خیال کا تیا بجا کر اپنے۔

وہی مشہور نکتہ کھنکھار اور سلسلہ کلام جاری
کیا۔

"بھئی دیکھئے یہ جو دہل ہے نا اس میں نور انزہیں
لور ان مہیں غلوں کی جھلکوں میں تھی اور ثبت

آئین ہوتے ہیں لہتھم لور پونا قیم تو جب ان کا
توازن بڑتا ہے تو ایک عجیب سی کیفیت وارد ہوتی ہے
یہ توازن جسم میں ہار سوز کی وجہ سے یا کسی۔"

تو محی بات میں ہی سب شاعروں نے ہاتھ جوڑ لیے اور
بعضوں نے کان بھی پکڑ لیے (اپنے) کہ "بخش دلیلی
ہم سے ہمارا عشق نہ چھینو۔"

سب کو دھلا کے ذرا سکون ملا موضوع فوراً بدل دیا
گیا اور تذکرہ چھڑا ہندوستان میں "مشاعروں" اور
کوئی معین "کا مشاعرہ تو مشاعرہ ہوتا ہے لیکن یہ
معلوم کر کے دکھ ہوا کہ وہاں مشاعرہ بھی اردو کی طرح
آخری دسویں پہ ہے۔" باہر اتنے بڑے بڑے اوتے گر
رہے تھے لور ہم سب "لاسٹ سیلفی" کے لیے پر گیا
کے گھرے کے سامنے اکٹھے ہونے کی کوشش کر
رہے تھے۔

لدھیانہ :-

ہم دو روز سے لدھیانے میں مقیم تھے لیکن
لدھیانہ ہم سے چھپا ہوا تھا۔ شہر بھی بڑی عجیب چیز
ہوتے ہیں بعض اوقات آپ عمر بھر ایک شہر میں
رہتے ہیں لیکن شہر عجوبہ ہی رہتا ہے کسی روز کیا کسی
شہر سب پردے ہٹا کر سورج کی طرف بے محابانہ آپ
کے سامنے آجاتا ہے اور خوف سے آپ کے پیچھے
چھوٹ جاتے ہیں کہ خدایا میں اس شہر نگاروں کا باپ
ہا؟ اور کور چشم لیا کہ دیکھ ہی نہ پایا۔

تلختے کی میز پر ار تھنی کریم صاحب سے دلیانہ
ملاقات ہوئی اپنا نمبر دیا پاکستان آ کے اس پہ پیغام بھیجا
جواب نہ آیا ار تھنی صاحب اگر خود پڑھیں تو رہبط

کریں دہلی پونہ رشی بھی چند رعایات کے باعث ہمارا
وطن ہے۔

خیر میں سے اٹھے تو ترنم ریاض کے کمرے میں
جو کڑی جھلی ترنم نے ہمیں ایک ایسا تھوہ پلایا جو آج
تک نہ بیا تھا چھلے ہوئے ثابت بلوام دار چینی لٹا چکی
اور ذرا سے زعفران کو اچھے پانی میں دم کیا۔

ماہنامہ

ستمبر 2015 کا شمار و شمار ہو گیا

✽ مہلاٹنی اکڑل میں "شیف راجت" سے شاہجہ شہر

کی

✽ نیا کار " تڑپ مل مہاسی " سے شروع ہو چکا ہے

● لاکھ "کامیاب" کہے ہیں "میری بھی ہے"

✽ اردو "سید یوسف" کے "مقابلہ چائینہ"

• "بلازل" عربی میں کاٹنے والی

❖ ”دعا ہے دعا“ از سیدنا علیؑ علیہ السلام

۱۰ "میں گمان نہیں کرتا کہ" ایسا ہی کمال ہو

• "سات" ٹاپ جیو ٹی وی پر

✽ "پھر نہ کہتا" علی فقیر حسین کا دلچسپ مکمل جلد

• "مشایخ" قادیان کا دہلی دور

• ”اب نیندو کی پرائی“ عرصہ غسل کا ہوتا ہے

● صفت جان کیلے اور پھر اور کرشن ماطرے

انسان اور عقل کے

ابن سنان سے کہے کہ تم نے کون کیا؟

گوشت کے پکوان.

قریبی کے فضائل اور اہمیت

— ۱۰۰ —

بھئی کیا خوشبو تھی اور ساتھ ایک خوب صورت کشمیری گانا۔ ترنم واقعی اسمہ ہمسایہ ہیں کھڑکی کے باہر لہ حیانہ قطرات بھری بارش کے بعد جگمگا رہا ہوا شرجو ہندوستان کے کثیف ترین اور آلودہ ترین شہروں میں سے ایک ہے، لیکن آج ہمارے اعزاز میں ہاتھ منہ دھو کے اچھا بیکہ بنا میٹھا تھا۔

ترغم کے گھر سے اپنے کمروں میں پہنچے تو خیل کو اپنی حلاش میں پریشان پایا خیل بے چارے نے آتے ہی پولیس رپورٹ نہیں کرائی تھی اب اس کے چکر میں پریشان تھا۔

ڈاکٹر کیوں دیر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ لہذا سے
شاہجہ کا پوچھا گیا تو انہوں نے کہا۔

”بھئی لہجے میں آپ خواتین کے شاپنگ کرنے کی کوئی جگہ نہیں دیکھیں تو فیکٹریاں ہیں تولیوں کی مشینوں اور سائیکلوں کی کیا کرو گی تم لوگ؟“

قاسمی صاحب نے بھی مجمع دہلی اور اجمبر کا رخ کر چکے
تھے شام کو ایک فمستر آف اسٹیٹ سٹیشن ڈھائیڑا
صاحب نے پاکستانی شعرا کو جاسے لایا تھا۔

جرائع نمیک کو لیے پھرو ہے تھے بعد سٹانی پولیس
بھی یا سٹانی پولیس کی طرح ہی ہے بظاہر ہے دونوں کا
مفعول تو ایک ہی ہے، جس خفیہ کلائل طرز فکر۔

ہم چاروں ڈاکٹر کیل کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ کے کمرے کے لیے روانہ ہوئے ایک دو گھنٹوں بعد موٹر کے ایک بہت بڑے شہر کا سر نظر کیا یہ ایک مندر کا

دو دن تھا شیر کے گلے منہ سے گزرو کے لوگ اندر
مندر میں جا رہے تھے مندر کے ساتھ ہی مندر
صاحب کی چھوٹی سی پرانی مگر سنبھلی ہوئی کوٹھی تھی۔

باغیچے میں بہار آ رہی تھی اور ہر قدمے میں منظر صاحب کے کارخانے میں بننے والی مائیکل رکھی تھی۔

اور انکے روم کی طرف سے باہر ایک کھڑکی پر سے
 دیکھیں تو دیکھ کے جو کھو گنا شروع ہوا ہے تو آخر اس
 پہاڑ سے کہیں اور بھیجنا پڑا۔ منتر صاحب میوزک کے
 بے حد رسیا تھے۔ آتے ہی ساحر کی غزل منعم اپنا سن کو غم

اپنی ہر شئی مجھ سے ڈنڈا دکلاؤ۔

اگلے جیلے میں اپنی عزیز یکم رستا کے انتقال کی خبر سنائی اور اس سے لگے جیلے میں پہلے بھڑی چھوڑی کہ میں اگر کسی خاتون کو دکھتا ہوں تو نیڈی (needy) اور اگر کوئی اور دکھتا ہے تو وہ گریڈی (Greedy) ہے اپنے اس مذاق پر وہ تلوار خودی ہنسنے رہے۔

پھر وہ اسوں کا ذکر اور جملہ دلائل کا۔

”بھئی آپ کے ہاں تو طلاق فوراً ہی ہو جاتی ہے کسی بات پر غصہ کیا اور کہہ دیا طلاق طلاق طلاق بات ختم۔“

اب کی بار صرف تنبیہ بھی کھنکھار سے کام نہیں چلنے والا تھا۔ چنانچہ فوراً چہرے پر ایک خشونت بھری سنجیدگی طاری کی اور بتایا کہ ایک بار میں جا رہے ہزاروں طلاق کہہ دس وہ ایک ہی طلاق ہو کی پھر ایک مقررہ مدت کے اندر اگر رجوع کر لیں تو طلاق نہیں یعنی اب دو طلاقیں کا حق محفوظ ہے اور اگر وہ مدت گزر جائے تو پھر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

”تو یہ سب دکھا کون ہے؟ مولوی۔“

”جی نہیں شریعت صحیح سب کچھ فی البدیہہ کہتا تھا اس لیے مڑ کے بلی گروپ کو نہیں دیکھ رہی تھی۔“

”اور چار شلویاں؟“ اگلا جملہ۔

”چار شلویاں دیکھئے یہ ایک الگ مسئلہ ہے بیالوجی کے مطابق کسی بھی نوع میں باہر کی شرح پیداواری ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے پھر جنگل وغیرہ میں مولوں کے مارے جانے سے یہ تناسب مزید بڑھ جاتا ہے تو اس لیے۔“

تو جیلے میں فسر صاحب کو ایک کل آگلی اور وہ کرے سے نکلے جان میں جان لگی تھوڑی دیر میں بے چارے منہ لٹکائے داخل ہوئے گرد حیانہ میں اسی

روز ایک لڑکی کا رپ اور قتل ہوا تھا۔ پولیس والوں کی جان آفت میں تھی کیونکہ ایک دزد پہلے ہی ”لیلیٰ“ کی پہلی ہوئی ڈاکیومنٹری جو ”نر بھیا“ تھی دکھانے سے منع کیا گیا تھا اس کے چوبیس گھنٹے کے اندر یہ خبر

حکومت کے لیے بے چینی کا باعث تھی۔

”دیکھا یہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے چار شلویوں کی اجازت ہے اور اگر آپ سنگسار کی سزا دیں ایک مجرم کو تو آئندہ کبھی ایسا نہ ہو۔“ میں نے جلدی سے طعنہ مارا اور جی ہی جی میں سرخرو ہوئی کہ لو بھئی معرکہ سر کر لیا۔ صلاح الدین ابول بن گئے۔

چائے کی میز بڑی پر تکلف تھی ڈھونڈا سبزی کا پڑا میسرز اور سموے گلاب جامن جو خاص اسی دکان سے منگوائے گئے تھے جنہوں سے ساحر خرید کر تے تھے۔

گلاب جامنوں میں واقعی ساحر کے مصرعوں کی شہاس تھی کسی الو کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دلوں کو محبتوں سے فتح کیا جاتا ہے۔ جنگوں سے نہیں۔

فسر صاحب اب ذبیحہ یہ بات لے آئے میں نے تیر بار کہ آپ کے ہاں بھی تو کچھ لوگ گوشت کھاتے ہیں کیا ان کا دھرم بھڑٹ نہیں ہوتا۔

بہت ہنسے اور بولے کہ بھئی میں تو اگر کسی روز گوشت نہ کھاؤں تو میرا پوتا کتا ہے۔ ”دادا! میرے پیٹ میں گھاس آگ آگلی ہے۔“ یہ تو چکنے گھڑے نکلے۔

خیر ابھی بات باقی تھی۔ میں نے ویلایکیشن کا تیر نکالا اور چلے میں چلے جا کے چھوڑ دیا۔

بہت ہنسے کہ میں بھی ہم نے خوب عی و سکی ہانپی اور خوب دہیہ مگر نہ کھو تو ساری نشستیں عام آدمی لے گیا۔

”انہوں نے کیا بولا؟“ میں نے فخر تیر چھوڑا۔ ”کچھ نہیں۔“ بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

اب کے میں نے ”عام آدمی“ پارٹی کی حمایت میں تقریر کرنے کی خواہش کا اگلا بڑی مشکل سے کھوٹا۔

فسر صاحب کے گھر میں جگہ جگہ ان کی آنچلیانی چٹی ”رستا“ کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور وہ ہمیں بار

بار دکھانے پر روک رہے تھے لیکن ہم ”گولڈ مارکیٹ“ دیکھنے کا بہانہ کر کے کھٹک آئے۔

باقی آئندہ ان شواہد

"لور سائمن کیا تو میرے لور کیا کچھ آئے ولا ہے؟"
 "آج کل جو تو میرے ہاں "ریگ لاگا" کے ہم سے ایک سیریل ہے لور آئے وائی سیریلز میں "دل حلق" جو میرے تو میرے آئے گا لور ایک سیریل ہم سے تو میرے آئے گا"



"لور کوئی فلم بھی تو آئے والی ہے آپ کی؟"
 "نہی اور کوئی ایک فلم نہیں بلکہ تین فلمیں تقریباً تیار ہیں ریلیز ہونے کے لیے جن میں ایک تو 14 اگست کو ریلیز ہوگی جس کا نام "سلیو خدائے ادا اقبال" ہے بلانڈ لو (Blind Love) عید الاضحیٰ ریلیز ہوگی اور ایک کینیڈین فلم ہے "خواب" یہ اردو فلم بندہ کینیڈا میں ریلیز ہوئی۔"

ادکان موسیقار

عامر قریشی سے ملاقات شاہین رشید

"اس کی شوٹنگ بھی کینیڈا میں ہی ہوئی ہوگی؟"
 "یہ پاکستان میں تیار ہوئی ہے مگر پہلے یہ کینیڈا میں ریلیز ہوئی اس کے بعد شاہد پاکستان میں آئے گی۔"
 "اور آپ کے دیگر کام میوزک اور گلوکاری کیسی چل رہی ہے؟"
 "الحمد للہ وہ کام بھی میٹ جا رہے ہیں۔ بس مجھے کچھ کام کر کے بتا چکا لگتا ہے۔"
 "کچھ عرصے پہلے اداکاری کی طرف آپ کا رجحان کتنی کم تھا اب آپ ڈراموں میں نظر کرنے لگے ہیں۔ وجہ؟"

"بس بات اچھے اسکرپٹ کی ہے۔ اچھی کہانی ہو اچھا کردار ہو تو انکار نہیں کرتا۔ کیونکہ اداکاری بھی میرا شوق لور میرا جنون ہے شروع شروع میں کم آتا تھا ڈراموں میں لور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈراموں کی

ایک وقت تھا بلکہ کچھ عرصے پہلے تک عامر قریشی کی پہچان ان کے والد مصطفیٰ قریشی تھے مگر اب شوہر میں عامر قریشی ایک مستتر نام ہے جو ناصر فن اداکاری میں اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ہو چکے ہیں بلکہ دیگر فیلڈز میں بھی اپنا نالی نہیں رکھتے۔"
 "کیسے ہیں عامر قریشی صاحب؟"
 "جی اللہ کا شکر ہے۔"

"بازے کیسے گزرے عید کیسی گزری؟"
 "الحمد للہ سب کچھ بہت اچھا گزرا۔"
 "بڑی ہوئی آپ کی پر فارملس بہترین تھی۔" شکیو بدل میں دلہن پائی یا بائیں سنیں؟"
 "دلہن بھی پائی لور بائیں بھی سنیں۔ شکیو بدل میں ایسا ہی ہوتا ہے مگر مجھے رسپانس بہت اچھا لگتا اس سوچ کا۔"



شوٹ میں وقت بہت لمبا نہ تھا کہ جیسے وقت ضائع ہو رہا ہے۔

”شاید آپ کوئی عرصہ باہر رہ کر آئے تھے اس لیے،

”ہاں یہ وجہ بھی ہے، لیکن اب میں ایسا ہی ہو گیا ہوں جیسے یہاں کے لوگ ہیں۔ یہاں کے لوگ وقت کی بندوبستی نہیں کرتے تو میں نے بھی بندوبست کرنا چھوڑ دی ہے۔ باہر کی تو آپ بہت ہی نہ کریں، جتنی بندوبست وہاں کی جاتی ہے اس کے بارے میں ہم صرف سوچ ہی سکتے ہیں۔ وہاں سنسن روڈ پر بھی ریڈ سگنل کا احترام کیا جاتا ہے اور یہاں بھرے ہجوم میں ریڈ سگنل کا کوئی احترام نہیں ہوتا۔“

”آپ کا اصل شعبہ میوزک ہے۔ تو آپ کیا کیا کر چکے ہیں؟“

”بہت سہم کیا ہے ماشاء اللہ سے بے شمار ڈراموں کا بیک گراؤنڈ میوزک دے دیا ہوں۔ یہاں ملک جب سرکاری سطح پر کوئی وفد جاتا ہے تو ان کے جانے سے پہلے وفد کے اعزاز میں جو تقریبات ہوتی ہیں ان کا میوزک بھی میں ہی دیتا ہوں اور سیف گیمز کی اقتصادی اور اقتصادی تقریب کا میوزک بھی میں نے ہی ترتیب دیا ہے۔“

”سارے فن آپ کو دورے میں ملے ہیں؟“

”جی الحمد للہ۔ میری والدہ مدینہ قریبی کو بھلا کون نہیں جانتا گلوکاری کا فن ان سے ملا۔ میوزک کی سوجھ بوجھ بھی ان کی طرف سے ملی اور اب ان کی طرف سے کام کر رہا ہوں۔“

”پھر پی ڈی پی، انارکلی، امجدیہ کی سی سرحدوں میں منت ہو گا؟“

”نہی نہیں، بلکہ ہرگز نہیں۔ بے شک مجھے بچپن سے سب جانتے ہیں کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے کبھی میری سفارش کی اور نہ ہی میں نے ان کے ہم کام ہونے کا خواہش کیا۔ مجھے تو اس قیادت میں لانے کا سرا منگور قریبی صلاب کے سر جاتا ہے

انہوں نے ہی مجھے اپنی ٹیلی فلم میں ایک کیا تھا اور پھر اس کے بعد خود بخود مجھے آفرز آنے لگیں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنی محنت سے یہ مقام بنایا ہے۔“

”بے شک آپ کا بہت سہم ہے لیکن اگر آپ اپنے والد کے ہم کے ساتھ آگے بڑھتے تو کیا بہت آگے نہ نکل چکے ہوتے؟“

”بے شک بہت آگے نکل چکا ہوتا لیکن شاید مجھے

اطمینان نہ ہوتا اور مجھے ہر دم میں اس پریشان کرتا کہ میری محنت سے زیادہ میرے والد کا نام ہے۔ تو آج میں بہت فخر ہے کہ سنا ہوں کہ یہ مقام میں نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔“

”اب سے ہیں اس وقت کی باتیں میں؟“

”92-91 میں اس قیادت میں آیا اور ایک ٹی چینل سے ویڈیو جنکشن کی میزبانی کی اور یوں اپنی لی زندگی کا آغاز کیا اور پھر ”انارکلی“ کے لیے ”شوٹ کارڈ فرام پاکستان“ کے عنوان سے ایک پروگرام کرنا تھا اور میں سلا پاکستانی تھا کہ جس نے اس پروگرام کی میزبانی کی۔“

”اچھا انارکلیس۔ کیسے مہنگی ہوئی؟“

”انارکلیس کے لیے ٹوئیشن ہو رہے تھے اور میرا

توڈیشن نواب یعنی صاحب نے لیا تھا اور اس آڈیشن کے لیے پورے پاکستان سے کافی لوگ آئے ہوئے تھے لیکن کامیابی میرے نصیب میں لکھی ہوئی تھی سو مجھے مل گئی اور جب سب کچھ لوگ ہو گئے تب میں نے والد صاحب کو بتایا تو وہ بہت حیران ہوئے اور دلچسپ بات بتانے لگے کہ یہ پروگرام ملک سے باہر بھی دکھایا جاتا تھا تو جب میں انگلینڈ پڑھنے کے لیے گیا تو کافی لوگ مجھے پہچانتے تھے۔

”اچھا گڈ۔ کمال تک پر محنت کی۔ مطلب ڈگری“

”میں نے ایم بی اے اور ایم ایس سی فن مارکیٹنگ کی ڈگری حاصل کی ہے اور کچھ عرصہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام اور کمپنی پروڈکٹ کے لیے جنگلوز بھی لکھے۔“

”پر محنت کی لیے گئے میڈیا میں کیپٹا آپ نے متعلق ہو لیا بہتر ہوا؟“

”میں سمجھتا ہوں کہ کیپٹا میرے لیے نقصان کا باعث بن گیا۔ میں اس وقت ریڈیو جنگلوز کرتا تھا اور ایک کامیاب وی بے تھا۔ اسی زمانے میں حدیقہ کیلی، شیراز ہیل، عبدالرحمن، جو لو احمد، نجم شیراز وغیرہ بھی تھے۔ اپنے پروگرام سلسل کے ساتھ کرتے رہے اور ان کی جگہ جتنی بھی ٹیکس پر محنت کی وجہ سے منظر سے غائب ہو گیا اور آپ کو بتائی ہے کہ میں تو آنکھ لو جھل پازو لو جھل والی بات ہوتی ہے مجھے میرے کیپٹا نے ایک دم سے پیچھے کر دیا۔“

”یہ کس سن کی بات ہے؟“

”یہ بات ہے 2001ء کی پھر میں کافی عرصہ ملک سے باہر رہا۔ تعلیم مکمل کی۔ جب کی اور پھر پاکستان واپس آیا۔ مگر پچھتاہوں اس وقت پر جب میں نے ملک سے باہر جا کر پڑھنے کا فیصلہ کیا۔“

”اگر آپ پاکستان میں ہی نہ کر اپنی تعلیم مکمل کرتے اور ساتھ ساتھ اپنے شوق کو بھی جاری رکھتے تو یقیناً آج کس سے کس کی پیچھے گئے ہوتے؟“

”بالکل۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں ایک بار پھر اپنی جگہ بننے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اور اب شوہر کی اس فیلڈ کے ہر شعبے میں کافی کام کر رہا ہوں۔“

”کمالی کا عمل کب سے شروع ہوا؟“

”کمالی کا عمل تو بہت کم عمری میں ہی شروع ہو گیا تھا مجھے یاد ہے کہ جب میں شاید 6th کلاس میں تھا تو مجھے ایک اسٹیج ملے میں کام کرنے کا موقع ملا تو مجھے اس میں کام کرنے کے لیے بھی ملے یہ یاد نہیں کہ کتنے ملے

تھے۔ البتہ جب میں ریڈیو جنگلوز کرتا تھا تو مجھے ایک پروگرام کے چار ہزار روپے ملا کرتے تھے۔ باقاعدہ جاب میں نے 2000ء میں شروع کی۔ فری لانس بہت کام کیا ہے۔ ٹیچر میں کام کرتا۔ جنگلوز بنانا۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”آپ نے شوہر کے ماحول میں آنکھ کھولی آپ کی تربیت میں بھی اس کے اثرات آئے؟“

”ہم اپنے والدین کی ودی لولادیں ہیں۔ ایک میں اور ایک میری۔ سن تو والدین نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ ہمارے گھر کا ماحول شوہر والا نہ ہو۔ لہذا انہوں نے اسے گھر کو ہمیشہ شوہر کے ماحول سے دور ہی رکھا۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت سادہ اور مذہبی رہا۔ گھر میں فلم کے بارے میں زیادہ بات چیت بھی نہیں ہوتی۔ یہ تو دورے میں ملتی ہوئی صلاحیتیں ہیں کہ میں اس فیلڈ میں آ گیا اور نہ جس طرح کا ہمارا ماحول تھا میں شاید اس فیلڈ میں نہ ہوتا۔“

”نہ تو کیا اچھا لگتا ہے اپنی بچپن اپنے حوالے سے یا والد کے حوالے سے؟“

”اپنے حوالے سے اپنے کام کے حوالے سے بچپن کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے لیکن والد کے حوالے سے بچپن بھی بہت اچھی لگتی ہے بلکہ خیر ہوتا ہے کہ میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں جس کو ساری دنیا جانتی ہے جس کا ایک نام ایک بچپن ہے مجھے خیر ہے اپنے والدین کا ش میں ان کی توقعات پر پورا اتر سکوں۔“

”اپنے لیے کردار کا انتخاب کرتے وقت کیا



”اچھی عادت تو یہ ہے کہ دن کے مذہب کے قریب ہوں اور رات کی عادت یہ ہے کہ لوگوں پر جلدی بھروسہ کر لیتا ہوں جس کی وجہ سے نقصان بھی اٹھاتا ہوں۔“

”مہربان! کیسے ہیں آپ؟“

”میں جناب ایک ٹھنڈے مزاج کا بندہ ہوں مجھے نہیں یاد کہ میں نے کسی پہ ہاتھ اٹھایا ہو یا میں کسی پہ چٹخا چلایا ہوں۔“

”اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عام قہشتی سے اجازت چلی اس شکر ہے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں تادم کیا۔“



سرواق کی شخصیت

ماڈل _____ فریضہ اعجاز
میک اپ _____ روز بی بی پار
فوٹو گرافر _____ صوفی رضا

ترجیحات ہوتی ہیں آپ کی؟“

”میں کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کدو اور کتنا بڑا ہے یا کتنا چھوٹا ہے میں تو صرف یہ دیکھتا ہوں کہ وہ لفظوں کے ڈانڈ لاگ میں بھی پاور ہے یا نہیں بس پھر وہی کدو میرے لیے اہم ہو جاتا ہے اور نہ صرف فلم میں بلکہ سٹی وی کے ڈراموں میں بھی میں کدو اور کوئی اہمیت دیتا ہوں۔“

”ڈائریکٹر اور پروڈیوسر آپ کے سامنے کدو رکھتے ہیں یا صرف آفر دیتے ہیں؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسرز میرے سامنے پوری کہانی پورا اسکرپٹ رکھتے ہیں۔ مجھے کدو اداؤں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اپنی رائے بھی دیتے ہیں اور مجھ سے مشورہ بھی لیتے ہیں۔ تب کسی بات پہ معاہدہ ہوتا ہے اور میں کلام کرنے پر راضی ہوتا ہوں۔“

”کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہو جائیں۔ انڈیا کی زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“

”جی الحمد للہ بہت اچھی گزر رہی ہے۔“

”بچے؟“

”ہو جائیں گے جب اللہ کا حکم ہو گا۔“

”مذہب کا رجحان؟“

”بہت زیادہ رجحان ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھوں اور روزے بھی پورے رکھوں اور ہر وقت وضو میں رہوں۔ سنا ہے کہ ہر وقت وضو میں رہنے سے اللہ کی نعمتیں نازل ہوتی رہتی ہیں اور رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔“

”شاپنگ کریڈٹ کارڈ سے کرتے ہیں یا کیش کی صورت میں؟“

”میں کریڈٹ کارڈ سے شاپنگ کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ میری نظر میں یہ ایک ادھار ہوتا ہے اس لیے بہتر ہے جو کام کرو کیش پہ کرو تو میں ہمیشہ کیش ہی رکھتا ہوں بوائے ساتھ۔“

”اپنی کوئی اچھی بُری عادت بتائیں؟“

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
جھولنے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گزریاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے تانا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا باپل کا کمر چھوڑ کر یادیں جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مر جاتا ہے۔
غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سکی خال اور گئے پچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک بڑی گھسی گھاس کا خاکہ خیال نہیں طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا بڑے جہاں ان بڑے لوگ کالم کلچر عزائی، جھڑا، مٹھنے تھنے ہوں اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت و کار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رانیاں ہی مٹتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس مادہم اسی عالم سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے تانا جوڑا ہے

میدانی

پھرتی۔ عمران ڈائجسٹ اس طرح بڑھے گویا کہ میرے
میں لیے تھے اور پڑھنے کی رفتار اتنی تیز کہ چھوٹے بہن
بھائی صبح شام لائبریری جانے سے تنگ لائبریری
الگ حیران۔

ابن علی، نسیم حجازی اور ہر وہ راسخ جس نے تجس
لکھا۔ پھر کالج میں اردو لوب لیا اور لائبریری سے
دوستی کاٹھ لے۔ میرا لائبریری کارڈ دیکھ کے دوستیں
حیران ہوتیں۔ اتنی کتابیں کب پڑھتی ہو۔ کالج ورک
کسے کرتی ہو اور بس جی تب سے گھڑی کے مطابق
چلنے کی جو عادت پڑی تو اسے جیتنے نہیں دیا۔ گھر میں
بہن بھائیوں میں بڑی تھی تو ماں کا آدھا حصہ تھی۔
لہذا اتمام تر سلیقے اور ہنر انہوں نے میرے اندر ایڈیٹ
کی سعی کی۔ شادی سے پہلے زیادہ سے زیادہ ڈگریاں جمع
کرنے کا شوق تھا۔ لہذا استاد محترم بہت محنت ملے۔
انہوں نے سہ ماہی میں دو دو چھاپائیں لگوائیں۔ میٹرک

پہلے تو سلسلے سے پہلے جو آپ نے نین شعر لکھے
ہیں وہ ہر شعر شادی شدہ خواتین کے دل کی عکاسی کرتا
ہے۔

ج۔ ”شادی کب ہوئی؟“
ج۔ ”جب میری شادی 7 فروری
1999ء کو ہوئی۔ اب عمر گنتے نہ لگ جائے گا“
میں بمشکل اٹھارہ سال کی تھی۔ جو ظلم تھا۔“
ج۔ ”شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں
تھیں؟“

ج۔ ”شادی سے پہلے زندگی زندہ تھی۔ نہ جانے
کب یا شاید جب چلے جانے پھر پڑھنے سکھ لے تو
کتابوں سے عشق ہو گیا۔ بادشاہوں کی ایک ایک
روپے کی بکتے والی کتابیں پھر ہمسایوں کے گھر دیکھے
اخبار جہاں تو جاسوسی کہانیاں کا چھکچھک جو لگا تو جاسوسی
ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ کے دیوتا کی سونیا بنی

شکر ہے رب کا خوب صورتی بھی ملی۔ غیور اور محنتی بھی ملا۔

س۔ ”معنی کتنا عرصہ رہی شادی سے پہلے فن پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟“

ج۔ ”۳۰ سال کا جواب ہے کہ معنی اٹھارہ سال رہی۔ (۱۱۱) لیکن سی ایل فن تھا اور جرأت ذرا کم تو ایسی کوئی کوششیں نہیں ہوئیں۔ والد صاحب کو اللہ جنت دے۔ ہمارے دلیلیں پر اپنا بے اتھارہ عب رکھتے تھے۔“

س۔ ”شادی سے پہلے سرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟“

ج۔ ”شادی سے پہلے سرال والے نہیں تھے بلکہ پھوپھو اور پھوپھا تھے اور مجھے میرے والد صاحب سے بہت متعلق تھیں۔ لیا تھا، کیونکہ ہمارے جوان ہونے پر ظالم سلج بھی آگ آئے تھے۔ رشتہ داروں کی صورت میں تو ابوجہاں رشتہ دینے سے انکاری اور سریاں صاحب نے گھر والوں کا ہاتھ بند کر رکھا تھا۔ خود گشتی کے اڑا دے دے دے کے تو بے چاروں نے خوب ناک سے لکیریں کھینچیں، بے اتھارے و عید کرنے کے بعد میرا رشتہ لیا۔ سب میری بے تحاشا عزت کریں گے، میں اپنا سلیقہ اور ہنر آزمایا کہوں گی اور خوب دلو سمیٹا کہوں گی۔ پر مہا لکھا ماحول بناؤں گی۔ محبتیں باتوں کی محبت پاؤں گی مگر ساتھ ہی کہیں قسمت کھڑی میری منصوبہ بند ہوں۔ قہقہے لگا رہی تھی کہ میں تمہارا ساتھ چھوڑ رہی ہوں، آگے اللہ کی امان میں۔“

س۔ ”شادی کے لیے تعلیم چھوڑنا پڑی یا کوئی قربانی بننا پڑی؟“

ج۔ ”شادی کے بعد تعلیم چھوڑنا پڑی اور اس کے بعد قربانیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور رست کی طرح پہلے ہوئے خوابوں کی کرسیوں سے لپکتی ہوں۔“

س۔ ”شادی بقیہ خولی انجام پائی یا رسموں کے دوران لیں دین کے معاملے پر بد مزگی ہوئی؟“

کیا تو اپنی ہی ساتھ ایسا ہے۔ ایسا ہے ملل ہوا تو سی ٹی گمراہ ہوا۔ کپیوٹر تب نیا نیا کالج میں رائج ہوا تھا۔ اس کے شارٹ کورسز لی اے کیا تو لی ایڈ اور پھر شادی۔ سر صاحب جو پھوپھا بھی ہیں اس وعدے کے ساتھ کہ تعلیم جاری رکھو اؤں گے۔ (جو بعد میں بھول گئے۔)

کپڑے برتن، ڈیرائن کرنا شوق تھا، کوکنگ تو کھنی میں ملی۔ ایف اے کے بعد پرائیویٹ اسکول میں چاب کی تو بچوں کی ہر دلعزیز پھر رہی۔ عزت، قدر اور تعریف بے تحاشا سمیٹی۔

س۔ ”۳۰ رشتے میں آپ کی مرضی تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟“

ج۔ ”یہ رشتہ تب سے بڑھ گیا تھا۔ جب سے دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں۔ ہوا کچھ یوں کہ پھوپھو جن کے یہ صاحب زادے ہیں۔ دلوری کے لیے اپنے مکے آئی ہوئی تھیں۔ تو وہاں میری امی جان بھی ہوئی تھی۔ تو دس دن پہلے یہ تشریف لائے رمضان میں اور عید الفطر کے روز میں نے دنیا میں آنکھیں کھولیں تو ان کے چچا جو بچے کو دیکھنے آئے ہوئے تھے گوجر والوالہ سے گجرات تو بولے کہ بھئی یہ بی بی ہماری ہو بنے گی، تو پھر آپ خود سوچیں کہیں کی مرضی، کہیں کے خیالات۔ ہاں جب جوان ہوئے تو لوگوں نے روئے بھی اٹکائے۔“

س۔ ”ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے پہلے سے کوئی تصویر تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟“

ج۔ ”ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے بہت سی خواہشات تھیں۔ بہت سے خیالات تھے۔ ہر کہانی میں میں خود کو ہیروئن دیکھتی اور انہیں کو ہیرو کہلاتی اپنے اوپر اس طرح طاری کر کے بڑھتی کہ ساتھ موجود لوگوں سے نا اتوریتی۔ کلن خود بخود بند ہو جاتے۔ جی چاہتا ہمارے غیور اور محنتی بے تحاشا قلع، محبت کرنے والا ساتھی ملے جو میں اور تم کا فرق مٹا کے محبت کرے۔“

اعتبار قدر محبت خلوص میں ملا۔ وہ سب کچھ جو ملا اس میں لالچ، حسد، خود غرضی کی فراوانی تھی۔ خوابوں کے لیے کے نیچے سے اب نیچے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ست پہلے جب مجھے ہوش آیا اور ہاتھ چلا کہ

مجھے بیاہ کے پھوپھی کے گھر کو جراثوالہ جانا ہے۔ تو میں بے ساختہ بولی کہ گوجراثوالہ جہاں کے پہلوان مشہور ہیں۔ اب وہ تو دل غ سے نہیں بیٹ سے سوچتے ہوں گے۔ واہ رے رب تیری قدرت میں نے عرصے کے بعد ان لوگوں کو ایسا ہی پایا۔ (سوری۔ ابن لوگوں سے جن سے میرا واسطہ نہیں پڑا) مگر جن جن سے رزاقہ ایسے ہی ہیں۔ ظاہر ہے وسیع نظر اور وسیع دل لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں یہاں بھی ہوں گے۔
س۔ ”شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟“

ج۔ ”شادی کے پانچ چھ دن بعد کام سنبھال لیا۔ کھیر بکوائی کی رسمیں یہاں نہیں ہوتی۔ میں پہلی سوختی۔ گھر کو سنبھالنے کے لیے ماسی ل گئی کام ختم اور وہ بھی راضی لکھی ماسی۔ سات بجوں کی دہائی نویں دہائی میں گئی اور نئی دہائی میں یو ڈھ میں روح سا گئی۔“
س۔ ”کیا میکے اور سررال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟“

ج۔ ”سررال اور میکے کے کھانوں میں کافی فرق تھا۔ وہ لوگ اچھے چاول کھاتے ہیں۔ میکے والے تڑکے والے چاول کھاتے تھے۔ میکے میں امی جان ناشتا اور کھانا ناٹم بردے دیتی تھیں۔ ہم اسکول سے آتے تو کھانا تیار ملتا۔ یہاں بچوں بجے ہوتی اور رات کا کھانا جب آتیں بھوک سے سوکھ جاتیں تب پکانے کو لایا جاتا۔ ہمارے ہاں رواج نہیں تھا پھوپھوں، خالاؤں کے گھر جانے کا۔ اس لیے کبھی آنا نہیں جاتا تھا۔ تو ماحول کا اندازہ نہیں تھا مگر بڑے بچن میں ابو سرفرست تھے۔ جانتے تھے اسی لیے رشتہ دینے سے انکاری ہو گئے۔ مگر ہر حال ہو کے رہا۔ جو منظور خدا تھا۔ ماحول پر ماحول لکھا نہیں تھا۔ بچے سب چھوٹے تھے اور ابھی پڑھ

ج۔ ”شادی پھر وہ خلی انجام پائی۔ میرے ابو جان اور امی جان جیسا کہ دین پھوپھی، چھوٹی بہن کا بھی دھیان رکھنا پورے خاندان میں کسی کا بھی نہیں۔ لہذا کوئی

سوق و راعی نہیں کیا۔ ہاں رسم و نمائی نہ ہو پائی۔ ہوا کچھ یوں کہ جو زیورات مجھے چڑھائے جانے تھے وہ دوسری پھوپھی کے حوالے تھے اور انہوں نے آتے ہی بارات کے ساتھ مجھے پہنا دیے۔ اس میں ایک لاکٹ اور انگوٹھی جو دو لہانے دلہن کو گفٹ دینا تھا۔ وہ بھی شامل تھے۔ رات کو مجھ سے مانگیں اور میں نہ دلاں اور خوب انجوائے کیا۔ بعد میں پھر وہ نمائی میں پیسے ملے۔ ولیمہ بھی بہترین رہا۔ مگر ہاں ایک بات اور بارات پہ میری دوستیں سارے گاؤں سے میرے اسٹوڈنٹس کی حاضری تھی اور میرے سررال والے حیران۔ اتنے گفٹ تو کبھی کسی کو نہیں ملے۔ بعد میں بھی میری سررال میں اس بات کا تذکرہ رہا۔ ہر چاہنے والے کا شکریہ۔“

س۔ ”شادی کے بعد شوہر نے پہلی بار آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟“

ج۔ ”شادی کے بعد دو لہا میاں دیکھتے ہی بولے ماشاء اللہ۔ شکر ہے سب خیریت سے ہو گیا اور تم مجھے مل گئیں۔“

س۔ ”شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟“

ج۔ ”میرا ہوں اتنی کہ بس حیرانی جاتی ہی نہیں۔ جو کچھ ابھی تک لکھا ہے وہ اک سر تھا اور زندگی شادی کے بعد دو سراں بن گئی۔ سب پر محبتیں سب سلیتے نکل ہو گئے۔ پاکریے گئے۔ سب سے پہلے کتب خانی پر پابندی لگائی گئی۔ رسالے پھینکے گئے۔ ہر دم متحرک زندگی میں گھراؤ آ گیا۔ سررال نمائند خانے کا پنجواں ہوا بڑا نہیں تھا کہ بڑوں کو ازلان کے لیے جگہ ملتی۔ سو چاندوں طرف بے بسی ہی بے بسی تھی۔ والد محترم کی خاص نصیحتوں میں سے ایک ”لوٹ کر پیچھے نہیں دیکھنا“ (روند پتھر کی ہو جاوگی)۔ سب کچھ ملا۔ عزت

رہے تھے اور خوب تو تکار ہوتی۔ میں وقت کی پابند
 تھی نہیں سب سے تھے۔
 س۔ ”سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور
 کب تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟“
 ج۔ ”میں نے سسرال میں جو سارے گزارے۔ شوہر

اور ساس کی خفا کے مطابق۔ ہر وقت دھڑکتے دل
 کے ساتھ کہ اب کھانا کھا کر چلا۔ کوئی مگر نئی نہیں
 ہوتی بیٹیوں کے مقدر کی یہ ٹھیک ہے مگر جہان میں
 ضرور کریں۔ لوگ کا اخلاق اس کی کمالی سب
 دیکھیں بعد کی جمل خواہی سے بہتر ہے۔ محض پرانے
 رشتوں کی وجہ سے خدا اور لوگ نے رشتے آنکھیں بند
 کر کے نہ بنائیں۔ ورنہ بیٹیوں کی زندگی ایسا ہی ہو جاتی
 ہے۔ تنقید ہی تنقید ہر طرف تعریف کا تو دور تک پہنچا
 نہیں۔ (خاص بدایت تھی بیویوں کی تعریف کریں تو
 سر پر چڑھ جاتی ہیں۔) مگر پھر بھی چھوٹے دیوہوں
 نعلوں کے (بچپن کے) کچھ جملے حاصل زندگی
 نصیب۔ چھوٹی ننہ نے کمال اتنے کام کرتی ہیں آپ
 ہر وقت مصروف رہتی ہیں۔ ایک دفعہ کمال کلج ٹکی
 فریڈ کو کہہ رہی تھی صابھی ٹھکانے سے لے کر سوچی تک
 سب کام کرتی ہیں اور ڈریس ڈیرا تک تو کمال کی
 ہے۔ بیٹی ننہ نے کمال (جب کواری تھی تب سے) خوب
 آپ کا ہی حوصلہ ہے پانی جو اس جن نما انسان کے
 ساتھ رہتی ہیں لوہے میں پڑی پاگل بڑے بھائی ہیں
 تمہارے۔ چھوٹے دو دیور میرے کھانوں کی اکثر
 لوگ تعریف کرتے بے شک بعد میں ان کی کلاس
 خوب مل جاتی ہے ساری باتیں تب کی ہیں جب وہ خود
 بھی چھوٹے تھے میرے بچے بھی چھوٹے تھے نا بھی
 کلور تھا اٹھارہ افراد کا گھر تھا۔ چل چل رہے ہوتے
 گئے بھول گئے کہیں نے یہ یاد کیا ہے اس نے ہمیں پالا
 ہے۔ جتنی تعلیم زیادہ حاصل کرتے گئے اتنے مجھ سے
 میرے بچوں سے لے کر بھائی سے دور ہو گئے۔ ان کے
 دل پھر کے ہو گئے شاید۔ بھوٹی بھوٹی باتیں ہنسی
 و ہنس احتیاد کر گئیں جو میرے احتیاد سے باہر

ہو گئیں۔ میں تو بس بند کمرے میں رہتا کرتی۔ دوسرا
 حیران ہی رہی کہ یہ لوگ اتنے بدل گئے ہیں۔ مجھے چیز
 میں کپڑے سکھانے والی مشین ملی تو میں نے شوق میں
 نکل کے لگائی، ساس صاحب فرماتے تھیں ناگ
 چیز ملے، کپڑوں پہ کپے مل بڑ جاتے ہیں اس سے۔ یہ
 تم ہی کو مبارک ہو۔ ہمارے کپڑے نہ اس میں ڈالنا۔

میں نے رسل سے سمجھایا نہیں، پھر پھر ایسا نہیں
 ہے۔ جلد ہی سنبھالے جائیں گے اتنے زیادہ کپڑے۔
 آگے سے مجھے خوب سنائیں۔ (وہ کتھوں آئی ایڈی
 لٹنی) لوٹی بات ختم ایسی بے شمار کا اتحاد تو تنقید میں
 مقدر تھیں۔ کس کس کا ذکر کریں۔ شکر ہے رب کی
 ذات کا وقت گزر گیا، مگر دل یہ کھنڈے ڈال گیا وہ جیسے
 جامد میں نظر آتے ہیں۔ مگر تعلیم نے زبان بندی سکھا
 رکھی تھی جو ہمیشہ کام آتی۔ دوسری کے بعد میرے
 جیسے کی شادی ہوئی تو کچھ صبر جمیل کو دیکھ آگیا۔ کچھ
 بدلتی ہیں کچھ نصیب جس اس نے بے پائندہ دیں۔ تو
 گزارا ہونے لگا۔ میں مردوں کے گھر سے جانے کے
 بعد گھر کو سنوارنے لگی۔ گھر کے کام کو شش کرتی ان
 کے آتے تک ختم ہو جاتیں۔ مگر یہ لوگ مردوں کو دکھا
 دکھا کے کام کرتیں سو پھر سوچ لیجئے مرد کیا سمجھتے۔

س۔ ”سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو
 آپ کا حق تھا؟ سسرال میں گھریلو اور خاندانی
 معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی
 ہے؟“

ج۔ ”سسرال والوں نے قطعی حق نہیں دیا جو میرا
 تھا۔ بیٹے سے ہی کام چلا لیتے اس کی انہیں ضرورت
 تھی۔ رشتے کرنے ہوتے، کہیں جانا ہوتا ہمیں نہیں
 بتایا جاتا تھا۔ چپ چاپ سب کام کر لے جاتے۔“
 س۔ ”سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد
 تک پوری ہوئیں؟“

ج۔ ”سسرال والوں سے وابستہ کوئی توقع
 پوری نہیں ہوئی۔ ان کے سامنے تو میرا جنازہ
 ہو گا تو بھی ان کے قہقہے لگیں گے۔“

س۔ ”بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے۔ خصوصاً ”سہلا بچہ“ ایک طرف خود میں آتی تبدیلی دوسری طرف شوہر اور سسرال والے آپ کو کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔“

ج۔ ”بچوں کی پیدائش عورت کے لیے واقعی بڑا امتحان ہوتی ہے پہلی بیٹی کی پیدائش سے پندرہ دن پہلے ساں بھرا پراگھر چھوڑ کے بہن کے گھر جا کے بیٹھ گئیں۔ میں الگ پریشان کاموں کی نہ ختم ہونے والی لسٹ اور مردوں سے بھرا گھر، بہر حال صبر کیا کوئی شکوہ نہیں کیا۔ میرے چچا سسر ایک دن آئے پالی مانگا میں دینے گئی تو کہنے لگے بھابھی کہاں ہیں میں نے بتایا تو پالی وہیں چھوڑا اور اٹھ کھڑے ہوئے بعد میں پتا چلا کہ جاکے بھابھی کو خوب سنائیں کہ بچی کو اس حالت میں گھوڑا کیلے چھوڑ کے یہاں آکے فالٹو بیٹھ گئی ہیں گھر چلیں تب آئیں۔ بہر حال میری امی نے اسپتال سے گھر تک ساتھ دن میرے ساتھ گزارے، بچی یزیر بن پیدا ہوئی اور ٹھیک آپریشن کے گیارہویں دن میرے

جینٹھ جی کی منگنی کا شوشہ چھوڑ دیا گیا تو ایسی حالت میں سارے کاموں کی نگرانی بظاہر مگر زباناں تر خود کرتا خوب مگر می کاموں جولائی میں پھولی سی بچی تھی۔ مہمانوں کی آمد روز کا معمول تھی۔ کچھ سسر صاحب بھروسے کے کو کھڑ بھی تھے ڈیرہ داری بھی تھی۔ بھینسیں، گائیں، نوکر چاکر، عیروں ڈھیر مصروفیات ایسے میں آرام کرنا تو خواب ہوا۔ ساتھ ساتھ سفار پڑا مگر کوئی انوکھے بچے ہیں، ہم نے بھی تو پیدا کیے تھے۔ بچے سو میں تو باؤں کو کالم کرنے چاہئیں۔ (تو پھر باؤں کو کب سونا چاہیے، جب بچے اٹھ جائیں؟) پکڑنے والا بھی تو کوئی ہو۔ اللہ کا شکر رہا میاں صاحب جہاں بہترین بننے ہیں یہاں بہترین باپ بھی رہے۔ بچوں کا خیال کرتے، شہزادوں کی طرح چالنے کی کوشش کی بساط بھر۔ تمام تر مخالفتوں کے باوجود اور میں نے پھر اللہ کا نام لے کر بہترین ماں بننے کی ٹھان لی اور صد شکر کامیاب رہی، آئندہ بھی اللہ کرے، ساری دنیا کو چھوڑ کے جو عورت گھر اور بچوں کی ہو جائے اللہ کی رضا کے لیے تو آستیاں اللہ خود پیدا کر دیتا ہے۔ جو انٹ فلی

فہرست مکتبہ عمران ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ڈائل

ساری بھول
ہماری تھی



راحت جبین
قبت ۱۷۳۵۰۱ ہے

شریک سفر



ذہرہ ممتاز
قبت ۱۷۳۵۰۱ ہے

کسی راستے کی
تلاش میں



میونہ خورشید علی
قبت ۱۷۳۵۰۱ ہے

میرے خواب
لوٹا دو



نکھت عبد اللہ
قبت ۱۷۴۰۰۱ ہے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی
فون نمبر 32735021

گئی۔ میری دیکھا۔ ایسی مثالی پسندی کی عادات اپنائی گئیں۔ لباس کی وضع قطع میں فرق آیا۔ مہمان نوازی میں فرق آیا۔ کوئی مانے یا نہ مانے، میں نے بے شمار خامیاں دیکھیں۔ ہاں ذہن صاف نہ کر سکی، دل وسیع نہ ہو سکے۔ اس کے لیے رب سے ہر لمحہ دعاگو ہوں۔ مجھے فخر ہے اپنے ماں باپ پر جنہوں نے ہمیشہ ہمیں محبت کرنا سکھایا۔ بیوی کا ادب سکھایا۔ نماز، روزے کا پابند بنایا۔ ہمسایوں کے حقوق کی پاسداری سکھائی۔ رشتہ داروں سے بہترین سلوک سکھایا۔ تعزیت و عیادت کا شعور دیا۔ غرضیکہ کسی چیز میں کمی نہیں رکھی، مگر آگے کیسے رہتا ہے، نہیں سکھایا، ہائے بے چارے والدین۔ وہ عورتیں یا مائیں جن کے بیویوں اور بیٹیوں کے لیے الگ الگ قانون ہوتے ہیں۔ وہ اپنا گھر تو جنم بہائی ہی ہیں۔ بیٹیوں کا بھی سکھ برباد کر دیتی ہیں کہ بے شک منصف اور بیٹھا ہے اور دیکھ رہا ہے۔ شادی شدہ عورت کی کامیابی آج تک سمجھ ہی نہیں آئی کس میں ہے، خاوند کے ساتھ منافقت اور جھوٹ میں، اس سے نا فرامی میں؟ تو پھر جنت میں کیسے جایا جائے گا۔ تو بس چھوٹا چھوٹا جنت کما میں، صبر بھی آجائے گا۔ مشکلیں بھی مل جائیں گی، رب سے لو لگائیں۔ یقین جانیں سکون آجائے گا اور دشمن اور حاسد لوگ حیران ہوں گے کہ یہ سکون سے کیسے ہیں۔ اس کی ذات آپ کو اپنی رحمتوں کے حصار میں جب لے لے گی تو آسائیاں خود بخود نکل آئیں گی۔ یہ یقین کامل مجھے سولہ سال کے تجربے کے بعد ملا۔



سشمنی زبانہ بہت مشکل ہے۔ عمر میں تو بھرے پڑے گھر سے تھی۔ بھرے پڑے گھر میں آئی تو تھائی مشکل لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے ابو جان کو جنت الفردوس عطا کرے۔ (آمین) وہ ہم سے نو سال پہلے چھڑ گئے۔ اپنی طویل بیماری کے بعد۔ مگر ان کا طریقہ زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہے اور والد صاحب کی اخلاقی نمونہ نوازی اور خوش اخلاقی ہمارے دلوں میں رائج کرتی ہے اور ہم نے اس کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ یہ عیا وجہ ہے روٹی لگا کے رہتی ہوں۔ لاہور کے لیے والے اگر مجھے ملے بغیر کجرات چلے جائیں تو بھی اور اگر کجرات والے مجھے بتائے بغیر لاہور نکل جائیں تو سخت ناراض ہو جاتی ہوں۔ جھوٹے بھائی کے بقول دربار پر حاضری ضروری ہے تو اسی کا کہنا، میرے ہوتے ہوئے ناممکن ہے اسے ملے بغیر جانا۔ تو ملتی نہ ملتا۔

س۔ ”آپ جو انٹ فیل سشمن سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟“

ج۔ ”مجھے تو جو انٹ فیل اگر محبت بھری ہو تو اس جیسا کچھ نہیں لگتا، آپ کے ارد گرد محبتیں ہوں۔ ظلم ہو، دکھ سکھ کے ساتھ ہیں۔ چوٹ بھی لگے تو دس تو اڑیں کیا ہوا؟ مگر ایسا مشکل ہی نہیں، آج ناممکنیت میں سے ہے۔ سوچوں کی آسانی کے لیے علیحدہ رہنا چاہیے۔“

س۔ ”آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کی؟ آپ کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی؟“

ج۔ ”تمام تر ناراضیوں اور خفگیوں کے باوجود میں ماحول کو بہتر رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں نے سسرال کے ماحول کو پڑھا لکھا صاف ستھرا لچ رہنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی رہی۔ نماز کی پابندی سکھائی۔ جب تو بیکار عام تھی وہاں کچھ تہذیب جھلکنے

لیکھی سہ ماہی

عمریل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی پوسے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثل ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں دو اپنی ماس بہو کا تعلق ہے۔ سچ سال کی مسلسل کوشش کے بعد بشری کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح ہوا لے روز بشری کو لکھا تعلیم کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عمریل سے شادی سے قبل تعلیم کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات منہ کی تھی۔ نکاح ہوا لے دن فوزیہ کی ماس زادہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عمریل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو کتاب سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عمریل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے اہل سات سال بعد پھر خوش فہمی ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد قاریق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ مگر بچی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ذبیحہ کو شمس زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوش خوش شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ذکیہ کی وادعات میں نکل ہو جاتے ہیں۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور قاریق صاحب کی مگر بچی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر مگر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپس پر عمریل دونوں متعلقین کو دکھاتا ہے۔ زادہ نسیم بیگم سے ہیں لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عمریل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لائے کو کہتا ہے۔ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مو نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی سختی سے کوئی لے کر آ جاتا ہے کہ دوران دور۔ انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے





جانا ہے اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی اوس کا نشانہ بناتا ہے اور دیر لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ جاتا ہے۔

مہمان ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر ہوا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل پیش میں بشری کو دھکارتا ہے اس کا اہار سن ہو جاتا ہے عدیل شرمنا ہو کر محفل مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں ملا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے غمگین اور خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم پہنچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آ جاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو بتا دیتا ہے کہ زید نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان ملا دیتا ہے۔

بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ بیگم کی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اور والا پور سن بشری کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے بشری کے آنے کے بعد بشری کو مجبور کرنا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری ابھی بہت دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل پیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مشکل کو پیچھن لیتا ہے۔ مشکل بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بسن کی حالت دیکھ کر مشکل کو عدیل سے پیچھن کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کر چاکنز لیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن جھڑپاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بھگا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مشکل کو لے جائے تاکہ وہ بشری کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچتی ہیں۔ فوزیہ کی اچانک شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر کچھ توبہ ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق ذکیہ بیگم سے بشری کا رشتہ مانتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشری کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

مگر کین کا ڈکے لاف میں بشری سے منگتی تو ذکر نازیہ یعنی سے شادی کر لیتا ہے۔ پھر شادی کے پلاٹ ہو جانے پر ایک بیٹے سیٹی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آ جاتا ہے اور ایک بار پھر بشری سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشری اب مذہب کا نشانہ ہو جاتی ہے۔

بشری اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مشکل کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعو کرنا ہے مگر بشری انہیں نہیں مانتی۔ پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ بیٹے کے ابتدائی چند دنوں میں مشکل بمشری کے پاس رہے گی اور پھر چند دن عدیل کے پاس۔ مگر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالا آخر عدیل غصت سے شادی کر لیتا ہے۔ عدیل کی شادی کے بعد مشکل دونوں گھروں کے درمیان گھن چکرتی جاتی ہے۔ بشری کے گھر میں سیٹی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی غصت۔ مشکل کے لیے مزید ذمہ نگار بشری اور عدیل کے ساتھ بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اصرار کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی بیوی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مشکل کو تاراج سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مشکل کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مشکل مشکل میں گھرجاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک منشی غمگین لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مشکل اپنے نامہل عمران کو فون کر کے طوائف ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات سحر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً صبور اور اسی میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوئی سیکر خوب تر بن کر جاتا

ہے۔ مثالِ واقع کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔
عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور گتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں مارشہ اور اربہ کو اپنے
بیٹوں وقار و قاسم کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واقع بہت خوش ہوتے ہیں۔
سیٹی مثال پر مبنی نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیخوں سے سب وہاں ہٹ جاتے ہیں۔ سیٹی الٹا مثال پر الزام
لگاتا ہے کہ وہ اسے ہمارا ہی تھی۔ حسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ مثال اور بشری مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ
نہیں پاتیں۔ احسن کمال پورنی فیملی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ بشری مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ
جاتی ہے۔ جہاں عفت اور پریشہ اسے خاطر میں نہیں لاتیں۔ واقع کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور واقع کے
درمیان ان کما ساق تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ واقع البتہ محل
کرائے جذبات کا اظہار کر چکا ہے۔ واقع عاصمہ سے اپنی کیفیت بیان کر دیتا ہے۔ عاصمہ خوش ہو جاتی ہے مگر تابانہ ذکر
پر بھی مثال کو پہچان نہیں پاتی۔ واقع عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر ملنے جاتا ہے۔ مگر دروازے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو
دوسروں پرانی رات یاد آ جاتی ہے۔ جب بچہ نے عاصمہ کی صحت دوری کر کے اسے دروازے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے
عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا جاتی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ
کو نہیں پہچانا تھا مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیا تک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے
احساس سے عاصمہ کو انجانا لگا اٹیک ہو جاتا ہے۔ واقع دروازے سے ہی ماں کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار
کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے فہد سے مثال کا
رشتہ نئے کر دیتا ہے۔ عفت مثال کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر ہی طرح چل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ
کسی طرح یہ رشتہ پریشہ سے ملے ہو جائے۔ مثال بھی اس رشتے پر دل سے خوش نہیں ہے۔ مگر اپنی کیفیت سمجھ نہیں
پا رہی۔ عاصمہ کی کیفیت ذرا سنبھلتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی فہد سے
عفت کی تقریب ہو رہی ہوتی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے واقع کی ملاقات پریشہ سے ہو جاتی ہے جو کافی ناخوداادہ واقع سے
بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس فیلو وہ خواسے بہت پسند کرتی ہے۔ واقع کی بہن ہے۔
عفت کی بعد مثال ایک دم شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ عفت خوش ہو جاتی ہے۔ عدیل بہت فخر کرتا ہے اور بشری کو فون
کر کے مثال کو بھیجنے کی بات کرتا ہے۔ مگر میں ٹینشن پھیل جاتی ہے۔ اسی ٹینشن میں مثال کالج کی ملا بھری میں واقع سے ملتی
ہے۔ واپسی میں عفت اسے واقع کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتا دیتی ہے۔ عدیل از حد پریشان ہو جاتا ہے۔ پریشہ
ورہ سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو واقع سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

رستہ یوں قہر پہ

عدیل ایک طرف ہو کر نکاح خواں کو فون کر رہا تھا۔ عفت اس کے ساتھ شانہ ملا کر کھڑی تھی۔ اس کے دل کی
مراد پوری ہونے جا رہی تھی۔
مثال سے چھٹکارا بھی مل رہا تھا اور ساری زندگی سوتن کی موجودگی کے احساس سے کانٹوں کے بستر پر گزارنے
والی ہے۔ عفت کے دل کو شاد کرنے کے لیے کافی تھی۔
وقار اور فائزہ اپنے وکیل کو فون کرنے کے بعد اب بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔
باہر ملازم اور کامووالے لڑکے از سر نو اسٹیج کو ٹھک کر رہے تھے۔
بچے کچھ ترقی مہمان اب گروپ کی شکل میں گریساں جوڑے چہ بیگونیوں کر رہے تھے۔
کھانے کے برتنوں کے لیے دھیمی گنج میں آگ لگائی جا چکی تھی۔

”تہی خوشی کی بات ہے یہ تو بظاہر دکھا جائے تو فہمائی میں کچھ برائی نہیں میوں بھی ان کی پہلی بیوی امریکا میں رہے گی۔ تمہیں کوئی مسئلہ تو ہو گا نہیں۔ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے۔“

پری کمرے میں آکر مثال کا میک اپ پھر سے تازہ کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ جیسے مڑا لیتے ہوئے مثال کو آنے والی پتھریشن کے لیے تیار کر رہی تھی۔

مثال کسی بے جان دست کی طرح اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

ان چند گھنٹوں میں اس کے دل نے جو آس پاندھی تھی بھوتے سرے سے خواب بنے تھے وہ سب راکھ ہو چکے تھے۔ اسے بدل سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ وہ یوں جانتے بوجھتے ان لوگوں کی اصلیت پہچان کر بھی مثال کو اس گڑھے میں دھکیل دے گا۔

”کلی ہو بھئی آئی! کیسے گزری بات پھر سے بن چلی ذرا تو میں نے موٹلی سویر میں دیکھا ہے اچھے موقع پر ایک بار بار اسے واپس چلی جائے تو پھر اس لڑکی کی شادی نہیں ہو پاتی۔ ہے نا تم نے بھی دیکھی ہوں گی ایسی سویر تو۔“

وہ دل سے چادر ہی تھی کہ مثال کچھ ایسا بولے کہ پری اسے مزید شائے مکر مثال کے لب تو جیسے سل ہی گئے تھے۔

”ویسے بُری نہیں ہے فہمائی کی پہلی بیوی بھی اور اس کی بچی تو بہت کیونٹ ہے۔ طلاق و طلاق تو نہیں دیں گے فہمائی اسے تم دیکھ لینا اس وقت صرف معاملہ سیدھا کرنا ہے۔“ وہاں کی طرح دعوہ کرنے والے لہجے میں بول رہی تھی۔

”پلیز تم جاؤ میں سے۔ مجھے کچھ دیر اکیلا چھوڑ دو۔“ مثال ایک دم سے اس کے ہاتھ زور سے پرے جھٹک کر روکے سرو بجے میں بولتا۔

”اب اکیلا بن تو ملنا مشکل ہے چند منٹوں میں نکاح ہونے جا رہا ہے مجھے ممانے کہا ہے کہ تمہیں تیار کر کے اپنے ساتھ باہر لے لوں گی یوں بھی تو صبحی رات تو ہو چکی ہے پہلے ہی سب کچھ لیٹ ہو چلا ہے۔“ وہ بڑے فکر مند سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جیسے یہ سارے مسائل اسی کو درپیش ہیں۔

”تم ابھی جاؤ میں سے۔ جب میری ضرورت ہوگی میں آجاؤں گی خود سے باہر۔“

مکر ممانے کہا۔ ”اس نے بولنا چاہا۔“

”ایٹ لاسٹ نکل جاؤ میں سے۔ نکلو۔“

اس سے پہلے کہ پری اپنی بات پوری کرتی مثال نے اٹھ کر پوری طاقت سے پری کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلا تھا۔ پری کے لیے یہ بہت غیر متوقع تھا۔ مثال نے اسے باہر دھکا دیے ہی کمرے کا دروازہ ٹانک

کر لیا تھا۔ پری لمحہ بھر کو گنگ سی کھڑی رہ گئی۔

”مثال تہی! کیا کرنے جا رہی ہو تم۔ کچھ ایسا دسا نہیں کرنا۔ مطلب سو سائڈ وغیرہ۔ پاپا بے چارے پہلے ہی بہت زیادہ پریشان ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟“

”وہ سرے سمجھتا ہے ہوش کیا تو روز اپنے ہونے کو بے اختیار چلائی تھی۔“

اندر مثال نے اپنا دھڑا لہجہ کر ہیمنگ دیا تھا۔ گجرے چوڑیاں اتار دی تھیں۔ اب وہ مندر دوزاے کے ساتھ گلی نمک پر بیٹھی بے توازا آنسوؤں کے ساتھ رو رہی تھی۔

”کیا ہو پری۔ تم یہاں ہو؟“ دروازہ شاید اسے دھونڈتی ہوئی وہاں آگئی تھی۔

”مثلاً آپنی انار گاڈ سیک۔ دروازہ کھولو دیکھو پلیز۔ اب مزید کسی ڈرامے کی محتاجش نہیں ہے۔“ دروازہ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر پھر سے دروازہ پر پہنچے ہوئے اونچا اونچا بولی تھی۔

”مثلاً آپنی اندر کمرے میں ہیں۔“ دروازہ بھی اس کے پاس آکر ہمدردی سے پوچھنے لگی۔

”یار انیسویں نے مجھے باہر نکال کر کمرہ لاک کر لیا ہے۔“ پری روہائی ہو کر بولی تھی۔

”اوماںی گاڈ۔ کچھ مس (بہت) بات بھی ہو سکتا ہے۔“ دروازہ بھی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

”یہ ہی تو مجھے فکر ہے،“ مجھے آپنی کی زہنی حالت بھی کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ بالکل رُت کی طرح خاموش تھی۔ ”وہ فکر مندی سے بتانے لگی۔“

”تو تمہیں باہر نہیں آنا چاہیے تھا؟ نہیں اکیلا چھوڑ کر کمرے میں۔“ دروازہ نے پریشانی سے کہا۔

”آپنی! مثلاً آپنی! خدا کے لیے دروازہ کھول دو۔“ ماما پاپا پہلے بہت پریشان ہیں۔ میری شامت آجائے گی۔ کہ میں نے تمہیں اکیلا کیوں چھوڑا۔“

دروازہ کی بات ان سنی کرتے ہوئے پھر سے دروازہ ہیٹ کر فوجی لمبے میں بولی تھی۔

جواب میں اندر بالکل خاموشی تھی۔

”یار! مجھے ڈر لگ رہا ہے اندر کی خاموشی سے، کوئی آواز نہیں۔“ دروازہ کچھ ڈر کر بولی۔

”کیس اس نے کچھ کر تو نہیں لیا؟“ پری ماڈی رنگت کے ساتھ بولی تھی۔

”میں ماما کو بتاتی ہوں جا کر روٹی آکر کچھ کریں گی۔“ وہ تیزی سے وہاں سے چل گئی۔

دروازہ چند لمحوں میں تاسف بھرا چہرہ لیے کھڑی رہی پھر آہستگی سے وہاں سے چلی گئی۔



”نہیں ماما! کچھ فائدہ نہیں بے کار ہے یہ سب سوچنا۔“ واثق مایوسی کی انتہا پر تھا۔

وہ بالکل بہت ہار کر ایک طرف آکر بیٹھ گیا تھا۔

دوسری طرف پھر سے نکاح کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ نکاح خواں ابھی ابھی اس کے پاس سے گزر کر اندر گیا تھا۔ فائزہ اور وقار وکیل کو لیے بیٹھے تھے۔

نہد اور لیلیٰ میں بھی کچھ بات چیت چل رہی تھی۔

”نہیں واثق! ایوں بہت نہیں ہارتے بیٹا! اور یہ سب جو کچھ ہونے جا رہا ہے یہ ان کے پاس الٹی میٹمیشن ہے۔“

”اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے تو اس لیے یہ کیا جا رہا ہے۔“ عاصمہ اس کے پاس بیٹھ کر بہت بڑھانے

والے انداز میں بولی۔

واثق سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

عفت اور عدیل ایک طرف کھڑے تیس میں کچھ بحث کر رہے تھے۔ مثلاً کی زندگی دوسروں کے لیے عبرت کی

مثلاً بننے جا رہی تھی اور یہ سب کچھ اس کے اپنے بہت ہارے باپ کی مرضی سے ہو رہا تھا۔

یہ اس کی اپنی مرضی سے بھی تو ہو رہا تھا! وہ بھی تو بہت ہار کر بیٹھ گیا ہے۔

”کیا محبت صرف موانع حالات میں پنپنے کا نام ہے۔ اگر حالات مناسب نہیں ہوں تو محبت جڑ میں جاتی ہے؟“

کوئی اس کے اندر سے بولا تھا۔

اب سے خود بھی نہیں پتا چلا اس کے خون میں ایک دم سے جو جوش بھری لڑائی تھی وہ کس طرح جا کدیل کے

عدیل نے کچھ ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

عفت کے چہرے کے اثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔

مگر اس لمحے وہ فیصلہ کر کے کیا تھا کہ وہ ان سے بات ضرور کرے گا۔ اب پیچھے نہیں ہٹے گا۔
”سر! مجھے آپ سے بات کرنا ہے بہت ضروری ہے۔“ وہ ٹھوس انٹل لیجے میں عدیل کی آنکھوں میں دیکھ کر

پراعتقاد انداز سے کہہ رہا تھا۔

عاصمہ اس سبکی سے اس کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے اچھا لگا کہ واثق نے کسی کا بھی سہارا لیے بغیر خود اپنا کیس لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”آپ کسی اور وقت آئیے گا“ اس وقت میں کچھ ایسی بات نہیں ہو سکتی — اس وقت میں کچھ ایسی بات نہیں ہو سکتی۔“ عدیل اسے مل کر جانے لگا تھا۔

”بات اسی وقت ہوگی اور مجھے کرنا ہے۔ آپ کو سننی ہے کہ یہ بات بھی بہت اہم ہے۔“ وہ اس کے رستے میں جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”کیا سلسلہ ہے مسٹر!“ عدیل سخت درشتی سے بولا تھا۔

”واثق کہتے ہیں مجھے اور میں۔ میں آپ کی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ اسی پراعتقاد لیجے میں آنکھوں میں چمک اور ہلکا سا جوش لیے بولا تھا۔ عدیل یک دم جیسے ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔

”Are You Senses“ (تم اپنے حواس میں ہو۔) کچھ دیر بعد کچھ تحقیر سے بولا تھا۔

”عدیل بھائی! میرا بیٹا ہے یہ اور اصل میں ہم پہلے بھی آپ کے پاس آپ کی بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں آئے تھے مگر آپ اس وقت مثال کی بات طے کر چکے تھے تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں یہ بات آپ سے کروں، ہم خاموشی سے واپس چلے گئے کہ یقیناً اس میں مثال کے لیے بہتری ہوگی، جبکہ میں اور میرا بیٹا دل سے آپ کی بیٹی کو اپنے گھر کی عزت مانتا چاہتے ہیں۔“

اب عاصمہ کو آگے بڑھ کر بیٹے کا کیس پیش کرنا پڑا تھا۔

عفت کے چہرے پر اب غصہ تھلکنے لگا تھا۔

”دیکھیں یہ رشتے تانے جوڑنا کھیل یا مذاق نہیں کہ کوئی بھی اٹھ کر آئے اور رشتہ ٹانگ لے اور ہم صرف اس بنیاد پر ”ہاں“ کہیں کہ ماتحتی والا دل میں چاہت رکھتا ہے ہماری بیٹی کے لیے۔“ عفت درشتی اور رکھائی سے کہہ رہی تھی۔

”دل میں بات ہے بس، دغلا پن یا منافقت نہیں اور خدا نخواستہ دھوکا تو بالکل بھی نہیں۔“ عدیل نے ٹھنک کر عاصمہ کو اور پھر واثق کو دیکھا تھا۔

”یہ سب جو کچھ ہو رہا ہے اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ لوگ جو پہلے ہی آپ لوگوں کو اتنا بڑا دھوکا دے چکے ہیں۔ آگے جا کر مثال کے ساتھ کیا نہیں کر سکتے۔“

وہ پھر سے عدیل کو احساس دلانے والے انداز میں بولی۔

”تو آپ کے پاس کیا گارنٹی ہے کہ آپ کی بیوی نہ کر مثال کو دنیا جہان کی خوشیاں مل جائیں گی، جبکہ ہم آپ لوگوں کو جانتے بھی نہیں۔“

”چھوڑیں عدیل! ہم ضائع نہیں کریں۔ ویسے بھی نکاح سیٹ ہو چکا ہے“ آجائیں جلدی سے۔“

”جن کو جانتے تھے وہ کیا نکلے اگر جان پہچان کا یہ ہی معیار ہے تو۔“ عاصمہ پیچھے سے ہولی تھی۔
 عدیل وہیں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب آنکھوں سی تھی۔ عفت ناگواری سے ہلٹی تھی۔ اس نے بظاہر
 سرسری انداز میں مگر واقعی کوہست گہری نظروں سے دیکھا تھا اور اسے پری کا دیا گل بن یاد آیا۔
 ”کہیں یہ ہی تو وہ لڑکا نہیں۔ ورنہ کا بھائی ہے یہ جس کے گھر سے لوٹ کر آئے کے بعد پری بیمار رہی تھی اور
 اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرنے لگی ہے۔“
 انہوں میں اس نے بہت ساری انجمنی باتوں کی کڑیاں جوڑ لی تھیں۔
 ایک بار پھر مثل اور پری بالفاظیل تھیں۔

”بھائی صاحب آپ ان لوگوں پر ایک بار پھر بھروسہ کرنے جا رہے ہیں جو بہت ہی طرح سے آپ کو دھوکا دے
 چکے ہیں۔“ عاصمہ عدیل کو خاموش دیکھ کر پھر سے چوٹ لگاتے ہوئے بولی۔
 عدیل کچھ بول نہیں سکا۔

”میں اور میرا بیٹا میری فیملی آپ جس طرح چاہیں ہمارے بارے میں معلوم کروائیں، آپ کی جھوٹی بیٹی پری
 میری بیٹی کی کلاس ٹیو ہے، دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہے اس کے علاوہ جو آپ معلوم کرنا چاہیں
 آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔ آنکھوں سے او بھل کچھ بھی نہیں رہے گا آپ کی۔“ ودرک کر بولی تھی۔
 ”شریف لوگ ایک بار زبان دے کر جھکا نہیں کرتے پیچھے نہیں ہٹ سکتے ہم لوگ ان سے بات کر چکے
 ہیں۔“ عفت نے ایک اور کوشش کے طور پر جتا کر کہا۔

”شریف لوگ بار بار دھوکا بھی نہیں کھاتے عفت بس۔ اور آوازے ہوئے لوگ جب دھوکے باز نکلیں اور
 صرف یہ سوچ کر آئندہ یہ دھوکا نہیں دیں گے کیا ہمیں ان پر بھروسہ کر لینا چاہیے اپنی سب سے قیمتی چیز ان کے
 حوالے کر دینی چاہیے۔“ عاصمہ بھی پوری تیاری کے ساتھ بولی تھی۔

”سر! آپ مجھے جانتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ہم بہت دولت مند بہت امیر پیسے والے لوگ ہیں میری مدد
 کی اکیڈمی ہے اور میرا چھوٹا سا بزنس جو میں اشارت کر چکا ہوں اور جاب بھی کر رہا ہوں۔ میں ان شاء اللہ آپ کی
 بیٹی کو عزت کے ساتھ تمام خوشیاں دینے کی کوشش کروں گا جو ایک سیلف میڈ تختی نوجوان دے سکتا ہے۔“
 واقعی بہت ممانعت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”سر میرے پاس نہ تو کسی دوسرے ملک کی فیشننگ ہے کہ میں کہیں آپ کو دھوکا دے کر بھاگ جاؤں گا نہ
 میرے پاس ایسی جائیداد یا پیسہ ہے جس کو بنیاد بنا کر کہ اسے آپ کی بیٹی کے نام کرنے کا وعدہ کر کے رشتہ جوڑوں
 میرے پاس عزت ہے غیرت اور خوف خدا کہ میں کسی کے ساتھ برا نہیں کروں اور اپنے زور بازو سے سب کچھ
 حاصل کرنے کا جذبہ بچپن کی تیشی نے مجھے بہت پہلے ہی خود پر اور خدا پر بھروسہ کرنا سکھایا تھا۔“
 واقعی غصہ ٹھہر کر بول رہا تھا۔

”یہ سب فضول لفظی کمائیاں ہیں اور آپ ہمیں یہ سب کیوں سنا رہے ہیں جب ہمیں یہ نہیں سنا نکاح
 ہونے جا رہا ہے۔“ انہیں عدیل اسب بھار ہے ہیں ہمیں۔“

و مضبوطی سے عدیل کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ کر لے جانے لگی تھی۔
 ”ٹھہرو عفت! جب جانے بوجھے لوگوں سے دھوکا کھانا ہے تو پھر انجان لوگوں کو آوازے میں کیا حرج ہے۔“
 وہ واقعی کوہستے ہوئے کچھ سوچ بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
 ”عدیل! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ ان لوگوں کی باتوں میں آ رہے ہیں۔ وہ قار بھائی اور فائزہ بھابی کیا سوچیں

کے نسب سے زیادہ زیادہ ہے جس چلیں اب آپ لڑہی طرح سے مصر تھی۔
 "کیا دقا اور قاتل نے یہ سوچا تھا کہ جب ان کا دھوکا کھلے گا تو میں کیا سوچوں گا۔ میری بیٹی پر کیا بیٹے کی۔" وہ
 رک رک کر بول رہا تھا۔

"عدیل کیا ہو گیا ہے۔" صفت کچھ پریشان ہو کر بولی۔
 "صفت یہاں ہر انسان صرف اپنا فائدہ اپنا مطلب دیکھتا ہے۔ کسی میں اس کا فائدہ ہے اور کسی میں نقصان،
 یہاں کسی کو دوسرے کے فائدے اور نقصان سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ یہی معاشرے میں اصول بننا جا رہا ہے
 Survive کرنے کا تو پھر ہمیں بھی اپنا فائدہ اپنا مفاد دیکھنا چاہیے۔"
 عدیل کیا کچھ سوچ چکا ہے واقع اور عاصمہ کو کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔

دونوں نے طمأنیت بھرے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔
 "مہما! یہ مثال آپ نے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کر لیا ہے انہوں نے مجھے باہر نکال دیا اور اب بہت بار
 کہنے پر بھی نہیں کھول رہیں اندر خاموشی ہے۔"

پری پھولے سانسوں کے ساتھ حواس باختہ سی ماں کے پاس آکر بولی تھی۔
 "میرے لہو یہ کیا ہونے جا رہا ہے اب۔" صفت نے اختیار بدل پکڑ کر بولی تھی۔
 عدیل پری سے کچھ بھی پوچھے بغیر خیزی سے مثال کے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔
 واقع اور عاصمہ بھی اس کے پیچھے گئے تھے۔

"یہ دونوں خدا جانے کہاں سے ٹپک پڑے ہیں، چہا بھلا سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا تھا اور یہ عدیل تو ایسا کچے
 کھنوں کا توئی ہے کہ فوراً ہر کسی کے کہنے پر چل پڑتا ہے۔"
 وہ سخت خیزی سے بیڑا کران کے پیچھے جا رہی تھی۔

"یہ مثال تپا والا معاملہ نیٹ جانے تو میں مہما کو واقع کے بارے میں بتا دوں گی۔"
 پری سرشاری واقع کے چوڑے کندھوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"کیا بھلا؟ بنا دیا تمہارے اپنی مدد کو مثال آپ کے بارے میں۔" وہ اس کے پاس آکر کھڑی تھی۔
 "ہوں اور میری گئے ہیں سب۔ آج تو تم بھی۔" پری بے خیالی میں اس کی طرف دیکھے بغیر پوٹنی سر کو جنبش
 دے کر بولی اور مثال کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"مثال، مثال دروازہ کھولو۔" عدیل اس کے کمرے کے باہر جا کر سختی سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے دھیمی مگر
 بھاری توازن میں بولا تھا۔
 اندر جاہ خاموشی تھی۔

"اگر اس نے خود کو کچھ کر لیا اسے کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔" اس کا دل بے اختیار ڈرنا
 تھا۔

"بھئی کو میں کیا جواب دوں گا؟" وہ سری سوچ ہی آئی تھی اس کے دل میں۔
 "مثال، بنا دواں کھولو بیات کرو مجھ سے مثال! یہ جیسے گڑگڑا کر کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔"

اس کی سے دروازہ کھلا تھا۔
 اجڑے روپ اور بکھرے حلیے کے ساتھ نسخ آئیں اور آنسوؤں بھرا چہلے مثال اس کے سامنے کھڑی
 تھی۔

”اور اگر میرے اس فیصلے سے یہ آنسو ہمیشہ کے لیے مثال کا مقدر بن گئے تو میں کیا کروں گا۔“ اس کا دل ٹہری طرح سے تڑپا تھا۔

دوسرے لمحے اس نے ٹوٹی بکھری مثال کو اپنے گلے لگا لیا تھا۔ وہ اب تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور خود بھی اس کے ساتھ جیسے بکھر گیا تھا۔

پچھلے سب کے آنے کا پتا مل رہا تھا اور اس وقت عدیل کو لگا انہیں کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہیے اس نے بے حد آہستگی سے مثال کو اپنے کندھے کے ساتھ لگا کر اپنے قدم کمرے کے اندر کیے تھے۔
”بابا پلیز مجھے شادی نہیں کرنی چاہیے میں کرنی شادی“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
محنت عاصمہ اور دافن وہاں پہنچے تو کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

”بابا پلیز“ غمزدہ چہرے ہوئے لمبے میں بولا تھا۔

”نہی بھی تم یہ سب کہو گے۔“

وفا قاری غصے بھرے لمبے میں بولا تھا۔

فاتنہ کی نظروں میں بھی ہست لعن طعن سی تھی۔

”کچھ رہ نہیں گیا ہمارے پاس اب گوانے کے لیے عزت سا کھ سب کچھ خاک میں مل گیا ہے اور ایسی دو نمبر بازاری عورت کو تم بھر بھی اپنے ساتھ چٹائے رکھنا چاہتے ہو“ آج جس کی وجہ سے ہم سارے میں ذلیل و خوار ہوئے ہیں تم ابھی بھی اسے طلاق نہیں دینا چاہتے۔“ فاتنہ پوچی ہوئی آواز میں بولی تھی۔
”یہ چاہتا ہے کہ میں سے ہم دھکے مار کر نکالے جائیں صرف اس بات کی کسر تو رہ گئی ہے۔“ وفا قاری غصے میں بولا تھا۔

”کس بات کی مجبوری ہے آپ کو مجھے بتادیں بھوتنا کر کہ ہم یہ شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔“ غمزدہ جیسے برواشت کہو کر بولا تھا۔

”یہ تم ہم سے پوچھ رہے ہو؟ شرم تو شاید اب تم میں بچی ہے نہ ذرا سی غیرت۔“ وفا قاری غصے میں بولا۔

”میری بیٹی ہے اس کے پاس۔“ وفا قاری نے لمبے میں جیسے گڑ گڑا کر بولا۔ اس باب کو یاد کرانے کو۔

”لے لیں گے ہم اس سے بچی کو تم اس کی فکر مت کرو۔“ وفا قاری بولتی سے بولا تھا۔

”اور تم اس بات کی شنیشن نہیں لو اس طرح کی عورتیں بہت دیر قید رہ کر بچوں کا دم چھلا اپنے ساتھ نہیں لگاتی ہیں۔ خود بھی تمہارے حوالے کر دے گی محض چند مہینوں میں۔“ فاتنہ اسے تسلی دیتے ہوئی بولی۔

”یہ خیال آپ کا اس وقت بھی تھا جب میں نے اس سے شادی کی تھی کہ یہ چند ہفتے تو کیا چند دن بھی میرے ساتھ نہیں گزار سکے گی۔“ غمزدہ بڑا کر بولا۔

”اور اس نے نہ بھوڑا تمہیں تم چھ سال سے اس کو جو تک کی طرح اپنے ساتھ چٹائے بیٹھے ہو۔“ وفا قاری غصے میں بولا۔

”اور اب ہمیں مزید تماشا نہیں دناؤ۔ میں طلاق نامے پر سائن کرو اور ختم کرو اس قصے کو۔“

وفا قاری نے پیپر اس کے آگے کیے غمزدہ بی بی سے بیٹھی لپٹی کو دکھاتا چلا گیا جس کی گود میں اس کی بیٹی بچپن کی معصوم اور بیٹھی غنیمت سو رہی تھی اس سے بے خبر کہ اس کا دادا اور دادی اس کے بارے میں کتنا غلطانہ فیصلہ کر

ہے۔ تخت مشکل میں جٹا اپنے آگے رکھے پیچہ زکوہ کھتا جا رہا تھا۔ وہ مثل کو اپنانے کو تیار تھا مگر لیلیٰ کو چھوڑنا۔ ایک سہانہ صبح خیال جولے کائنات پر گھسٹ رہا تھا۔
”فدا امت سو جوتے اس وقت اور کوئی آپشن نہیں ہے ہمارے پاس۔“ قاترہ اب کے کچھ نرمی سے بولی تھی اس کا اندھا تھک کر۔

”مما اگر میں لیلیٰ کو طلاق نہیں دوں اس پیچہ پر سائن نہیں کروں تو؟“ وہ بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔
”تو پھر علق تو ہم نہیں کریں دوس گے ہم دونوں کے جنانوں میں بھی تمہیں شامل ہونے کی اجازت نہیں ملے گی۔ یہی وصیت ہوگی ہماری اب تم فیصلہ کر لو۔“
دقار بے چلک لہجے میں کہہ رہا تھا اور فدا ساکت سا دیکھے جا رہا تھا باپ کو!



”پاپا! مثل لہجے میں شاگ لیے باپ کو دیکھ رہی تھی سر جھکائے بیٹھا تھا۔
وہ باپ کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر بے اختیار سی ہو گئی۔ ست سال پہلے یونہی بچپن میں بھی عدیل کے ادا اس و پریشان چہرے کو دیکھ سکتی تھی۔
اس وقت بھی اس کے دل میں یہی ہوتا تھا جیسے بھی جس طرح بھی جتن کرے اور عدیل کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے اور آج تو پاپا کو میری وجہ سے جس مسلسل پریشانی و تڑپ سے گزرنا پڑا میں چاہتے ہوئے بھی اس کی مدد نہیں کر سکتی۔

وہ ایک تک باپ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچے جا رہی تھی۔ ابھی چند منٹ پہلے اپنی جان لینے جا رہی تھی۔ مگر ان لمحوں میں بھی عدیل کی ایک تواز ایک دکھانے اسے پانی کی طرح بکھلا کر رکھ رہا تھا۔
وہ جانتی تھی وہ انہیں زندگی کی طرف پلٹنا عمر بھر بھائی کے پھندے پر فکرنے کے برابر ہو گا۔
لیکن وہ اپنے تئذیل باپ کی خاطر عمر بھر کے لیے اس پھندے پر بھی جھولنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔
”پاپا! آپ جو کہیں گے جیسے کہیں گے میں ایک بھی سوال نہیں کروں گی میں صرف آپ کے چہرے پر سکون خوشی اور اطمینان دیکھنا چاہتی ہوں۔“

وہ باپ کے دونوں ہاتھوں کو ہونٹوں اور آنکھوں سے چوم کے جذباتی لہجے میں بولی۔
”پاپا! میری وجہ سے آپ نے اتنے سال بہت سی پریشانیاں دیکھی ہیں بہت ٹینشن جب کہ میں نے کبھی بھی نہیں چاہا کہ آپ کبھی ہوں اور ہر بار آپ ہوئے صرف میری وجہ سے۔ پاپا مجھے معاف کر دیں۔“
وہ اس کے ہاتھوں پر چہرہ رکھ کر رڈ پڑی تھی عدیل کے دل پر جیسے چوٹ پڑی۔
وہ بہت بہت اس کے جھگے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا جذبات کی لورش اسے کچھ بولنے نہیں دے رہی تھی۔

”مثل! تو ہی دے کچھ کانتا ہے، جوں ہوتا ہے۔ میں نے پریشانیاں ہوئی تھیں تو اپنی مرضی سے تمہارا اس میں کچھ قصور نہیں تھا اور تمہیں میں سزا دینے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ لیکن میں دیتا ہاں اتنے سارے سال تمہیں ان جرائم ان گناہوں کی سزا دیتا ہاں جو تم نے کیے ہی نہیں تھے۔“
”بھئی! اپنی آنکھیں پونچھ کر گلو گھر لہجے میں بولا تھا۔
”پلیز پاپا! ایسا نہیں کہیں! آپ آج بھی میرے تئذیل ہیں مجھے اس دنیا میں سب سے پیارے ہیں۔“

وہ پھر سے باپ کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر رونے لگی تھی۔
 ”لور تمہارا آئیڈل باپ تمہارے ساتھ کیا ظلم کرنے جا رہا تھا اپنی اتنی پیاری اتنی حساس بیٹی کے ساتھ۔“ وہ اس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے نل شکستہ سے کہہ رہا تھا۔
 ”پاپا! مجھے صرف آپ کی خوشی چاہیے جس میں آپ کو سکون ملے اور میں نے خدا سے دعا کی ہے پاپا کہ آئندہ آنے والے دنوں میں میری وجہ سے کبھی آپ کو کوئی دکھ نہیں ملے اور میں نے ابھی روبرو کر اللہ سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ میری یہ دعا ضرور قبول کرے۔“ وہ بیٹیوں کی سی معصومیت سے کہہ رہی تھی جیسے سالوں پہلے وہ باپ کی پریشانی بانٹنے ہوئے اس کی گود میں بیٹھ کر یہ سب کہا کرتی تھی۔
 ”میری بیٹی! میں کبھی نہیں کوئی خوشی نہیں دے سکا۔“ دل کا پچھتاوا بولوں پر آگیا تھا۔
 ”نہیں پاپا! یہ نہیں کہیں‘ جب ماما مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ آپ نے رکھ لیا تو آپ نہیں جانتے آپ نے مجھے اپنا کون سا خزانہ بخش دیا تھا آپ نے مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے دی تھی‘ مجھے آپ سے اور کچھ نہیں چاہیے پاپا!“
 وہ اس بار بہت پر سکون لہجے میں کہہ رہی تھی۔
 ”ہیش خوش رہو مثل! میری دعا میں ہیں تمہارے ساتھ ہر لمحہ ہر گھڑی ایک باپ کی دعا جسے خدا رو نہیں کرتا۔ وہ بہت جذبے سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 ”میرے پاپا میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں آپ میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے۔ میں زندگی بھر اسے اسی خوشی بھراؤں گی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے‘ آپ کو کبھی میری طرف سے کوئی شکایت کوئی غم نہیں ملے گا۔“
 عدیل اسے ساتھ لگا کر تھکنے لگا۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا تھا۔



”یہ کیا کہہ رہے ہو عدیل تم!“ وقار شاک بھرے انداز میں سامنے کھڑے عدیل کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 ”وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا تمہاری اور تمہارے بیٹے کی اصلیت جان لینے کے بعد۔“ عدیل کی آنکھوں میں سرور مہر تو تھی ہی کمری اجنبیت بھی تھی۔
 ”لیکن اس پر تو ہم بات کر چکے ہیں تمام معاملات طے پا چکے ہیں مجھے تم چاہ رہے تھے۔ گھر بھی مثل کے نام ہو چکا ہے اور فرد اس لڑکی کو طلاق۔“
 ”بس!“ عدیل نے ایک ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا تھا۔
 فاترہ اور وقار نے تخت پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ سب کچھ پھر اٹنے جا رہا تھا۔
 عفت کے چہرے پر ناگواری ابھرنی لگی۔
 مگر وہ آگے بڑھ کر اب عدیل کو روک نہیں سکتی تھی اسے پھر سے بھری محفل میں ڈیل ہونے کی صحت نہیں تھی۔
 ”آگے نہیں وقار۔ آگے کچھ نہیں بولنا میں ایک بار زندگی میں اپنا یہ حق استعمال کر چکا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ برس ہا برس بیٹی ایسے کسی بھی معاملے میں حصہ دار بنے جس میں کسی کو طلاق ہو۔“

”مگر عدیل! اس میں تمہارا مثل کا کوئی ہاتھ نہیں بہم تو پہلے ہی ایسا چاہتے تھے۔“ وقار اصرار سے دہرایا۔

انداز میں بولا۔

عبدال نے اسے ہنس بھری نظروں سے دیکھا۔

"اور مجھے بہت افسوس ہے کہ اتنے سال دوستی رہنے کے باوجود میں تمہیں ٹھیک سے پہچان نہیں سکا۔" وہ اس کے چہرے پر سرد نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

"عبدال! وہ گھوسب معاملے طے پا چکے ہیں۔" وقار نے صلح خواندہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم اتنے خود غرض بے حس اور مفاد پرست ہو کہ صرف اپنی غرض کی خاطر کسی کی بھی زندگی کو تباہ کر سکتے ہو اور میں بے وقوف و سری بار دہی غلط فیصلہ کرنے جا رہا تھا جس سے بچانے کے لیے قدرت نے اس لڑکی کو بھی مددنا کر بھیجا۔"

عبدال نے ایک طرف کھڑی لیلیٰ کو ہمدردی سے دیکھ کر کہا۔

"تم اس کی باتوں میں مت آؤ عبدال۔" وقار اسے وارن کرنے والے انداز میں بولا۔

"نہیں آ رہا بالکل بھی بلکہ میں اس کے لیے صرف دعا کر رہا ہوں کیونکہ ہر حال یہ بھی کسی کی بیٹی ہے اور تمہاری بولی کی ماں بھی۔"

"تم نہیں جانتے عبدال۔"

"وقار! جھوٹی ضد اور بے کاری انا چھوڑ کر ان دونوں کو اپنا لو جبکہ تمہارا بیٹا بھی اسے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس کی خاطر ان دونوں کو قبول کر لو تو شاید میری نظروں میں کچھ تمہارا مقام رہ جائے ورنہ میں ہمیشہ یہی شکر ادا کرتا رہوں گا کہ خدا نے میری بیٹی کو تم جیسی دھوکے باز فیملی کے ہتے چڑھنے سے بچالیا۔"

اس نے دو ٹوک انداز میں کہہ کر جیسے بات ہی ختم کر دی۔

"لے جاؤ اس لڑکی کو اپنی بیوی نہیں اپنی بیٹی بنا کر ایک بار اسے کھلے دل سے قبول کر لو۔ تمہارے لیے زندگی آسان ہو جائے گی۔ بیٹا بھی تمہارے پاس آجائے گا۔ تمہارا گھر ہمیشہ کے لیے آباد ہو جائے گا۔ میں صرف تمہیں مشورہ دے سکتا ہوں۔"

"عبدال بھائی! نکاح شروع کر دائیں" لیلیٰ والے معاملے کو بھی بعد میں دیکھ لیں گے۔"

فائزہ شوہر کی مدد کو آگے بڑھی تھی۔

"عفت بھابی! مثال بنی کو لے کر آئیں۔" وہ عفت کو بہت اپنائیت سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ مثال کو اب لے آئیں عفت! کیونکہ ذرا سی دیر میں نکاح ہے اس کے باوجود کہ تم نے مجھے بہت بڑا دھوکا دیا ہے وقار! پھر بھی میں چاہوں گا تم میری بیٹی کے نکاح میں ضرور شامل ہو۔"

عبدال کی بات پر وقار اور فائزہ نے کچھ پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"واثق بیٹا! آجائیں آگے آپ! عبدال نے مجھے کفرے واثق کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کیا تھا۔

وقار فائزہ غمزدہ اور باقی سب کے لیے یہ کسی جھگڑے سے کم نہیں تھا۔

اور عفت تو لمحہ بھر کو بے یقین سی کھڑی رہ گئی تھی۔

ایک بار پھر عبدال نے فیصلہ کرتے ہوئے اس کو کسی قابل نہیں سمجھا تھا وہ غصے میں کھولنے لگی تھی۔

واثق اور مثال کا نکاح ہو رہا تھا۔

دلوں کے چروں پر ایک مسلسل بے یقینی کی کیفیت ثبت تھی۔ ہفت اور پری ششدر سی سب دیکھ رہی تھیں۔

وردہ ماں اور بھائی کو خوش دیکھ کر مطمئن سی ہو چکی تھی۔

عدیل کے چہرے پر جیسے صدیوں بعد ایک سکون بھرا ٹھہراؤ آیا تھا۔ دکار اور اس کی ٹیلی عدیل کے اصرار کے بل بوتہ پر نہیں رکھی تھی۔

عدیل نے بھی اس میں جاملے دیا۔ یہی مقام شکر کیا کم تھا کہ مثل کو سر حال اللہ نے بچا لیا تھا۔ نکاح ہو جانے کے بعد عاصمہ عدیل کو مبارک باد دیتے ہوئے بے اختیار مثل کو ساتھ لپٹا کر ہار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

سالوں پہلے کی دورات جب عدیل کو اللہ اس کے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا تھا۔ اور اس نے جب جب عدیل کو یاد کیا اس کو بہت دعائیں دی تھیں اور سمجھ رہی تھی شاید قرض چکا دیا لیکن آج جو کچھ ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ اللہ اس سے کچھ اور بھی تو چاہتا تھا۔ اسے اپنے اللہ پر بھی اس لمحے بہت پیار آ رہا تھا۔

”میری بیٹی بہت سادہ بہت معصوم ہے عاصمہ! اس نے اپنی اس پھول سی زندگی میں مکمل خوشی نہیں دیکھی اگر اس سے کچھ بھول ہو جائے کچھ غلطی تو آپ سے اپنی بیٹی سمجھ کر نظر انداز کر دیجیے گا۔“ رخصتی سے پہلے عدیل نے جب رندھی آواز میں واقع کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھیں مثل کو دیکھتے ہوئے کہا تو عاصمہ کے چہرے پر بڑی احمق بھری مسکراہٹ ابھری تھی۔

”عدیل بھائی! مثل کو میں اپنی بیٹی ہی بنا کر لے جا رہی ہوں۔ پلیز اب تب بھول جائیں یہ آپ کی بیٹی ہے۔ مجھے اپنے واقع سے کچھ برہ کر عزیز ہے ان شاء اللہ آپ کو اس کی طرف سے کبھی کوئی ایسی ایسی بات سننے کو نہیں ملے گی۔“

اور عدیل کی آنکھیں مزید بھیگ گئیں۔

”اور آپ کا بہت شکریہ آپ نے مجھ پر میرے بیٹے پر بھروسہ کیا اللہ نے چاہا تو میرا بیٹا آپ کی توقعات پر پورا اترے گا۔“

”ان شاء اللہ میری دعائیں ہیں ساتھ۔“ طمانیت سے چہ صاف کر کے مسکرایا تھا۔

”تو اب ہمیں رخصتی کی اجازت دے رات کافی سے زیادہ بیت چکی۔“ عاصمہ نے کہا تو عدیل لمحہ بھر کو جیسے منجھ سا رہ گیا ایک لمحہ کو اسے غموس ہوا کہ اگر مثل اس سے پیشہ کے لیے لا رہی تھی تو کیا کرے گا۔ اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔

ہر لمحہ صرف مثل کو ایک بوجھ سمجھ کر اٹارنے کی خواہش کی تھی۔

اور آج جب یہ بوجھ کوئی بہت سہاؤ سے اٹار کر اپنے سینے سے لگا کر لے جانے کا خواہش مند تھا تو جیسے اس کا دل ٹھک سا گیا تھا۔

مثل کی دوری کے خیال نے تو ہمیشہ اسے ہراساں کیا تھا۔

”کیا یہ ممکن نہیں عاصمہ! سن کہ رخصتی چند دنوں بعد ہو جائے کیونکہ جس طرح نکاح غلت میں ہوا ہے تو مثل کو ہمیں اس سارے کو ذہنی طور پر قبول کرنے کا کچھ وقت مل جائے گا۔“ وہ ذرا دیر بعد لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

”عدیل بھائی! عاصمہ کچھ فحش سے بولی۔“ تو آپ کو بھروسہ نہیں بہر پر۔“

”آپ سمجھ سکتی ہیں اب کہ میری مثال نے یہاں کیسی زندگی گزار دی ہوگی۔“
 ”میں سمجھ سکتی ہوں۔ اجازت دیں اب ہمیں۔ میں اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جا سکوں۔“
 عاصم نے تلے انداز میں کہہ کر اس کی سے قدم پر بحالی اس کی طرف بڑھ گئی۔
 جب بیٹیوں کی نئی زندگی شروع ہونے جا رہی ہو تو اپنی ماؤں کی موجودگی کتنی ضروری ہوتی ہے اس لیے عدیل کو بہت شدت سے احساس ہوا تھا۔
 ”اب تو ہمیں یقین آگیا ہو گا مثال! کہ کس کے جذبے سچے ہیں اور اس میں کتنی طاقت تھی جبکہ تم تو مجھے
 بیشہ کی جدائی دے کر کسی ماور کی ہونے جا رہی تھیں؟“
 وہ چوہ جھکائے بہت سرشار لہجے میں اپنے بیویوں پر بنے مسندی کے خوب صورت نعل بوٹوں کے ڈیزائن پر
 نظر کر کے حنائے کھڑی مثال سے کہہ رہا تھا۔
 وہ جواب میں بہت گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سیاہ بوٹوں کو دیکھتی رہی۔



اور رات کے آخری پہرہ لا آخر غصتی ہوئی گئی۔
 عاصم نے عفت کے اصرار کے باوجود بہت کم سالن ساتھ لیا تھا عفت یوں تو خمرے دکھاتے ہوئے انکار کیے
 جا رہی تھی مگر مل میں دو طرح سے مل کھا رہی تھی۔
 ”کیسی قسمت کی دھنی ہے یہ مثال! پہلے سر مل والے کیا کم تھے۔ پار محبت لٹانے والے پیسہ دولت مل
 رکھنے والے، پھنسنے دھوکے باز تھے کہ اب یہ جو ایمر جیسی میں رشتہ ہوا اس طرح بچھاؤر ہو رہے ہیں سب جیسے
 مثال بلبل دنیا کی آخری خوب صورت ترین لڑکی ہو۔“
 وہ درجائی گاڑی کی ٹیل لائن میں کود کھینچے ہوئے مل میں کھس رہی تھی۔
 عدیل نے جس طرح آخری وقت میں آکر فیصلہ لایا تھا عفت کو یقین ہو گیا کہ مثال کے لیے عدیل کسی بھی حد
 تک جاسکتا ہے وہ کیا بھی۔ اس نے ایک عمر کی دوستی تعلقات سب گنوا دیے۔ وہ تو شاید عفت کو بھی اپنی زندگی
 سے الگ کر دیتا اگر وہ مزید ہنگامہ کر لے۔
 ”یہ چیل اس گھر سے رخصت ہو کر بھی کبھی نہیں جائے گی۔“ عفت کو یقین تھا۔
 ”تمہاں تو نہیں ہو گئی ہو ری۔“
 عفت بے تحاشا دہائی ری کو دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے طے اور طیش میں پڑی تھی۔
 ”ہاں میں ہو گئی ہوں یا گل! میں نے چاہا تھا واثق کو۔ پہلے میں نے محبت کی تھی اس سے۔ میں نے اللہ سے
 مانگا تھا اسے تو مجھ پر مثال کو کیسے مل سکتا ہے وہ میری محبت ہے ماما! میں اسے مثال کو تو کیا کسی کو بھی نہیں دے
 سکتی۔ میں جان سے مار دوں گی مثال کو اسے کبھی بھی واثق کے ساتھ نہیں رہنے دوں گی۔“
 وہاں کی طرح بے سوچے سمجھے شدید جذباتی پن میں بولتی چلی جا رہی تھی۔
 ”شادی ہو گئی ہے دونوں کی ہوش کو کچھ اور اس لڑکے میں ایسا کچھ نہیں جو تم یوں ہوش کھو بیٹھو۔“ عفت
 غصہ دکھاتے ہوئے اسے سمجھانے کو چلا۔
 ”شادی ہوئی ہے مگر صرف تو کیا ہوا۔ شادی ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ اس کی ماں کی بھی تو ختم ہوئی تھی اس کی بھی
 ہو جائے گی۔ میں کہوں گی اس کی شادی ختم۔“ اور باہر کھڑا عدیل ششدر سا رہ گیا تھا۔



مثال اس اجنبی کمرے کو دیکھ رہی تھی جہاں آج سے پہلے کبھی بھی نہیں آئی تھی۔
 مگر ڈریسنگ روم پر پڑے اس کے تصویری اسٹل اس کی کچھ اور ہی داستان سنا رہے تھے۔
 وہ ششدر سی ان دونوں تصویروں کو دیکھے جا رہی تھی۔
 ”یہ میرا دیوانہ پن تھا۔ مانو گی ناں ان تصویروں کو تو دیکھ کر۔“ وہ اس کے بالکل پیچھے آکر اس طرح سرگوشی میں بولا کہ مثال کو لگا اس کا دل ٹھم گیا ہے۔
 صرف اس کا دل نہیں اس کائنات کی ہر شے اور مثال کے دل میں دھڑکتی دھڑکتی بھی!
 وہ بے حد خواہش کے بھی پلٹ کر اس کو اپنے اتنے قریب نہیں دیکھ پا رہی تھی جس کو اپنے کی خواہش کو اس نے کبھی خواب میں بھی خود سے کہنے کی ہمت نہیں کی تھی۔
 اور یہ تو اسے پتا تھا کہ کبھی بھی قسمت کی اچھی نہیں رہی لیکن ان چند گھنٹوں میں جو کچھ ہوا، وہ اپنی قسمت کے بارے میں اپنا گھبراہٹ فراموش کر چکی تھی۔
 یاد تھا تو صرف اتنا کہ وہ اس شخص کی ہو چکی ہے جس کی چاہت اس کے دل کی اتھاہ گھرائیوں میں بھی کہیں بہت نیچے نیچے پوشیدہ تھی۔
 ”کچھ نہیں کہو گی تم؟“ اس نے بہت نرمی سے اسے بانٹوں سے پکڑ کر میں اپنے سینے کے مقابلے کرا کر کہا تھا۔
 اور اس کی پلکیں یوں بوجھل ہو رہی تھیں جیسے ان پر بڑا بھاری بوجھ پڑا ہو۔ وہ کبھی پلکیں اٹھا کر سامنے کھڑے اس پر پورے محبت میں کندھے شخص کو نہیں دیکھ پائے گی۔
 ”مثال! تم خوش تو ہونا۔ پلیز کچھ کہو۔ کچھ بولو۔ کچھ ایسا کہ مجھے لگے تمہاری محبت میرا وہم نہیں تھا۔ میرا یقین تھا۔ میری زندگی کا سب سے خوب صورت یقین جس کے سارے میں تمہارے پیار کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔“ وہ بہت بھاری بوجھل لہجے میں کہہ رہا تھا۔
 وہ صرف اس کی وائٹ شرٹ کے منوں پر نظروں جمائے بالکل ساکت کھڑی تھی۔
 ”مثال! تم خوش ہو مل۔ بتاؤ مجھے۔“ اس نے پھر بے قراری سے پوچھا۔
 اور وہ ضبط کھو کر اس کے سینے سے لگ کر بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خانہ نمبر ۱۱

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خواہشورت ناول

فرصت درون
 در حد درجہ
 مضبوط
 آئینہ

☆ تئیاں، پھول اور خوشبو راحت جنیں قیمت: 250 روپے
 ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ انکار قیمت: 600 روپے
 ☆ محبت ہیاں نہیں لہنی جدوں قیمت: 250 روپے

32216361 فون: 37۔ اردو بازار، کراچی۔

ایک لکھنؤی

سبزی دھو کر اس نے چولہا جلایا اور سالن کی تیاری شروع کر دی۔

جب بھی عذر ایچکم خورشیدہ آئی (مکملہ دار) کے گھر سے ہو کر آئیں، کتنے ہی دن تک ٹھنڈی آہوں کے ساتھ جھلسا دینے والے فقرے ان کے رخ و بدن سے لڑا ہوتے رہتے اور دونوں ہوس میں ان کے قہروں سے لکڑی تڑپ اٹھیں گویا کوئی انہیں کند چھری سے کاٹ رہا ہو۔

کچھ عرصے افسوس سے بے حال ہو جاتیں، کیونکہ وہ خورشیدہ آئی کی ہوس کی خوش خلقی اور مہمان نوازی تو دیکھ آتی تھیں مگر انہیں خورشیدہ آئی کی اپنی ہوسوں سے محبت ان کو دیا ہوا احمق اور آزادی نظر نہ آتی تھی۔

یہاں تو گھر میں کوئی آجائے تو ہوسوں کو جب تک سانس کی آنکھ کا اشارہ نہ مل جائے چائے پانی کے لیے کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی۔

لول تو آنے والے کو باتوں ہی پر رُخا دیا جاتا اور اگر کسی خوش بخت کے نصیب میں عذر ایچکم کے گھر کا دلہن پائی لکھا ہو تو خود اٹھ کر کچن میں ہوسوں کو ہدایات دیتے آئیں۔

”چینی کم سے کم ہو، چائے بھی ہے منگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔“ اور چائے میں دودھ پتی تو خور ڈال کر جاتیں۔

کم دودھ، پتی اور چینی کی چائے پی کر کون سا ایسا مہمان ہو گا جو عذر ایچکم کی ہوسوں کی مہمان نوازی کے قصیدے پڑھے گا اور کبھی بھول کے کوئی ہو کسی آئے گئے کسی اس بیٹہ جاتی تو عذر ایچکم کی گھر کی ہی دہلیز سے اٹھنے کے لیے کلن ہوتی۔ بعد میں یہ اس کے لیے

”بھئی خورشیدہ بھائی کی پسند کی دلدنہ و نیاز داتی ہو گی بیٹو، سو میں مکھن ملائی، برنی کی دلیاں ہیں۔ حسن صورت اور حسن سیرت، شاماء اللہ تینوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ روز بھی جاؤ تو ایسے ملتی ہیں گویا کوئی صدیوں کا چھڑا قن ملا ہو۔“ خندہ لب و خندہ پیشانی سے ایسے استقبال کرتی ہیں کہ ان کے گھر جانے والا اپنی خوش نصیبی سے ناز کرے۔

خورشیدہ بھائی کے پاس بیٹھے ابھی حل احوال ہی پوچھنے کی نوبت آتی ہے کہ چھوٹی ہوس ٹھنڈی بوتل کا ٹکاس قہلے آ جاتی، جسے لی کر پورے جسم میں ٹھنڈک اتر آتی ہے۔ لوہو بوتل ختم ہوتی اور خورشیدہ بھائی میں کا پیر ہاتھ میں تھما دیتی ہیں، بیسرا کستی ہوں کہ بھائی میں کھانے کی عادت نہیں، مگر ان کے اصرار پر منہ میں رکھ لیتی ہوں۔ بوتل کی ٹھنڈک کا اثر بھی زائل ہونے نہیں پاتا کہ بجلی چائے کے ساتھ نہ بچائے آجاتی ہے۔

لور بڑی ہوس تو اپنی خوش کنھاری سے ہی آنے والے گلچیدہ ٹھنڈتی ہے۔

حق۔! انکی ہوس میں ہر کسی کے نصیب میں کھلے۔ انہوں نے سو تو بھری لور سبزی بنائی کترا کے بل میں یہ قہو کھب کیا ہے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا۔

”کیسی ساسیں بھی ہر کسی کے نصیب میں کھلے۔“ عکسے کہ اس کی بیویا ہت عذر ایچکم کے کالوں میں قتل نہایت کے باعث نہ پہنچ سکی اور نہ سبزی کا تکی چھری پٹا۔ بھر میں کترا کا قیسٹاری ہوئی۔ اس نے جلدی جلدی سبزی کلن لور بچن کا رخ کیا۔

لتے لیتیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے توبہ کر لیتی تو پھر خود ہی سوچیں کہ فن کی سوویں میں خوش مرزا کی کہیں سے آئے گی۔

”بد مزاج، پھوڑ اور کجیوس، سوویں کے خطاب تو پورے محلے میں انہوں نے خود مشہور کر رکھے ہیں۔“ گنزا سے پھولی ہانیہ آنا گوند حتی جاتی تھی اور ہنسنے لگتی۔

”چھوڑو بھی ہانیہ کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔ یہاں تو دل اور خون جل جل کر خاک ہو جائیں تو نقصان تو ہمارا اپنا ہی ہے۔ کل کو اگر کوئی بیماری لگ گئی تو ہمارے ہی بچوں نے ڈرنا ہے۔ اس لیے ایسی باتوں کو ایک کھن سے سن کر دوسرے کھن سے نکال دیا کرو۔ سچ سچ ہو گئے مجھے یہ دل جلے فقرے سنتے، کلیجہ بھی پھٹتی ہو گیا مگر ان کی فطرت میں سرسوفرق نہیں آیا۔“ گنزا نے ہانڈی بھون کر ایک طرف رکھی اور ہانیہ نے مدنی بنانے کے لیے توجہ دے کر رکھ دیا۔

”کیا ہو گیا! آج کی تاریخ میں کھانا ملے گا یا نہیں؟“ ماس کے خلاف کولن سے منصوبے تیار ہو رہے ہیں جو ابھی تک کچن سے ہی سارا نیاں فارغ نہیں ہو رہے۔“ عذرا بیگم کی کڑک آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرانی تو دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔ انہیں کب یہ کسی طور کو ارا ہوتا تھا کہ وہ دونوں کبھی مل کر بیٹھیں، جہاں وہ دونوں اکٹھی ہوتیں، فن میں سے کسی ایک کو کام پہ لگا دیتیں۔

شوہروں سے ٹھنک تو بالکل ہی بے کار تھا۔ وہ مٹی کے برحوالوں کے آگے چون و چرا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کوئی بیٹا غلطی سے بیوی کی حمایت میں دو جملے بول دیتا تو کن پر غشی طاری ہو جاتی، آواز لاشہ بکارتیں۔

”جانو جی۔ ہائے جانو جی۔“

فن کے جانو جی میں ایسی ہائیاں و آہیں ہوتیں کہ سنبھالنے کا کلیجہ منہ کو آجائے۔

”ہائے جانو جی! اپنی عذرا کو کن کے سارے چھوڑ گئے۔ ہائے مجھے بھی کیوں نہ جائے ہی اپنے پاس بلا



لیا۔ یہ دن دکھانے کو چھوڑ گئے تھے مجھے کہ بیٹے جو وہ کے غلام بنے، مل کو باتیں سنائیں۔ کیا ہی واسطے فن کو جگر کا خون پلا کر دیا گیا کہ کل کو غیر عورت کے مقابلے میں مل کے سامنے تن کر کھڑے ہو جائیں۔“ نکاح میں آئی عورت فن کی نظر میں غیر تھی۔ ”اے اللہ! یہ وقت دیکھنے سے پہلے فرشتہ اجل میرے پاس کیوں نہ بھیج دیا۔“ وہ ہاتھ رگڑتی اس انداز سے گریہ و زاری کرتی کہ بیٹے ہو کس کلیجہ تھام لیتے۔

بیٹے اس وقت کو گوتے جب غلطی سے فن کے منہ سے الفاظ نکل گئے، سکھان سے نکلتا تھا، پس آسکتا نہ منہ سے نکلی بات، سوا ب لہجے کے سامنے نتیجہ بھگتے کے لیے تیار تھے۔ فن کے گھنوں پہ سر رکھ دیتا، پر سو چل دیتیں۔

”دفعہ ہو جانا بنجار، کوئی واسطہ نہیں میرا تمہارے سے، بیوی کے گوڑے سے جا کے لگ جاؤ، یہی بخشائیں گی تمہیں۔ مل کے قدموں تلے جھٹ

کمل۔ جنت میں تو یہ حوریں لے جائیں گی
 ہمیں۔ وہ تھیلیاں رکڑ رکڑ کر دوں گی اور پیار جانو
 گی کو پیار تیں۔

شروع شروع میں تو ہوئیں ان کے اس انداز میں
 پکارنے پر حیران ہوئیں بعد میں پتا چلا کہ ان کے سر کا
 نام رمضان عرف جانو تھا جس کا نام اپنے لہجے میں
 دینا جہاں کا پیار سموئے جانو کی کہہ کر اٹھائیں۔ وہ جانو
 جی کو پکارے جائیں۔ جانو جی تک تو ان کی پکار کیا جاتی
 وہ سب ان کی ہر پکار پر لرز کر رہ جاتے۔

ہوئیں لائن حاضر ہو جائیں۔ کلن پکڑ کر معافیاں
 مانگتیں کہ ہماری سلت پستوں کی توبہ جو ہم آپ کی کسی
 زیادتی کا گناہ اپنے شریک حیات سے کریں بیٹھے ٹاک
 سے ٹیکریں کھینچتے تب کہیں جا کے خلاصی ہوتی اور جانو
 جی کا مہول میں کہیں گم ہو جاتا۔



”جانو جانو کو بھی ملت دے دی تم لوگوں نے وہ بھی
 توازیں من کے لوہر لوہر ہو جاتے ہیں۔ ارے کوئی
 حیا شرم ہے کہ نہیں۔ جو ان بخش گھر میں ہیں اور یہ
 دن چڑھے تک بیوی کو بغل میں لیے بڑے ہیں۔“
 لہاں نے اتنے زور سے دروازہ دھڑکا دیا کہ گویا بھونچیل آ
 گیا ہو نازک سی کنڈی فن کی بوہڑ دھڑاہٹ سے مکمل
 گئی اور دروازے کا ایک پٹ بھی فن کی نگاہوں کو
 راستہ دینے کے لیے ساڑھ پہ ہو گیا۔ ہر پڑا کر اٹھی اور
 بکھرے ہاتھوں کو جوڑے کی شکل میں لینا اور لپٹے
 اچھی طرح جوڑہ کہا ہر نکل آئی۔

”ہاں بھی! مردوں کا کیا قصور جب حوریں بل
 بکھرائے سنگھار کیے میاں کے پہلو میں ہوں گی تو
 کس کافر کو ہوش آئے گا“ انہوں نے اس کے لبوں پر
 لب اسٹک بھی دیکھ لی تھی حالانکہ رات کو نہ صاف کر
 نے سولی تھی مگر ان کی نگاہوں نے بل میں پوسٹ مارٹم
 کر ڈالا تھا۔ پوچھت رہی تھی اور رات اس کے سکون کی
 طرح رخصت ہو رہی تھی۔

”آئندہ یہ بے جانی اس گھر میں نہیں رہی گی۔ منہ
 اندھیرے اپنا جسم پاک کر لیا کرو گھر سے رزق اڑاتا
 ہے۔ جوان نند لور دیور گھر میں ہیں۔ سر صبح سویرے
 فجر کی نماز کو نکلتے ہیں۔ جیا کا دامن پکڑا۔“ انہوں نے
 اس کے غسل خانے میں گھستے گھستے بھی فقرے
 اچھالے اور وہ شرم سے زمین میں گر گئی۔

سارا دن ان کے ساتھ گزارنا اس کے لیے کڑے
 امتحان سے کم نہ تھا ایک کلم ختم ہوتا تو دسرا شروع
 دوسرے سے فراغت ملتی تو میرا تیار رہتا۔ ناشتہ دوسرا
 اور رات کے کھانے تک وہ ہلکا ہوا جاتی شکوہ لبوں کو
 چھونہ سکتا تھا۔

مرد صبح کے نکلے رات کو گھر میں گھستے۔ دن میں
 عورت ہی عورت سے کیا سلوک کرتی ہے۔ وہ جان کر
 بھی انجان بنے رہتے بقول لہاں کے عورتوں کے
 معاملات میں ————— مردوں کا کیا کام۔

سالن کے لیے وہ ٹمٹم ہری مرچیں، مسالہ سب
 نکل کر دیتیں۔ اس کا کام صرف کانا ہوتا تھا۔ صحن میں
 بنے چو لیے پر کام کرتی ہوئیں ساس کی نگاہوں کی مسلسل
 زد میں ہوتی۔ کبھی جو نمک جاننے کی غرض سے وہ
 مسالہ چٹختی تو لہاں وہیں سے چلاتیں۔

”بس بھی کر اب چکھنے ہی چکھنے میں ہانڈی چٹ کر
 جائے گی۔ برکت الگ اڑے گی“ وہ پچاری شرمندہ ہو
 جاتی۔

ہنڈیا دہلی کر کے وہ ایک طرف ہو جاتی اور لہاں
 بانٹنے کے لیے چو لیے کے پاس آسودہ ہوتیں۔ کس
 کو کتنی بوئیاں شور مارتا ہے اس کا فیصلہ وہ خود کرتیں۔
 اس کے حصے میں ہمیشہ ہڈی والی بولی اور شور بے سے
 بھری کٹوری ہی آتی۔ وہ صبر و شکر سے نوالے اپنے اندر
 آستین۔

گرمی اور جائے کا کپڑا کبھی سرال سے نہ ملا جو
 کبھی سال چھ سینے میں اب کے جانا نصیب ہوتا یا کسی بچی
 کی پچھی آلی تو نیا سوٹ بھی تن پہ جاتا۔
 آدلی کی تو یہ مثل تھی کہ اندھے کے آگے روئے
 اپنے بھی نہیں کھوئے۔

”حق۔ ہا۔ بھی دن کے اجالے میں تمہارے ابا کی شکل ڈھنگ سے دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ابا کی نگاہیں میرے چاروں اور کھوتیں ذرا جو پاس سے گزری تو جوان مردوں کا طعنہ سر اٹھانے نہ دیتا۔ اللہ بخشے اباں مرحومہ کو یہ تم دونوں کے شوہر اور تمہاری چار مندریں جانے کیسے دنیا میں آگئے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تو دنیا میں آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اباں کا بس چلتا تو رات کو بھی بچے کو کمرے کا رخ نہ کرنے دیتیں۔ بری بھلی جیسی گزرتی تھی گزرتی۔ اللہ بہشتی کے درجات بلند کرے۔“ وہ آنکھوں سے جھٹکے چند آنسو پونچھنے لگیں۔

”بس چھوڑو۔ کہاں تک میری چٹا سنو گی۔ کئی راتیں سیاہ ہو جائیں پر میری داستان ختم نہ ہوگی“ انہوں نے اپنی ٹانگوں پر سے کنزا اور ہانیہ کے ہاتھ ہٹائے اور ٹانگیں سیٹ لیں۔ گویا یہ بدعات، لہجے کی سختی اور الفاظ کا چٹا زان کی ساس کی دین تھا۔ کنزا کو ان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

”اباں پھر تو ہماری بہنیں بھی ہمارے عجب سے بچ نہ پائیں گی ہم بھی ساری کسر نکالیں گے“ ہانیہ کہہ کر چھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔ عذرا بیگم کو اس کے فقرے نے سن کر دیا۔

”یہ کیا کہہ گئی ہو۔ ہم بھی اپنی بہنوں سے ساری کسر نکالیں گے“

اس ایک جملے نے لمحے میں اباں کی آنکھیں روشن کر دیں۔ انہیں بہنوں پر اپنی زیادتیاں بالکل واضح دکھائی دینے لگیں۔ ساری رات نیواڑی چنگ پر کھڑی بیٹھ رہیں۔ چند آنکھوں سے غائب ہانیہ کا فقرہ سوچ کے کئی بار دہرا کر گیا تھا۔

بہو کے ایک جملے نے راتوں رات عذرا بیگم کے ذہن دہل میں بے پناہ وسعت پیدا کر دی۔ صبح ناشتے سے فراغت کے بعد انہوں نے دونوں کو اپنے پاس بلا دیا۔ اباں کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور چایاں بنی، سو کنزا کے ہاتھوں میں تھما دیں۔

”کنج سے اس گھر کی مالکن تم دونوں ہو۔ سیاہ کو

یاسفید یہ ہر تہا را ہے۔ میں پاگل ہو تو ف اپنے دکھوں کا بدلہ انجانے میں تم سے لے کر سکون محسوس کر رہی تھی۔ میرے نصیب میں تم دونوں کا کیادوش۔ اگر تم مجھے معاف کر دو تو کیا پتا میرا اللہ بھی مجھے بخش دے۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔ کنزا اور ہانیہ نے اباں کے ہاتھوں کو چوم لیا اور کنزا چایاں اباں کے پاس واپس رکھتے ہوئے بولی۔

”اباں یہ گھر اور اس گھر کی ہر شے آپ کی ہے ہم بھی آپ کے بیٹے بھی آپ کے جس آپ ہم دونوں کو اپنی چاہت اور اعتماد کی بدولت سے نوازدیں۔ خورشیدہ آئی کی بہنیں اگر پہلی کی ڈلیاں ہیں تو آپ کی بہنیں مصری کی ڈلیاں بن کر اپنی گفتگو کی سیرنی سے سب کا دل جیت لیں گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ جو کچھ آپ کی ساس نے آپ کے ساتھ کیا وہ کل کو لے والی بہنوں میں بدل در بدل منتقل ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں کے چراغ سے چراغ جلتا رہے اور ایک ہنسا سکرانا“ دل سے بزرگوں کی عزت کرنے والا گھرانہ یہوں چڑھے۔ عذرا بیگم نے اس کی اتنی اچھی صحیح پر غم آنکھوں سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دونوں کو اپنی بانہوں میں سیٹ لیا۔

کمرے کے باہر کھڑے ذرا اور شہسوار دونوں پلکیں جھپک جھپک کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ کلن کی چالیاں وہ گھر پر بھول گئے تھے، اپنے کے لیے جو آئے تو یہاں تو کیا ہی چلی ہوئی تھی۔ وہ بے یقینی سے اس منظر کو دیکھتے تھے۔

بے اختیار انہوں نے مہربانی کی طرف یہ دیکھنے کو نگاہں نکا دیں کہ آج وہ کس سمت سے نکلا ہے۔ عذرا بیگم کنزا اور ہانیہ نے ان کے حیران چہروں کو — دیکھا تو تینوں تفرقہ لگا کر فس دس اور وہ بھی نخل سے ہو کر اباں کے قدموں سے لپٹ گئے۔



گنگا کی شہر

"آہا... میں نے سنا ہے۔"

مجھ کے گمن میں ہنسنے کے نورانی قلم کھولے کرتے۔

حرکت سے متعلق تھی میرا ہر دم دہرا رہا تھا۔ من

کے جنبش کرتے لیوں کے ساتھ کسی کو نے کھدے

میں دیکھے چاہا شو کے کیوں میں بھی حرکت ہوتی۔

وہ بچوں کی قلم میں لب کے ساتھ ساتھ سر بھی ہلا کر

اس کے سامنے کوئی نورانی قلم نہ ہوا کہ نہ ضرورت

تھی اور نہ ہی قلم۔ وہ چنان پڑھ تھا "انگوٹھا چھاپ

کو رہے قلم کی مانند چھاپ۔ نہ پڑھنا جانا تھا نہ

لکھنا۔

اور تو کوئی نہیں بس کلام قلم بڑھنے کا برا شوق تھا۔

اکو اک شوق۔ آنکھوں کے آگے لب جلا سا بنا اور

کسی حرف پر نظر نہ بھی سزا بن بھی کنور تھا اور نظر بھی

پھر بھی امام صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ

خس گیا۔

"اب اس عمر میں کیا سکھے گا چاہے ایک وقت

سے نہ سیکھتا۔"

"سکھنے دی کہی عمر نہیں ہو مری جھلیا۔"

اور یوں میری نماز پڑھ کر چاہا امام صاحب سے

قرآن پڑھنے لگا۔ امام صاحب نے نورانی قلم سے

تھاڑ کیا۔

"پہلی تھی حروف مفہومات کی ہے۔" چاہے کو

بھلا اس سے کیا سوکارا ہے تو بس پڑھنا تھا۔

امام صاحب روز سکھاتے مگر چاہا بھول جاتا۔ روز

بھول جاتا۔ ایسا نہیں تھا کہ چاہا کو شش نہیں کرتا تھا۔

روز کا سبق کئی کئی بار دہرائی کرتا۔ مسجد میں الگ

رہتے میں الگ اور گھر۔ الگ مگر پچھلے دن کا سبق

الگ دن ہی بھول جاتا۔ فرض لسیان جو لاحق تھا سو کیا

رہنے دیں امام صاحب۔ چاہا تو وہ بلا ہے اپنے

ساتھ اب کا وقت بھی برباد کرتا ہے۔" کسی نے آگے

جالتے پھرتی تھی۔

"کیا کرے گا چاہے اس عمر میں سیکھ کر۔" منجھلے

مسجد سے نکلتے چاہے پڑھنے کے لئے اور ایسے جیلے ملتے تو

پچھلے چاروں سے سن رہا تھا۔

سیکھنے کی کون سی عمر ہوتی ہے۔ شوق شوق کی بات

ہوتی ہے۔"

"پڑھا ہے میں ہی شوق پڑھا۔" وہ ہنستے۔

"شکر ہے اس رب کا پڑھا ہے میں ہی سہی موت

سے پہلے ہوش تو آیا۔" وہ گہری سانس بھرنا پاس گزار

سلن جاتا۔



شوکت علی عرف شوکا چاہا ان پڑھ، غریب اور

سلوے میں پاپ کی انگوٹھی لولہ تھا۔ برائیت تھا

غریب زیادہ تھی سو کسی میں عقل مت نہ تھی کہ

زندگی جاور کی طرح نہیں گزارنا چاہیے۔ پیدائش

سے موت تک بس ایجن لگایا، کھلا اور سولیا۔

گلوں میں ہنسی غریب تھی سو بچے اسکول تک نہ جاتے۔

شوکا بھی اپنے لبا کے ساتھ تھیں میں کام کو اتا،

بانے میں موٹیوں کی دیکھ بھل کرنا اور مٹی کے

برتن بناتا۔

ایک روز یونی آئی سے پوچھ بیٹھا۔

"تک میں مدر سے نہیں جاتوں گا؟"



اور لائق کستی ”مدرسے جا کر کیا کرے گا پتر۔ اے
 کے ساتھ کام کرو اس کا سارا بن۔“
 وہ تبلیغ داری سے سر ملاتا ہے اس سارا تو بن گیا مگر
 اہل بابا جیسا ان بڑھ رہ گیا۔ کبھی کبھار گلوں کے مولوی
 صاحب اسے پکڑ کر چند سو تیس پر معاوضے ”رٹوا دیتے۔
 پوری زندگی جفا کش کسان کی طرح گزر گئی اور جب
 چالیس کے پنے سے لگا تو سجدہ جانے لگا روزے رکھنے
 لگا۔ حج کی استطاعت نہ تھی اور زکوٰۃ فرض نہ تھی۔
 کچھ دعائیں رٹ رکھی تھیں جو چلتے پھرتے پڑھتا رہتا۔
 پھر بس قرآن پڑھنے کا شوق چرایا تو احساس ہوا کہ
 جولانی کی عجلت ہی اصل عجلت۔ بدھاپے میں نہ
 نظر کام کی نہ مغز۔
 ”کیا کرنا ہے لب بیکہ کر؟“ وہ ابرار بھائی تھا۔
 سب کا براری بھائی
 چاہا آپس بھرتا۔ ”جتنی مٹھی بھر جائے بھر لینی
 ہے۔“
 ”اس عمر میں جب آنکھیں ضلع اور زبان بھی کام
 نہیں کرتے۔“
 ”یہ سب تو اللہ کے حکم کے تابع ہیں جو وہ سمجھو۔۔۔
 سوئے نیم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کہا کہ مجھ

سے لکھ تک علم حاصل کرو۔ غیر دس علم دی کیا عمر ہوئی؟ شہادت دہرائے۔
 چاچا سو باتوں کی ایک بات کر گیا تھا۔
 ”نہر اور لکھ کے مطلب بھی جانتا ہے۔؟“
 اور چاچا کو راتن پڑھ تھا مگر اتنا تو جانتا تھا۔
 ”سب جانتا ہوں پتر۔ بس لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔
 وہ بھی لب جانتا چاہتا ہوں۔“ بچوں میں سچا لور
 سیانوں میں سیانا تھا۔
 ”تو تم سے لکھ اتنے سل کہاں رہا ہے؟“ گوروہ کیا
 بتاتا کہ بس ہوش ہی اب آیا ہے۔ غفلت کا پردہ ہی
 اب چاک ہوا۔ چاچا روز کا سبق روز دہرائتا اور روز
 بھولتا تھا مگر کوشش جاری رکھتا۔ زبان میں لکت تھی
 ۔ اچھے لگا مگر سوچنا نہ تو کوشش کے لئے ہیں سو دیتے
 والا کچھ تو دے گا ہی۔ ایک روز لام صاحب نے بھی لگا
 سلجوا بھڑے ڈالا۔

”برائے متاثر تیرے بس کا کلم نہیں ہے یہ۔“ گوروہ
 چاچا نرم آنکھیں لے انہیں دیکھنے لگا۔
 ”سیکھنے والا نہیں ہار تو سکھانے والا کیسے ہار گیا ہے؟“
 لام صاحب گنگ رہ گئے۔
 ”میں اللہ سے دعا کروں گا چاہے تیرے لیے۔“
 ”دعا تو کر دے گا پر مجھے وہ ابھی دے دے۔“ بس
 اتنا کہ کر نرم آنکھوں سے ہنسنے سر سمیت گھر کی راہ
 لی۔
 پھر چاہے نے نیا ولیو اپنایا۔ جب سبق بھول جاتا
 تو اس سبق پر انگلی پھیرتا جاتا اور دل ہی دل میں کلمہ

پھر ایک روز اچانک چاچا کو قلع ہوا اور پھر جو بستر
 سے لگا تو اس کا ہو کر رہ گیا۔ چاچی قرن لے کر آئی
 اور چاہے کی نظروں کے سامنے کر دی۔ بس وہ
 روزانہ کے سبق پر نظر بس پھیرتا رہتا۔ جسم نے ساتھ
 چھوڑ دیا تھا مگر غور کوشش جاری تھی اور اس رات
 چاچا نے بستر پر پڑے پڑے قرن ختم کیا اسی روز زندگی
 ختم ہو گئی۔ پورا گاؤں جمع تھا۔ جب چاچا کو قبر میں
 اتاراجا تھا گوروہ کی مٹی مشک زعفران بن گئی۔
 سب دفنا کر گھروں کو لوٹنے کی بجائے چاچا شوکے
 کے گھر گئے اور چاچی سے پوچھا کہ ایسا کیا تھا جو چاچا کی
 قبر عطربنی ہوئی ہے۔ چاچی کا نہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
 ”بس علم کی طلب تھی اور مسلسل کوشش کرتا
 رہا۔“



حکایتیں گاہ کہیں والی انجمن اسلامیہ کراچی
 750 روپے
 کے ساتھ ساتھ کتاب
 کیلئے
 کے ساتھ ساتھ کتاب
 کے ساتھ ساتھ کتاب

زندگی کے راز و کھجور

کراچی کی ہسپتال میں ہر طرف خاموشی کا راج
تھا۔ عید کا دن تھا، صرف کچھ مستقل مریض تھے جو عید
والے دن بھی ہسپتال میں مقیم تھے۔ باقی سب مریض
گھر چلے گئے تھے۔ چھ منزلہ ہسپتال کی شان دار
عمارت میں چند ہی ڈاکٹرز آن ڈیوٹی تھے، باقی سب عید
کی چھٹیوں پر تھے۔ کالمن روم میں اس وقت ڈاکٹر



فارحہ اور ڈاکٹر فاطمہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے علاوہ لور کوئی ڈاکٹر وہاں نہیں تھا۔

”کیا یار! عید کے دن بھی ہم ڈیوٹی پر ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟“ فارحہ صوفے کی بیک سے سر لکاتے ہوئے بولی البتہ فاطمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں اپنا دوس جاب مکمل کر رہی تھیں شہر ہسپتال میں گراچی کے حالات ایسے تھے کہ ہر وقت کسی نہ کسی ایمر جنسی کا خطرہ رہتا تھا سو — اب سب ڈاکٹرز کو چھٹی نہ ملتی تھی۔ کوئی نہ کوئی تن ڈیوٹی ہی ہوتا تھا۔

”فاطمہ۔“ فارحہ کے پکارنے پر وہ چوکی۔

”ہاں۔“

”کیا سوچ رہی ہو؟“ فارحہ نے بغور اس کی چمکتی آنکھوں میں سوچ کی ہر چھائیوں دیکھیں۔
”کچھ نہیں“ بس دلیلا کا سوچ رہی تھی۔ ہاں نہیں کچھ کھانا بھی ہو گا انہوں نے یا نہیں۔“ فاطمہ کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ تب ہی پولیس گاڑیوں لور

ایمر جنس کے تیز تیز سائرن پر وہ پوٹھلا کر کھڑی ہو گئیں۔ سائرن کی آواز سے پورا ہسپتال گونج رہا تھا۔ ان دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر تیزی سے کھڑکی کی طرف بھاگیں۔ وہ سینکڑوں فلور پر تھیں کھڑکی کے باہر متاعِ عدل دہلانے کو کھڑی تھیں۔ ہسپتال کے احاطے میں پولیس گاڑیوں اور ایمر جنس کا جھوم تھا۔ مریضوں کو جلدی جلدی اسٹریچر پر ڈھلا جا رہا تھا۔ اس سے میلے کہ وہ کچھ سمجھتی تھیں، کاسن دوم کا ردانہ ایک جھنگل سے کھلا اور سینئر ڈاکٹر وہاں اندر داخل ہوئے۔

”ڈاکٹر فارحہ! فاطمہ! جلدی آپریشن روم میں آئیے۔“

ہری اپ ”تیز تیز لہجے میں کہہ کر مڑے۔“

”مگر سر ہوا کیا؟“ فارحہ نے پوچھا۔

”ایمر جنسی ہو گئی ہے شہر میں بدترین مارگٹ ٹنگ ہوئی ہے بہت لوگ زخمی ہوئے ہیں سنا ہے ایک مجرم بھی پکڑا گیا ہے لیکن شدید زخمی حالت میں اسے ہر صورت بچانا ہے۔ جلدی آؤ“ کہہ کر کے نہیں لور

ناؤلیٹ



باہر نکل گئے۔
 ”یہ بلیک اینگل کون ہے؟“ فاطمہ نے نا سنجھی سے
 قارحہ کو دکھا جو ابھی تک بے یقینی کی حالت میں کھڑی
 تھی۔
 ”بلیک اینگل۔ تم نہیں جانتیں؟“ قارحہ نے ہنر
 لبانہ اور بیز نقاب پہنے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ فاطمہ بھی تیزی سے آپریشن ٹھیٹر
 جانے کے لیے ڈریس لب ہو رہی تھی۔

”نا ہے انتہائی خطرناک، بلور، نڈر اور تیز مجرم
 ہے۔ پولیس کب سے اس کی تلاش میں ہے۔ مکالمہ
 کھلا واردات کرتا ہے مگر پکڑا بھی نہیں گیا۔ مگر آج
 پہلی بار۔“ قارحہ کے بتانے پر اس وقت وہ اپنی حیرانی کا
 اظہار نہیں کر سکتی تھی، سو جلدی جلدی قارحہ کے
 پیچھے بھاگی۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ سارے
 فن ڈوبی ڈاکٹر زون خیموں کا علاج کر رہے تھے۔ آپریشن
 روم کے باہر پولیس کی بھاری نفری موجود تھی، فادونوں
 تیزی سے آپریشن روم میں داخل ہوئیں۔ جہاں ڈاکٹر
 وہاب اسٹریچر پر لیٹے وجود پر جھکے ہوئے تھے۔ ہنر
 دوشیوں نے کیڑا لبا چوڑا وجود بالکل ساکت تھا۔

”تین گولیاں لگی ہیں، آپریشن کرنا ہو گا۔ نہتے کے
 چاندز بہت کم ہیں، اتنی آسانی سے اسے نہیں مرنے
 دینا۔“ ڈاکٹر وہاب ہن دونوں سے مخاطب ہوئے وہ
 لہنتہ سہا دے چکے تھے شاید۔ وہ بے ہوش بڑا
 تھا۔ آپریشن شروع ہو چکا تھا، ڈاکٹر وہاب اور قارحہ کے
 ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے البتہ فاطمہ کم مہم
 سی کھڑی اس لیے وجود کو دیکھ رہی تھی۔ چھ فٹ سے
 لکھتے قد کی وجہ سے پاؤں بند سے باہر نکل رہے تھے،
 کسلی جسم اور جہرے پر چھائی معصومیت بند آنکھیں

اور بے حد لمبی گھنی پلکیں۔ اس نے کبھی کسی مووی
 اتنی لمبی پلکیں نہیں دیکھی تھیں۔ کھڑی ٹاک عجیب
 سی مغرور تپید کر رہی تھی یوں جیسے کوئی بادشاہ ہے
 بس بڑا ہو۔ کیا اتنے خوب صورت اور معصوم ہونے
 ہیں مجرم!

”فاطمہ خون رو کو ڈاکٹر وہاب کے چلانے پر وہ اپنے
 خواہوں میں آئی اور تیزی سے کانٹن رکھنے لگی۔ مگر کچھ
 منٹ بعد جب آپریشن ابھی جاری تھا، اس کے بے
 بس وجود کو ایک جھٹکا لگا اور تھوڑی سی حرکت ہوئی۔
 اس کے بے ہوش وجود میں حرکت ہو رہی تھی، تنہے
 پھول اور پچک رہے تھے۔

”یہ یہ یہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں نے اسے خود
 تین گھنٹوں کے لیے لہنتہ سہا دیا ہے۔ پھر یہ کیسے
 کیسے ہوش میں آ سکتا ہے۔“ حیرت کی شدت سے
 ڈاکٹر وہاب کی آنکھیں پھٹنے کو تھیں۔ اب حرکت تیز ہو
 چکی تھی۔

”لہنتہ سہا دہ جلدی“ ڈاکٹر وہاب چلائے۔
 کیا ڈاکٹر تیزی سے انجکشن بھرے لگا۔

”مگر سر مزید لہنتہ سہا تو خطرناک ہو گا۔ اس کی
 ذہنہ بھی ہو سکتی ہے۔“ پہلی بار فاطمہ نے زبان کھولی۔
 ”اس کے علاوہ اب کوئی چارہ نہیں، سچ گیا تو خوش
 نصیب ہو گا۔“ وہ انجکشن بازو میں لگاتے ہوئے
 بولے۔ حرکت بند ہو گئی، ایک بار پھر بے ہوش ہو
 چکا تھا۔ پھر تین گھنٹوں کے طویل ترین آپریشن کے
 بعد معجزاتی طور پر ریویج کیا تھا تینوں گولیاں اس کے جسم
 سے نکل دی گئی تھیں۔

”حیرت انگیز قوت مدافعت کا مالک ہے یہ میں نے
 آج سے پہلے کبھی کسی میں اتنی دل پیار نہیں دیکھی۔“
 ڈاکٹر وہاب نقاب اتارتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں
 بولے۔

”خیر! ڈاکٹر فاطمہ چکر لگاتی رہے گا یہاں مزید
 تو جسے کھتے تک اسے ہوش آجائے گا۔ ڈرنے کی
 ضرورت نہیں باہر پولیس کی بھاری نفری موجود
 ہے۔“ وعدہ ایات دیتے باہر چلے گئے۔ پیچھے وہ اور قارحہ
 تھیں، جبکہ ڈاکٹر وہاب باہر پولیس اور میڈیا کو بریف کر
 رہے تھے۔

”حیرت ہے ویسے تین گولیوں اور لہنتہ سہا کی
 اتنی زیادہ مقدار کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا اس پر“ فاطمہ

اب بھی حیران تھی۔

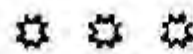
”ایسے ڈیٹ اور بے حس لوگوں پر کوئی اثر ہوتا بھی نہیں۔ تمہیں بتا ہے اپنے باپ کو بھی اس نے قتل کیا ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس نہ دل ہوتا ہے نہ جذبات، ان پر نہ گولیاں اثر کرتی ہیں نہ دو اینٹیں“ قارحہ کا لہجہ نفرت سے بھر پور تھا۔ اور فاطمہ تو بس ”باپ کو خود قتل کیا“ پر ہی ایک گئی تھی۔

”کیا کیا واقعے؟ تمہیں کیسے پتا“ وہ حیران تھی قارحہ کی بانٹار مشین پر۔

”کس دنیا میں رہتی ہو تم فاطمہ۔ کچھ ارد گرد کی بھی خبر لیا کرو۔ تین سال پہلے بنین لور باپ کو قتل کرنے کے جرم میں اسے قید ہوئی تھی مگر یہ جیل سے بھاگ گیا۔ جن کے لیے یہ کام کر رہا ہے، انہی لوگوں نے اسے وہاں سے فرار کروایا تھا۔ ان تین سالوں میں اس نے کتنے جرائم کیے ہیں۔ کتنے بینک لوٹے ہیں، کتنا بھتہ لیا ہے، یہ تو گناہی نہیں جاسکتا۔ ہر جگہ یہ اپنا نشان چھوڑ کے جاتا ہے، بلیک ایکل۔ وہی بلیک ایکل کاٹیو اس کی باند پر بھی بننا ہے، اصل نام تو کچھ اور ہے مگر بلیک ایکل کے نام سے ہی مشہور ہے۔“ قارحہ نے اب تفصیل سے بتایا، فاطمہ کو بے اختیار کھن آنے لگی تھی۔

”اس کو تو مری جانا چاہیے تھا، کیوں بچایا اسے“ وہ بھی نفرت سے بولی۔

”نہیں اگر یوں مرجانا تو یہ بہت آسان موت ہوتی اس کی۔“ قارحہ کے کہنے پر اس نے زور زور سے سر ہلایا۔ پھر وہ دونوں ہی باہر نکل گئیں۔



چھٹی کا دن ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کوئی خوش خبری۔ وہ بھی کلنی دیر سے سو کے اٹھا پھر فریش ہو کر نیچے آگیا۔

جہاں زہو مشین لگا کر بیٹھی تھی۔ آدھے سے زناہ کپڑے ڈھل چکے تھے، زنیو پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں مسکرائیں۔

”بائستہ لگاؤں زہو نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کبھی ہنستے ہیں، یکے آلی تھی تو پوچھی گھر کے کام سمیٹ کے جاتی تھی، مگر زنیو کو زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ کام دلی بھی رکھی ہوئی تھی مگر نہ ہو پھر بھی ہنستے ہیں ایک دن یکے ضرور رہتی۔ اور عمو“ چھٹی والے دن ہی رہتی تھی۔ شادی سے پہلے سارا گھر اس نے سنبھال لیا تھا اماں کی وفات کے بعد۔ پھر شادی کے بعد زہو ہفتے میں ایک چکر لگا لیتی۔

”اب کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بیمشک میں ہیں۔“ زہو نے جواب دیا۔

”بائستہ کر لو، کتنے کمزور ہو گئے ہو تم۔ ٹھیک سے کھاتے پیتے نہیں ہو تم؟“ اس نے اب پھر ٹوکا۔ وہ مسکرا دیا۔

”میں ٹھیک سے کھاتا ہوں زہو، تمہاری نظر کمزور ہو گئی ہے۔ عدیل بھائی سے کہہ کر چیک کروانا، پھر چشمہ لگا کر مجھے دکھانا، بالکل فٹ اور ٹھیک نظر آوے گا میں۔“ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی کچھ بچہ نہ گیا۔

”ہاں ازالو مذاق اور تو کوئی کام نہیں ہے۔“ زہو نے منہ بتایا۔ وہ ہنس پڑا۔

”میری چھوٹی نے ٹپ کرنا ہے اس بار؟“ اس نے اب زنیو کے سر پر چپٹ لگائی جو رٹے لگانے میں مصروف تھی۔

”ان شاء اللہ۔“ وہ بھی پر عزم لہجے میں بولی۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔

”سعد کہاں ہے؟“ اب کے بھانجے کا پوچھا۔ ”سو رہا ہے، اٹھی تو نہ ہی جگاتا۔ پھر تنگ کرے گا، کوئی کام نہیں کرنے دے گا“ زہو نے منع کیا بیٹے کو جگانے سے وہ سر ہلا آیا، میٹھک کی طرف مڑا۔

”کہاں جا رہے ہو؟ ہشتہ تو کر لو۔“ زہو نے پھر پکارا۔

”نہیں کرنا، کرنا ہوا تو خود کر لوں گا۔“ وہ نظر انداز کرنا میٹھک میں آگیا، پھر وہ اونے پر ہی رک گیا۔

ابا کے پاس پندرہ سولہ لوگ بیٹھتے تھے محلے کے۔

بھی رہیں بیٹھ گیا آغا مصوف رہتا تھا کہ کہی موقع ملتا تھا لبا کی خوب صورت باتیں سننے کا وہ سنوں کے ساتھ ان کی جھولی سی فیملی کھل گئی۔ زہرہ پڑی گئی پھر زنبو۔ زہونہ صرف بیٹی بہن گئی بلکہ اس کی سب سے اچھی دوست بھی گئی اور لبا بھی۔ لبا پولیس انسپکٹر تھے مگر ساری زندگی اپنا دامن حرام سے بچا کر رکھا۔ اسی لیے وہ اپنے ہم منصبوں سے بہت پیچھے رہ گئے نہ اچھا کھریا سکے نہ کار نہ بینک بیلنس لیکن اپنے بچوں میں انہوں نے یہی ایمان داری اور خلوص نری اور سلگی کوٹ کوٹ کر بھری دی گئی۔ اس عمر میں بھی وہ اپنے فرائض کی لوائی میں ایسے ہی ہوشیار تھے جیسے جوانی میں کھلے میں ان سے زیادہ کسی کو بھی قتل اعتبار نہ سمجھا جاتا تھا۔ لوگ ان کے پاس آتے اور مسئلے حل کرواتے نہ صرف مسئلے حل کرواتے بلکہ ان کی خوب صورت باتوں سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ وہ کوئی عالم نہیں تھے نہ ہی اسکالر بس ایک سادہ آدمی۔ مگر اس سلگی میں بھی علم کا سمندر چھپا تھا اس کے لبا اس کے آئینہ دل تھے وہ انہی جیسا بننا چاہتا تھا اس وقت وہ ایم ایس سی کیمسٹری کا اسٹوڈنٹ تھا۔ یونیورسٹی سے آکر ایک ورکشاپ پر پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ اپنی پر محلی کا بوجھ خود انھما زندگی بڑی سہل گزر رہی تھی۔

اسے پیچھے بٹھا دیکھ کر لبا چوٹے بھر ساتھ والے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”مگر گناہ کیوں انسان کو اس شدت سے اپنی طرف کھینچا ہے؟ گناہ سے بچنا ناممکن کیوں ہے۔ گناہ سے بڑھ کر کیوں نہیں ملتی؟“ وہ توئی کہہ رہا تھا۔ وہ بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”گناہ ایک فطری چیز ہے اور فطرت سے کون بھاگ سکتا ہے۔“ لبا مسکرا کر بولے۔

”مگر رضوی صاحب مجھ اکیس گے نہیں تو بچیں گے کیسے یہ تو ہمیں جنم میں کھینچ کر لے جائیں گے“ وہ

توئی دیا دلا۔ لبا ب بھی مسکرا رہے تھے۔

”میں سمجھ رہا ہوں احسن صاحب کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ میں بتاتا ہوں آپ کو۔ گناہ نہیں گناہوں یہ آگے رک جانا انسان کو بتائی کی طرف لے جاتا ہے گناہوں یہ آگے ٹھہر جاتا ہے کہ جاتا ہے جنم کی طرف جنم کے تو تقاضے معنی ہی رک جانے کے ہیں۔ جو گناہ کرے پھر توبہ کر کے پلٹ آئے تو یہی گناہ اس کی عظمت کو چار چاند لگا دیتا ہے اللہ کو اس کے لیے رحیم بناتا ہے اور جو گناہ کرے پلٹے ہی نہ۔ مگر ہی نہ دیکھے وہیں ٹھہر جائے تو۔“ لبا سانس لینے کے لیے رکتے۔

”ٹھہر جاتا ہے۔“ رک جاتا ہی موت ہے۔ سانس رک جائے جنم کی موت دھڑکن رک جائے تو دل کی بتائی۔ مومن اپنی زندگی میں کبھی نہیں رکتا گناہ کر کے پلٹ آتا ہے۔ وہ ایک نئی پر بھی نہیں رکتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مومن کی زندگی میں چلنا لکھا ہے موت تک کی مسافت ہے آرام نہیں۔ آرام اور سکون دنیا میں اس کے لیے پہلی ہیں ہاں یہ نعمتیں اسے اخروی زندگی میں پہنچنے کے ساتھ دی جائیں گی۔ آخرت میں اہمیت ہی یہی دالے اعمال کی ہے جس نے ہمیشہ گناہ ہی کیے گناہ بڑھا رہا رک رہا تو پھر یقیناً اس کے لیے ہلوی ہے آگ ہے گناہ کا دنیا میں بھی جلتا ہے اس کا ضمیر اسے جلاتا ہے وہ آخرت میں بھی جلتا ہے۔ جلتا اس کا مقدر ہے۔“ ان کی آنکھیں اب نم ہو چکی تھیں ہر کوئی عقیدت سے انہیں دیکھ رہا تھا اور وہ فخر سے دیکھ رہا تھا۔ اسے فخر تھا کہ وہ عرفان رضوی کا بیٹا تھا۔ ایک عام مگر ایماندار پولیس انسپکٹر کا کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ لوگ نکلتے چلے گئے پھر صرف وہ اور لبا رہ گئے کمرے میں۔

”کچھ دیر اور آرام کر لیتے تم ایک دن ہی تو ملتا ہے تمہیں چھٹی کا“ لبا فکر مندی سے بولے۔ رات گئے تو وہ تھا کاہارا آتا تھا صبح سویرے پھر چلا جاتا تھا۔

”آرام کرنا بتائی ہے رک جانا موت ہے مومن کی زندگی میں چلنا لکھا ہے لبا“ وہ چمکتی بھوری آنکھوں

گئی۔ کیا وہ رہا تھا؟
 ”اے لوگو جو اپنی جانوں پر قلم کر بیٹھے ہو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا“ آنسوؤں میں تیزی آگئی تھی۔

”بے شک اللہ سارے ہی گناہ معاف کرتا ہے“
 اب کے اس کے منہ سے سسکی نکلی۔ وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اسے دیکھ رہی تھی اس کی بند آنکھوں سے بے تحاشا نکلنے آنسوؤں کی جھڑی دوکھ رہی تھی۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ اس کے ہونٹ میل رہے تھے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا فاطمہ قریب ہوئی۔

”ال۔۔۔ ال۔۔۔ ال“ وہ لاشعوری طور پر بول رہا تھا۔ بے خبری کی حالت میں سر ہل رہا تھا۔

”ال۔۔۔ ال۔۔۔ اللہ۔۔۔“ اب کے اس کے منہ سے سسکی کر اللہ نکلا تھا۔ اتنا درد اتنا کرب تھا اس کی سسکی میں یوں جیسے کوئی پوری شدت کے ساتھ اللہ کو پکار رہا ہو۔ فاطمہ پھٹی آنکھوں کے ساتھ اس کے منہ سے نکلے الفاظ سن رہی تھی۔

”اللہ۔۔۔ اللہ۔۔۔“ سسکیوں کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر الفاظ نکل رہے تھے۔ اتنا برا مجرم وہ رہا تھا، وہ کہہ بھی کیا رہا تھا؟ پکار بھی کس کو رہا تھا۔ بے یقین کی پیچھے ہٹی پھر ڈاکٹر وہاب کو بتانے بھاگی۔

ڈاکٹر وہاب نے اس کے ہوش میں آنے کی خبر سننے ہی اسے دسرے کمرے میں شفٹ کروانے کے آرڈر دیے، ایک بار پھر سخت سیکورٹی میں اسے شفٹ کیا گیا۔ اب وہ اکیلا ایک کمرے میں تھا۔ ڈاکٹر وہاب اور ڈاکٹر سعید اکٹھے اس کے کمرے میں آئے تھے۔ اس کا جسم شدید زخمی حالت میں بھی بستر میں جکڑا ہوا تھا مگر بھاگ نہ سکے ان کے آنے پر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا کیا تھا ان آنکھوں میں؟ صرف سرد مہر۔ اتنی سرد مہر، فاطمہ کو لگا کہ جسم ہی جائے گی بالکل بے تاثر آنکھیں نہیں ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ نظریں دوبارہ چھت پر جم گیا۔ چہو بھی آنکھوں کی طرح بے تاثر تھا۔ نہ تکلیف کے آثار تھے نہ بے زاری کے۔

”کیسا محسوس کر رہے ہو اب؟“ ڈاکٹر وہاب نے

کے ساتھ مسکرایا۔ اب ہولے سے ہنس پڑے۔ انہیں خبر تھا کہ وہ اچھا اسٹوڈنٹ تھا، سبق جلدی یاد کر لیتا تھا پڑھایا ہوا۔ اب بھی وہ ان کی بات سن رہی ہوتی تھی۔

”شہروز حناں آیا ہے تم سے ملنے“ زہرو کی آواز پر وہ چونکا پھر رہا تھا۔ جہاں حناں جرتل ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

”کیا خیال ہے بتائیں لو اس آج“ حناں کے کہنے پر وہ مسکرایا۔

”چلو آؤ“ وہ رضامند ہوا مگر جیسے زہرو آگئی۔ ”پہلے ہشتہ کر لو تم اور تم بھی حناں۔ مجھے پتا ہے تم نے بھی نہیں کیا ہو گا“ زہرو کے کہنے پر وہ دونوں ہنس پڑے۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ“ میں نے واقعی ہشتہ نہیں کیا۔ اس نے من لیا۔ زہرو مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی ہشتہ لگانے۔



آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا تھا اسے، تھریشن کے ایک گھنٹے بعد وہ اب بس بے ہوش تھا۔ پولیس اب بھی وارڈ کے باہر تھی۔ فاطمہ گاہ بے گاہ چکر لگا رہی تھی۔ اس وارڈ میں بلیک اینگل کے علاوہ وہ اور مریض تھے دونوں کو ما میں تھے۔ فاطمہ اندر آئی تو کیا ڈور تلاوت لگا رہا تھا۔ یہ روز کی روٹین تھی مگر دونوں کمرے میں گئے مریضوں کو روزہ کھنے قرآن پاک کی تلاوت سنائی جاتی تھی۔ فاطمہ، بلیک اینگل کا ہڈی ٹیپ کر دیکھنے لگی جو نارمل تھا مگر وہ ہوش میں نہیں آ رہا تھا۔ سورہ الزمر کی تلاوت شروع ہوئی تو بلیک اینگل کے جسم کو جھٹکا گیا۔

”ابن اللہ بخل الذنوب جہیما“ اب کے اس کے جسم میں حرکت شروع ہو گئی۔ فاطمہ نے بے اختیار طویل سانس لیا۔ شکر ہے وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ اس نے جبکہ کر اس کی آنکھوں کو کھولنا چاہا مگر اب کے وہ خود جھٹکے سے جھجھکے ہو گئی۔ بند آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر پھیل رہے تھے۔ وہ ساکت ہو

نہی خوب صورت مسکراہٹ۔ وہ حیران کھڑی اسے مسکراتا دیکھ رہی تھی۔ بولا اب بھی نہیں تھا صرف مسکراتا تھا ایس بی کی ہاتھ پہ۔ شاہ زیب حسن پھر تپ کیا تھا اسے مسکراتا دیکھ کر۔

"دیکھ لوں گا تمہیں میں" جھٹکے سے کہہ کر وہ مڑ گیا۔ "عزہ سلام کہہ رہی تھی تمہیں ایس بی" وہ بول رہا تھا طنزیہ مسکراتا ہوجا۔ باہر جا تا شاہ زیب حسن تپ کر مڑا تھا اس کا چہرہ اور آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئی تھیں۔ مگر آنکھوں کی سرخی میں عجیب سی بے بسی تھی پھر وہ کسی سرخ آنکھیں لے باہر چلا گیا۔ اس کے وہ بولا تھا تو شاہ زیب حسن نہیں بولا تھا۔ فاطمہ اب بھی حیران کھڑی تھی اس کو ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس کا۔ ایس بی کا۔ اس نے دوبارہ اسے دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ چمکتی سمجھوری آنکھیں اس پر جمی تھیں، پہلی والی سرد مہی نہ آنکھوں میں کسی نہ چہرے پر۔ پل سی ہو کر آنکھیں جھکا گئی۔

"مجھے سوتا ہے ڈاکٹر! مجھے نیند کا انجکشن لگاؤ۔"

رعب سے بولا۔
"سوری! ابھی ہم آپ کو انجکشن نہیں لگا سکتے۔"
وہ بھی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ جواباً "وہ اسے گھورنے لگا۔ مگر وہ آنکھ نہیں ملا رہی تھی اسے اعتراف تھا کہ سامنے لیٹے بندے کی آنکھوں میں دیکھنا ایک مشکل کام تھا۔

"کیوں نہیں لگا سکتیں آپ؟" ایک اور سوال کیا تھا۔ فاطمہ کو غصہ آگیا۔ مجرم ہو کر ایسے شفا رہا تھا جیسے پرائم منسٹر کا بیٹا ہو اور ہسپتال اس کے باپ کا ہو۔
"نہیں لگا سکتے بس۔ اور ڈاکٹر میں ہوں" آپ نہیں۔ مجھے پتا ہے کہ آپ کو کیا لگاتا ہے کیا نہیں۔ ایس تختی سے آدڑ سے آپ کا خیال رکھنے کا اور نہ تو آپ جیسے قابل نفرت لوگوں کو تو دل کرتا ہے ہمیشہ کی نیند سلا دل۔" وہ تڑخ کر بولی۔ جواباً "مقاتل کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ بڑی پتا دینے والی مسکراہٹ تھی یوں جیسے وہ اس کی بے بسی پر ہنس رہا ہو۔ پادشہ کیج کیا ہر نکل گئی۔

پرفیشنل لہجے میں پرچھا۔
کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ چپ تھا یوں جیسے سنا ہی نہ ہو۔

"دیکھو! بتاؤ ہمیں کہ کیا محسوس کر رہے ہو ناگہمیں پتا لگے کہ تمہیں کتنی دیر لگے گی ٹھیک ہونے میں؟" ڈاکٹر سعید نے آگے ہو کر اسے ہلایا۔ اس نے اب بھی جواب نہ دیا۔ منہ پہ "نولٹ" کا بورڈ لگا تھا۔ تینوں ڈاکٹرز نے ایک دوسرے کے ساتھ نظروں کا جھلکا کیا پھر تینوں نے ہونٹ سمجھنے لیے۔

دردانہ کھول کر ایک جویہ سا شخص اندر داخل ہوا ایس بی شاہ زیب آگے والے نے اپنا تعارف کر لیا اور ڈاکٹر وہاب سے تفصیل پوچھی۔

"اس کا منہ کھلوانا میرا کام ہے ڈاکٹر! یو ڈونٹ وری۔ آپ جاسکتے ہیں جو میں آن ڈیولپ سے وہ بے شک موجود ہے بلیقی آپ آرام کریں" ایس بی مسکرا کر بولا تو ڈاکٹر وہاب اور ڈاکٹر سعید باہر چلے گئے۔ فاطمہ وہیں رہ گئی کیونکہ وہی آن ڈیولپ تھی۔ شاہ زیب حسن نے ایک نظر اس دھن دھن سی لڑکی پر ڈال لیا۔

"آپ کی ڈیولپ ہے یہاں؟" وہ نرمی سے بولا۔
"جی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ وہ سر ہلاتا بلیک ایگل کی طرف مڑا۔ جواب بھی ہمت پر ہی دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو ایگل! آخر کار میں نے تمہیں پکڑ ہی لیا۔ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں، کبھی نہ کبھی مجرم تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ صبح کہہ رہا ہوں میں؟"
ایس بی طنزیہ لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ فاطمہ چپ بیٹھی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ بلیک ایگل نے ہمت سے نظر ہٹا کر ایس بی پر ڈالی پھر بولے بیٹا منہ پھیر لیا۔ ایس بی کا منہ اس بے عزتی پر سرخ ہو گیا تھا۔

"بولیں گے تو تمہارے فرشتے بھی سلاں ہیں پھر تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پھر جہاں ہم تمہیں لے کر جا میں گے جہاں پر لوگ تو کیا ان کی بد میں بھی بول اٹھتی ہیں۔" وہ صے میں چلا رہا تھا۔

بلیک ایگل کے چہرے پر بد مہری مسکراہٹ بکھر گئی۔

کہینہ۔ دلی ہی دل میں اسے گلیاں دیتی نہ کاسن
ردم کی طرف آگئی۔

”ششروز۔“ بابا کے پکارنے پر وہ مڑا۔
”جی بابا۔“

”بابو کے گھر تک چلو گے میرے ساتھ؟“ بابا کے
پوچھنے پر وہ حیران ہوا۔

”بابو؟ وہ غنڈہ۔“ آپ کیوں جا رہے ہیں وہاں؟
اجھا آوی نہیں ہے۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا
مگر بابا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل گئے
تھے۔

”تم کہے کہہ سکتے ہو کہ وہ اجھا آوی نہیں ہے کیا
مند ہے تمہارے پاس؟“ وہ ناگواری سے بولے۔
شہروز شرمندہ ہو گیا۔

”اس کی شہرت اچھی نہیں ہے بابا۔“ اس نے
آہستگی سے کہا اور وہ صحیح کہہ رہا تھا، محلے میں اس کی
کاروائیاں مشکوک تھیں۔ پتا نہیں کیا کام کرتا تھا کیا
نہیں؟ ریتا خوب ٹھانٹا باٹ سے تھا۔ دوبارہ گرفتار ہو کر
اباکی ہی جیل میں گیا تھا۔ پھر بھی بابا؟

”شہرت تو پولیس کی بھی اچھی نہیں ہے۔ تو پھر تو
میں بھی اجھا آوی نہیں کیوں کہ میں پولیس والا ہوں۔“
بابا نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ ہونٹ پیچ گیا۔

”وہ بیمار ہے۔ سڑاج پرسی کرنے جاتا ہے۔ جب
عیادت کے لیے جاتے ہیں تو مریض کی عیادت نہیں
دیکھتے، حالت دیکھتے ہیں ایک مسلمان کی عیادت
دوسرے مسلمان پر اس کا حق ہے اور جو حق نہ دے وہ
لوگ اللہ کو پسند نہیں۔“ اب کے وہ نرمی سے سمجھا
رہے تھے۔ مسکرا دیا۔

”چلیں بابا۔“ اس نے سر ہلا کر رضا مندی دی اور
ساتھ چل پڑا۔ بابو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔
”اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ بابا نے کھٹار کر
سلام کیا۔ بابو حیران سا انہیں بٹھارہا تھا۔
”کیسے ہو میاں؟“ بابا نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں رضوی صاحب۔“ آپ یہاں؟
معاف کیجئے گا، مجھے آپ کے آنے کا مقصد سمجھ نہیں
آتا۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ابا مسکرا دیے۔

”وردی کے بغیر آیا ہوں تو بتا کسی مقصد اور مطلب
کے آیا ہوں۔ مقصد تو وردی دیتی ہے۔ ہم تو تمہاری
طبیعت کا محل پوچھنے آئے تھے سنا ہے بیمار ہو؟“ بابا نے
نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ بابو کے چہرے پر تلخ
مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میرا محل؟“ اتنی کرم لوازی اور محبت ہم جیسے لوگوں
کو اس نہیں آتی۔ ہمیں ہماری اوقات میں ہی رہنے
دیں۔

ہمارا تذکرہ چھوڑو، ہم ایسے لوگ ہیں جن کو نفرت
کچھ نہیں کہتی محبت مار دیتی ہے۔“
بابو کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

”ایسے نہیں کہتے بابو؟“ بابا نے اسے روکا پھر ہاتھ میں
پکڑا ڈبہ اس کی طرف بڑھایا۔ بابو نے سوالیہ نظروں
سے دیکھا گویا پوچھ رہا ہو یہ کیا ہے؟

”کھانا ہے اس میں گھر کا بنا ہوا۔ بیماری میں باہر کا
کھانا کھانا ٹھیک نہیں اور تم ہو بھی اکیلے گھر کھانا
بنانے والا بھی کوئی نہیں۔ اسی لیے میں لے آیا۔“
انہوں نے ڈبہ اس کے پاس رکھا۔ بابو ایک لمبے لمبے
ساکت ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں واضح کمی لا ڈھنگی
جیسے فوراً چھپا گیا۔

”شکریہ“ اس نے کہہ کر آہستگی سے تمام لیا۔
”آپ تو دشمنی بھی پیار سے نبھاتے ہیں؟“ اب کے
وہ مسکرا کر بولا۔ بابا ہنس پڑے۔ اس سارے عرصے میں
وہ خاموش بیٹھا دونوں کو دیکھتا رہا تھا۔

”الوسوس میں آپ کی خاطر داری نہیں کر سکتا مگر
جائے بنا سکتا ہوں۔ وہی بتا لیتا ہوں۔“ بابو اٹھ کھڑا ہوا۔
”نہیں بابو ہمیں ہم ملتے ہیں۔ میرا بیٹا ہے میں اس
کے پاس دقت نہیں ہو مازیا۔“ بابا کی باتیں۔ اللہ
سمجھتے سمجھتے پاگل ہو جائے گا شاید۔ بابو نے ایک نظر
بیٹے پر بھی ڈالی، ”نوجوان، کھڑی ناک یوں جیسے کوئی
شہزادہ ہو۔“ باپ کی نسبت بیٹے کے چہرے پر عجیب سی

معاذ نے قاتلہ کی طرف اشارہ کیا۔

”ہیں؟ کون الونینسٹ ڈیول؟“ وہ چونکی۔
”نئی بلیک ایگل۔ معصوم شیطان نیوز تو صبح ہی آ رہی تھی کہ وہ شدید ترین زخمی حالت میں شہی ہسپتال ہی لے جایا گیا ہے“ معاذ نے وضاحت کی تو اس نے طویل سانس لیا۔

”ہاں ہمارے ہسپتال میں ہی ہے۔ میں بھی تھی آپریشن روم میں جب آپریشن ہوا۔“ اس نے بتایا۔
”لو، تمہیں کیا ضرورت تھی پتہ لگنے کی۔ دوسری رہو ایسے لوگوں سے کہہ دینا اپنے ڈاکٹروں کو کہ میں نہیں کرتی ایسوں کا علاج“ اہل پھر شروع ہو گئی تھیں۔ وہ اور معاذ دونوں مسکرا رہے۔ ابھی تو اس نے اہل کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے گھرے میں ڈیوٹی پر بھی وہی تھی۔ ہاں معاذ کو اس نے بتا دیا تھا مسیح کر کے۔ یہ اس کی اور معاذ کی پرانی عادت تھی جب بھی انہوں نے بات کرتی ہوتی اور اہل پتہ لگاتے ہوتے تو وہ ایک دوسرے کو مسیح پہ بتانا شروع کر دیتے۔

”بی کیئر فل۔“ معاذ کا اسمائل کے ساتھ رپٹائی آیا۔

”سنا ہے اس کی شکل بہت معصوم ہے۔ اس لیے اسے معصوم شیطان کہتے ہیں۔ کیا واقعی؟ ایسا ہے؟“ معاذ کا اگلا مسیح آیا۔

”ہاں۔ واقعی۔“ اس نے جواب دیا۔
”کیا مجھے دیکھنے دو گی اسے؟“ اس کا اگلا مسیح آیا۔

”نہیں، وہاں تو میڈیا کو آنے کی اجازت نہیں۔ تم کیسے آ سکتے ہو۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم پک بنا لینا اس کی کل“ معاذ نے نئی ترکیب بتائی۔

”اوکے کل جب سوئے گا تب بہانوں گی۔“ اس نے جواب دیا۔

”گھر آ کر تو اس موئے کی جان چھوڑ دیا کرو، کم بخت ہر وقت انگلیاں اسی میں گھسائے رکھتے ہو“ اہل

بے نیازی تھی عجیب سی کشش۔

”اچھا بابو۔ خدا حافظ خدا تمہیں صحت مند کرے اپنے لیے۔“ انہوں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ شہروز نے بھی لبا کی تقلید کر کے ہاتھ ملایا، وہ ہر کام لبا کی تقلید میں کرتا تھا۔ اس سے ہاتھ ملا کر بابو کو لگا جیسے کسی پتھر سے ہاتھ ملایا ہو، بڑے سخت ہاتھ تھے۔ اس نے بغور شہروز کو دیکھا، ہاتھوں جیسی تختی، ہر محل چرے پر نہیں تھی مگر اپنے باپ جیسی نرمی بھی نہیں تھی اس کے چہرے پر۔

رات کو وہ گھر لوٹی تھی۔ عید کا سارا دن ہسپتال میں گزر گیا تھا۔ گھر آتے ہی وہ پلا سے لپٹ گئی تھی پلا نے اس کا سر جوا تھا۔

”اگیا میرا بیٹا“ انہوں نے اسے ساتھ لگایا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی کمال بھی آگئیں۔

”گھر لا اپنے ہسپتال والوں سے، کم بخت عید کے دن تو چھٹی دیا کریں۔ لے کے میری بیٹی کی ڈیوٹی لگادی آج بھی“ اہل شروع ہو گئی تھیں۔ ابھی تو معاذ کی گورنمنٹیاں ہلتی تھیں وہ اور پلا اس بڑے تھے۔

”سچ تو کہہ رہی ہیں اہل، آج پہلی عید تھی جب میں نے تمہارے بیٹا کھیر کھائی، مڑا آگیا قسم سے تمہارا حصہ کھانے کا بھی“ سیریس لہجے میں کہتا کہتا آخر میں وہ پھر شرارتی ہو گیا تھا۔ قاتلہ نے بیگ کھینچ کر اسے دے مارا۔ دونوں جڑواں تھے، بنتی بھی خوب تھی آپس میں لور لڑائیاں بھی خوب ہوتی تھیں۔ معاذ انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ اہل اب کھیر لے آئی تھیں اس کے لیے سلائیڈ دیکھ رہے تھے۔

”بڑی کل دعا کرت ہوگی ہے۔ عید کے دن کا بھی لحاظ نہیں۔ دل نہیں پتھر ہیں پتھر لوگوں کے پاس“ ساتھ ساتھ بیٹو بھی ہاور ہا تھا۔

”شکر ہے کچھ تو کام کیا ہماری پولیس نے بھی“ پلا نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

”تمہارے ہسپتال میں ہے اہل یہ انونینسٹ ڈیول“

دونوں کو سبائکل پر جھکا دیکھ کر غصہ ہوئیں۔ ان دونوں نے فوراً "سبائکل آف کیے" ایک دوسرے کو دکھا پھر ہنس پڑے۔



جسے کر کے دل کو دکھ نہ ہو مجھے اس گناہ کی تلاش ہے۔

"سی" اس کے منہ سے سکاری کی لکلی۔ نرس ڈرپ کی سولی اس کے ہاتھ پر لگا رہی تھی۔ بھی وہ اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی نرس نے سلام کیا۔ وہ سر ہلاتی آگے آگئی۔

"کیا چویشن ہے؟" اس نے نرس سے پوچھا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑی فائل دیکھنے لگی اٹھا کے جس میں اس کے ہوئے میسنوں کی رپورٹس تھیں۔
"نائن ہے میڈم" "نرس" ہارٹ بیٹ "بلڈ پریشر" ایوری تھنگ؟ "اس نے پوچھا۔

"لیس ڈاکٹر۔" نرس نے سر ہلایا۔ فائل نے اس کی طرف دیکھا ہے زار سالیٹا ہوا تھا۔
"کیسا لیل کر رہے ہو؟" فائل لب اس سے مخاطب ہوئی۔

"یہ کسی کو بھی جواب نہیں دیتا ڈاکٹر" بولتا ہی نہیں ہے۔ رات ڈاکٹر عدنان تن ڈیوٹی تھے انہوں نے بہت سر کھایا مگر نور پالس "اس کی بجائے جواب نرس نے دیا۔ فائل نے گھور کر اسے دیکھا ڈراے باز کہیں کا۔ کل تک تو بول رہا تھا "مسکرا رہا تھا اس کے سامنے۔

"بند کرو ڈراے بازی اپنی" "ترخ کر رہی۔ معصوم شیطان نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا "آنکھوں میں شرارت تھی۔ یوں جیسے چھیڑ رہا ہو کہہ رہا ہو تم بلاؤ گی تو بولیں گا ورنہ نہیں۔

"بتاؤ کیسا قیل کر رہے ہو ورنہ تو نہیں ہو رہا ناگوں میں؟" فائل نے چڑھتی آنکھوں سے۔

"ہو رہا ہے" وہ آرام سے بول پڑا۔ نرس نے حیران ہو کر اسے دیکھا پھر فائل کو۔ کل ساری رات ڈاکٹر عدنان نے کوشش کر لی تھی وہ نہیں بولا تھا۔

"کتنا ہو رہا ہے؟" کھنچاؤ محسوس ہو رہا ہے الٹی سی ہو رہی ہے؟ یا اری ٹیشن؟" فائل آگے ہوئی اس کے قریب۔

"کھنچاؤ" وہ سکون سے بولا لگ تو نہیں رہا تھا کھنچاؤ کہیں سے فائل نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ چہرے پر نوکنت کے آثار بھی نہ تھے۔

"میں بچ بول رہا ہوں" وہ گویا اس کا چہرہ بڑھ گیا تھا۔ آنکھوں میں اب بھی شرارت تھی۔ کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ یہاں سے فائل کے بھی تو پچاسی ہی چڑھتا تھا اس نے پھر بھی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ نہ ہی خوف وہ چپ چاپ اس کے ٹانگہ دیکھنے لگی۔

"ابھی تازہ تازہ ہیں میں۔ جیسی تکلیف ہو رہی ہے۔ ہو جا میں کے ٹھیک۔" فائل نے تسلی دی۔

"میری باڈی کیوں کلہا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"بجڑموں کو باندھ کے ہی رکھا جاتا ہے" وہ ترخ کر بول۔ بھلا یہ بھی پوچھنے والی بات تھی۔ اوپر سے کم سخت ایسی معصومیت سے پوچھتا "واللہ پیار آتا تھا وہ مسکرا دیا تھا جواب سن کر۔

"ذخیوں کو تو باندھ کے نہیں رکھا جاتا" مسکراتے ہوئے پوچھا۔ فائل نے گھورا "مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ٹانگوں پر گڑھے ابھر رہے تھے وہ میری ہو گئی ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے قدیم دور میں چلی گئی ہو یوں جیسے سامنے کوئی یونانی دیوتا کھڑا ہو اور وہ ایک عام سی بچان جو کچھ نہ بول سکے۔

وہ سحر زدہ سی دیکھ رہی تھی۔ مقابل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ تو ہاتھ کچھ کے مسکرا کر ہی جیت گیا تھا گوھر سے سارے ہتھیار آنا کر بھی وہ بار گئی تھی۔

"دائیں آجا میرا۔" بلا آخر اس نے کہا تو وہ جھٹکے سے حواسوں میں لوٹی۔ آنکھیں اس کی آنکھوں سے ملیں "اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں اپنی جگہ پر۔ وہ شرمندگی سے آنکھیں چرا گئی۔ باندھنے کی بات کرتے کرتے وہ باندھ گیا تھا اسے۔

"پولیس کھڑی ہے باہر؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ قاتل نے خود کو کمپوز کیا۔ وہ اسے جواب دینے کی پابند نہیں تھی۔ وہ انجکشن لگا رہی تھی۔

”میں سونا نہیں چاہتا“ وہ انجکشن دیکھ کر منہ بنا رہا تھا۔ غرے غرے تو دیکھو سرکار کے اٹھ کر جیل جانا تھا اور غرے لیسے تھے جیسے صدر مملکت کی سیٹ پر بیٹھنا ہو۔

”تمہارے چاہنے پانا چاہنے سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔“ وہ فحشہ ہوتی۔ کچھ دیر پہلے ہونے والی شرمندگی کا فحشہ نکل رہا تھا۔ وہ سب سمجھ رہا تھا، چہرہ خاموش تھا، آنکھیں پل رہی تھیں، سر گوسیلیں کر رہی تھیں کہ میں جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ غافل ہو گیا تھا، بے خبر۔ وہ چپ چاپ کھڑی اس معصوم شیطان کو دیکھتی رہی۔ سوتے میں تو اور بھی معصوم لگ رہا تھا۔ چہرے پر وہی انڈی سکون، نہ ڈر نہ خوف۔ اس نے ایک نظر ہولی دروازے پر ڈالی پھر آہستہ سے سواگل نکل کر کہو تن کیا اور تصویر بٹل۔ پھر فوراً کمرے سے نکل گئی۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔



”آج ریل نہیں جاتا تم نے؟“ وہ یونیورسٹی کے گروٹھ میں بیٹھا تھا جب حنن نے اس کا شانہ ہلایا۔

”جانتا ہے۔“ اس نے فوراً کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ریل میں داخل ہوتے ہی لڑکیوں کی خود پراختی نگاہیں دیکھ کر وہ نظریں جھکا گیا۔ البتہ حنن کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھیر گئی۔ اسے اس سب میں کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پروفیسر ساجد پریکٹیکل کے متعلق ہدایات دے رہے تھے، وہ لکھنے لگا۔ بھی باہر سے فائرنگ کی توانوں نے سب کو چیختے پر مجبور کر دیا۔

”سائنس، سائنس، پلیز۔“ پروفیسر نے ڈیمک بجایا۔ ایکشن کلور تھا یونیورسٹی میں روزی بے ہنگامے ہوتے تھے۔ بھی فائرنگ کے ساتھ نسوانی چیخیں بھی سنائی دیں مگھاس میں خاموشی چھا گئی۔ اب کہ نسوانی چیخیں بلند ہوئیں تو وہ خود کو روک نہیں سکا، ہین

پھینک کر بھاگ گیا ہر۔

”شہروز، شہروز، رک جاؤ“ پیچھے سے مختلف آوازیں آتی مگر اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ اسے لپا کی بات یاد تھی بس۔ لپا کا کرتے تھے ”جب بیٹیاں“ نہیں، ٹائیں تکلیف میں ہوں تو ہر مرد کا فرض ہے کہ قاتل بن جائے۔“ وہ تیزی سے ڈیپارٹمنٹ سے نکلا۔

وجاہت ڈوگر اور اس کے کارندے کھینچ رہے تھے اس لڑکی کو کار میں۔ کوئی انہیں روکنے والا نہیں تھا، اس حلقے کے ایم این اے کا بیٹا تھا آخر۔ یونیورسٹی والوں کی کیا جیل اسے روک سکیں۔ اس نے آگے ہو کر ایک جھٹکے سے لڑکی کا بازو کھینچ کر پرے کیا اور گردناٹا چما گیا۔ وجاہت اور اس کے بندے آنکھوں میں خون لیے اس کی طرف مڑے، وہ لڑکی ایک طرف کھڑی تھی، دھڑک رہی تھی۔

”میرے راستے سے ہٹ جاؤ شہروز ضوی۔“ وجاہت پھنکارا۔ شہروز نے فوراً عمل کیا، راستے سے ہٹا، مڑا اور لڑکی کا بازو پکڑ کر چلتے لگا، مگھاس نے مگھاس نکلی مگر وجاہت نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”رک جاؤ“ وہ چیخا۔ شہروز رک گیا۔

”میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں شہروز۔“ ہنر ہے تم جاؤ یہاں سے۔“ وجاہت نے دوبارہ دھمکی دی۔ اس سے پہلے کہ شہروز کچھ کہتا، وہ لڑکی مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ کر شہروز کے پیچھے ہو گئی۔

”اس سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟“ شہروز نے اپنے پیچھے کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”اسی سے پوچھو“ وہ آہستہ سے بولا۔ شہروز مڑا، لڑکی رو رہی تھی۔

”تم بتاؤ وجاہت۔“ وہ نہیں بتائے گی، ہمارے ہیں لڑکیوں سے تحقیق اور تفتیش نہیں کی جاتی“ وہ دوبارہ وجاہت کی طرف مڑا۔ اب کہ اس کے چہرے پر چنانوں والی سختی تھی وجاہت نے ہیل پڑ گیا۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو شہروز! میں ہنگاموں کا قاتل نہیں۔ مگر یہ لڑکی، چھ ماہ اس نے مجھے اپنے جیل میں پھنسائے رکھا، مجھے لونی رہی مگر میں اس کے

بولوں نے بھلائی تھی۔ وجاہت کو صبح رات دکھانے والا مل گیا تھا، جسے آگ بجھ گئی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ شہزاد کو یہ آخری بات نہ سمجھ میں آئی تھی اور نہ ہی اس کا دھیان کیا تھا۔ کہ بدلے کی آگ اکیلے بجھائے نہیں جھکتی۔



عید کا تیسرا دن تھا اور اس کا ہسپتال میں تیسرا دن تھا۔ آج بھی اس کے کمرے کے باہر پولیس کی بھاری نفری تھی۔ ڈاکٹر عدین ابھی ہسپتال پہنچ کر کے گیا تھا اور وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔

”ڈاکٹر کب آئیں گی؟“ اس نے سسٹر سے پوچھا۔
”نرس نے منگوا کر ہو کر اسے دیکھا۔“
”کون ڈاکٹر؟“ نرس نے پوچھا۔

”وہی جو سال ہوئی ہیں صبح کے ٹائم۔“ اس نے کہا۔

”اچھا۔ ڈاکٹر کا نام وہ بس آتی ہی ہوں گی۔“ نرس کے کہنے پر اس نے سر ہلایا مگر پیام سن کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ ”جی ہاں آگئی تھی۔“
”دروازہ کھول کر۔“ پیچ ٹکر کے سوٹ میں وائٹ لائبرر کل بنے ”سر۔“ وہ پتہ لڑھے آسمان سے اتری جو رنگ دہی تھی۔ اس کے چہرے پر جھلکی بے زاری نورانی ہو گئی۔
”فریش ہو گیا تھا اسے دیکھتے ہی۔ آتے ہی وہ اس کی بغیر دیکھنے لگی۔ پھر مڑی۔“

”ڈاکٹر عدین نے وہ تبدیل کی ہے؟“ وہ سسٹر سے پوچھ رہی تھی۔

”جی ڈاکٹر۔“ سسٹر نے سر ہلایا۔ وہ چپ چاپ وہ اسے دیکھنے لگی۔

”کیا ابھی وہ اس سے آرام مل رہا ہے تمہیں؟“
اب کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ نہیں پرے اختیار مسکرا دیا۔ جتنے بھی ڈاکٹر آئے تھے، کبھی کہتے تھے۔ بڑی دیر سے ”تم“ کہتی تھی۔

”ہوں ہو رہا ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔
اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اسی

ساتھ لہو تھا۔ تم مجھے بھی جانتے ہو میں، میں قرٹ نہیں ہوں۔ میں نے کبھی کسی لڑکی کے ساتھ قرٹ نہیں کیا، میں اس کے ساتھ لہو تھا۔ حالانکہ یہ اسٹینس میں میرے ہم پلہ نہیں تھی، پھر بھی میں کھٹمنٹ بھاتا رہا اور یہ یہ چھ ماہ بعد کہہ رہی ہے مجھے بھول جاؤ، میرا تو لکھ ہو چکا ہے اپنے کزن کے ساتھ۔
چھ ماہ اس نے میرا تماشا بنایا، میرے جذبات کے ساتھ گھمایا۔ خود کو تماشا بنانے والوں کو نہیں جھوڑا میں۔
وہ چیخ رہا تھا۔ لڑکی تمہارے کنب رہی تھی۔ ہر طرف سکوت طاری ہو گیا تھا۔ شہزاد نے ایک طویل سانس لے کر لڑکی کو دیکھا، پھر آگے پرہ کر وجاہت کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کل ڈاکٹر اس نے آہستہ سے کہا۔ مگر وجاہت اب بھی ہلال پیلا ہو رہا تھا۔

”معافی، سترن انتقام ہے وجاہت۔“ طے جانے سے اس نے کہا۔ وجاہت نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے کیا اور چلا گیا۔ سب حیرانی سے شہزاد کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ دیکھنے بٹار کی طرف متوجہ ہوا۔

”لڑکیاں غور ہوتی ہیں اپنا بھی، اپنے گھر والوں کا بھی۔ افسوس اس غور کو وہ خود توڑ دیتی ہیں۔ چلو گھر آئے۔“ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر اسے ساتھ لے کر چلنے لگا۔ پھر رکشہ کرا کر اسے بٹھایا اور لوٹ آیا۔ محمد بن قاسم بننے کے لیے ضروری تو نہیں تھا کہ نیک بیٹیوں کی پکار پر ہی جایا جائے۔ بیٹیاں تو بیٹیاں ہوتی ہیں۔ اسے آج کم از کم لبا کی یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ بیٹیاں، بیٹیاں ہی ہوتی ہیں چاہے غلط ہوں چاہے صحیح۔ ابن آدم کا حق ہے کہ وہ ان پر نرمی کرے۔ ایک اور بات جو اس کی سمجھ میں آئی تھی وہ یہ کہ ہمیشہ ابن آدم ہی غلط نہیں ہوتا۔ وجاہت اس کا کلج فیلو رہا تھا کہ اب وہ فزکس میں تھا اور شہزاد کیمسٹری میں۔ مگر اس نے پھر بھی ملن رکھا تھا شہزاد کی ملن کر اس کے دل میں اس کی عزت بڑھ گئی تھی۔ ایک اور بات بھی جو سمجھ میں آئے دلی تھی۔ وہ یہ کہ بدلے کی آگ جس میں وجاہت جل رہا تھا، نرمی کے چند

ایک منشا۔
”وہ فائرنگ تمہارا دھیان مٹانے کے لیے ہی کی گئی تھی۔“ شاد زب چلایا۔

”اور تم سارے کے سارے نیچے بھاگ گئے یہی تو پلان تھا ان کا۔ فائرنگ کروا کے تمہارا دھیان ادھر لگا دیا، بھگدڑ مچ گئی اور وہ نکل گیا۔“ وہ مٹھیاں بٹھینچ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بلیک ایگل اس کے سامنے آئے اور وہ اسے کچا چبا جائے۔

”مگر اس کی باڑی تو کلہاڑی پھر وہ؟“ اب کے فاطمہ بولی۔

”ایسے پکس سے رکنے والا نہیں وہ اسے راڈز میں بھی جکڑ دیتے، وہ تب بھی بھاگ نکلتا“ ایس پی ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ فاطمہ جب چاپ پیچھے ہٹ گئی، دل میں یکدم ورنانی سی اتار لی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس بیڈ کو دیکھ رہی تھی جس پر کچھ گھنٹے پہلے وہ لیٹا تھا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر باہر آگئی اور ڈاکٹر فارحہ کو بتا کر گھر چلی آئی۔

”بلیک ایگل بھاگ گیا؟“ اس کے گھر آتے ہی معاذ نے پوچھا۔ وہ یقیناً ”خبریں سن چکا تھا۔“

”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

”تم نے تصویر نہیں بنائی اس کی میں نے کہا تھا جیس؟“ معاذ نے پھر پکارا۔ فاطمہ مڑ گئی، ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر ڈالی اور پھر موبائل پر گرفت سخت کر کے بولی۔

”نہیں میں نے نہیں بنائی۔“ کہہ کر وہ تیزی سے مڑ گئی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے معاذ کے ساتھ جھوٹ بولا تھا مگر وہ کسی کو نہیں جانتا چاہتی تھی کہ اس کے پاس اس کی نوٹو ہے، فی الوقت وہ اسے صرف اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی، صرف اپنے پاس۔ معصوم شیطان کی یہ بھانپنے والی شیطانی اسے اداس کر گئی تھی۔ وہ کیوں اداس تھی اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا نہ ہی اسے اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی غصہ آ رہا تھا۔

سے بچنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اسے ہنسی آ گئی۔ کوشش بھی تو وہ کھوکھو رہی تھی، جب کام ہو گیا تھا۔ اس پر ہونے کے بعد اسیری سے رہائی طلب ہو رہی تھی۔

”مہوں، صبح۔“ وہ بھی بس ہوں ہیں کر رہی تھی۔ پھر چلی گئی۔ وہ طویل سانس لے کر سر نہکا گیا۔ اور وہ نیچے آئی۔

”کیا ہے تمہارا مرض؟“ فارحہ نے اسے کاہن روم میں آ کر دیکھ کر پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ اس سے پہلے کہ فارحہ کچھ اور پوچھتی، فائرنگ کی تیز آوازیں سے وہ دونوں اچھل پڑیں۔ ہسپتال کے کمرائڈز میں زبردست فائرنگ ہو رہی تھی، ہر طرف بھگدڑ مچ گئی تھی، باہر نکلنے کے لیے بلیک ڈور کھول دیا گیا تھا۔ بلیک ایگل کے روم کے باہر موجود ساری پولیس نیچے بھاگی، بالآخر ایک گھنٹے بعد وہ فائرنگ کرنے والے گرفتار ہو گئے تھے دو لوگ تھے اور بھی کاناچ نچا کر رکھ رہا تھا اب کو۔ ان کے پکڑے جانے پر حالات معمول پر لوٹے، بلیک ڈور بند کر دیا گیا، ڈاکٹر زہرا بس اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے، فاطمہ بھی اٹھ کر اوپر آگئی۔ پولیس بھی واپس روم کے باہر آگئی تھی، وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ کمرہ خالی تھا، وہاں کوئی نہیں تھا، بلیک ایگل بھاگ چکا تھا۔

”لغت سے اتنی نفرتی پر لغت ہے۔ ایک بندہ چمکے دے کر بھاگ گیا، اب بھی شدید زخمی حالت میں اور تم کچھ نہ کر سکے، کچھ بھی نہ کر سکے۔“ ایس بی شاہ زب برس رہا تھا، سارے سپاہی سر جھکا کر کھڑے تھے۔ یہ وہی روم تھا جہاں سے وہ بھاگا تھا، ایک طرف ڈاکٹر وہاب، دوسرے سینئر ڈاکٹر ز اور ڈاکٹر فاطمہ بھی کھڑے تھے۔

”مگر وہ نیچے فائرنگ ہوئی تو ہم ادھر بھاگے تو۔“

میں تو ابھی کام کر سکو۔" من کالجہ بھر آگیا تھا۔
 "تم میرا غرور ہو نئی۔" انہوں نے زنیو کا ہاتھ
 چوما۔

"اس غرور کو ٹوٹنے نہ دینا کبھی، بہادر اور اچھی
 بیٹیاں خود کو توڑ لیتی ہیں، ماں باپ کے غرور کو نہیں
 ٹوٹنے دیتیں۔" وہ اس کے آنسو صاف کر رہے تھے۔
 "اور تم میرا ماں ہو شہوڑ۔ غرور ٹوٹنے کا تو اتنا دکھ
 بھی نہیں ہو تا جتنا ماں جانے کا ہو تا ہے۔ میرا ماں نہ
 توڑنا کبھی۔ ایمان داری کو اپنا لوزھنا پھوٹا بنا لیتا۔" وہ
 اب شہوڑ کا ہاتھ چوم رہے تھے۔ پھر وہ اٹھ گئے۔
 "میں زرا زہر سے مل آؤں۔ وہ میری سب سے
 صابر بیٹی ہے۔" انہوں نے کہا اور چلے گئے۔ پیچھے سے
 وہ دونوں ساکت بیٹھے تھے بالکل ساکت۔



"خوش آمدید خوش آمدید۔ حکم یک" سلطان
 نے کھڑے ہو کر اسے گلے لگالیا۔
 "میرا شیر لوٹ آیا ہے، جاؤ سلطان کرو، تاج جشن ہو
 گا یہاں جشن" سلطان دونوں ہاتھ اٹھا کر بول رہا تھا۔
 اس کے چہرے پر پھلی مسرت اور خوش اندھا بھی دیکھ
 سکتا تھا۔ خوش تھا، بے تحاشا خوش۔
 "ابھی تم آرام کرو۔ تمہارے زخم ٹھیک ہو
 جائیں پھر بات کریں گے۔" سلطان نے اس کا شانہ
 تھپک۔

"میری زندگی میں آرام کا لفظ نہیں ہے سلطان۔
 آئندہ میرے لیے یہ لفظ بولنا بھی مت۔" اس کا لہجہ
 سرد ہو گیا تھا۔ وہاں موجود کچھ لوگ اسے رشک، کچھ
 حسد اور کچھ حسرت سے دیکھ رہے تھے وہی تو تھا واحد
 جو سلطان کے آگے بولتا تھا، اور سلطان کبھی برا بھی
 نہیں مانتا تھا۔ سلطان کا لاؤلا تھا۔ لاؤلا شیر۔ اب
 بھی وہ غصہ پڑا تھا۔

"اوتے میرے شیر، چل جا پھر جو تیرا دل کرتا ہے کر"
 اس نے فوراً الفاظ واپس لیے۔ وہ اٹھا، لنگڑا کر چلنے
 لگا۔ لاؤلا قوی ہیکل آدمی اسے سہارا دینے کو بروئے مگر اس



"کیا بات ہے لبا؟ کچھ پریشان ہیں" وہ کب سے
 دیکھ رہا تھا لبا کو یوں خاموش لیٹے۔ زنیو بھی مدتیں مرتبہ
 پوچھ چکی تھی۔

"نہیں بیٹا، انہوں نے تسلی دی۔
 "نہیں کچھ تو ہے۔ کیا ہوا ہے" اب کے زنیو
 بولے۔ وہ دونوں اٹھ کر لبا کے تخت پر آ بیٹھے۔ لبا
 مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔

"جس باپ کی تمہارے جیسی لولاد ہو، وہ پریشان
 نہیں ہوا کرتا۔" انہوں نے دونوں کو ساتھ لگایا۔
 آنکھیں غم ہو رہی تھیں۔

"زہر سے ملنے کا بہت مل کر رہا تھا۔ اسے لے لی
 آتے شہوڑ، انہوں نے کہا۔

"کل لے آؤں گا لبا، فوراً" من گیا۔
 "کل کس نے دیکھا ہے؟" لبا کا لہجہ مدح و تحسین کر
 انہیں دیکھنے لگا۔

"لبا؟ کب ٹھیک ہیں۔" اس نے تڑپ کر کہا۔
 زنیو تو رونے لگی۔

"ارے میری گڑبا بیٹی۔ میری بیٹی تو بہت بہادر ہے
 مل، مدد کیوں رہی ہے؟" لبا نے اس کے سر پر ہاتھ
 رکھا۔ وہ اور شدت سے رونے لگی۔ شہوڑ پریشان ہو
 گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے لبا؟ کچھ تو بتائیں۔" اس نے اصرار
 کیا۔ لبا مسکرا دیے۔

"کچھ نہیں ہوا شہوڑ۔" انہوں نے طویل سانس
 لے کر دبا دبا ہونے کو ساتھ لگالیا۔

"ایک بات یاد رکھنا تم دونوں۔ زندگی میں جو کام
 بھی کرنا پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ کرنا اور
 ایسا کرتے ہوئے کبھی بھی انجام سے مت ڈرنا۔
 انسان کو زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور اصل بات تو یہ
 ہے کہ یہ جو زندگی ہم کو مل رہی ہے، یہ تو خواب ہے۔
 آگے تو مرنے کے بعد کھلے گی، زندگی تو وہاں شروع ہوگی،
 جس میں موت نہیں ہوگی تو کوشش کرنا کہ خواب

”اور تم مجھے پاگل کہہ رہے ہو اپنے متعلق کیا خیال ہے۔“ اب کے وہ اس کی طرف مڑی۔
 ”میں ایک برا آدمی ہوں۔ اپنے متعلق بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔“ وہ کہہ کر سر جھکا لیا۔
 ”تم سے زیادہ اچھا آدمی کوئی نہیں ہے ڈیول۔“
 میں بھی بس اتنا ہی جانتی ہوں۔“ وہ جوں اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔
 ”تیس پی بھی نہیں؟“ اس نے پوچھا۔ اب کہ وہ
 نہیں پڑی۔
 ”نہیں۔“ اس نے قہقہہ دیا۔ اب کہ وہ دونوں
 نہیں پڑے۔
 ”جھولی۔“ اس نے ہنستے ہوئے گلاس تمام لیا۔



”تمہیں کیا ہوا ہے“ اتنی چپ کیوں ہو گئی ہو؟“
 معاذ نے اسے شوکارا۔ ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے خرابی کی
 شام اتر آئی ہو اس پر۔
 ”کچھ نہیں مجھے کیا ہوتا ہے؟“ وہ آہستہ سے بولی۔
 وہ دونوں دی لاؤنج میں بیٹھے تھے، آج اس کا ہسپتال
 سے آف تھا۔ دونوں لیٹ انٹے تھے اور ناشتہ کر کے
 بیٹھے تھے۔
 ”کچھ تو ہوا ہے؟ تم کبھی اتنا چپ نہیں رہتیں۔“
 معاذ بھائی ہی نہیں دوست بھی تھا۔ رگ رگ سے
 واقف۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔
 ”کچھ نہیں ہوا“ وہ کہہ کر اٹھ گئی اور ریاست پر آگئی۔ لان
 میں پالتو کیوتر آزادانہ پھر رہے تھے۔ وہ بھی ان کو
 دیکھتی، کبھی ایک طرف پنجرے میں بند عقاب کو۔
 عقاب معاذ کا تھا، ایک سال پہلے لے کر آیا تھا۔ اسے
 عقاب اچھے نہیں لگتے تھے۔ مگر آج وہ پہلی بار بغور
 اسے دیکھ رہی تھی۔ ”بلیک ایگل“ اس کے ہونٹوں
 نے بے آواز حرکت کی۔ معاذ کبھی بھی عقاب کو کھلا
 نہیں چھوڑا تھا اسے ڈر ہی رہتا کہ کہیں وہ اڑ کر بھاگ
 نہ جائے۔ اتنا تو وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ لہکڑا کو کھلا

نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور ویسے ہی چلتا ہوا اوپر اٹھ گیا۔
 کمرے میں آتے ہی وہ بیڈ پر گر گیا، ”بھئی کمرے کا
 دروازہ جھٹکنے سے کھلا اور خوب صورت سی لڑکی اندر
 داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر وہ دوبارہ اٹھ بیٹھا۔
 ”کانگریجویشنز ڈیول، لینڈ ویلکم بیک“ وہ بولی۔ یا
 قوی لیوں سے الفاظ نکل رہے تھے رکھنے میں یوں لگتا
 تھا جیسے میوے کی دہنی ہو۔ نازک سی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
 ”ایس لی کو تمہارا سلام کہا تھا۔“ وہ بولا۔ اب کے
 گندوال کے چہرے کی مسکراہٹ سٹ سی گئی تھی۔
 ”اوہ۔“ وہ بولی۔ پھر دوبارہ، نہیں پڑی۔
 ان کی نظریں نہ جان پائیں ہماری اچھائیاں محسن
 ہم جوج میں خراب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے
 اس نے شرارت سے شعر پڑھ کر بلیک ایگل کو
 دیکھا۔ وہ بھی نہیں پڑا۔
 ”میں ایس لی بن کر جواب دلا تمہیں اس کا؟“
 اس نے پوچھا، عزہ نے سر ہلا دیا۔
 ”کس کے دل میں کیا چھپا ہے یہ رب ہی جانتا ہے
 دل جو بے نقاب ہوتے تو سوچو کتنے فساد ہوتے۔
 وہ تجھ پر لہجے میں پڑ رہا تھا۔ عزہ نے سر جھکا لیا۔ وہ
 آنکھوں میں آبی نمی چھپا رہی تھی۔
 ”کیسا تھا وہ؟“ کچھ دیر بعد وہ خود پر تباہ پاتے
 ہوئے بولی۔
 ”ٹھیک۔۔۔ لیکن تمہارا نام سننے ہی چپ لگ گئی
 تھی اسے۔“ اس نے عادت کے مطابق سچ بولا۔ عزہ
 ہونٹ بھیچ گئی۔
 ”آئی دش کہ تمہیں عقل آجائے۔“ بلیک ایگل
 کے بولنے پر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
 ”اینڈ آئی دش کہ مجھے موت آجائے۔“ اس نے
 سن کر دینے والے لمحے میں کہا۔
 ”موت نہیں مانتے کبھی بھی۔“ وہ ٹوک رہا تھا۔
 ”پہلے تو مانتے پر جیسے سب کچھ مل گیا ہے میں
 جواب موت بھی مل جائے گی۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔
 وہ میز سے جوں اٹھا کر گلاس میں اینڈ لینے لگی۔

سک رہا تھا۔ آیت بن کر نیم بے ہوشی میں ترپ رہا تھا۔ یہ بھی ترپ رہی تھی۔



ایم ایس سی کیمسٹری فرسٹ سبسٹر میں وہ طلبہ کر گیا تھا۔ آج رزلٹ کا اعلان ہوا تھا، بے تحاشا خوش گھر لوٹا تھا۔ سب سے پہلے بابا کو بتانا چاہا تھا، گھر کے قریب آتے ہی اسے عجیب سی ویرانی کا احساس ہوا۔ وہ نہر کا وقت تھا، ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ سر جھٹکا آگے بڑھا گیٹ بجانے کے لیے ہاتھ گیٹ پر رکھا، ہاتھ رکھتے ہی گیٹ کھل گیا۔ بجانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ ان کے گھر کا گیٹ کھلا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ تیزی سے اندر داخل ہوا، صحن میں کوئی نہیں تھا۔ کیاری میں لگا سکہ چین کا درخت بھی جیسے آج زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا، عجیب سیایت ٹپک رہی تھی اس سے بھی۔

”زنبو“

”ابا“ اس نے صحن میں توازن لگائی۔ کوئی جواب نہیں آیا، وہ پریشان سا بابا کے کمرے کی طرف دوڑا۔ دروازہ کھولتے ہی ساکت ہو گیا۔ آنکھیں پھٹ گئی تھیں، ایک لمبے کے لیے سانس بھی رک سا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ نکل گئی۔

”ابا! ابا! ابا!“ وہ چنٹا ہوا اندر بڑھا۔ کمرے میں خون ہی خون تھا، لہا فرش پر گرے ہوئے تھے۔

”ابا“ وہ چنٹا ہوا جھکا اور پھر ایک بار پھر ساکت ہو گیا۔ بیڈ کے نیچے سے خون بہتا ہوا آ رہا تھا، جھکا اور دوسرے ہی لمحے اس کی چیخوں سے پورا گھر گونج اٹھا۔ بیڈ کے نیچے سے خود اس کی بہن کا تھا۔

”زنبو۔ زنبو۔ زنبو۔“ اس نے اسے باہر کھینچا، وہ پوری شدت سے مدد رہا تھا۔ ابا کہتے تھے۔

”شہو زبے حوصلے والا ہے۔“ ابا غلط کہتے تھے۔ اس کی بہن کا سر خون سے رنگین تھا، یوں جیسے کوئی نوکیل چیز اس کی سر پر لگی ہو، اس کی نظریں اس کی بند

سین چھوڑنا چاہے۔ وہ اڑ جاتے ہیں، بھاگ جاتے ہیں۔ کسی کے لیے نہیں رکھتے۔

”بجروں کو باندھ کے ہی رکھا جاتا ہے۔“ اسے اپنی توازن آئی۔

”زنبو! کو تو باندھ کے نہیں رکھا جاتا۔“ اس نے کہا تھا۔

”مجھے سونا ہے مجھے انجکشن لگاؤ۔“

”مجھے نہیں سونپے، لیجئے انجکشن مت لگاؤ۔“

”درد ہو رہا ہے۔“

”اپنی بہن اور بابا کا قاتل ہے۔“

”وہ انویسٹ ڈیول، بلیک اینگل کے نام سے جانا جاتا ہے۔“

”خون سے رنگے ہیں اس کے ہاتھ۔“ طرح طرح کی توازیں۔ اس نے ہاتھ کٹوں پر رکھ لیے۔ وہ قاتل نفرت تھا اور وہ نفرت کرنے کے قاتل بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے چھوڑا ہی نہیں تھا اسے اس قاتل۔

اسے تو بس وہ آنکھیں ہی بے بس کر گئی تھیں۔

”ڈاکٹر عدین کے بلانے پر تو یہ بولے ہی نہیں۔“

”بند کرو ڈاکٹر سے بازی۔“ عقاب اس کی نظریں خود رجمی محسوس کر کے پھر پھر رہا تھا۔ گویا وہاں کا کہہ رہا ہو گھر۔ آئندہ وہ کبھی سوچے گی بھی نہیں اس کو رہا کرنے کا۔ ورنہ پہلے تو سزا کے عقاب کو وہ اکثر آڑلو کرنے کا سوچتی۔ اب تو اسے ہالگ گیا تھا، عقاب کا کام ہی اڑلن بھرتا ہے، بھانکا ہے، رکنا نہیں، لہن کو آرام سے نفرت ہوتی ہے۔

”ناظمہ! تم دور رہی ہو؟“ سزا کب وہاں آیا۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس نے سٹا کر اسے دیکھا، پھر اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا جو جھکے ہوئے تھے۔

لف۔ وہ دور رہی تھی اور اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ دور رہی تھی۔ سزا حیران پریشان اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اور اندر کی طرف بھاگی، اب اس کی سسکیں نکل رہی تھیں۔

”ل۔ ل۔ ل۔ اللہ۔ اللہ۔ کوئی اس کے اندر

مٹھی پر نہیں جن میں کانچ دیا تھا تو کیا اس نے خوب؟
خود کو مارا اس کے بازو کی آستین لوٹھڑی ہوئی تھی۔
کیا ہوا تھا وہاں؟ وہ لبا کی طرف مڑا لبا کا سینہ خون سے
رنگین تھا، انہیں یقیناً گولیاں ماری گئی تھیں۔ وہ
انے حواس کھو رہا تھا ناگلوں کے انداز میں وہ ان دونوں
کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اپنے پاس گرا پٹل اس نے اٹھایا
اس کے ہاتھ پر لگا زنیو کا خون بھی پٹل پر لگ گیا تب
ہی بھاری بوٹوں کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ سامنے
پولیس کھڑی تھی وہ کھڑا ہو گیا، پٹل اس کے ہاتھ
میں تھا۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کچھ؟ آنسوؤں سے اس
کی آواز گلے میں دب گئی تھی۔ وہ چیخا چاہتا تھا، واہ لا
کرنا چاہتا تھا مگر۔

”یو آر اینڈر آر سٹ مسٹر شوہر رضوی“ الفاظ تھپا
جئے۔ گج قیامت کا دن تھا۔ قیامت آگئی تھی
جھکریاں اسے لگائی جا رہی تھیں۔ باہر لوگ اکٹھے ہو
گئے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا، لبا کی طرف دوڑ رہا تھا مگر اسے
پولیس گاڑی میں لے جایا جا رہا تھا، لاشوں کو ہسپتال
لے جایا جا رہا تھا۔

”لبا۔ لبا۔ لبا۔ زنیو۔ زنیو۔ اس کی چیخیں
گلی میں گونج رہی تھیں۔ وہاں موجود ہر بندہ رو رہا تھا۔
پورا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ تب کہاں تھے سب جب یہ
ظلم ہوا تھا۔ پولیس کسے آگئی وہاں؟ ان باتوں کا ہوش
کے تھا لوگ تو حیران کھڑے تھے۔ خون سے الٹے وہ
وجود ایسولنس میں ڈالے جا رہے تھے اور یہی خون
پولیس کی گاڑی میں اس کے ہاتھوں پر تھا۔ وہ بلک رہا
تھا، سسک رہا تھا اس کی کوئی نہیں سن رہا تھا، کوئی بھی
نہیں۔



کرہ عدالت میں خاموشی طاری تھی۔ دلائل اور
ثبوت پیش ہو چکے تھے۔ اپنے باپ اور بہن کا قاتل
کھڑے میں کھڑا تھا عدل۔ گج کے فیصلے کا انتظار
تھا۔ سات برسوں میں رہنے والی اس کی بڑی بہن زہو
بھی وہیں بیٹھی بلک رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ

جیل میں تھا، سنا تھا ایک دنیا آئی تھی اس کے باپ اور
بہن کے جنازے پر۔ بس سنا ہی تھا، وہ سن ہی سکتا تھا
اب۔ لبا کا بدن ٹوٹ گیا تھا، وہ ان کے جنازے میں نہیں
تھا۔ ان کا بدن ہی آخری مسافت میں ساتھ نہیں تھا۔
باپ غور وہ اپنا ساتھ لے گئے تھے۔ مدد کر اب تو
آنکھوں کا پانی بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے اور
گردن پر نسل کے نشانات تھے، اسے ہی نشانات کمر پر
بھی تھے مگر وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ کپڑوں کی وجہ سے
پولیس والوں نے مار مار کر اسے پاگل کر دیا تھا، وہ
دھاڑیں مار مار کر روتا، وہ سمجھتے مار کھانے پر مدد رہا ہے
جب کہ وہ لبا کو یاد کر کے روتا، زنیو پر روتا۔ سب سے
برا حال زہو کا تھا، سوچی آنکھیں کپے وہ عدالت میں
بیٹھی تھی۔ وہ من سے کہہ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں
کیا۔ وہ تو اپنے باپ پر جان دے سکتا تھا، لے کیسے لیتا
وہ تو کسی کی بیٹیوں کے لیے بھی بن قاسم تھا پھر اپنی
گڑیا کے لیے۔ مگر اس کے اس اپنی بے گنہی کا کوئی
ثبوت نہیں تھا اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی گنہگار پکڑا
گیا تھا۔ ساری زندگی اس نے صاف ستھری گزاری
تھی، لبا اور زنیو کا خواب تو ٹوٹ گیا تھا۔ لبا خواب ہی تو
کہا کرتے تھے اس زندگی کو۔ لیکن اس کا خواب
ڈراؤنے خواب میں بدل گیا تھا۔ سامنے سکتے میں بیٹھی
زہو عدیل، حنا۔ وہ انہیں نہیں دیکھ رہا تھا، وہ کسی
کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بس خون
تھا خون۔

”سائنس پلیز۔“ گج کی آواز پر ہل میں خاموشی
چھا گئی۔

”تمام گواہوں اور ثبوتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ
عدالت مجرم شوہر رضوی کو عمر قید کی سزا سناتی ہے۔“
نقارہ بج گیا تھا، وہ گھٹنے پہلے وہ ملزم تھا اب وہ مجرم بن گیا
تھا۔ اسے مجرم بنا دیا گیا تھا۔ زہو کی چیخیں عدیل حنا
کی کپکپاہٹیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ سزا سن کر نہ وہ چیخا
تھا، نہ اس نے احتجاج کیا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا
بالکل خاموش۔ میڈیا پر خبریں آگئی تھیں، اس کی نوٹوں
کے ساتھ دکھایا جا رہا تھا اس کا گناہ ظلم۔

”لکھ انہوں کو آنا ہے۔ جس کا جتنا طرف ہو
اسے لکھی آنا جاتا ہے۔ اس نے بے اختیار دعا کی
کہ وہ کم طرف ہوتا۔ یا وہ لبا کا بیٹا نہ ہوتا۔ ایک ہفتہ
پہلے تک اس کے پاس سب کچھ تھا مگر شہرت نہیں۔
ایک ہفتے بعد سب چھن گیا اور بدنامی مل گئی۔

وہ جیل کی کھلی کوٹھی میں آگیا تھا۔ زہرا کی تھی،
اس نے خستے سے انکار کر دیا یہ ضروری تھا اگر وہ انکار
نہ کرتا تو وہ بار بار تھلنے آتی اور بار بار اپنی پاک بھن کو
دہلی نہیں دیکھتا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں لدا جل رہا
تھا۔ ایک میڈیا والے نے تو اس کے گھر جا کر اس
خون کندہ گھرے کی ویڈیو بھی دکھادی تھی اور ساتھ ہی
ساتھ ہی جس بیٹے پر ایسے ذاتی لگ سارے کہ مائیں
پتہ مانگتے لگیں کہ خدا ایسے بیٹوں سے تو بیٹے نہ ہی
دے۔

دل میں ابلا لدا پکایا، وہ بعد اس نے پہلی بار
سوچا کہ آخر یہ سب کس نے کیا؟ جس جیل میں اس
کے با مجرم لایا کرتے تھے ”تج من کا بیٹا تھا ہوں۔“
ایماندار پولیس انسپکٹر کا کرپٹ بیٹا جس نے اپنے باپ
اور بھن کو مارا۔ کیوں مارا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ چاہتا
بھی کیسے جب بیٹے نے وہ جیسی نہیں بتلی تھی۔ نہیں
بلکہ اس کھلا قاتی تیا تھا۔

”کون ہے؟“ وہ حیران کھڑا پولیس والے سے پوچھ
رہا تھا۔
”کوئی بیو ہے۔“ پولیس والے نے کہا تو وہ چونکا۔
تب ہی بیو آگیا۔

”یہ اچھا تو نہیں ہے لبا۔“ اسے اپنے الفاظ یاد
تھے وہ چپ کھڑا ہو کر دیکھ رہا تھا وہ سلاخوں کے اندر
تھا، بیو باہر۔ سلاخوں کے اندر تو برے آدمی جاتے
ہیں۔ برا کون تھا پھر؟ بیو یا وہ مجرم تھا، بیو تو لڑکی ہی
رہتا تھا پھر رہا ہو جاتا تھا۔ پہلی بار میں ہی سیر کر لیا گیا
تھا، لڑکے سے مجرم بننے کا سفر دنیا نے ایک جھٹکے میں طے
کر دیا تھا اسے۔ دنیا کی عدالت کا فیصلہ آگیا تھا۔ بیو
اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہارے باپ کا قاتل چودھری غلام حسین
ہے۔“ بیو نے آکر دھاکہ کیا وہ ساکت کھڑا اسے دیکھ
رہا تھا یہ بھی نہیں کہہ سکا کون چودھری غلام حسین؟
”اپنے سندھ کے وزیر اکرچی میں ہی منہم ہوتے
ہیں۔ ان ہی میں سے ایک کا وکیل ہے یہ۔ رضوی
صاحب اس کے راستے کی دیوار تھے، ان کا لاکھوں کا
باجا ترمیل جو پنا چینگ ہر پولیس ٹکے سے گزرتا تھا،
رضوی صاحب کے ٹکے سے نہ گزر سکا۔ بس پھر
رضوی صاحب اڑ گئے، ان کی ایمانداری نے یہ گوارا
نہ کیا کہ وہ رشوت لے کر جانے دیں۔ الٹا انہوں نے
اس بات کو لوہا روپوٹ کر دیا مگر اوپر والے تو خود اوپر
والوں کا ہی ساتھ دیتے ہیں۔ تمہارے لبا کی وجہ سے
پہلے بھی لوہا والوں کو بہت مسئلے تھے۔ ایک عام سا
پولیس انسپکٹر ان کے آڑے آئے، انہیں گوارا نہیں
تھا۔ چنانچہ تمہارے ابو کو معطل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔
جب تمہارے لبا کو یہ پتا چلا انہوں نے خود دریا سن لکھ
دیا مگر ساتھ ہی ٹکے والی بات انہوں نے میڈیا میں
لانے کا فیصلہ کر لیا اور میڈیا کے نمائندے کو بلایا۔ وہ تو
نہیں تیا مگر تمہارے لبا کی موت آگئی، تمہاری بھن
کے ساتھ جو نہ کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے، اس نے خود
کو خود مار لیا مگر اپنی عزت پر حرف نہیں کہنے دیا۔ پھر
خود ہی انہوں نے پولیس کو بھیجا اور ان تو تھا کہ تحقیقات
چلیں گی، آخر میں کوئی مجرم نہیں ملے گا تو پھر اس کیس
کو بھی قاتلوں میں دبا دیا جائے گا۔ مگر ان کی خوش قسمتی،
مجرم کی صورت میں انہیں قتل گئے مرنے والی صورت
میں بھی مل گئی۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا۔“ بیو سانس
لینے کے لیے رکنا سکتے میں کھڑا ہے دیکھ رہا تھا۔
”تمہاری زندگی ایماندار رہنا“ اسے یاد تھی لبا کی بات۔
ایمانداری اور زندگی ساتھ رہ سکتے تھے بھلا؟“ جب
ایمانداری آتی ہے، زندگی چلی جاتی ہے۔ موت قبول
کرتی پڑتی ہے۔ پھر بیو نے اس سے جو کچھ کہا، وہ
نہیں سن رہا تھا۔ بیو بولتا رہا، جب وہ خاموش ہو اتوں
بس ایک لفظ بولا۔

”مجھے یہاں سے باہر نکالو، مجھے باہر نکالنا ہے ہر

قیمت پر اس کی آنکھوں میں خون باترا ہوا تھا۔ پاؤں
اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا پھر پتھپتا کر مڑ گیا۔

تھپ۔ تھپ۔ تھپ۔ تھپ۔ تھپ۔ تھپ۔ تھپ۔ تھپ۔
تھی۔ اس نے ہڑپا کر آنکھیں کھولیں۔ رات کے
گیارہ بج رہے تھے وہ جیزی سے اٹھی۔ خوف کی لہر
اس کے وجود میں دوڑ گئی۔ اس کی سے چلتی چلتی وہ لڑکی
کے پاس آئی۔

”گنگ۔ گنگ۔ کون۔ کون۔“ اس نے بمشکل کہا
ساتھ ہی موبائل اٹھا لیا تاکہ مولا کو بلا سکے اندر کمرے
میں۔

”تپ کامریض۔“ آواز تھی یا ہم۔ وہ اچھل پڑی
دو منٹ تک وہ بے یقین رہی پھر اس نے وعدہ ہٹا
دی۔ وہ وہی تھا، واقعی وہی تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے
دیکھ رہی تھی بڑے عجیب طریقے سے وہ پاپ پر چڑھا
ہوا تھا۔

”تت۔ تت۔ تم۔ تم۔ تم۔“ الفاظ اس کے منہ سے
نوٹ کر نکلنے لگے۔ مقابل نے ہاتھ بڑھا کر اندر چلا گیا
لگائی اس کے منہ سے چیخ سی نکلنے لگی تھی مگر اس نے
آگے ہو کر فوراً ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اس کی چیخ
اس کے بھاری ہاتھ تلے دب کر رہ گئی تھی۔ وہ اس
کے قریب کھڑا تھا بہت قریب اس کے منہ پر ہاتھ
رکھے۔ گھر تک آگیا تھا۔ اس کے کوسمان خطا
ہونے لگے۔

”کیسی ہو ڈاکٹر؟“ آنکھیں شرارت سے بھر پور
تھیں۔ وہ زپ کر پیچھے ہوئی۔

”تم کیا کر رہے ہو میں۔ تم۔“ اس کی آواز ادنیٰ
ہونے لگی اس نے دوبارہ ہاتھ رکھ دیا۔

”ہائے کھلانے آیا ہوں ڈاکٹر۔ آپ نے لگائے
تھے آپ نے ہائے چا تھا کھولیں گی بھی آپ ہی۔“ وہی
دھولس جانا لہجہ۔

”میرا گھر کیسے ملا تمہیں؟“ اس نے خود کو کمپوز کیا۔

اور ایک بار پھر شرارت بھر آئی تھی۔
”ڈھونڈنے نکلا تو مل ہی گیا۔“ کہہ کر مزے سے بیٹھ
پر بیٹھ گیا۔ وہ حیران کمری اس کی حرکتیں دیکھ رہی
تھی۔

”مجھ سے ڈر تو نہیں لگ رہا ڈاکٹر؟“ وہ مسکرایا۔
وہی جان لیوا معصوم شیطانوں جیسی مسکراہٹ۔ وہ
واقعی ڈرتی نہیں تھی اس سے۔

”شٹ اپ۔“ اس نے غصے سے کہا۔
”چلو اٹھو میرے بیڈ سے نکلو یہاں سے۔“ وہ ترغی
وہ غصہ بڑا تھا۔

”ٹٹکے کھولیں پھر جاؤں گے۔“ وہی ضد بھرا لہجہ۔
فاطمہ نے گھورا مگر ایک پل بھی نہ دیکھ سکی ”فورا“ ہی
آنکھیں جھٹکا گئی۔

کبھی دیکھنے بھی نہیں دیتا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کو
سنجاتی بیماری سے میڈیکل یا کس نکالنے لگی۔ اتنا تو
سمجھ گئی تھی کہ وہ جانے والا نہیں۔ وہ مزے سے بیڈ پر
بیٹھا تھا۔ بھی پاس بیٹھ گئی۔

”شرٹ اتارو۔“ اس نے نظریں جھٹکے جھٹکے
کہا۔ اس نے بڑی فرمانبرداری سے اتار دی۔ وہ ٹٹکے
دیکھنے لگی پھر اتنا جتنب نے کی نہیں تھی کہ تو پہلے سے
ہی اکڑے بڑے تھے۔ وہ جگہ سرخ ہوئی بڑی تھی۔
اس نے ٹٹکے کاٹے دھالے کھینچے اس کو خوش میں
وہ پوری اس پر جھک گئی تھی مسخری بالوں سے لڑھکاسر
اس کے سینے پر ہی تھا تقریباً۔ وہ سرشار سا سیمپہ کی
انہی ہلکے سونگہ رہا تھا۔

”درو تو نہیں ہو رہا؟“ اس نے جھٹکے جھٹکے پر چھل
”ہو رہا ہے ٹٹکے۔“ وہ مسخری خیزی سے بولا فاطمہ
نے سر اٹھا کر اسے دیکھا چہرے پر وہی انہی سکون تھا۔
سکون ہی سکون۔

”گنگ تو نہیں رہا کہ درو ہو رہا ہے۔“ وہ غصے میں آ
گئی۔ اس نے مسکراہٹ دی۔

”ہو رہا ہے ٹٹکے۔“ اس نے آہستہ سے
کہا۔

”کیا؟“ وہ چیخ اٹھی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ دھواں اس

کے منہ پر رکھا۔
”میں چلا ہوں ڈاکٹر، شکریہ۔“ مسکراتا لہجہ،
مسکراتی آنکھیں، ہانڈھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کی طرف چلا
گیا۔ پھر مڑا۔

”لو رہا میری تصویر سنبھال کر رکھنا“ کہہ کر باہر
کو دیا اور وہ سن ہو گئی۔ اے۔ اے۔ اے۔ اے کیے
پتا کہ میں نے اس کی تصویر بنائی۔ اور میرے خدا لیا۔

پہلے اے جیل سے فرار کروا کر سلطان کے پاس لایا
تھا۔ سلطان کے پاس آکر وہ ملک ایگل بن گیا تھا۔ میڈیا
بر اس کے فرار کی بھی خبریں آگئیں اور جب اس نے
جلی بار بینک لوٹا تب وہ جان بوجھ کر اپنا کارڈ چھوڑ گیا
تھا اپنی فوٹو کے ساتھ تب سب جان گئے کہ وہ شہروز
رضوی بلیک ایگل بن گیا تھا۔ آخر کو وہ ایمان داری کا
بیٹا تھا، ہر کام ایمان داری سے کرتا اس کی عادت تھی۔
پولیس کو دھت میں نہیں ڈالتا تھا، بتا دیتا تھا کہ میں نے
کیا ہے یہ کام۔ اس نے بینک لوٹے، چودھری غلام
حسین کے خاندان کو نہیں چھیڑا۔ اس نے کبھی قتل
کیلئے عرفان رضوی کا بیٹا تھا، خون سے اپنے ہاتھ بھی
نہیں رنگ سکتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ مشہور قاتل تھا۔ اب
تو شہر میں جیل بھی مارگٹ کنگ ہوئی، نام اس کا
آجائے۔ حلال کہ وہ ظر نہیں تھا۔ بس چودھری غلام
حسین کا کارڈ بار تباہ کر رہا تھا۔

اور عزم و حمت، سلطان کی بیٹی۔ بس وہ تھی اس کی
دوست، گلشن بی شامہ زیب کے ساتھ اس نے محبت کی
تھی بالکل معصوم لڑکی بن کر، آخر میں سلطان کے
خلاف جتنا رپکار ڈھانے میں تھا، سارا لے کر وہ ایس
بی کو چھوڑ آئی تھی۔ مگر اپنا بل بھی وہیں چھوڑ آئی
تھی۔ عید کے دن ہونے والی قتل و غارت میں بھی اس
کا ہاتھ نہیں تھا، وہ بس وہاں سے گزر رہا تھا جب
فائرنگ شروع ہوئی۔ وہ لوگوں کو بچانے کے لیے اترا تو
خود گولیاں کھا بیٹھا۔ اور گرفتار ہو گیا۔ سلطان کوئی
مارگٹ ظر نہیں تھا، اس کا کارڈ بار بس جہتہ لینے

بینک لوٹنے تک تھا۔ مگر بلیک ایگل مارگٹ کلر کے نام
سے مشہور ہو گیا۔ اب تو جو بھی مارگٹ کنگ کرنا
وہاں بلیک ایگل کے کارڈ پھینک آتا اور نتیجے میں سارا
نزلہ اس پر گرتا۔

ایک بار پھر عدالت لگی تھی، کٹہرے میں ارمان غلام
کھڑا تھا۔ جج بیٹھا تھا گواہ بیٹھے تھے۔ فیصلہ آنے والا
تھا۔

”یہ عدالت تمام ثبوتوں اور گواہوں کے پیش نظر یہ
فیصلہ کرتی ہے کہ شہروز رضوی جو تین سال پہلے جیل
سے فرار ہوئے تھے وہ باعزت طور پر اس کیس سے
بری کیے جاتے ہیں اور۔۔۔ فیصلہ سنایا جا رہا تھا۔ ہر کوئی
لی دی پروکھ رہا تھا، من بھی رہا تھا۔ جو وہ چاہتا تھا وہ ہو گیا
تھا۔ چودھری غلام حسین اور اس کا بیٹا خود عدالت میں
جا کر مانے تھے، اس نے ان کی زندگی اتنی تنگ کر دی
تھی ان پر کہ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں
تھا۔ سلطان اور وہ اپنی فتح پر مسکرا رہے تھے۔

”میں ملوں گا آج ایس بی سے“ اس نے عزم کے
کلن میں سرگوشی کی۔ سنا اچھل پڑی۔

”خبردار وہ تمہیں گرفتار کر لے گا فوراً“۔ ایک
کیس سے بری ہوئے ہوئے ہوئے بلی کا کیا؟“ عزم نے روکا۔
”نہیں کرتا“ میں اس سے مل کر اسے ساری
حقیقت بتاؤں گا اور پھر۔۔۔ وہ کہتے کہتے رکا۔

”پھر تمہیں اس کے ساتھ بھگدوں گا“ اس نے
شرارت سے کہا۔ عزم نے زوردار مکا اس کے کندھے
پر مارا۔

”فاطمہ پھر بھی نہیں ملنے والی تم کو“ عزم نے چڑایا۔
وہ نہیں پڑا۔

”میں گے تو اس کے فرشتے بھی۔“ اس نے کہا،
آنکھوں میں وہی شرارت تھی جو فاطمہ کو دیکھنے پر آئی
تھی۔ اب بھی ایسے لگ رہا تھا جیسے تصور میں ہی فاطمہ
کو دیکھ رہا ہو۔ عزم نے دل ہی دل میں نظر اتاری اس
کی، جب سے ہسپتال سے آیا تھا یونہی خوش رہتا تھا

۔۔۔ درنہ ان تین سالوں میں وہ تین بار ہی مسکرایا تھا۔
فاطمہ تھی جو اس کے چہرے پر مسکراہٹ بن کر دوڑ

رہی تھی۔ وہ کہتا تھا "عزہ" جب وہ جاتی ہے ناں۔
واللہ میں بتا نہیں سکتا کہ کتنی اچھی لگتی ہے۔" اور وہ
ہنس پڑی۔

نماز پڑھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی، دل میں ایک سکون
اتر آیا تھا، امدالت کا آج کا فیصلہ سن کر وہ آئینے کے
سامنے آکھڑی ہوئی۔
تبھی عدیل اندر آیا۔

"زہرا ہا ہر پولیس۔" آواز اس کی منہ میں ہی تھی
کہ دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا اور اسے دیکھ کر
زہرا ساکت ہو گئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور اسے اپنے
ساتھ لگایا۔ دوسرے ہی لمحے پورا گھر ان کی سسکیوں
سے گونج رہا تھا، وہ رو رہے تھے بے تماشاً پیچھے کھڑے
شاہ زیب حسن اور عزہ بھی رو پڑے تھے اور عدیل بھی
ایک طرف کھڑا چار سالہ بچہ حیرانی سے سب دیکھ رہا
تھا۔

"میں مر گئی تھی شہوز۔ میں مر رہی مٹی تھی۔" وہ
ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ بھی رو رہا تھا۔ تین سال سے
اندر چھپے آنسو آج سیلاب بن کر نکلے تھے۔
"ابا۔ زہرا۔" اس کے دل سے ایک بار پھر ہوک
سی نکل گئی۔ زہرا زہرا ہی تھی اس نے ابا کا غور نہیں
ٹوٹے رہا تھا، خود ٹوٹ گئی تھی۔ زہرا بار بار اس کا منہ
چوم رہی تھی۔

"سہ۔ یہ سعد اتنا بڑا ہو گیا۔" اس نے حیرانی سے
سعد کو دیکھا جو شرابا رہا تھا پھر تڑپ کر اسے ساتھ لگایا
تھا۔ ایک بار پھر آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب نکلا تھا،
کچھ خسارے زندگی میں کبھی پورے نہیں ہوتے۔
کچھ کی ہمیشہ رہ جاتی ہے، کچھ تنگ رہ ہی جاتی ہے۔
اسے ابا یاد آئے۔ اور بڑی شدت سے یاد آئے
آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

"مبارک، مبارک۔ ہر طرف سے مبارک
سلامت کا شور مچا تھا۔ اب وہ گلے مل رہے تھے۔
اس کے چہرے پر خوشیوں کا موسم تھا۔ زہرا بھی
خوش تھی اور سعد بھی۔ ابھی اس کا نکلا فاطمہ سے ہوا

تھا، بلک ایگل آج وہ لہا بن گیا تھا۔ حیرت کی بات تھی
ہاں مگر اس سب کے پیچھے شاہ زیب حسن تھا جو اپنی
ہوی عزہ رحمن کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جس دن
شہوز رضوی اسے ملا تھا، اسی دن وہ اس کا فین ہو گیا
تھا۔ وہ اب ہری تھا، اور سلطان کے خلاف تو ویسے بھی
سارا ریکارڈ ختم ہو چکا تھا۔ عزہ نے شرمندگی سے جب
اس سے معافی مانگی تھی، اس کا سارا غصہ بل میں اتر گیا
تھا۔ محبت کرنے والوں کو بھلا محبوب۔ کہاں غصہ آتا
تھا۔ وہ عزہ سے کیا ملا؟ اسے زندگی مل گئی۔ پھر فاطمہ کے
گھر والوں کو منانے والا بھی وہی تھا۔ کچھ دیر بعد فاطمہ
کو اس کے ساتھ لاکر بٹھار دیا گیا۔ ڈیپ ریڈ فرائڈ میں
وہ آسمان سے اتری حور لگ رہی تھی، آنکھیں جھکی
ہوئی لرز رہی تھیں، دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے ساتھ
بیٹھتے ہی اس کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی تھی۔
ابھی نکلا ہوا تھا، رخصتی وہاں بعد تھی۔

"میں آج پھر اوس گاڈ آکٹر، کھڑکی کھول کے رکھنا۔"
اس نے شرارت سے سرگوشی کی۔ وہ بے اختیار
سٹ سی گئی۔
"پھر دکھاؤں گا تمہیں کہاں کہاں درد ہوتا ہے
تمہیں دیکھ کر۔" وہ مزید شرارتی ہوا۔ وہ سرخ ہو گئی۔
لوگ چاند سورج کی جوڑی کہہ رہے تھے۔
"ترج ڈانٹنا نہیں مجھے؟" اس نے پوچھا۔ فاطمہ نے
سر جھکا دیا، ہنس پڑا۔

"علاج کرتے کرتے لا علاج کر دیا مجھے۔" وہ سرشار
تھا اپنی فتح پر۔ وہ جھکے سر کے ساتھ مسکرا دی۔ زندگی کی
راہ گزر روشن تھی، راستہ صاف تھا۔ معصوم شیطان
اس وقت اس کے پسلو میں بیٹھا مسکرا رہا تھا اور لبا کو
سوچ رہا تھا۔ اب اسے زندگی گزار دی، اس کی بھی گزر جانی
تھی۔ وہ اپنے باپ کی ہر بات نہیں مان سکا تھا مگر اس
نے ہر بات رو بھی نہیں کی تھی۔ وہ اللہ سے معافی کا
طلب گار تھا اور اسے بتا تھا کہ اسے معافی مل جائے
گی۔ کیونکہ ابا کہتے تھے گنہ پر رک جانا ہم جانا گنہ ہے،
یہ دنیا کی طرف لے جانا ہے۔ گنہ کر کے پلٹ آنا
اللہ کو سہارے کے لیے رحیم بنا دیتا ہے۔



نے کوئی نئی بات نہیں "میرا انداز کچھ اس طرح کا تھا کہ منی کا چہرہ یک دم اتر اٹھا۔
"کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔" اس نے منہ پھلا کر کہا تو مجھ سے بھی برداشت نہ ہوا جھٹ جواب دیا تھا۔

"ہونا کیا ہے؟ دنیا بیل گئی مگر اس کی حرکتیں نہیں بدلیں۔ پہلے چھروں والی پستول۔ لیے پھرتا تھا اب اس بچوں والی پستول کے بجائے جج جج کی بندوق ہاتھ میں آگئی ہے۔ پتا نہیں کس کی اٹھا لایا ہے۔" میں نے دل کی بھڑاس نکال تو منی کچھ اور پرالمان گئی۔

"ایسے تو نہ کہو بے چارہ کسی کھار کھوس آتا ہے تو مونج میلہ کر لیتا ہے ورنہ اب تو اس کو لیم (ٹائم) ہی نہیں ملے۔" اس نے فوراً اس کی طرف داری کی تھی مجھے غصہ تو بے حد آیا مگر ضبط کر گئی۔

جانتی تھی منی اور رنگ زیب (دل سے ہمیشہ رنگ زیب ہی کہتی تھی) دونوں ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے بقول منی "محبت اور عشق کے لازوال رنگ میں۔"

"پہلو منی نیچے چلیں۔" میں نے اس کی توجہ اور رنگ زیب ہی کی طرف مبذول دیکھی تو فوراً اسے کہنی ماری تھی اس نے پہلے تو ناگواری سے منہ دیا پھر دل پر پھر رکھ کر میرے ساتھ ہی بیڑھیاں اتر آئی۔

پھر نیچے آکر میں نے اوپر اوپر کی حوالت بھی کی اس نے محض ہول ہول میں ہی جواب دیا۔ میں کچھ دیر تو وہاں بیٹھی رہی لیکن منی نے سیدھے منہ بات نہ کی تو میں گفتگو کے ساتھ واپس حویلی آگئی تھی۔

مجھے وہاں چھت۔ بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی جب ایک دم گول چلنے لگی آواز آئی تھی۔ دوسرے ہی بل دھڑک کے درخت پہ بیٹھی بہت ساری چیزیاں پھر سے وہاں سے اڑ گئیں۔ میرا اپنا دل بھی گویا اچھل کر حلق میں آیا تھا۔

"کیا ہوا؟ کس نے چلائی ہے یہ گولی؟" میں نے بدحواسی میں منی کی طرف دیکھا تو اس نے جیسے ہوئے مجھے بلاتا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا سیدھے! اتم تسلی سے بیٹھ کر گلی میں لڑکے کو منی نشانہ بازی کر رہے ہیں۔"

اس نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا اور خود دینرے کی طرف گئی تھی میں نے بھی فوراً اس کی پیروی کی پھر منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر نیچے گلی کی طرف جھانکا تو سامنے کے منظر نے مجھ پر سب کچھ واضح کر دیا تھا۔

وہاں کونے میں بہت سارے لڑکے جھگڑھٹا لگائے کھڑے تھے اور ان میں سب سے نمایاں اور رنگ زیب اس وقت کلائی میں رین باندھے بندوق ہاتھ میں لیے چیزوں کا نشانہ لگائے کھڑا تھا بالی دوساٹی لڑکوں کے برعکس اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور بالوں کا اسٹائل بھی ایک معروف انڈین فلمی ہیرو جیسا تھا۔

"اور رنگ زیب" منی نے دبے دبے جوش کے ساتھ مجھے کہنی ماری تو یک دم میرا لہجہ چڑھ گیا۔

"یہ کیا تم رنگ زیب رنگ زیب لگا۔ رکھتی ہو سیدھی طرح اور رنگ زیب کہا کرو۔" میں نے مجھے سے کہا "اور دیکھ رکھا ہے رنگ زیب پہلے بھی میں

ہوئی اس روز داری کا جود ملنے والا ہوتا تھا۔
 ”داری منی کی منی ہو گئی ہے؟“ میں نے داری کو
 خاموش پا کر یونسی سرسری انداز میں پوچھا تو وہ سچ
 پڑھتے پڑھتے یکدم رکی گئیں۔

”غلام رسول ترکھن کی لڑکی کی بات کر رہی ہو؟“
 انہوں نے استفسار کیا۔ ”میں نے تمہیں لکھا ہے کہ میری طرف سے کھلا
 ”جی ہاں۔“ میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

”کھلا۔ ابھی کہاں ہوئی۔“ گلاب دلی سے کہہ کر
 پھر صبح پڑھنے لگیں۔

”وہاں لڑکیاں تو کہہ رہی تھیں کہ ہو گئی۔ وہ جو
 اس کے چچا کا لڑکا ہے اور تک زب اس کے ساتھ۔“
 میں نے ذرا تجسس سے انداز میں کہا تو داری نے یک
 دم آنکھیں میکر کر میری طرف دیکھ کر
 ”تو ترکھنوں کے گھر گئی تھی؟“

”جی ہاں منی اور زیادہ نہیں۔ سہیلیاں ہیں نا
 میری۔“ شگفتہ کے ساتھ گئی تھی۔ ”میں نے فوراً“
 وضاحت کی۔

اس بڑی سی حویلی میں میرے دلوا داری اور چچا چچی
 رہتے تھے ویسے تو ان لوگوں کا پرانا گھر گاؤں کے
 دو سرے گھروں کے درمیان میں ہی تھا مگر چند سال
 پہلے چچا نے سارا اسٹال گاؤں سے کچھ فاصلے پر بنی اس
 حویلی میں شفٹ کر لیا تو دلوا داری کو بھی چاروں باہار
 یہیں آنا پڑا۔

”کتنے دن رہو گی تم اس بار۔“ میں حویلی میں واپس
 آکر محن میں کچھ چارپائی پر جا کر بیٹھی تھی کہ داری
 نے پوچھ لیا۔ وہ بھی اسی چارپائی پر بیٹھی صبح پڑھ رہی
 تھیں۔

”تھوڑے ہی دن رہوں گی۔“ میں نے جواب دیا تو
 انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

امی ابو کے شہر چلے جانے پر میں بھی ان کے ساتھ
 ہی گئی تھی مگر موسم گرما دلوا داری سے ملنے یہاں
 ضرور آتی تھی۔ وہ بھی بڑی شدت سے میرے آنے
 کے منتظر رہتے تھے اور جس دن یہاں سے میری واپسی



ان پھٹیوں میں میں جتنے دن وہاں رہی، منی کے گھر یا کہیں اور آتے جاتے میرا کئی بار اور تک زیب سے سامنا ہوا تھا۔ وہ اکثر یہاں سے وہاں پھرنا نظر آتا۔ کبھی ہاتھ میں بندوق لیے نشانہ باندھ رہا ہے تو کبھی واک مین لیے پھر رہا ہے۔ اس زمانے میں واک مین کسی کسی کے پاس دیکھنے کو ملتا تھا اور گلوں کے اس روکے کے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے اچھی خاصی حیرت ہوتی تھی پھر تو اس کے بعد جب بھی وہ کھاواک مین ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے، انڈین فلموں کے گیت بچ رہے ہیں اور اورنگ زیب صاحب ایک ہیو کی مانند لڑکوں کی بھیڑ میں چل رہے ہوتے تو حرا و حرا جانی لڑکیاں ذرا ٹھہر کر اسے دیکھنا نہ بھولتیں اور پھر جیسے ہی اورنگ زیب کو احساس ہوتا اس کی شخی آسمان کو چھوئے لگتی۔

ایک روز مجھے بھی دیکھ کر ایک لڑا سے مسکرایا اور ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سلام کیا تھا۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جیسے ہی شام کو سنی آگ میں نے اسے خوب سناٹیں۔

”ہیسا چچھو رہا ہے تمہارا چچا لڑا اور تم پھر بھی اس کی تعریفوں کے بل باندھتی رہتی ہو۔“ میں نے جھڑکا تو اس نے فوراً ”اس کی صفائی پیش کی۔“

”جیسے تو نہ کوئی کیا برائی ہے اس میں۔“ وہ تو اس کو بتا ہے کہ تم میری سسلی ہو اس لیے سلام کیا ہوگا ورنہ ایسا دیتا تو نہیں۔“ اس کی بات سن کر میں خاموش کی خاموش رہ گئی۔

جانتی تھی کہ منی کو جو مرضی کہوں وہ ایک بات بھی اس کے خلاف سننے پر تیار نہ ہوگی۔

”بے چاری منی، ظاہری چمک دک سے متاثر ہو گئی ہے مگر آگے جا کے زندگی میں اسے پتا چلے گا کہ صرف شکل و صورت سے کام نہیں چلتا اور بھی گمن ضروری ہیں۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا ضرور ہنکر

خلفہ گلوں کی ہی لڑکی تھی اور ہر روز کام کاج کے لیے حویلی آیا کرتی تھی اس کے ساتھ جانے پر دہلی کو اعتراض نہ ہوتا۔

”جب آپ برائے گھر ہوتے تھے تو تب بھی تو ان کے گھر جایا کرتی تھی میں۔“ کچھ واڑے ہی تو گھر تھا ان کا۔“

میں نے حفظ مقدم کے طور پر فوراً ”ہی انہیں یاد کروایا تاکہ ان کی کسی بھی قسم کی ڈانٹ سے بچا جاسکے۔“ دادی نے بات سن کر ہولے سے سر ہلایا تھا اور شیع کے اٹنے کرا لی رہیں۔

”پتا نہیں میں نے تو نہیں سنا کہ اس کی منگنی ہو گئی۔“ ویسے اچھا ہو منی نے ہی کرے اپنی لڑکی کا رشتہ اس شخص سے لڑکے سے۔“ انہوں نے ناگوار سی کہ۔

”دو چار دن شہر جا کر کام کر لیتا ہے پھر واپس آکر وہی پھر سے گلوں کی توارہ گردی۔“ وہ بد مزہ سے انداز میں کہتی جا رہی تھی اٹھ کر نماز پڑھنے کے لیے برآمدے کی طرف چلی گئیں۔

اس شام منی ہماری طرف آئی تو میں نے اسے آٹے اٹھول لیا۔ ”تو نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ مجھے تو پتا چلا ہے کہ تیری کوئی منگنی ہو گئی نہیں ہوئی ابھی۔“

”مسعدہ جی! ایک ہی کل (بات) ہے نا۔ آج نہیں ہوئی تو کل ہو جائے گی۔ ہمارے بیچ کون سا کسی دوسرے نے اتنا ہے۔ اپنا رشتہ دار ہے ذات کا وہ بھی ترکھان میں بھی ترکھان۔“ اس نے جیسے ہوئے کچھ اس انداز سے کہا کہ مجھے بھی ہنسی کو ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

پھر وہ منی ہی دیر اپنا ”رنگ بلمہ“ کھول کے پیش رہی ”رنگ زیب یہ رنگ زیب دے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کر لیا تھا۔“

دہلی کو اس کی باتوں کی بھنک بھی پڑ جاتی تو اس کا یہاں اتنا ہی بند کر دیتیں اور شاید مجھے بھی خوب ڈانٹیں میں نے اسے یہی بات کہی تو وہ کچھ دیر بیٹھ کر

نیلان سے کچھ نہ کہا کہ بہر حال مٹی کی دوستی مجھے خاصی عزیز تھی اور اگر میں اور رنگ زیب کے خلاف کوئی بات کرتی تو یقیناً اس نے مجھ سے ناراض ہو کر یہاں آتا ہی چھوڑ دیتا تھا جو میں بالکل بھی نہیں چاہتی تھی۔
 وہ چند منٹ تک تو منہ پھلائے بیٹھی رہی پھر میں نے خود ہی موضوع بدل لیا تو وہ بھی دوبارہ چمک چمک کر باتیں کرنے لگی۔

پھر متواتر دو برس گزر گئے، لیکن میں گاؤں نہ جاسکی۔ ہر بار ارادہ کرتی، سالانہ ہجرت کی تیاری بھی کرتی مگر کوئی نہ کوئی ایسی مجبوری آڑے آجاتی تھی کہ مجھے ارادہ ملتوی کرنا پڑتا۔ اس بار البتہ میں مقررہ تاریخ کو ابو کے ساتھ حویلی پہنچی تھی۔
 توقع کے عین مطابق مجھے دیکھ کر سب ہی بے حد خوش ہوئے تھے، ڈاڑھی بھی خوب چمکیں۔ وہ بہرنگ میں ان سے لوہرا دھڑکی باتیں کرتی رہی پھر شام ہوئی تو گفتہ کے ساتھ چمتہ پر آگئی تھی۔

"اب اوپر کھانا پکاتے ہو۔" میں نے گفتہ سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 "گھڑی ہوتی ہے تو شام کو ہوا دیکھو چلنے کی وجہ سے پیس آجاتے ہیں۔" وہ لکڑیاں لے کر مٹی کے بنے چولہے کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی اور میں چلتی چلتی چمتہ کے کونے جا کھڑی ہوئی۔

یہاں سامنے پگڈنڈی کا راستہ خلاصا واضح نظر آتا ہے اور ارد گرد پھیلے کھیتوں کی وجہ سے منظر بھی بے حد خوب صورت ہو جاتا ہے میں یونہی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جب یک دم پگڈنڈی سے شہر کو جلتے رہتے پر مجھے ایک مرد اور عورت چلتے نظر آئے۔

"گفتہ لوہرا آنا جلدی سے۔" میں نے کہا تو وہ تھک جھاک کر تکی تھی۔

"وہ دیکھو سامنے مٹی ہی جا رہی ہے نا؟" میں نے مٹی کی چال سے اسے پہچان لیا تھا۔

گفتہ نے لوہرا کھاتو اثبات میں سر ہلادیا۔

"ہاں جی ویسی ہے۔ شادی ہو گئی ہے اس کی۔"

نے مجھے سرسری سے انداز میں بتایا تو میں یک دم

چمک گئی۔

"چھا۔ کس؟" اور وہ ساتھ اور رنگ زیب ہے؟
 میں نے فوراً گفتہ کی طرف دیکھا تو اس بار اس کا جواب نفی میں تھا۔

"کہاں۔ یہ تو اس کا شوہر ہے اور رنگ زیب سے کہاں شادی ہوئی اس کی؟ یہ تو دوسرے گاؤں کا لڑکا ہے۔" اس نے مزید تفصیل بتائی تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"کیا؟ اور رنگ زیب سے نہیں ہوئی، لیکن تو۔" میری بات کھل ہونے سے پہلے ہی گفتہ نے بات کاٹی تھی۔

"وہ سب تو ختم ہو گیا کب کا۔ بڑی لڑائی ہوئی تھی دونوں گھروں کی۔ مٹی کی چاچی رشتہ لے کر گئی تو مٹی نے انکار کر دیا تھا۔"

"کیا مٹی نے انکار کر دیا؟" مجھے یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں اس نے اصل میں اور رنگ زیب کا کام چھوڑ آیا تھا اور سارا دن گاؤں میں کواں پھرتا رہتا تھا۔ مٹی نے چند روز تو دیکھا پھر کہنے لگی کہ میں نے ساری زندگی اس کی نشانی والی پستول اور فیشن ہالوں کے ساتھ تو گزار لی نہیں، کوئی ہنر بھی سکھ تو پھر بات بھی بنے۔" گفتہ کہتے کہتے ہنسی۔

"اور رنگ زیب نے سنا تو بڑا غصہ کیا تھا۔ بس پھر وہیں بات ختم ہو گئی۔" وہ کہہ کر دیکھ نہیں بلکہ چولہے کی طرف مڑ گئی تھی اور میں وہیں کھڑی کتنی ہی دیر پگڈنڈی پہ جاتے دن دو سایوں کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔ مٹی اتنی بے وقوف ثابت نہیں ہوئی تھی جتنا میں اسے سمجھ رہی تھی میں نے یہی سوچا اور وہاں مڑ گئی۔

اس بل گاؤں کی طرف سے گولی چلنے کی گواہ تھی اور پھر دور بہت سی چڑیاں پھر سے اڑتی دکھائی دیں۔

"ارج یقیناً" اور رنگ زیب کا نشانہ خطا گیا ہے۔"

میں نے گہری مسکراہٹ لیے ڈیر لب کہا تھا اور پھر تیزی سے بیڑھیاں اترتی نچے آگئی۔

حیاتِ شہر

رہی تھیں۔ گاڑیوں کے شیشوں سے سر نکالے کچھ لوگ حریف نظروں سے ان عورتوں کو دیکھ رہے تھے۔ بات میں جانی تو وہ اسے اپنے ساتھ بٹھا لیتے تھے۔ رات کے دس بجے شہر کی ان سڑکوں پر رات جو ان تھی۔ یہ اس شہر کا ریڈ لائٹ علاقہ نہیں بلکہ مشہور کاروباری مرکز تھا جہاں دن کی روشنی میں لاکھوں کروڑوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ سڑک پر ٹریفک جام اور سب سے اشیانہ پہ لوگوں کا جھوم ہوتا تھا۔ مگر رات کو اس سڑک پر بنے چند مشہور کلبوں میں زندگی کی ایک اور جھلک دیکھنے کو ملتی تھی۔

یہاں پر زیادہ تر وہ لڑکیاں تھیں جو دن میں چھوٹی موٹی نوکریاں کرتی تھیں اور رات میں پادیک لپٹنے پر اچھے ہاتھ پاس کی غرض سے اور کچھ اضافی پیسے کمائے کی لالچ میں یہاں موجود ہوتی تھیں۔ وہی سنگل کیونٹی کے لیے مشہور بھی ہے اور بدنام بھی لڑکیاں اپنی معمولی سی تنخواہ سے اپنے خواب پورے کرنا تو دور کی بات وہ اس ہائی لائف وہی کو چھوٹے کاسٹیج بھی نہیں سکتیں جو اس شہر کی سب سے بڑی کشش ہے۔ ایسے میں اگر کلب میں لڑکیوں کا داخلہ اور مفت ڈرنک کی آفر سے فائدہ اٹھایا جائے تو کیا برا ہے۔

اسے اس شہر میں رہتے وہ سبیل ہو چکے تھے اور اس ہوٹل کو وہ دن میں دوبارہ جیتی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اس عایشان عمارت کو اندر سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بلڈنگ باہر سے بھی قاتل ستائش تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا یہ اندر سے اتنا عایشان ہو گا۔ بلاشبہ یہ آرکس کچھو کا اندر نمونہ تھا۔ وہ عمارت جتنی شان دار

فٹ پاتھ پہ بازار مصر کا گلیں تھ۔ کپڑوں سے جھلکے عریاں بدن۔ لڑائی مل کھاتی وہ حوا کی بیٹیاں اپنی لواؤں سے گاؤں کو ترغیب دے رہی تھیں۔ حسن کے بازار میں بولیاں لگ رہی تھیں۔ کیا حشر ہر پاتھ پہل رنگ و نسل کی تمیز نہیں تھی جس ہوس ہر شے پہ حاوی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف عیسیوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ سروس لین میں گاڑیاں رنگ





باہر سے نظر آتی تھی اس کا انشیر اس سے زیادہ
مہسوت کر دینے والا تھا۔ لالی میں اس وقت کافی لوگ
تھے جو اسے سرسری نگاہ سے دیکھ کر آگے چلے گئے
کلب میں داخل ہوتے وقت اس کا دل بے کی طرح
کناں رہا تھا اگر اس وقت وہ مجبور نہ ہوتی تو کبھی اس
جگہ قدم نہ دھرتی۔ قیمتی ٹاکل فلور پر دھسے قدموں
سے چلتی وہ اس ہوٹل سے ملحقہ کلب میں داخل ہو
گئی تھی۔ اندر کا ماحول اس کی سوچ سے زیادہ آزاد تھا۔
اس کی نظرس لوگوں کے ہجوم میں حشر کا تعاقب
کر رہی تھیں اور پھر وہ اسے ڈانس فلور پر نظر آگئی
تھی۔ اسے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی
تھی۔ گھٹنے سے اونچا راکل بلو سیلوئیس لباس اور
چہرے پر انتہائی ڈارک میک اپ کے حشر پھولے
ہوئے سٹائلس کے ساتھ اس کی طرف تکی تھی۔

”یہ کیا جلیہ بنا رکھا ہے اب اگر کلب آہی رہی
تھیں تو کچھ حالت بھی سنوار لیں۔“ اسے لے کر
کلب سے باہر جلتے ہوئے حشر نے تسخر سے کہا۔
سیاہ ٹاپ اور بلیک جینز میں سر پر سیاہ کراف اوڑھے
وہ اس ماحول میں پوری طرح مٹ گئی۔

”کیا خرابی ہے میرے حلیے میں حشر؟“ وہ اس
کے ذہن پر اڑانے کے کچھ شرمندہ ہو کر بولی تھی۔

حشر اس کی گھسی بھی بات کا جواب دیے بغیر تیز
قدم اٹھاتی چلتی جا رہی تھی۔ اس کا رخ ریسٹ رو مزن کی
طرف تھا۔

”لب چونکہ کچھ وقت تمہیں یہاں میرے ساتھ
گزارنا ہے تو پلیز یہ اسکارف اتار دو۔“ اس کے سر
سے اسکارف کھینچ کر اتارتے ہوئے اس نے کلب
میں جکڑے اس کے لیے سیاہ بالوں کو کھول دیا تھا۔
اپنے پرس سے ایک لب اسٹیک نکل کر اس نے
زبردستی اس گھری سرخ لب اسٹیک سے اس کے
ہونٹوں کو رنگ دیا تھا۔

”میں نہیں کرتی میک اپ اور پلیز میرا اسکارف
واپس کر دو مجھے ابھن ہو رہی ہے۔“ اس کی حرکتوں پر
لب سیٹ ہوتی وہ اپنے بل باندھنے لگی تھی۔

”دیکھو اگر تمہیں میرے ساتھ یہاں کچھ دیر رہنا
ہے تو اپنا جلیہ میرے مطابق کرنا ہو گا“ لب تمہاری
بدولت میں اپنے فریڈز کے سامنے شرمندہ نہیں ہو
سکتی۔“ اس کے دو ٹوک لہجے پہ لب کانٹے اس نے
بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔

”جی کب تک آئے گا؟“ وہ واپس کلب کی طرف
جاتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

”بس آتا ہی ہو گا“ ابھی اتنا وقت نہیں ہوا۔“
حشر نے لا پرواہی سے کہا۔

کچھ دیر بائیں کرنے کے بعد وہ اسے ایک بار اسٹول
پر بیٹھنے کا کہہ کر دوبارہ ڈانس فلور پر چلی گئی تھی۔

بے دلی سے وہ کلب میں بیٹھی ہوئی تھی جہاں رات
کے اس سپر میلے کا سہا تھا۔ تیز آواز میں کانوں کو چیرتا
میوزک اور لوگوں کا ہجوم۔ اسے وہاں بہت ٹھن ہو
رہی تھی۔ یہاں ایڈریڈ کی نہ صرف انٹری فری تھی بلکہ
اندر انیس ڈریک بھی مفت سرو کیا جاتا تھا اور مردوں کو
کافی میسج ایڈریڈنگ کرنا پڑتی تھی اس کی وجہ خلافتا
کاروباری تھی۔ لڑکیوں کے چکر میں زیادہ سے زیادہ مرد
وہاں آتے تھے۔ وہ سہمی ہوئی الگ تھلگ سی بیٹھی
تھی جب وہ اس کے پاس ڈریک لے کر آئی لیکن
اس نے انکار کر دیا تھا وہ کندھے اچکا کر حیرت سے وہاں
سے چلی گئی وہاں اکثر لڑکیاں اپنے بوائے فریڈز کے
ساتھ تھیں۔ جو سٹیکل تھیں وہ اپنا پارٹنر تلاش کرنے
میں مصروف تھیں۔ وہ خاموشی سے اس انجان ماحول
میں بیٹھی تھی۔ اسے یہ سب دیکھ کر وحشت ہو رہی
تھی وہ وہاں ان فٹ تھی۔ اس شور و غوغا سے اس کے
اعصاب پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ بار بجے کے بعد
میوزک کا موڈ بدل جاتا تھا۔

اب بن اسٹاپ میوزک شروع ہو چکا تھا۔ میوزک
کالہ ہو بدلاتو لوگوں کا جوش و خروش بھی عروج پہ تھا۔
میوزک کے شور سے اس کا دل اٹھٹ رہا تھا۔ مستحضر
تک صبر سے وہ اس بے ہنگم اور بیہوش شور کو برداشت
کرتی رہی لیکن جب اس کا ضبط ختم ہو گیا تو وہ وہاں
سے اٹھ کر ایک بار پھر حشر کے پاس گئی۔

میں اگر مزید چھ دیر یہاں بیٹھی تو بالکل ہو جاؤں گی۔" اس نے چلا تے ہوئے سحرش سے کہا۔
 "میں چیک کرتی ہوں جی اب تک کیوں نہیں آیا تم ایسا کرو اور روم میں چل کر بیٹھو تب تک میں جی کا پتا کرتی ہوں۔" کلب سے نکل کر سحرش اسے ہوٹل روم کی طرف لے آئی تھی۔ ایک کمرے کے سامنے رک کر اس نے کارڈ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ کارڈ کو اس نے دیوار پہ لگے سوئچ میں پھنسا یا تو کمرہ روشن ہو گیا۔
 "تم یہاں آرام سے بیٹھو" میں ابھی آئی ہوں۔" سحرش اسے اس کمرے میں بٹھا کر واپس جا رہی تھی۔
 "یہ کس کا کمرہ ہے سحرش؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ پائی تھی۔

"میری فریڈ کا کمرہ ہے" آج ہی بنگا ک سے آئی ہے چند دن گھونٹے پھر نے پچھلی بار آئی تھی تو ہماری اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ خود اس وقت نیچے کلب میں ہے تم بے فکر ہو کر یہاں بیٹھو میں جی کا پتا کرتی ہوں۔" اسے مطمئن کرنے کے بعد سحرش اپنے فون پہ کوئی نمبر ملائی کمرے سے نکل گئی تھی۔
 وہ خاموشی سے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ایک اچھٹی نگاہ کرے پر ڈالی۔ یہ کمرہ نہیں ایک سوئیٹ تھا۔ جہازی سائز پیش قیمت بینڈ اور میچنگ کلاؤچ، قیمتی لیمپ سے چھلکتی دودھیا لائٹ وہاں مٹی بار بھی تھا۔

اچانک لاک کھلنے کی آواز یہ اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ بہت چنڈ سم اور خوش شکل تھا۔ اس کی عمر تیس اکتیس سال کے قریب تھی۔ گندی رنگت اور برکشش زہین آنکھیں اس کی شخصیت کو اور بھی متاثر کن بنا رہی تھیں۔ اس کی شخصیت اتنی برکشش تھی کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی عشق میں گرفتار ہو سکتا تھا، لیکن وہ اسے دیکھ کر بری طرح ڈر گئی تھی۔

ہوٹل لابی سے پارکنگ ہل تک آتے شاید صدیاں

بیٹ گئی تھیں۔ قدم بوجھل تھے یا وقت ختم کیا تھا یہ راز وہ جان نہیں پایا تھا۔
 آج کا پورا دن خوشگوار مگر راتھا اس لیے وہ بہترین موڈ میں تھا۔ صبح گیارہ بجے وہ لاہور آیا تھا اور پھر اس نے اپنی زندگی کی بہترین شاپنگ کی تھی اور آج ہی اس نے اپنے ہینس کی سب سے ہنسی ڈیل سائن کی تھی۔
 سرریوں کی پہلی بارش کے بعد اس کا موڈ اور بھی اچھا ہو گیا تھا۔ ویسے بھی کچھ عرصے سے موسموں کا تغیر اس کے دل پہ اثر انداز ہونے لگا تھا۔ اپنے امریکی دوست کو ساتھ لے کر وہ اس مقامی فائو اسٹار ہوٹل میں آیا تھا اور اب وہ دونوں ڈنر کے بعد رست ہی اچھے موڈ میں ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے کہ سامنے کے منظر نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔
 "نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے خود کھائی کی۔

جانسن اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔ اس نے چونک کر اپنے ساتھ کھڑے سفید فام کو دیکھا۔
 "مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے وقار!" اس کی آڑی ہوئی رنگت دیکھ کر کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس وقت اب سیٹ ہے۔
 "آئی تھینک سو۔" صبح ملوں گے" رچرڈ جانسن کا قیام اسی ہوٹل میں تھا اس لیے اسے لابی سے رخصت کر کے وہ اب پارکنگ کی طرف جا رہا تھا جہاں اس کا ڈرائیور انتظار کر رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر ایک بار پھر ابھر آیا تھا۔ ڈرائیور کی وجہ سے ہوٹل میں معمولی کارش تھا۔ وہ اوپر والی منزل پہ بنے ریٹورنٹ سے نکلا تھا اس لیے شاید وہ اسے پہلے نہیں دیکھ پایا تھا یا پھر وہ ابھی کچھ دیر پہلے وہاں آئی تھی۔ اس کی تیاری ہمیشہ متاثر کن ہوتی تھی لیکن وہ آج غیر معمولی حسین لگ رہی تھی۔ یوں تو اس پہ ہر رنگ چھا تھا لیکن اس سفید لباس میں وہ کسی دیو مالائی داستان کا حصہ لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رکشے جگنو دیکھ کر اسے اپنا دل ہاتھوں نے پھسل معلوم ہوتا تھا۔ وہ جب بھی اس سے ملتا اس کے

چہرے سے نکھریں نہیں اٹھاتا تھا اور شاید آج بھی اس کے سامنے بیٹھا حکم مسجد اس سے آنکھیں نہیں ہٹاتا تھا اس کا نازک ہاتھ تھا وہ اسے ایک انگوٹھی پہنا رہا تھا اور وہ جانتا تھا اس میں بڑے پتھر میرے ہیں۔ ایسی ہی ایک بیویوں جڑی انگوٹھی وقار نے بھی اس کے لیے خریدی تھی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے سیاہ زرد سوٹ کی دامن میں جیب میں گیا تھا جس میں اس وقت بھی وہ لٹل کی ڈیڑھ لگی تھی۔

”جیسے ایک خوشی کی خبر سنی تھی بیٹا!“ صابرہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔

”جلدی بتائیں امی! مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا ہے۔“

”آتمہ کا نام ایم بی اے کی میرٹ لسٹ میں آیا ہے۔“

”کچھ امی؟“ وہ بے اختیار چبھی تو اس کی دم مٹ نے اسے فور سے دیکھا تھا۔ اسے معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھتی وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

”اگلے پتے داخلہ فیس جمع کروائی ہے تم تو جانتی ہو نا روشنی تیساریں بن کر اس یونیورسٹی میں داخلے کی کتنی خواہش تھی۔ اپنا نام میرٹ لسٹ میں دیکھ کر تو اس کے پاؤں زمین پہ نہیں ٹک رہے ہیں۔“

”ہاں امی! اس نے محنت بھی تو بہت کی تھی اور پھر اسے بڑھائی کا شوق بھی ہے“ تب بس جلدی سے اس کا داخلہ یونیورسٹی میں کروادیں۔“ وہ آتمہ کی کامیابی پہ بہت خوش تھی۔

اس کے ابو کی کتنی خواہش تھی کہ ان کی دونوں بیٹیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں لیکن ان کی طویل بیماری اور پھر وفات کے بعد گھر کا سارا بوجھ کم عمری میں ہی اس کے کندھوں پہ آگیا تھا۔ صابرہ خود محض آنکھوں میں تھیں اور زندگی میں بڑا وقت آنے پر وہ اپنی بیٹیوں کے لیے کچھ نہیں کر پاتی تھیں۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کرتی تھیں۔ ان کے خلوہ ایک معمولی تنخواہ

دار ملازم تھے۔ ان کی وفات کے وقت روشنی بیوی اسے کر رہی تھی۔ وہ بڑھائی میں بہت اچھی نہیں تھی لیکن آگے بڑھنے کی خواہش رکھتی تھی۔ گھر کے حالات کی وجہ سے وہ بی بی اے میں داخلہ نہیں لے سکی تھی کیونکہ اسے اپنی چھوٹی بہن اور بیویوں کی ذمہ داری سنبھالنی تھی۔ اس کے والد کے ایک پرانے دوست کی وجہ سے اسے ایک رانیوٹ کمپنی میں ٹیلیفون آپریٹر کی ملازمت مل گئی تھی۔ اگر الوار انکل کا حوالہ نہ ہوتا تو اسے یہ لو کر ہی بھی نہ مل پاتی کیونکہ اس معمولی سی جاب کے لیے بھی اس سے زیادہ تعلیمی قابلیت رکھنے والے امیدواروں کی لمبی لائن تھی۔ وہ سال بعد اس کی تنخواہ آٹھ سے دس ہزار ہو گئی تھی جو ان کی زندگی میں کوئی بڑا بلاؤ نہیں لائی تھی مگر وہ مطمئن تھی کیونکہ اس کے گھر والے عزت کی زندگی گزار رہے تھے اور انہیں اپنے نام نماد رشتے داروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا رہتا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر اور موٹا بھوتا پس کر بھی وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی تھی۔

آتمہ انٹر کرپسی تھی جب روشنی کو کسی نے وہابی میں کنٹریکٹ پہ ہونے والی بھرتیوں کا بتایا۔ اس کمپنی کو ایک بہت بڑے گروپ کے وہابی میں واقع سپر اسٹورز کے لیے سیلز گرل اور سیلز بوائے چاہیے تھے۔ اسی طرز کے اسٹور اس کمپنی نے پاکستان میں بھی بنائے تھے۔ روشنی کو اس ملازمت میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ پچھلے دو سال میں اس کی شخصیت میں بہت تبدیلی آچکا تھا۔ مہینے کے دس ہزار روپے کوئی اتنی بڑی رقم نہیں تھی جس پہ تین لوگ اپنی تمام عمر کی ملازمت کر لیتے اور پھر وہ نہیں چاہتی تھی کہ آتمہ اس کی طرح اپنی بڑھائی مکمل نہ کر پاتی۔ اس نے اس ملازمت سے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ملانہ تنخواہ کے ساتھ رہائش اور ٹرانسپورٹ بھی شامل تھی اور یہ ایک پُرکشش پیکج تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے یہ ملازمت مل گئی تھی۔ وہ سال کے کنٹریکٹ پہ دو ہزار روپہ ملانہ تنخواہ اس کی زندگی کے

بتایا۔

”ای میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ میں تو اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ آپ کو بھیج دیتی ہوں۔ میرے پاس جتنے پیسے ہوتے ہیں ان میں پورا مہینہ کس مصیبت سے گزارتا ہے وہ میں جانتی ہوں۔“

”تمہارا وہاں خرچہ کتنا ہوتا ہے روشنی؟ رہائش؟“

”راہپور سب تو مفت میں ملتا ہے تمہیں۔“ صاحبہ نے منہ بتایا۔

”وہی بہت منگتا ہے ای! اپنی بھی پیسوں سے خرید کے پتہ پڑتا ہے۔“ وہ بھی گواہ میں ہوئی لیکن اس نے انہیں اس رہائش کا نہیں بتایا جو آٹھ ہائے دس فٹ کا ایک کمرہ تھی اور جسے وہ پانچ لڑکیوں کے ساتھ شیئر کرتی تھی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے روشنی! ہم تمہارے پیسے ہوئے پیسوں سے پیش کر رہے ہیں۔ اس منگائی کے دور میں چالیس ہزار کی اوقات ہی گیا ہے۔ گھر کا کرایہ آٹھ کے اور میرے اخراجات کے بعد اگر کوئی مسلمان آجائے تو ہزار پانچ سو تو ایسے ہی نکل جاتا ہے۔“ وہ دس ہزار ماہانہ ملنے پہ طن میں دس بار شکر ادا کر لے والی اپنی ماں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حیران رہ گئی تھی۔

”کون مسلمان ای؟“ اسے سمجھانے کے ہم پہ بھی شاک لگا تھا۔

”کیا ہم لاوارث ہیں؟ تمہارے ابا کے اور میرے کتنے رشتے دار ہیں۔ باہر جا کر اپنوں کو بھول گئی ہو۔“

”ای! آپ ان رشتے داروں کی بات کر رہی ہیں جو ابا کی موت کے بعد اس لیے ہمارے گھر نہیں آتے تھے کہ کہیں ہم ان سے کوئی بدوشا منگ لیں۔“

”تم پیسے بھیج رہی ہو یا نہیں؟ اس فون کا بھی بل آتا ہے جو تمہارے پیسے چالیس ہزار میں سے ہی لوا کر ہوتا ہے۔“ صاحبہ نے طنز سے کہا۔

”ای! میرے پاس اس وقت فقط اتنے پیسے ہیں کہ میں مہینے کے باقی دس دن ٹائم کھانا کھا سکوں۔ میں نے آج تک اپنی ضرورت کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا یا ہے اور یہاں سب میری طرح محنت

کھتے مسائل حل کر سکتی تھی۔ ویرا، میڈیکل اور ٹرننگ کے ساتھ اگر وہ چاہتی تو یہ دوسل کا کنٹریکٹ دے دیتی ہو سکتا تھا۔

صاحبہ نے اسے منع کیا تھا و اسے روکے نہیں بھیجنا چاہتی تھیں لیکن اس نے انہیں سمجھایا کہ وہی کچھ معلومات میں ملتا اور سے زیادہ محفوظ شہر ہے۔

”تمہیں اکیلی کیسے رہو گی؟“

”میں اکیلی ٹھوڑی ہوں گی ای! میرے ساتھ اور بھی بہت سی لڑکیاں ہوں گی۔“

”لیکن روشنی!“

”آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا ہو گا ای! ہمور ہاٹل خواستہ صاحبہ نے اسے دینی جانے کی اجازت دے دی تھی۔

وہ دینی آگئی تھی۔ دوسل سے وہ ان کے لیے مشقت کر رہی تھی۔ آٹھ کھنڈ کلچے لی اے کر چکی تھی اور اب ایم پی اے کرنے لگی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین اسٹوڈنٹ تھی۔ اس کے ہاتھ سے لگا تھا سا ہوا ایک مضبوط درخت بننے والا تھا۔ کچھ عرصے میں وہ پھل دینے لگے۔ بس دوسل اور۔ پھر آٹھ کا ایم پی اے ہو جائے گا تو وہ پاکستان واپس چلی جائے گی۔ آٹھ کو تو پاکستان میں بھی بہت اچھی نوکری مل سکتی تھی اور ان دوسلوں میں اس کی بھی نے بھی خوب بچت کر لی ہو گی۔ وہ تو دس ہزار میں بھی گھر بہت اچھے سے چلایا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ تین لوگ تھے اور اب تو وہ ہر ماہ انہیں چالیس ہزار بھیجتی تھی۔ صاحبہ سے باتیں کرتے وہ آنے والے اچھے وقت کے خواب دیکھنے لگی تھی۔

”روشنی! آٹھ کے داخلہ کے لیے پچاس ہزار روپے بھیج دینا!“ صاحبہ کی آواز سن کر وہ اپنے خواب سے باہر آئی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں ای! آپ؟“ اسے لگا اس نے کچھ غلط سنا ہے۔

”کیا ہو گیا ہے روشنی! ابھی بتایا تو ہے تمہیں آٹھ کی داخلہ فیس اگلے پختے جمع کروانی ہے، پھر اگلی فیس وہ کہہ رہی تھی چھ ماہ بعد جائے گی۔“ صاحبہ نے تھپتھپا

مزدوری کر کے تھوڑی سی تنخواہ میں گزارہ کرتے ہیں۔
 ایسے میں کسی سے لوہا مانگ کر میں نہ خود شرمندہ ہو
 سکتی ہوں اور نہ انہیں شرمندہ کر سکتی ہوں۔ "ہفتہ نور
 دہیسے لہجے میں اس نے بات ختم کی اور فون بند کر دیا
 تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ کی پٹیلی سے اس نے اپنی
 آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور کمرے میں آ
 گئی۔ اندر اس وقت پانچ غیر ملکی لڑکیاں تھیں جن کے
 اپنے مسائل تھے، ان کے سامنے کیا آنسو بہا۔
 موبائل فون ہاتھوں میں تھا، وہ دھچکے دھکے سے
 کم مسم بھی تھی۔ سون دو سال پرانی لکیوں میں بٹک رہا
 تھا جب وہ پہلی بار دعویٰ آئی تھی۔ بظاہر بہت خود اعتماد
 اور بڈر دکھائی دینے والی روشنی نے جب پردیس میں
 پہلا قدم رکھا تو اس کا دل بچے کی طرح کتب رہا تھا۔
 صابرو کو بچے جانے والے سارے دلا سے وہ اس وقت
 بھول گئی تھی۔ وسوسے اور خوف کا ساتھ بچھن
 اٹھائے اسے ڈر رہا تھا۔ لیکن اس کا فائدہ یہ تھیں اس
 سبب ملوی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا بڑا قدم اپنی ہل اور
 بہن کی بہتر زندگی کے لیے اٹھایا تھا۔

ایرپورٹ سے کمپنی کی بس اسے اور چند دوسرے
 ملازمین کو لے کر ایک گنجان علاقے میں داخل ہوئی
 تھی۔ اس کے ساتھ زیادہ تعداد موبائل کی بھی اور لن
 کے حلیمے اور گنگو کے انداز سے اس نے یہی اندازہ
 لگایا کہ وہ سب مزدور طبقہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف
 اچھی عمارتیں اسکل اسکریپر عمارتیں سر اٹھائے کھڑی
 تھیں۔ یہ ڈیرہ کا علاقہ تھا۔ بس اب اندر ملنی سڑک سے
 ہوتی ہوئی ایک بلڈنگ کے سامنے رک گئی تھی۔
 وہ سری عمارت کے برعکس یہ ایک پرانی تین منزلہ
 عمارت تھی۔ اس بلڈنگ کی تیسری منزل پر واقع ایک
 چھوٹے سے فلیٹ میں اس کا قیام تھا جس میں ایک بیڈ
 مدم اور ایک ہل تھا۔ بچن اور لاٹھری کا انتظام بھی
 تھا۔ کمرے میں جا بجا کھومنیوں۔ زینے کپڑے لٹکے تھے
 اور بک بیڈ رکھنے کے بعد ہل چلنے پھرنے کی جگہ نہیں
 تھی۔ اس کے علاوہ اس ایک کمرے میں مزید پانچ
 لڑکیاں رہتی تھیں اور باہر ہل میں بھی چھ لڑکیوں کا قیام

تھا۔ اسے بعد میں پتا چلا کہ اس قسم کی رہائش کو یہاں
 بیڈ اسٹیس کہتے ہیں۔ اس کے کمرے میں ایک ایندین
 دو فلپا تھی اور دو چھنی نرگد لڑکیاں رہتی تھیں۔ اس
 بلڈنگ اور اس سے ملحقہ قومیوں اور رنگو نسل کے
 لوگوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ اس کے برعکس وہ سب
 لڑکیاں بہت بولڈ اور پراعتماد تھیں۔

وہ سب یہاں اس سے پہلے سے وہ رہتی تھیں اور
 ان کے پاس اپنے ملکوں سے زیادہ دعویٰ کی معلومات
 تھیں۔ شروع شروع میں اسے ان کے ساتھ
 ایڈجسٹ کرنے میں کچھ پریشانی ہوئی اور ان کے
 رویوں سے وہ الجھن محسوس کرتی تھی، لیکن آہستہ
 آہستہ اس نے خود کو وہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر
 لیا تھا۔ اس نے ان کے طور طریقوں اور بول چال پر
 کبھی اختلاف اور نا پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا اور
 یہی ایک واحد طریقہ تھا جو کسی بھی ملٹی کلچر سوسائٹی میں
 سمجھل ہونے کی پہلی اور آخری کنجی ہے۔ وہ کلم میں
 بے تحاشا مصروف ہو گئی تھی۔ ہفتہ میں ایک چھنی ملتی
 اور وہ دن اس کا اندر رہی اور اگلے ہفتے کی تیاری میں گزار
 جاتا۔ اسی دن وہ تھوڑا بہت کھانا بھی بناتی تھی۔ اس
 کی دویم ہفتیس زیادہ تر ن فوڈیہ انحصار کرتی تھیں جو
 اکثر سی فوڈ ہوتا تھا اور اسے اس کھانے سے کھن آتی
 تھی۔ ایندین لڑکیاں کیرالہ کی تھیں اور انہوں نے
 میس لگوا یا ہوا تھا۔ یہاں آکر اس نے سب سے پہلے
 اپنے لیے ایک موبائل فون خریدا تھا۔ یہ عیاشی نہیں
 ضرورت تھی اور اس کی یہ ضرورت صرف دو سو روپے
 میں پوری ہو گئی تھی۔ اگلے چند ماہ اس نے کمر آدھی
 تنخواہ بچھوائی تھی کیونکہ توہمے پیسوں سے اس کو وہ رقم
 واپس کرنی تھی جو کنٹریکٹ حاصل کرنے کے لیے اس
 نے اپنی سہیلی کے والد سے قرض لی تھی۔

یہاں اسے سیرا ریکٹ کے عملے کی طرح سیاہ پینٹ
 اور سفید شرٹ پہننی تھی، چند لڑکیاں اسکرٹ بھی
 پہنتی تھیں، لیکن وہ تو خود کو پینٹ میں بھی بے آرام
 محسوس کرتی تھی کیونکہ اس سے پہلے وہ کبھی چادر کے
 بغیر کمرے نہیں نکلی تھی۔ اس کا فادوڑہ کمرہ چادر کی

ایڈیٹر خوب انجوائے کرتی تھیں اور ان میں صرف
فلپائن اور چائینز میں پاکستانی اور انڈین بھی شامل
تھیں شروع شروع میں اسے حیرت ہوتی لیکن جلد ہی
وہ اس کی وجہ بھی جان گئی تھی۔ کئی بار اس نے لنڈا اور
جینی کو مختلف لڑکوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ ویک ایڈیٹر
اگر ان کی ڈیوٹی نہ ہوتی تو وہ پوری رات کمرے میں
واپس نہیں آتی تھیں۔ اس دن صبح چھ بجے اپنی ڈیوٹی
ختم کر کے واپس آ رہی تھی جب اس نے لنڈا کو
لڑکھاتے قدموں کے ساتھ بلڈنگ کی میڑھیاں
چڑھتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا لباس دیکھ کر اس کا
سر شرم سے جھک گیا تھا۔

یہاں آ کر اس نے دنیا کا جو روپ دیکھا اور جن
مسائل کا شکار رہی ان سب کا ذکر اس نے صابر سے
نہیں کیا تھا۔ وہ انہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔
اس نے تو انہیں یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اسے مشلوں
کے کاٹنے سے ایک بار کتنی بری لگتی ہو گئی تھی اور
بخار میں بھی وہ کبھی چھٹی نہیں کر سکی تھی۔ اس کے
لیے یہ اتنے بڑے مسائل نہیں تھے۔ اس نے بہت کم
عمر ہی سے محنت کرنا شروع کی تھی اور جلد ہی اس ٹلف
روم میں کی علوی ہو گئی تھی۔ فون کی نکل بہت دیر سے
بج رہی تھی۔ اس نے اسکرین پر نظر دوڑائی تو پاکستان کا
نمبر دیکھ کر جلد ہی سے فون ریسیو کیا۔ شاید ای کو اپنی
زیادتی کا احساس ہو گیا تھا اس لیے اسے دوبارہ کل کر
رہی تھیں۔ پہلی سے آنکھوں کی نمی صاف کرتے
اس نے سوچا اور کل ریسیو کی۔

”ہیلو آئی!“ وہ سری طرف آئہ تھی۔
”ہاں آئہ! ایسی ہو؟“ اس نے اپنی پھولی بہن کی
توازی میں کر محبت سے کہا۔
”اگر تم نے اگلے ہفتے تک میرے ایڈیشن کے
مے نہیں بھجوائے تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں میں خود
کسی کر لوں گی۔“ وہ چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”تم ہوش میں تو ہو آئہ؟“ وہ آئہ کی بات سن کر
بے تحاشہ پریشان ہو گئی تھی۔
”میں اس وقت پورے ہوش و حواس میں ہوں۔“

کئی کو پورا کر لیتی تھی۔ پچھلے دو سالوں میں روپے کی
تھکنی قدر نے پاکستان بھیننے والے روپوں میں اضافہ کر
دیا تھا لیکن وہی جیسے مسئلے شہر میں روز مواتراجات کے
لیے اسے تھوڑی بہت رقم کی ضرورت تھی۔ اس کی
ڈیوٹی بہت سخت اور شفٹوں میں ہوا کرتی تھی۔ یہاں کا
موسم شدید تھا اور سال بھر گرمی ہی رہتی تھی۔ اس شہر
کی ہائی لائف دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ دکانوں پر بھی
میں پر ایڈیٹا اشیا اس نے بھی خواب میں بھی نہیں
دیکھی تھیں۔ اس کے ساتھ رہنے والی لڑکیاں بھی ہر ماہ
کے آغاز میں اپنی مخواہ کا برادھ اپنی لہلہ کو بیچ جوتی
تھی۔ لنڈا اپنے دوست کے اپنی ماں کے پاس فلپائن چھوڑ کر
آئی ہوئی تھی۔ جینی کا شو ہر فلپائن سے وہی آنے کے
لیے پر تول رہا تھا۔ جونی کو اپنے جنر کے لیے دس لاکھ
روپے چاہیے تھے ورنہ اس کی مگنی ختم ہو جاتی اور
ہائی کی لڑکیاں بھی ایسی ہی کسی نہ کسی مجبوری میں وہاں
رہتی تھیں۔ لن کی باتیں سن کر اسے اندازہ ہوتا تھا کہ
اپنے لائف اسٹائل کو بہتر بنانے کے لیے وہ کسی حد
تک بھی جاسکتی تھیں۔ اس کی طرح لن کے پاس بھی
بہت معمولی رقم ہی چلتی تھی لیکن پھر بھی ان کا رہن
سمن روشنی سے بہت بہتر تھا۔ جتنے پیسوں میں روشنی
مہینے کی گروسری کر کے اپنے کھانے کا انتظام کرتی تھی۔
اتنے پیسے تو لنڈا ایک دن میں بیوی پارلر میں اڑا آتی
تھی۔

میٹرو کے پانچ درہم بچانے کے لیے کبھی کبھی وہ
پیدل چلتی تھی ایسے میں اس کے سستے جوتوں سے اس
کے پاؤں میں چھالے بن جاتے تھے۔ وہ ماہ پہلے اس
نے صابرہ اور آئہ کو بہت سے تحائف بھیجے تھے جو
اس نے یہاں کی سستی دکانوں سے خریدے تھے۔
اس کی ایک ملنے والی پاکستان جا رہی تھی اسی لیے اس
نے ایک ماہ اور ٹائم کر کے اس کے ہاتھ اپنی ماں اور
بہن کے لیے وہ سارا سامان بھجوا دیا تھا اور ایک سالہ تک وہ
بغیر کسی چھٹی کے کام کرتی رہی تھی۔ اس نے پچھلے دو
سال میں کبھی کسی ایچے ریٹورنٹ سے کھانا نہیں کھایا
تھا جبکہ اس کے ساتھ کام کرنے والی اکثر لڑکیاں ویک

اتنے سالوں سے خلل ہاتھ بیٹھی ہیں۔ آپ کو یاد نہیں، جب ایک ماہ پہلے لن کی کوئی ملنے والی پاکستان چھٹیوں آئی تھی تو کتنا سلسلن بھجوا یا تھا انہوں نے اس کے پیسے کہاں سے آئے تھے۔

”میں بھی تو یہی حیران ہوں۔ آخر دو سال میں اس نے کیا اتنی تھوڑی بچت بھی نہ کی ہوگی کہ بسن کے داخلے کے لیے چالیس پچاس ہزار ہی بھجوا دے۔“ صاحبہ نے منہ ہلایا۔

”اب کو تو بات کرنا ہی نہیں آتی نہ کھانا بڈاؤ والا ہے تو کیسے پیسے بھجوا میں گی۔“

آتمہ نے فریج سے ڈبہ نکال کر جوس گلاس میں ایڑی ملا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چند سال پہلے لن کے گھر کے حالات مختلف تھے، لیکن اب حالات ببل چکے تھے اور ان کے مزاج بھی۔



کل رات سے وہ اپنے کمرے میں رہتا تھا، پچھلے کئی محنتوں میں اس نے بے تحاشا سگریٹ پھونک ڈالی تھی۔ سگریٹ کے لوہ جلتے جلتے جا بجا کارپٹ پہ بکھرے ہوئے تھے۔ فینڈ سے اس کے پیوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن مایوف ہو چکا تھا۔ وہ سونا چاہتا تھا لیکن اس وقت صرف خود کو اذیت دے رہا تھا۔ یادیں کسی قسم کی ریل کی طرح ذہن کے پردے پہ چلتی جا رہی تھیں۔ شاید اس دن لانی کی بلابی سے نکل رہا تھا جب اس نے پہلی بار اس کو دیکھا تھا۔

”نرسٹ می بڈلی! میں نے اس سے پہلے اتنا شاندار لائیو کانسرٹ نہیں دیکھا۔“ زندگی سے بھرپور شغف اور چیخ توازا اس کے کانوں سے گھرائی۔

”میں تو خود عاطف کو فل فارم میں دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔“ لاسری لڑکی نے بھوکا کیا۔

وہ دونوں شاید کوئی کانسرٹ دیکھ کر باہر نکلے تھیں۔ اس نے گھڑی کو دیکھا جہاں اس وقت باران بج رہے تھے۔

”عاطف کو اتنے قریب سے دیکھا میرا کتنا بڑا خواب

جانتی ہوں کتنے احسان کیسے ہیں تم نے مجھ پر لیکن اس وقت تم میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نہیں کھینچ سکتیں آہی۔ تمہیں ایمان نہیں ہے میں نے اس یونورٹی میں داخلہ لینے کے لیے دن رات ایک کیا ہے اور اب جب میرا خواب پورا ہونے کا وقت آیا ہے تو تم خود کو گھٹن میں سے بل کی طرح نہیں نکل سکتی ہو۔ اگر تم نے یہی سب کرنا تھا تو پھر چند سال پہلے ہی کر لیتیں۔ اس وقت لوگوں کو اپنا بڑا پن دکھا کر عظمت کا میفل گلے میں سجایا اور آج جب میرے مستقبل کی سمت کا حصن ہونے لگا ہے تو تم نے ہاتھ اٹھا لیے ہیں۔“ آتمہ کی باتیں اس کے دل میں نشتر کی طرح گئی تھیں۔

”لیکن آتمہ! میرے پاس اس وقت اتنے پیسے نہیں ہیں۔ میں تو۔“ آتمہ نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

”میں یہ سب نہیں جانتی۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر میری فیس لوانہ ہوگی تو میرا سہل ضلع ہو جائے گا اور میں یہ برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ اس ذلت اور رسوائی سے اچھا ہے میں اپنی جان دے دوں۔ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر آتمہ نے کل ڈسکونکٹ کر دی تھی۔

اس نے شکست خوردگی سے فون اپنے ساتھ رکھا۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیک دکھا تھا۔ کمرے میں اب کوئی نہیں تھا اس لیے وہ مل بھر کر رو سکتی تھی لیکن اچانک ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور جینی باہر نکلے اس نے سرخ رنگ کا انتہائی مختصر سلویس لباس پہن رکھا تھا۔ اسے یاد آیا آج جو یک ایئر ٹائٹ ہے شاید وہ کلب جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔



”دیکھنا کیسے انتظام ہوتا ہے لب چیل کل۔“ فون رکھ کر آتمہ نے قاتلانہ نظروں سے صاحبہ کی طرف دیکھا۔

”آہی کیسے سب پیسے ہوتے ہیں ابی آپ کو کیا لگتا ہے نہ اتنی اچھی ہیں کہ ساری تنخواہ ہمیں بھجوا کر

ہوں۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے قدم آگے بڑھایا۔
 "ہمیں شادی مل جاتا ہے۔" مدلی کی کواڑیہ اس نے
 رک کر انہیں دیکھا۔ دوسری لڑکی اسے گھور رہی
 تھی۔

مدلی نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ
 ہوئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس سنگ مرمر کے
 منہ کو دیکھا جو ناراض ناراض سی مدلی کے ساتھ چل
 پڑی تھی۔ اپنی سیاہ مرسلین میں اس نے انہیں
 بحفاظت شادی کی ایک کوٹھی کے باہر اتار دیا۔ مدلی
 نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر وہ دونوں اس گھر میں
 داخل ہو گئی تھیں۔



اگلی بار ان سے اس کی ملاقات جیل روڈ کے
 سیکڑ وٹلہ میں ہوئی تھی جہاں وہ دونوں خوش گہریوں
 میں مصروف تھیں۔ ارد گرد سے بے نیاز وہ اس وقت
 برگر انجوائے کر رہی تھیں۔

"ہیلو گرلز!" خوش اخلاقی سے کتاہ ان کی نیل
 کے پاس کھڑا تھا۔ ان دونوں نے ہی اسے چونک کے
 دیکھا اور پھر مدلی کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہو گئی
 تھی۔ البتہ اس کے چہرے پہ آج بھی ٹولفٹ کا بورڈ لگا
 تھا۔

"آپ ہمیشہ اتنے غصے میں ہوتی ہیں یا مجھے دیکھ کر
 ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔" مدلی کی آخری وہ لب
 ان کے ساتھ ہی نیل پہ بیٹھ چکا تھا۔
 "میں اجنبیوں سے بے تکلف نہیں ہوتی۔" اس
 نے نکا سا جواب دیا تھا۔

"اجنبی پہلی ملاقات میں ہوتے ہیں اور ہم پہلے بھی
 مل چکے ہیں، لگتا ہے آپ کی یادداشت بہت بری ہے
 مس۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مسزوقار حسن! آپ کی مدد کے لیے مدلی اس صحن
 آپ کا شکریہ ادا کر چکی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے
 کہا۔

"لیکن مدد تو میں نے آپ کی بھی کی تھی۔" دوسری

تھا۔ مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا ہے۔"
 اس بار اس نے ذرا غور سے ان دونوں کو دیکھا۔
 سفید لباس میں وہ کسی راج ہنس کی طرح حسین لگ
 رہی تھی۔ اس کے خوب صورت کھلے بال اس کی
 شخصیت کو اور بھی دلکش بنا رہے تھے۔ اس کی منہور
 ناک اور کاجل سے بھری آنکھیں دیکھ کر وہ نظر ہٹانا
 بھول گیا تھا۔

"ڈرائیور کہیں لایا گیا ہے؟" اس کے انداز میں
 ہزاری تھی۔

"میں کل کر کے پتا کرتی ہوں۔" دوسری لڑکی جس
 کا نام مدلی تھا وہ اب اپنے موبائل سے کل مار رہی
 تھی۔

"ہیلو بشر! تم آئے نہیں اب تک ہم کب سے
 تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اوہو اس وقت تو کوئی ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔"
 "چلو ہم یہیں انتظار کرتے ہیں تم جلدی آؤ۔"
 "کیا ہوا؟ اس نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ کہہ رہا ہے گاڑی کا ٹائر پکڑ ہو گیا ہے اور اس
 کے پاس جیک نہیں ہے۔ گھر جا رہا تھا کسی سے لفٹ
 لے کر۔ آنے میں شاید گھنٹہ لگ جائے۔" اس کے
 چہرے پر پریشانی تھی۔

"کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" ان کی
 گفتگو سن کر وہ آگے بڑھا تھا۔ مغرور ناک والی نے
 ناک سکڑ کر اسے دیکھا۔

"معاف کیجئے گا میں آپ کی گفتگو سن چکا ہوں اگر
 آپ چاہیں تو میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اس
 نے خوش اخلاقی سے آفر کی۔

"یقین جانے میں ایک شریف توی ہوں اور ابھی
 ایک بزنس ڈنر سے فارغ ہوا ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔"
 اس نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

"دکار حسن!" مدلی نے ہا آواز بلند پر معاندہ ظالم
 حینہ ابھی تک خاموش تھی۔

"اگر آپ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی ہیں تو میں چلا

مرفہ محلاتی کے تمام ریکارڈ ٹوٹ چکے تھے۔
 ”تو آپ چاہتے ہیں اس احسان کے لیے میں باعمر
 آپ کی منتوں رہوں اور جہاں بھی آپ کو دیکھوں۔
 کورکس بجا لاؤں۔“ وہ بگڑے ہوئے تیروں سے
 بولی۔

اتنی حسین آواز اور اتنا روڈ انداز۔ وہ بھی اپنی قسم کا
 ایک ہی قہر اس بار سنے شکست کے آثار نمایاں
 تھے۔ سب لڑکیوں کی طرح تعریف بہر حال اس کی بھی
 کمزوری تھی۔

دن گزر رہے تھے اور ان دونوں کے درمیان فاصلے
 کم ہو رہے تھے۔ آٹھ نوے دنوں میں ان کی ملاقاتوں
 میں اضافہ ہو چکا تھا۔

”وائٹ فگر تم بہت اچھا لگتا ہے۔“ کانن نیٹ
 کے سفید لباس میں اسے دیکھ کر اس نے سر ہلایا۔ تم سے
 ملنا میری زندگی کا سب سے حسین اتفاق ہے۔ ان چند
 ماہ میں تمہیں بہت چاہنے لگا ہوں۔“ ارد گرد سے بے
 نیاز دل سے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ ”میں نے کبھی
 نہیں سوچا تھا کہ میں کسی لڑکی سے ایسی جذباتی
 باتیں کروں گا لیکن میں خود پہ اپنا اختیار کھونے لگا
 ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے تمہیں جانا ہے دل
 میرے بس میں نہیں رہا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں
 آنکھیں ڈال لے کر رہا تھا۔

”سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔ قار کہ کوئی اتنی
 آسانی سے مجھے فتح کر لے گا۔“ وہ لوار سے مسکرائی
 تھی۔

وہ بلا کی پراعتماد تھی۔ ذہین اور دلکش۔ وہ دل و
 جان سے اس پر فدا تھا۔

اس دن لانگ ڈرائیو پہ اس کا چاندی رنگ کا ہاتھ
 قہر سے دست خوش تھا۔ ”شادی کرو گی مجھ سے؟“

”ہمیں ملے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو ٹھیک
 سے ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں ہیں اور تم شادی
 تک پہنچ گئے ہو۔“ اس نے بے نیازی سے ہانک
 مکیڑی۔ اس کی علت پہ وہ اور بھی وارفتہ لگا ہوں سے
 اسے دیکھ رہا تھا۔

”خیر اب اتنا تھوڑا وقت بھی نہیں ہوا، ہمیں ملے۔“
 مجھے تو لگتا ہے میں تمہیں برسوں سے جانتا ہوں۔
 اب تو دل کر رہا ہے جلدی سے تم میری زندگی میں
 آ جاؤ۔ مجھ سے اب اور صبر نہیں ہوتا ہے۔“
 ”لیکن اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی میری اسٹڈیز
 مکمل نہیں ہوئی ہیں۔“

”تم شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم مکمل کر سکتی ہو۔“
 ”لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی“ ممی میری
 تعلیم کو لے کر بہت پوزیسو ہیں۔ شادی جیسی ذمہ داری
 اور پرحالتی میں اکٹھے منہج نہیں کر سکتی۔ ابھی تو میں
 لائف کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔“ دھیرے سے اپنا
 ہاتھ نکل کر وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔

”شادی نہ سنی تو کر سکتے ہیں۔“ وقار نے
 تجویز دی۔

”اس کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔“ اس نے
 مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اس کی سانگہ۔ وقار نے اسے سیاہ شیفون کا تہی
 لباس کھنے میں دیا تھا۔ اس کی خواہش کے مطابق وہ
 ڈریس اس نے اس کے ساتھ ڈنر پہ آتے ہوئے پہنا
 تھا۔ سیاہ ٹھٹھل کی ڈریس میں بند ایک قیمتی برسٹل اس کو
 دیتے ہوئے اس نے محبت سے اپنے سامنے بیٹھے اس
 سالی کو دیکھا جو بن پلاسٹک موش کر دینے کی صلاحیت
 رکھتی تھی۔

ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وقار کے
 دل میں اس کی محبت اور بھی مگری ہوئی جا رہی تھی۔
 محبت چیز ہی ایسی ہے یہ آنکھوں کی طرح وجود کو جکڑ کر
 بے بس کر دیتی ہے پھر اس کے شکنجے سے نکلنا آسان
 نہیں ہوتا۔

”تم نے اپنی والدہ کو میرے بارے میں بتایا؟“ وہ
 فون پر اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ممی ابھی لندن گئی ہوئی ہیں۔ ان کی کزن کی بیٹی کی
 شادی ہے ایک میڈن تو لگ ہی جائے گا۔ آئیں گی تو
 انہیں تمہارے بارے میں بتاؤں گی۔“

وہ آج کل بہت خوش رہنے لگا تھا اور اس کی خوشی

شادی کرنا چاہتے ہو۔“ انہوں نے اسے چند لمحوں کی بات کا حوالہ دیا۔ ویسے بھی زہیر ماسوں سے اس رشتے کی بات مئی ڈیڈی کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی۔ لور یہ تو ایک رسمی سی کلر دولی ہے۔

”پھر بھی آپ کو ایک بار مجھ سے تو پوچھنا چاہیے تھا یہ میری زندگی کا سؤل ہے۔“

”ہم تو دولہ بعد ختم دولوں کی شادی پلان کر رہے ہیں۔“ وہ قدرے خائف تھیں۔ وقار نے بھی ان کی بات کو رد نہیں کیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ ان سے اس لمحے میں بات کر رہا تھا۔ وہ اس کے رویے سے تلاں تھیں۔

”تو آپ ان کو منع کر دیں؟ کیونکہ میں کنزنی سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”لیکن کیوں؟ آخر کیا برائی ہے کنزنی میں؟“

”آپلی اگونی برائی نہیں ہے بلکہ وہ تو بہت اچھی لور سمجھ دار لڑکی ہے لیکن میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”کیا تمہیں اس بات کی بھی پروا نہیں کہ تمہارے اس فیصلے سے میری زندگی پہ کیا اثر پڑے گا میرے سرسٹل میں میری کتنی آکورڈ پوزیشن ہو جائے گی اور پھر ہمارے بیوں کا فیصلہ ہے۔“

”آپلی اہ ہمارے ماسوں کی فیملی ہے اور میری کنزنی کے ساتھ شادی سے آپ کی ذاتی زندگی کا کیا تعلق؟ وہ لوگ آپ کو اس طرح استعمال نہیں کر سکتے ہیں۔“

”ماسوں کی فیملی تھی لیکن اب وہ میرے سرسٹل والے ہیں اور تم اگر بیوں کا طے کیا ہو ایہ رشتہ ختم کر کے تو اس کے سنگم مجھے بھی تو بھگتنے ہوں گے۔“

”میری اس سے کوئی انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہے میں ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس میں صرف بزرگوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی ساری زندگی ایک ایسے انسان کے ساتھ گزار دوں۔ جس کی میرے ساتھ ہم آہنگی ہی نہ ہو۔ یہ کوئی دسویں صدی نہیں ہے۔“

”تو میری شادی بھی تو مئی ڈیڈی لور ماسوں نے ہی طے کی تھی کیا میری خرم کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ

اس وقت لایا ہوا تھی جب اس نے وقار کو یہ بتایا کہ وہ اپنی والدہ سے اس کے بارے میں بات کر چکی ہے اور جلد ہی وہ دونوں منگنی کر لیں گے۔ وہ ان کی اگوتی بیٹی ہے اور انہیں اس کی خوشی ہر حال میں عزیز ہے۔ اگلے چند دن میں اس کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ اسے دینی جانا تھا۔

اس کا موبائل کافی دیر سے بج رہا تھا۔ عائشہ کی کل دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کل اینڈ کی۔

”آپلی کیسی ہیں آپ؟“ وہ اس کی بڑی بہن تھیں جو شادی کے بعد کنیڈا میں مقیم تھیں۔ ان کی شادی ان کے ماسوں کے بیٹے خرم سے ہوئی تھی۔ وقار اور عائشہ کے والدین کا چند سال پہلے ایک ٹرنک ملائے میں انتقال ہو چکا تھا۔ وہ وقار سے آٹھ سال بڑی تھیں۔ ہمیشہ سے ان سے بہت المیہ تھا۔ ان کے والد حسن منیر کا تعلق سینٹرل پنجاب کے ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ بہت تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ان کا خاندان بڑا قدامت پسند اور روایتی تھا۔ خاندانی اقدار اور حسب نسب کی توجہ بھی وہ غائب کی طرح بیروی کرتے تھے۔ ان کی ذاتی کنسرکشن کمپنی تھی۔ وقار کی ابتدائی تعلیم کانوینٹ کی تھی وہ بیس سال کا تھا جب ان کے والدین کی وفات ہو گئی۔ ان دنوں وقار امریکہ میں تھا۔ حسن منیر کی وفات کے بعد وقار عائشہ کے اور بھی قریب آ گیا تھا۔ اپنی تعلیم ختم کر کے چند سال پہلے وقار پاکستان آ گیا تھا اور اب اپنے والد کی کنسرکشن کمپنی کو دوبارہ اسٹیبلیش کر رہا تھا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور عائشہ کی تو جیسے اس میں جان تھی سال میں ایک بار وہ وقار سے ملنے ضرور آتی تھیں۔

”میں نے کنزنی سے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔“

رسمی سلام دعا کے بعد وہ اسے زہیر ماسوں کی بیٹی سے اس کا رشتہ طے ہونے کے متعلق بتا رہی تھیں۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ! آپ نے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔“ وہ ان کی بات سن کے حیران رہ گیا تھا۔

”لیکن تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم میری پسند سے

نہیں ہے۔ کیا ہم ایک اچھی زندگی نہیں گزار رہے ہیں؟ تم نے سوچا ہے تمہارے اس طرح اس رشتے کو ختم کرنے سے خرم اور میرے درمیان کتنا شلوں آجائے گا۔

”آپ ابھی خود ہی مجھے اپنی خرم بھائی کے ساتھ انڈر شیڈنگ کے متعلق بتا رہی تھیں اگر آپ دونوں کے درمیان انڈر شیڈنگ ہے تو پھر تو انہیں آپ کے ساتھ اس موضوع پر بات کر لینی چاہیے۔“

”تم کہتے خود غرض کب سے ہو گئے وقار؟“

”میں اپنی زندگی اگر اپنے طریقے سے گزارا چاہوں تو کیا یہ خود غرضی ہے؟“ وہ جانتا تھا کہ اس کا رویہ عائشہ کو دکھ کر رہا ہے۔ اس نے آج تک ان کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا لیکن وہ کسی صورت ان کی بات نہیں مان سکتا تھا۔ اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”ہاں آج می ڈیڈی زندہ ہوتے تو تم بھی مجھ سے اس لمحے میں بات نہ کرتے اپنے سرال والوں کے سامنے کتنے فخر سے میں نے تمہاری اور کنزی کی شادی کے حوالے سے بات کی ہے اور اب میں کتنا شرمندہ ہوں گی ان سب کے سامنے۔“ وہ اسے اب ایموشنلی بلیک میل کر رہی تھیں وقار جانتا تھا وہ کچھ معاملات میں بہت رواجی عورت ہیں۔ وقار کی زندگی میں بہت اہم تھیں اور وہ جانتا تھا کسی نہ کسی طرح وہ وقار کو اس شادی کے لیے قائل کر لیں گی۔

لیکن میں شادی کر چکا ہوں۔“ وقار کے پاس جھوٹ بولنے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہیں تھا۔ اس جھوٹ کی صورت میں کم سے کم وہ اس متوقع شادی سے بچ گیا تھا۔ حالانکہ اسے اندازہ تھا کہ اس بات کو سن کر عائشہ کو شدید دکھ پہنچا ہو گا لیکن یہ سب بدلتی ہو گا اور جب اپنی محبت سے اسے ملوے گا تو وہ بھی اس کی پسند کی داد دے گی۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ اسے معاف کر دیں گی۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور دل کے فیصلے دل پہ حاوی ہوتے ہیں۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے شادی کر لی ہے اور

مجھے یہاں تک نہیں۔“

”میں آپ کو بتانے والا تھا اس حالات ہی کچھ ایسے ہوئے کہ مجھے شادی کرنی پڑ گئی۔“ وہ جھوٹ۔ جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس بات کے بعد کنزی کو الاباب ختم ہو جائے گا۔ وہ ٹھیک سوچ رہا تھا عائشہ نے اس وقت غصے سے فون بند کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ اپنی چند دن پہلے کی بات پر بری طرح بچتا رہا تھا۔

ماضی سے نکل کر وہ حال میں لوٹ آیا تھا۔ اس کا فون بہت دیر سے بج رہا تھا۔ بے دلی سے اس نے ہاتھ پر صبا کر فون اٹھیند کیا۔ آفس سے بار بار کل آرہی تھی۔

”سر! آپ کی کل وہ بہر کی سیٹ کنفرم کرا دی ہے۔“ اس کی سیکرٹری اسے اطلاع دے رہی تھی۔

”کلیں کی سیٹ؟“ اس نے غائب مافی سے کہا اور پھر اسے یاد آیا کہ اسے کل دینی جانا تھا۔

”مجھے ساری ڈیٹیلز ای میل کرو میں آج اور کل آفس نہیں آؤں گا۔“ اس نے کل کل دی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ صحیح معنوں میں کس بات سے اپ سیٹ ہے۔ کل رات اسے مقامی ایم این اے کے ادبائش بیٹے اعظم مسعود کے ساتھ دیکھ کر پھر اپنی بہن سے بولے اس جھوٹ کی وجہ سے۔

پچھلے ایک ماہ سے ان دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ دینی میں تھا اور اگر پاکستان آتا بھی تو اس کی مصروفیت علوجہ پہ ہوتی۔ لیکن فون پہ کئی بار بات ہو چکی تھی اور کل اس سے مل کر وہ اسے زندگی کا بہترین تحفہ بنا چاہتا تھا۔ عائشہ سے اس نے جو کچھ کہا وہ اسے پہلے ہی بتا چکا تھا اور اب بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی دے کر وہ اسے بالکل پروپوز کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جو اس نے کل ہی خریدی تھی۔ اگلے چند دن میں وہ دونوں شادی کر لیں گے اور پھر وہ عائشہ کو بھی منالے گا۔ وہ آفس سے رخصت کے ساتھ نکلا تھا اور رخصت کے لیے اسے آواری لے آیا تھا۔ بیس رخصت کا قیام بھی تھا لیکن جو کچھ اس نے دیکھا اس نے صحیح معنوں میں اس کے پیوں کے نیچے سے زمین نکل دی تھی۔

وہ جو پچھلے ایک سال سے اس حسن کی دیوی کے

ناراضی ختم کر سکتا تھا جس نے پچھلے دورے ایک ہفتے سے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا لیکن اگر عائشہ نے یہ سب جان کر شادی کرنے کی بات دوبارہ شروع کر دی پھر کیا کرے گا؟

ان حالات میں وہ شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ شاید اسے کچھ وقت خاموشی سے گزارنا چاہیے۔ وہ اپنی یہ وہ خود جا کر عائشہ کو سب کچھ بتا دے گا اور اس سے ریکورسٹ کرے گا کہ وہ اسے شادی کے لیے فی الحال مجبور مت کرے۔ تمام راستہ وہ یہی سوچتا رہا تھا۔ ایسپورٹ سے اس نے ہمیشہ کی طرح گاڑی پک کی اور اب اس کا رخ ہوٹل حیات کیلویا کی طرف تھا۔ وہی اس کے لیے اجنبی شہر نہ تھا بلکہ شاید یہ اس کے لیے سیکنڈ ہوم کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج وہ قارہی پہنچ گیا تھا جہاں کل شیخ زائد مدظلہ بنے لن کے دفتر میں وہ معاملہ دستخط ہونا تھا۔ کپڑے بدل کر وہ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا جب اس کے فہن پہ عائشہ کی کل آئی۔

”تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے کی! رسی سلام دعا کے بعد وہ لب اس سے کہہ رہی تھیں۔“

”آئی! میں شرمندہ ہوں۔“ وہ مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا۔

”تم جانتے ہو میں نے تمہیں بھائی نہیں بڑا سمجھا ہے“ می ڈیڈی کی وقت کے بعد میں یہ اپنا حق سمجھتی تھی کہ تمہاری شادی میں خود کرتی لیکن تم نے مجھ سے یہ حق چھین کر ثابت کر دیا ہے کہ تمہاری نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ وہ بہت لب سیٹ تھیں۔

”آئی پلیز میے مت کہیں۔ آپ میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہیں یہ آپ بھی جانتی ہیں میں آپ کو تکلیف پہنچانے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔“ وہ لن کی گواہی سن کر مزید شرب ہو گیا تھا اور ان سے کہنے ہی والا تھا کہ اس نے سب کچھ جھوٹ کہا ہے لیکن اس سے پہلے عائشہ نے اس کی بات کٹ دی۔

عشق میں دیوانہ ہوا پھر رہا تھا اپنی بہن سے اتنا بڑا جھوٹ بول کر اس نے اس کا دل دکھایا تھا اور اس وقت وہ جیب میں منگنی کی انگوٹھی ہالے اس سے اگلے چند دن میں شادی کے بعد گرا رہا تھا وہ اس کی آنکھوں کے سامنے احسن مسعود کے پیر ہلے اور کرپٹ بیٹے اعظم مسعود کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اسٹنٹ کمشنر اعظم مسعود کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی پوسٹنگ آج کل وقار کے آپلی علاقے میں تھی اور چند بار اس سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ بھی جانتا تھا کہ اعظم کتنا بڑا فلرٹ ہے اور اس کے چند معاشقوں کی خبر تو وقار کو بھی تھی۔ اعظم کے ساتھ بیٹھے اس کی آنکھوں میں وہی چمک اور وارفتگی تھی جو کبھی داپنے لیے دیکھتا تھا اس کا نازک ہاتھ اس وقت اعظم کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے بہت محبت سے ایک بیش قیمت انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ یہ لمس کبھی وقار کا نصیب تھا۔ اس سے پہلے کوئی رات وقار پہ اتنی بھاری نہیں گزری تھی۔



اس نے کئی بار شینہ کے راتے نمبر پہ رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی اس امید کے ساتھ کہ شاید وہ اس بار بھی اس کی کچھ ملا کر دے، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے اس بار رقم کی لڑائی لگ آسان نہیں ہوگی لیکن پھر بھی وہ لودر ہانم کر کے اس کو روئے واپس کر دیتی لیکن اس کی بات نہ ہو سکی تھی۔ اور پھر اچانک اسے عہرش کا خیال آیا۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل فون اٹھایا اور اس کے نمبر پہ کل ملانے لگی۔ تیسری بیل پہ اس کی کل اٹھلی گئی تھی۔



صبح کے دس بج چکے تھے فلائٹ کی اینکونسنٹ ہو رہی تھی۔ اپنا بیگ اٹھائے لب و ایریج کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اتنی طور پہ کافی شرب تھا۔ اس مسئلہ کو کس طرح حل کرے۔ کیا وہ عائشہ کو بتا دے کہ اس نے اس سے جھوٹ کہا تھا۔ تم سے کم بوج بول کر وہ اپنی بہن کی

”سحرش کی آواز میں حیرت اور بے یقینی کا ماحول
تار تھا۔“

سحرش روشنی کے ساتھ اسی سپردار کیٹ میں کام
کرتی تھی اس کا تعلق بھی پاکستان سے تھا اور وہ
روشنی سے سینیر تھی۔ روشنی کی اس کے ساتھ
معمول کی بات چیت تو تھی لیکن دوستی ہرگز نہیں تھی
اور اس کی بنیادی وجہ اس کا وہی لائف اسٹائل تھا جو
جینی اور لنڈا کا تھا۔ روشنی کو وہ ان دونوں سے زیادہ بری
لگتی تھی اور اس کا برملا اظہار وہ کئی بار باتوں باتوں میں
کر چکی تھی۔ جینی اور لنڈا کو نہ مذہب روکتا تھا نہ
تہذیب لیکن سحرش اس حدود سے مستثنیٰ نہیں تھی۔
وہ چاہ کر بھی سحرش سے اپنی ناپسندیدگی چھپا نہیں پالی
تھی اور اس دن کے بعد تو اس کی لہلہکنج عمل کر اس
کے سامنے آگئی تھیں جب روشنی نے سحرش کے ڈر
کی آفر کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ وہ حرام پیسے سے خریدا
ہوا کھانا نہیں کھا سکتی۔

”سحرش! میں اس وقت بہت پریشانی میں ہوں اور
مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ دیمی آواز میں
اس نے کہا۔

”یہ تو میری خوش نصیبی ہے جو روشنی نے مجھے
اس قابل سمجھا کہ میں اس کی کوئی مدد کر سکوں۔“ اس
کے لیےج کی کٹ کو نظر انداز کرتے روشنی نے اپنا مدعا
بیان کیا۔

”سحرش! مجھے پچاس ہزار روپے کی اشد ضرورت
ہے اور صرف تم ہی ہو جو اس وقت میری مدد کر سکتی
ہو۔“ اس کی بے بسی پہ ایک فہمیدہ لگاتے سحرش نے
اس کی شرمندگی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

”ڈیر روشنی، تم مجھے اپنا دوست سمجھو یا نہ سمجھو
لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا دوست ہی سمجھا ہے اور
مجھے بہت خوشی ہوگی تمہاری مدد کر کے، کم سے کم تم
نے میرے حرام کے پیسے کو نہ استعمال کرنے کی اپنی
قسم کو تو توڑا۔“ وہ حنائے ہوئے بولی۔

”سحرش! یہ میری بہن کی زندگی کا سوال ہے۔ اس
کے داخلے کے لیے مجھے اسے پچاس ہزار بھجوانے ہیں

”چھوٹو یہ سب باتیں۔ میں نے تمہیں یہ بتانے
کے لیے فون کیا ہے کہ مجھے تم سے کوئی گلہ شکوہ نہیں
ہے۔ میری ذمہ داریوں اور خرچے سے بات ہو گئی ہے اور
ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ ہمیں تمہاری خوشی میں خوش
ہونا چاہیے اور پھر شاید اسی میں اللہ کی بہتری ہو۔
زبردستی کے رشتے دیر پا نہیں ہوتے ہیں۔ حالانکہ
کنزٹی بہت اپ پیٹ ہے لیکن میں نے اس سے بھی
مطلق نامکلی ہے۔ بس اب میں جلد سے جلد پاکستان آ
کر تمہاری بیوی سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس مہینے کے
آخر میں میرا ارادہ ہے پاکستان آنے کا۔ سحر اور اسامہ
کلوٹر بریک بھی شروع ہونے والا ہے اور پھر تمہارا
دلیر بھی کر لیں گے۔“

انہوں نے اپنے دونوں بچوں کے نام ایسے وہ ان کی
بات سن کر سر پکڑ کر جھٹ گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا
کہ عائشہ اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتیں اور وہ جلد
اسے فون کرے گی اسی لیے اس نے فوری شادی کا
فیصلہ کیا تھا لیکن اب حالات بدل چکے تھے اس کا
مبھوت بری طرح اس کے گلے پڑ گیا تھا۔ ان کو اپنی
شادی کی جھوٹی خبر سنا کر وہ دن بعد اس نے اپنی بات کو
عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک قیمتی انگوٹھی بھی
خریدی تھی۔ وہ اس کی والدہ سے مل کر انہیں اس
رشتے کے لیے راضی کر لے گا اور پھر جلد ہی اس سے
شادی کر لے گا۔ سب بلا تک کر کے وہ خود کو بہت بلکا
پھلکا محسوس کر رہا تھا لیکن یہاں تو بازی ہی پلٹ گئی
تھی۔ عائشہ اسے معاف کر کے اس کی وہ شادی قبول کر
چکی تھیں جو ابھی ہوئی نہیں تھی اور اب وہ اس کی اس
بیوی سے ملنے آرہی تھیں جس کا وجود بھی نہیں تھا۔ وہ
سر پکڑ کر نہ بیٹھا تو کور کیا کرتا۔



”ہلو سحرش! میں روشنی بول رہی ہوں۔“ فون پہ
اس کی آواز سن کر وہ فوراً سمجھ گئی۔

”روشنی۔۔۔ اوسے ہاں روشنی بولو سب ٹھیک تو
ہے؟ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ تم نے مجھے کل کیا

اگر میں نے جلد سے جلد اس رقم کا بندہ دست نہیں کیا تو خودکشی کر لے گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں جلد سے جلد تمہارے پیسے واپس کر دوں گی۔“ اس نے التجائیہ کہا۔

”واپسی کی کون بات کر رہا ہے سوئی، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اتنے پیسے نہیں ہیں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں آج رات کو کلب آ جاؤ، جہی کی طرف میرا کچھ حساب لگتا ہے۔ اس سے پیسے کر میں تمہیں دے دوں گی اور کل صبح تم اپنی بہن کو وہ پیسے ٹرانسفر کرو گے۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”لیکن اس کے لیے مجھے کلب آنے کی کیا ضرورت ہے، میں تم سے کل پیسے لے لوں گی۔“ روشنی نے قدرے تامل سے کہا۔

”میں تو آج لمیٹیٹ کے بعد فرینڈز کے ساتھ فلیجو اچلی جاؤں گی۔ میرا یہ پورا ویک آف ہے تو میں نے سوچا کچھ دن آرام کر آؤں۔ اگر تم کلب نہیں آنا چاہتیں تو پھر میرے اگلے ہفتے لے لیں۔ ہم لوگ تو کلب سے ہی آگے چلے جائیں گے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”نہیں، نہیں۔ میں کلب آ جاؤں گی۔“ وہ رات دس بجے کے قریب وہاں پہنچی تھی اب وہ اس کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سحرش اسے بٹھا کر گئی تھی۔

”کون ہیں آپ اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ اسے دیکھتے ساتھ وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔ روشنی کی بات پر کسی قسم کا رد عمل ظاہر کیے بغیر وہ بہت اعتدال کے ساتھ کمرے کا دروازہ بند کرنا اس کے سامنے بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ!“ شائستہ اور دھیسے لہجے میں کتاہ مسلسل اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خوف سے کلپتہ وہ واپس اسی صوفہ پر بیٹھ گئی تھی۔ سینٹرل لے سی کمرے میں بھی ابے پسینہ آ رہا تھا۔

”آپ کون ہیں اور سلی کیا کر رہے ہیں۔“ روشنی نے خود پر قابو پاتے اس سے پوچھا۔

”میرا نام وقار حسن ہے اور میں ایک آرکائیوٹکٹ ہوں۔ کیا اتنا تعارف کافی ہے؟“ اس لہجے میں کچھ تھا جو روشنی سمجھ نہ پائی۔

”ویسے یہ کمرہ میں نے بک کیا تھا۔“ وہ مزید بولا۔

”لیکن سحرش تو کہہ رہی تھی یہ کمرہ اس کی دوست کا ہے۔“ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے اس نے ہمت کر کے کہا۔

”اس لڑکی نے مجھ سے ایک ہزار روپہم کمیشن لیا ہے تمہیں یہاں پہنچانے کے لیے کیا یہ بات تم نہیں جانتیں؟“ اس کی بات پر حیران ہو کر وہ اسے بتا رہا تھا۔

”کون لڑکی؟“ سحرش؟ وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے میرے ساتھ۔“ اسے شاک لگا تھا۔

”اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ رات گزارنے کے لیے مجھے ایک لڑکی فراہم کر سکتی ہے اور بدلے میں اسے کم سے کم ایک ہزار کمیشن چاہیے۔“ وہ اسے تفصیلات بتا رہا تھا۔

”تب غلط سمجھ رہے ہیں۔“ روشنی ہدایتی کیفیت میں چلائی تھی۔ ”میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔“

”دیکھو اگر تمہیں کچھ زیادہ رقم چاہیے تو میں تمہیں زیادہ بھی دینے کو تیار ہوں۔“ وہ شائستہ اور مہذب لہجے میں بولا تھا۔ ”وہ لڑکی کہہ رہی تھی تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے کیا میں جان سکتا ہوں تمہیں ایسی کیا مجبوری ہے؟“

اس کے نرم لہجے میں پوچھنے والے سوال پر بہت دیر کے رکنے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ وقار اسے کلنی دیر تک اپنے ناسے دوتے رکھتا رہا۔ پھر بڑا دم فرنگ سے پانی کی بوتل نکال کر اسے پانی پلا جو ایک ہی لمحوں میں پیا گئی تھی۔ پیاس سے اس کے حلق میں کلنے چھ رہے تھے۔ بے دردی سے لبوں کو کلنتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

”مجھے اس وقت پچاس ہزار روپے کی اشد ضرورت ہے۔ اپنی بہن کے واسطے کے لیے مجھے پاکستان پیسے بھجوانے ہیں۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو میری بہن اپنی جان دے دے گی۔“ اور پھر مختصر گفتگوں میں اس نے وقار کو اپنی کمائی سنائی تھی۔

ساری بات سننے کے بعد اس نے ایک کہی سانس لی۔

”تمہیں نہیں لگتا تمہارے گھر والے تمہارے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے ایک لڑکی ہو کر تم انہیں سپورٹ کر رہی ہو۔ ان کی ضرورتوں کے لیے دن رات خود کو بھانک کر رہی ہو اور وہ تمہیں لکھنپلاٹ کر رہے ہیں۔ تمہاری والدہ کا فرض بنتا تھا کہ وہ تمہاری بھجوری کو سمجھتیں اور تمہاری بہن کو سمجھائیں۔ لہذا اس کی بے وقوفی کا ساتھ دے رہی ہیں۔“ وقار اس کی بات سن کر غیر جانبدار بھوک رہا تھا۔

”میری بہن بہت خدی ہے ہم سب اس سے بہت پیار کرتے ہیں اور اسے پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔ میں تو اثر کے بعد آگے پڑھ نہیں پاتی لیکن اس نے دن رات محنت کی ہے۔ ایم بی اے کرنا اس کا خواب ہے بس اسی لیے وہ اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہے۔“

”تم فضول ان کی سائڈ لے رہی ہو حالانکہ مجھے تو وہ لوگ بہت بے حس لگے ہیں۔ تم کہہ رہی ہو تم پہلے ہی اپنی تمام کمائی انہیں بھجوا رہی ہو، فیس تو ہر چہ ماہ بعد دوا کرتی ہوگی، اگلے دو سال تم مزید پیسے کہاں سے لاؤ گی؟“

”میں اور باقی کمالی گی۔ جو ماہ میں میرے پاس اتنے پیسے با آسانی ہو جائیں گے کہ میں اپنی بہن کی فیس دے پاؤں۔“

”پھر تو وہ یہ سسٹم ڈراپ کر سکتی تھی۔“

”اس طرح اس کا سال منقطع ہو جائے۔“

”یہ اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں تھا۔ خیر نہیں تمہیں پچاس ہزار روپے دینے کو تیار ہوں۔“

”آپ پچاس ہزار تو کیا پچاس لاکھ بھی دیں تو میں آپ کے ساتھ ہر رات نہیں گزار سکتی۔“

”میرا تمہارے ساتھ رات گزارنے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔“ اس کی بات سن کر روشنی نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔ اس نے اگلی بات غری سے کہی۔

”میں تمہیں یہ پیسے لوہار دے رہا ہوں۔ جب ہوں مجھ کو اس کی ضرورت۔“

”لیکن میں کیسے آپ سے ادھار لے لوں میں تو آپ کو جانتی بھی نہیں ہوں اور اگر وہیں نہ لوٹ پائی۔“

”تو مت ڈالیں کرنا۔ میں شکایت نہیں کروں گا۔“

”یہ بہت بڑی رقم ہے۔ آپ کی سہیلی ہے کہ آپ نے میری بات سنی اور مجھے گناہ میں ملوث نہیں کیا۔“

آپ کا مجھ پر احسان ہے لیکن میں آپ سے ملے معلومات نہیں چاہتی ہوں۔“

”میں نے تمہیں یہاں کسی گناہ کے ارادے سے بلایا بھی نہیں تھا۔ روشنی میرے اپنے چند مسائل ہیں جو میری زندگی کو بری طرح الجھا رہے ہیں۔ میں عورتوں کی عزت کا خریدار نہیں ہوں بلکہ ایک شریف انسان ہوں۔ اس کرے میں کسی لڑکی کو ملانے کا مقصد عیاشی نہیں بلکہ مجبوری سے جڑا ہے۔ اگر تم چاہو تو میری مدد کر کے مجھے اس پریشانی سے نکل سکتی ہو۔“

بہت الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

”آپ کو ایسی کیا پریشانی ہے۔“ روشنی کو اب اس شخص سے خوف نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے وہ اسے بہت باؤس اور بکھرا ہوا لگا تھا۔

”میں نے اپنی بہن سے جھوٹ بولا تھا کہ میں شادی کر چکا ہوں اور اس ماہ کے آخر میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ میری بیوی سے ملے آ رہی ہے۔“

”آپ نے ان سے یہ جھوٹ کیوں بولا؟“

”بس بچویشن ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی۔“

”تو اب آپ ان کو سچ بتادیں۔“

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے اگر تم چاہو تو میری ایک مدد کر سکتی ہو۔ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چند دن میری بیوی بہن کے رہنا ہو گا۔“

و قار نے روشنی کو اس کی بلڈنگ کے باہر ڈراپ کیا
تھا۔ اس کا کنٹیکٹ نمبر اور یہ کہ اپنے پاس محفوظ کر رکھا
تھا۔

اپنے کمرے میں جا کر روشنی نے سب سے پہلے
وضو کیا اور دو نفل شکرانے کے لوا کیے۔ اللہ نے اسے
کتنی بڑی پریشانی سے بچا لیا تھا اسے منجھوں پہ یقین آ
گیا تھا۔ یہ منجھوی تو تھا جو قار کی صورت میں ایک
فرشتہ بھیج کر اللہ نے اس کی عزت کی حفاظت کی تھی۔
وہ کوئی شیطان بھی ہو سکتا تھا اور آج رات کے بعد وہ
کسی کو منہ دکھانے کے قتل نہ رہتی۔ بہت دیر تک
جدے میں گری وہ اللہ کا شکر ادا کرتی رہی تھی۔

آئمر کو فیس کے پیسے وہ بھجوا چکی تھی۔ صابرہ اور
آئمہ کے رویوں نے اسے ایک پراسیقہ دیا تھا۔ وہ
لوگ اس کی محنت کی کمائی کو بہت آسانی سے خرچ کر
رہے تھے۔ اس نے اس دوران ان سے کوئی رابطہ بھی
نہ کیا تھا کیونکہ وہ دل ہی دل میں ان سے ناراض تھی۔
لیکن وہ جانتی تھی کہ ان سے بہت دن تک ناراض
نہیں رہائے گی۔

حشر سے اس کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی اس کو
کل کرنے پہ ہر رات اسے اس کا نمبر بند ملتا تھا۔ وہ روشنی
کے ساتھ اتنا کھٹیا کھٹیا نہیں کرتی تھی یہ وہ سوچ بھی نہیں
سکتی تھی۔

حشر اچھی طرح جانتی تھی کہ روشنی ایک مضبوط
کردار کی لڑکی ہے اور وہ پول کے عوض خود کو بازار میں
کبھی نہیں لائے گی۔ اس نے پچھلے دو سال میں روشنی
کو بہت قناعت اور استقامت کا مظاہرہ کرتے دیکھا
تھا۔ اندر ہی اندر وہ روشنی کی اس خوبی سے بری طرح
خائف تھی اور یہ رقابت اس وقت اور بھی بڑھ گئی
تھی جب روشنی نے اس کے پیسوں سے کھانا کھانے
سے انکار کر دیا تھا۔ اب جو روشنی نے اس سے مالی مدد
مانگی تو اسے قدرت کی طرف سے روشنی کو نچا دکھانے
کا ایک موقع مل گیا تھا۔ اس کو بازار میں لا کر وہ اسے
ٹھیک اسی مقام پہ لے آئی تھی جہاں وہ خود کمزری تھی۔
”تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تم جانتی ہو“

سکراتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔
”میری ایک بلڈنگ کی چھٹی باقی ہے اسی نے منع کر دیا
تھا کہ خواہ مخواہ خرچا ہو جائے گا۔ اس لیے پاکستان نہیں
جاسکی۔ میں اگر اپنی کروں تو ایک ہفتے تک مجھے چھٹی
مل جائے گی۔“ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا تھا یہ
فحش اس کا حسن تھا اسے نہ جانتے ہوئے بھی اس کی
مدد کر رہا تھا اور پھر وہ کہہ رہا ہے کہ یہ سب اپنی بہن کی
وجہ سے کر رہا ہے اسے وقار کی مدد کرنی چاہیے۔ اس
نے ایک دم فیصلہ کیا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر میں تمہارے ٹریول کی ڈیٹ کچھ دن
میں کنفرم کروں گا۔ میرا آدمی یہاں تمہارے سفر کا
انتظام کر دے گا۔“ روشنی کی بات سن کر اسے حیرت
ہوئی تھی لیکن خود پہ قابو پاتے اس نے دھیمی آواز میں
کہا۔

”چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“ وہ بیڈ سے اٹھ
کر دروازے کی طرف جا رہا تھا۔
”نہیں میں خود چلی جاؤں گی۔“ روشنی نے
چپکاتے ہوئے کہا۔

”رات کتنی ہو چکی ہے۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔“
پختہ لہجے میں کتاہہ بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ
مزہ کچھ نہیں کھپائی۔

”سنو! وہاں سامنے واش روم ہے منہ دھو آؤ۔“
اشارے سے کتاہہ خود کمرے سے باہر جا رہا تھا۔

وہ سر ملاتی ہوئی واش روم میں چل گئی۔ کئی منٹوں
بعد اس نے اپنا چہرہ شیشے میں دیکھا تھا۔ خوب صورت تو
وہ خیر کبھی نہیں تھی لیکن اس وقت جو لگ رہی تھی وہ
خود ہی اپنا آپ دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ میک اپ کے باوجود
وہ صرف کاجل لگاتی تھی جو رونے کے باعث برسرِ کر
چہرے پہ عجیب و غریب نقش و نگار بنا رہا تھا۔ وہی سی
گھر حشر کی لگائی اس شوخ سرخ لب اسٹک نے
پوری کر دی تھی۔ خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھونے کے
بعد اس نے ایک بار پھر اپنے چہرے کو شیشے میں دیکھا۔
اس بار اسے تسلی ہوئی تھی۔ اپنے کچلے ہوئے لیے
بالوں کو سیدھی کر کے سے باہر نکل آئی تھی۔

رہی تھی۔



اگلے چند دنوں میں اس نے اپنی سالانہ چھٹی کے لیے اپلائی کر دیا تھا جو منظور بھی ہو چکی تھی۔ وقار کی طرف سے اسے ٹکٹ مل چکا تھا اسے ایک بلحا پاکستان میں رہنا تھا اور یہ بات وہ صابرہ کو بتا نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے اپنے فون کی روٹنگ کن کرائی تھی۔ اب وہ آسانی سے اپنے فون کے ذریعے لن سے رابطے میں رہ سکتی تھی اور اگر وہ لوگ اسے کل کرتے تو لن کی کل ریسیو بھی کر سکتی تھی۔

ڈیپارچر لاؤنچ میں بیٹھی وہ اس وقت بورڈنگ کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دو سال بعد پاکستان جا رہی تھی، لیکن اس دور لن وہ اپنی ماں اور بہن سے مل نہیں سکتی تھی۔ وہ پہلے جب اس نے صابرہ سے یہ کہا تھا کہ اس کے نئے کانسٹرکٹ کے آواز سے پہلے اسے ایک ماہ کی چھٹی ملے گی اور وہ پاکستان آئے گی تو صابرہ نے اسے منع کر دیا تھا۔ لن کے خیال میں یہ بیسوں کا ضائع تھا وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ اس کا ٹکٹ کمپنی کے ذمے ہے لیکن لن کے ذمے سے حیران ہو کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ صابرہ نے ایک بار بھی یہ اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین ہیں اور پھر اس نے ایک ماہ سے اکٹھے کیے ہوئے اور ٹائم کے پیسوں سے کچھ تحائف خرید کر لن دونوں کو بھجوا دیے تھے۔ فلائٹ کی انوائسمنٹ ہو رہی تھی۔ وہ اب ڈیپارچر گیٹ کے اندر جا رہی تھی۔

ارائیل لاؤنچ میں وقار اسے کچھ فاصلے پر کھڑا نظر آ گیا تھا۔ اس دن کی طرح بہترین لباس میں اور اتنا ہی جاذب نظر۔ اس دن کے برعکس روٹنگ نے کچھ مسئلہ شلوار لیس پہ سیاہ بڑی سی چادر لوڑھی ہوئی تھی پتا نہیں اس نے اسے دیکھ کر پہچانا بھی تھا کہ نہیں۔ روٹنگ اپنا ٹرل بیک ٹھیک اس کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دھلے منہ کے ساتھ وہ بہت خوب صورت تو تھیں لیکن بہت معصوم

تمہاری اس حرکت کے لیے میں تم پر کیس کر سکتی ہوں۔" روٹنگ نے ایک ہفتے بعد سحرش کی ملاقات ہوئی تو بہت غصے میں اس نے کہا تھا۔

"ایک تو میں نے تمہاری مدد کی ہے اور تم انٹا مجھے پولیس کی دھمکی دے رہی ہو۔ یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی کہ یہاں کی پولیس غیر ملکیوں کے تمام معلومات میں کتنی غیر متبادر رہتی ہے۔" وہ اس کی بات سے محفوظ ہوتے ہوئے ہنسنے لگی تھی۔

"سحرش! میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے میرا اس شخص کے ساتھ سودا کر دیا۔" وہ بھی گواہ میں بولی تھی۔

"یہ تو تم اپنے آپ سے پوچھو کہ تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ کتنی ذلت نظر آتی تھی مجھے تمہاری نگاہوں میں اپنے لیے اس دن جب تم نے میری ڈنر کی آفر کو ٹھکرا کر حرام کی کمانی کا طعنہ مارا تھا اس دن سے میں نفرت کرنے لگی تھی تم سے اپنی پارسلوں اور مضبوط کردار پہ بڑا باز تھا تمہیں میں نے سوچا کیوں نہ تمہیں بھی اس ذلت کا مزہ چکھو۔ سوچو تمہارا کام تو ہو گیا ہو گا۔ کلن مل دار آدمی تھا میں نے اسے بتا دیا تھا کہ تمہیں بڑی رقم چاہیے پھر بھی اس نے کمیشن کے طور پر مجھے پورا ایک ہزار روپے دے دیا۔" وہ بے شری سے کہہ رہی تھی۔

اس کی بات سن کر وہ شاک رہ گئی تھی۔

"لعنت ہے تم پر سحرش! ایک عورت تو کیا تم تو انسان کھلانے کے بھی لائق نہیں ہو، تمہیں اگر یہ خوش فہمی ہے کہ اس دن میں نے اپنی عزت کا سودا کر کے اپنی بہن کے ایڈمیشن کی فیس کے پیسے حاصل کیے ہیں تو میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دیتی ہوں۔ اللہ نے تمہارا اٹلاک منصوبہ ناکام بنا کر نہ صرف میری عزت کو محفوظ رکھا ہے بلکہ مجھے اس حرام کمائی کے استعمال سے بھی بچا لیا ہے جو میں تم سے ادھار لینے والی تھی۔" اپنی بات ختم کر کے اس کے چہرے پہ تاسف کی نگاہ ڈالتے روٹنگ وہاں سے چلی گئی تھی۔ سحرش ناقابل یقین حیرت سے اسے اسٹور سے نکلنے دیکھتی

لگ رہی تھی۔
 ”اسلام علیکم“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔
 ”وعلیکم السلام“ سفر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“
 لہجہ سنجیدہ تھا۔

”نہیں۔“ جواب مختصر آیا تھا۔
 ”چلیں۔“ کہہ کر وہ اب پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سورج ابھی کچھ دیر پہلے ہی ظلمع ہوا تھا اور آسمان پہ سورج کی کرنیں ابھی پوری طرح نہیں پھیلی تھیں۔ دونوں کے درمیان اس کی علیک سلیک کے بعد مزید کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے تھکا ہوا لگا تھا شاید اتنی صبح فلائیٹ کی وجہ سے وہ ٹھیک سے سونہ پایا ہو۔ دوستی نے خود ہی وجہ سمجھ لی تھی۔ وہ خود بھی تمام رات کی جاگ ہوئی تھی۔ وہ آج بھی بہت اہمک سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ یہ شہر دوستی کے لیے اجنبی نہیں تھا و قار نہ بھی بتا پھر بھی وہ جانتی تھی کہ گاڑی اس وقت کس علاقے میں جا رہی ہے۔ لیکن اسے حیرت ہوئی جب وقار نے گاڑی کسی گھر کے بجائے ایک بلڈنگ کے سامنے روکی اور اسے ایک فلیٹ میں لے گیا۔ پارٹمنٹ کا دروازہ کھل کر وہ خود اندر نہیں گیا تھا۔

”تمہیں چند دن یہاں رہنا ہو گا۔ اندر ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں اور اگر مجھ سے کوئی بات کرنی ہو تو اس موبائل میں میرا نمبر سیو ہے۔“ ایک موبائل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے اسے چند ضروری ہدایات دیں جو آج کے دن کے حوالے سے تھیں اور پھر تیزی سے واپس چلا گیا۔ دوستی فلیٹ کا دروازہ لاک کرتی اندر آگئی۔ یہ ایک فگژری پارٹمنٹ تھا جو بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ اگلے چند منٹ اس نے اس جگہ کا جائزہ لیا لیکن اور فریج میں بہت سا کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ وہ جہاز میں تھوڑا بہت کھا چکی تھی اس لیے اسے کسی چیز کی طلب نہیں تھی۔ سیانی کا کھانا پی کر وہ بیڈ روم میں آگئی تھی۔ وہ بے تحاشا تھکی ہوئی تھی اور اسے نیند آرہی تھی۔ بہت گہری نیند سوتی تھی اور اس کی آنکھ موبائل کی بیل

سے کھلی تھی۔ اسے چند لمحوں کے لیے سمجھنے میں کہ وہ اس وقت کہاں ہے اور یہ کواز کہاں سے آرہی ہے۔ یہ اس کے موبائل فون کی کواز تھی۔ تھکی ہوئے سیکنڈ میں اس نے کل اینڈ کی گئی۔

”ہیلو! اس نے بوجھل آواز سے کہا۔
 ”تم سو رہی تھیں؟“ اس نے اس کی آواز سن کر اندازہ لگایا تھا۔

”اب جاگ چکی ہوں۔“
 ”لچ کے بعد تیار ہو جانا تمہیں آج دستا سے ملنا ہے۔ میں تمہیں ایک بجے کے بعد پک کر لوں گا۔“ وقار جلدی جلدی بتا رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس وقت اس سے بات کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی کر رہا ہے یا شاید کہیں جا رہا ہے۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی یہ دستا کون ہے اور اسے کہاں جانا ہے لیکن وقار نے اپنی بات ختم کر کے دوسری طرف سے جواب سننے بغیر فون بند کر دیا۔

ڈیرہ بجے کے قریب وہ اسے لینے آگیا تھا۔ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کی سنجیدگی کی وجہ سے کچھ بھی کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا بیوی سیلون کم اسٹوڈیو تھا جہاں ایک میٹرون لور خوش مزاج لڑکی نے اسے دستا کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ وقار کے ساتھ اس کی بات چیت سے روشنی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ دونوں کئی بے تکلف ہیں۔
 ”فری ہو کر مجھے کل کر لینا میں تمہیں پک کر لوں گا۔“ دستا سے بات کرنے کے بعد وہ لب اس سے محتاط تھا۔

اگلے کچھ گھنٹے وہاں کی پویشن اس کے چہرے اور بالوں کو مختلف ٹرنمنٹ رہتی رہی تھیں اور وہ خاموشی اور بے ہوشی سے انہیں ان کا کام کرنے دے رہی تھی۔ ایک طرف بہت سے قیمتی کپڑوں اور جوتوں کا ذخیرہ تھا ان میں ایک لباس کو دستا نے اس کے لیے سہل کٹ کیا تھا۔ پویشن اس کا میک اپ کر رہی تھی اور روشنی آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چہرے پہ ایک بحریر نگہ بولی رہا تھی

لگ رہی تھی لیکن یہ بہت حیرانگی کی بات تھی کہ میک اپ سے اس کا چہرہ یکدم بدلا نہیں تھا بلکہ کلن بچل لگ آ رہی تھی۔

”بہت اچھی لگ رہی ہو غم۔“ ہیرا شائستہ اس کے ہل بٹا چکی تھی، ہنس کے کبے ہاتھوں کو بہت معمولی سی کٹنگ سے ایک خوب صورت شاگل دیا گیا تھا۔

”ایڈیٹور آر ریڈی۔“ شائستہ نے اسے دیکھ کر کہا تھا اب اس کا ہونٹہ ٹھیک کر رہی تھی۔

”لپ ٹر تھو ڈالائٹ نہیں؟“ اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔ میک اپ کے نام پہ ایک ڈارک لپ اسٹیک تو ہونی چاہیے تھی۔ اسے تھوڑی دیر سی ہوئی تھی۔

”وقار کی اسٹائل بدایت ہے کہ میک اپ لائٹ رکھا جائے۔ اسی لیے ہم نے نیوڈ شیڈز استعمال کیے ہیں۔“ وہ لاہر لائی سے کہہ رہی تھی، لیکن اس کی بات سن کر روشنی کلن شرمندہ ہوئی تھی۔

”وقار نے مجھ سے منع کیا تھا کہ تمہارے ہاتھوں کو ہرگز کاٹا نہ جائے۔“ وہ اب اس کے ہاتھوں کو اپنی انگلیوں سے سیٹ کر رہی تھی۔ ”یہ سارے ڈیسڈ تمہارے ساتھ جائیں گے اور اگلے تین دن میری یونیٹ میں سبک اپ کا ٹیوٹوریل دینے پڑے گا۔“ پھر تم خود بھی ایسا ہی میک اپ کرتے لگو گی۔

روشنی جانتی تھی کتنا تردد کیوں ہو رہا ہے۔ وہ وقار حسن کی بیوی کی حیثیت سے اس کی بہن سے ملنے والی تھی، کسی بھی راہ چلتی لڑکی کو اپنی بہن سے نہیں ملوا سکتا تھا۔ ایک عام سی لڑکی کو خاص بنا کر اپنی بہن کے سامنے بولے جھوٹ کا بھرم رکھنے کی خاطر وقار کو اتنا تو کرنا ہی تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”اپنی شادی پہ بلانا مت بھولنا۔“ وہ لب و لسان لہجے میں اس سے کہہ رہی تھی۔

”صیری شادی۔“ اسے حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں تمہاری شادی ہے نا اگلے مہینے مجھے وقار نے بتایا تھا۔ امریکہ جا کر ہمیں بھول مت جانا۔“ وہ جتنے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کی بات کا روشنی کے پاس

کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی وقار نے اسے کیا بتایا تھا وقار اسے لینے آیا تھا اور اس پہ ایک سرسری نگاہ ڈال کر وہ اب شائستہ بات کر رہا تھا۔

اگلے تین دن میں شائستہ کی طرف سے بھیجی گئی یونیٹ میں نے اسے کلن کچھ سکھا دیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ خود بھی اپنا مناسب سائیک اپ کر ہی سکتی ہے۔ ان تمام دنوں میں وقار سے اس کی ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ دن میں ایک دو بار خیریت پوچھنے کے لیے اسے کل کر آتا تھا۔

”تمہیں کچھ چاہیے تو نہیں۔“ کل رند کرنے سے پہلے اس سے پوچھتا تھا۔

اور اس کا جواب ہر بار نہ میں ہوتا۔ وقار سے اس کی ملاقات چار دن بعد ہوئی تھی۔ وہ اسے لینے آیا تھا۔ گاڑی ایک شاندار گھر کے سامنے رکھی تھی اور جو کیدار اس کے ہارن دینے پہ اب سیاہ آہنی وردا نہ کھول رہا تھا۔ اس کا سلیمن ڈگی سے نکل کر وہ خود گھر کے داخلی دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔ اس کی تھلید میں روشنی اس عیاشان گھر میں داخل ہوئی۔ باہر کی طرح گھر کا اندرونی حصہ بھی قابل ستائش تھا۔ ہل گھر بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ فرش پہ بچھے بیش قیمت قالین اور دیواریں پہ لگی قیمتی تصاویر کمین کی امارت سے زیاں اس کے بلذوق ہونے کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ حیران نظروں سے وہ اس جگہ کو دیکھ رہی تھی اور قدم آگے نہیں بڑھا سکی تھی۔ شاید وقار نے اس کا رکنا محسوس کر لیا تھا۔ پیچھے سر کر اب اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف متوجہ پارک تیزی سے قدم بڑھائی اس کے پاس چلی آئی تھی۔ کارڈور سے بائیں طرف وہ ایک کمرے کے سامنے رک کر اس کا وردا نہ کھول رہا تھا۔

”یہ ہمارا کمرہ ہے۔“ ملازم اس کا سلیمن اب کمرے میں رکھ رہا تھا۔ ”تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو تم ملازم سے کہہ سکتی ہو۔“ کمرے کا وردا نہ بند کرتے ہوئے اس نے روشنی سے کہا تھا۔

”کل رات کو عائشہ آپلی پاکستان پہنچ رہی ہیں۔“

اگلے پندرہ دن تمہیں یہاں اس کمرے میں ہی رہنا ہو گا۔" وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 "مجھے ایسی نظروں سے مت دیکھو ورنہ سنی! تم یہاں پوری طرح محفوظ ہو۔ تمہیں مجھ پہ ٹرسٹ کرنا ہو گا۔" وہ جیسے اس کے ان کے لفظوں کو بھی سمجھ گیا تھا۔

"مجھے ست ڈر لگ رہا ہے مگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی اور آپ کی بہن کو سب کچھ پتا چل گیا تو۔" اگر انہوں نے مجھ سے پوچھا ہمارا شادی کب اور کہاں ہوگی میں کس فیملی سے ہوں اور میرے والدین کون ہیں تو میں انہیں کیا بتاؤں گی؟" وہ بہت سارے سوال جو کئی دن سے اس کے ذہن کو الجھا رہے تھے اس نے ایک سی سانس میں پوچھ ڈالے تھے۔

اگر وہ تم سے پوچھیں تو تم ہی کہنا کہ ہم دینی میں ملے تھے اور تمہاری فیملی بھی دینی میں ہے۔ ہاں سب تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ یہاں میری بیوی سے ملنے آ رہی ہیں کوئی انہیں سنی گیشن کرنے نہیں۔ اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ انہیں سب کچھ بتا کیوں نہیں دیتے۔ اتنے سارے جھوٹ بولنے کے بجائے ایک سچ بول کر آپ اس ساری مشکل سے نکل سکتے تھے۔"

"یہ سب کہنا جتنا آسان ہے اس پہ عمل کرنا اتنا ہی دشوار سچ بتانے کی صورت میں مجھے اس کی نند سے شادی کرنا پڑے گی جو میں کسی قیمت پر نہیں کر سکتا اور ویسے بھی ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ اس نے چند ہفتے پہلے کیا تھا۔ وہ بھی اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کھانے کے بعد۔

اپنی ٹانگی کی ٹاٹ ڈھیلی کرنا اب ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا کوٹ بند پہ بڑا تھا۔ روشنی نے ایک نظر اس خوب صورتی سے سجے کمرے پہ ڈالی اور پھر اس کی نظر سامنے پڑے کاؤچ پہ جا گئی۔ اس کے رات کو سونے کا انتظام ہو چکا تھا۔ وہ رات اور اس سے

اگلی تمام راتیں اس نے اسی صوفہ پہ سو کر گزارنی تھیں۔
 اگلی صبح اس کی آنکھ دھواڑے ہوئے والی دھنگ سے کھلی تھی۔ وہ رات صوفہ پہ سوئی تھی اور وقار نے اس کے ہاں سونے پہ کوئی کنکٹ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے اس کی جگہ خود صونے یہ سونے کی آفر کی تھی۔ دھنگ کی توازن پہ وہ دونوں ایک ساتھ جاگے تھے۔

"ملازمہ کلنی لائی ہے تم باہر آ جاؤ۔" وقار نے جلدی سے کہا۔

اپنا ٹیکہ بیڈ پہ رکھ کر وہ اب کمرے کا دروازہ کھول کر کھڑی تھی۔

"السلام علیکم روشنی بیٹا!" یہ عفت ملی تھیں کل رات ہی وقار نے ان سے اس کا تعارف کروایا تھا اور انہوں نے وقار کی دلہن کو ڈھیر بول دعائیں دی تھیں۔ وقار نے کہا تھا یہ خاتون اس کے گھر میں کلنی کے عرصے سے ہیں اور اس کے کپلی گلوں سے ہیں۔ ویسے تو گھر کے بلٹی ملازمین کو بھی یہی بتایا گیا تھا کہ وہ مسوقہ حسن ہے۔

"وعلیکم السلام عفت لی۔" اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ دن سے کلنی کی ٹرے لے کر وہ اب دوبارہ کمرے کا دروازہ بند کر چکی تھی۔ ٹاٹے کی میز پر وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے ہی ملا تعلق تھے جتنا کل رات اس کمرے میں۔ ملازمہ اسے مختلف چیمرس سو کر رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اس کی بیٹی ڈشیز چکھ رہی تھی۔ وقار کے آفس جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ جہازی ساڑ کھڑکی پہ بیٹھ کر وہ ڈالے تھے۔ اس نے کھڑکی کے پردے کی فوری چیمچی سامنے کا سترو کیہ کرنا فریز ہو گئی تھی۔ کمرے کے باہر ایک خوب صورت سونٹنگ پول تھا۔ اس کے دونوں طرف سبزے کی کیا ریاں تھیں۔ پول کے اطراف بہت قیمتی پتھر لگا تھا۔ سامنے دیوار پہ قدوم آئینہ لگا تھا اور چھت کی جگہ لکڑی کی قیمتی آریہ دینی ہوئی تھیں۔ گلاس ڈور کو کھول کر وہ باہر آگئی تھی۔ سونٹنگ پول

کے چالے میں بھرا پانی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ کتنی دیر اس پول کے کنارے بیٹھی رہی تھی۔ اسے وہاں بہت سکون مل رہا تھا۔ وہ ہر کا کھانا اس نے نہیں کھایا تھا۔ گھر میں آج رات کے کھانے کا کافی اہتمام تھا۔ یہ وہ کچن میں جائے بغیر بھی جانتی تھی۔ اسے اس گھر کے کسی بھی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے یہاں لگے چھ دن گزار کر واپس چلے جانا تھا۔

رات کے نو بجے عائشہ اور اس کے بچوں کو لے کر دھار گھر پہنچا۔ عائشہ سے ملے ہوئے وہ جتنا جھجک رہی تھی، من کی خوش اخلاقی اور محبت دیکھ کر وہ اتنی ہی پرسکون ہو چکی تھی۔ سو قار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ انہوں نے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ جو پوچھا تھا وہ اپنے بھائی سے پوچھ چکی تھیں۔ امیر لڈ گرین گھر کے تین شیون ورک والے سوٹ میں مناسب سبک لب کے ساتھ وہ کافی اچھی لگ رہی تھیں۔ عائشہ کو اس کی کم کوئی اور مصحوبیت پسند لگی تھی۔ سو قار سے من کے شکوے مکمل ختم ہو گئے تھے۔

”ہم سے مل کر تو مجھے تسلی ہو گئی ہے کہ اس نے کسی ٹھیک بندی کا انتخاب کیا ہے شادی کے لیے“ ورنہ تو آج کل کی لڑکیاں اتنے نہ کوئی فیملی ویلیوز ہوتی ہیں اور نہ لہجہ۔ اسی لیے تو میں اتنی بھاکم بھاگ بکسٹن آگئی ورنہ اسے اس طرح مجھے بتائے بغیر شادی کرنے پر اتنی جلدی حلق کرنے والی نہیں تھی میں۔“ وہ اسے ہنستے ہوئے بتا رہی تھیں۔

”اب کی بہن بہت اچھی ہیں اور آپ سے پیار بھی بہت کرتی ہیں۔ مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے من سے کچھ چھپاتے ہوئے۔“

”اس سے کچھ بغیر نہیں رہ پائی تھی۔ اگر عائشہ کو ابھی لگی تھی تو اسے بھی عائشہ بہت پسند آئی تھی۔ اتنے بڑے خاندان سے تعلق ہونے کے باوجود اسے بہت شائستہ لگی تھیں۔ من کی باتوں میں لوٹے خاندان اور اسٹیشن کھنٹس ہونے کی جھلک نہیں تھی۔“

”یہ بات تو مجھے بھی دسٹرب کر رہی ہے لیکن میرے پاس اس کے سوائے کوئی حل نہیں تھا۔ وہ لب ٹاپ کھولے بند۔ بیٹھا تھا۔ ہا نہیں دیکھ میں اتنا مصروف تھا۔ رو شنی کو نظر انداز کرنے کے لیے یہ سب کر رہا تھا۔ اگلی صبح گھر میں خوب گھما گھسی تھی۔ سو قار تو صبح ہی آفس چلا گیا تھا۔ عائشہ کے بچے اس کے ساتھ بہت بے تکلف ہو گئے تھے۔ وہ لوگ کہیں کھوئے جانا چاہتے تھے اور من کے اصرار پر وہ بھی من کے ساتھ ہی لگی تھی۔ سو قار کا ڈرائیور انہیں من کی مطلوبہ جگہوں پہ گھماتا رہا تھا۔ سہ پہر میں وہ چاروں گھر واپس آئے تھے۔ عائشہ اسے لے کر کافی شاپنگ کرتی رہی تھیں۔ ”یہ میں تمہارے لیے لے رہی ہوں۔“ ایک گولڈ کے سیٹ کو خریدتے ہوئے انہوں نے رو شنی سے کہا۔ وہ سیٹ بہت قیمتی تھا۔ گولڈ اور کنڈن سے بنا وہ لکھنؤ کسی کے بھی ہوش پاڑا سکتا تھا۔

”یہ تو بہت مہنگا ہے۔“ رو شنی نے حیرت سے کہا۔ ”تو کیا ہوا اب اپنی پیاری سی بھابھی کو کوئی معمولی تحفہ تھوڑی سی ملے گی۔“ وہ بہت محبت سے بولی تھی۔

اس کی شرمندگی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ یہ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں اور میں کیا ہوں۔ وہ ہزار درہم کے عوض کسی کے ساتھ اس کی بیوی ہونے کا ڈر لانا کر رہی ہوں۔ اگر یہ لوگ سچ جان لیں تو یہ سب مجھ سے نفرت کریں گے اور میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہیں گے۔

من کی واپس سہ پہر میں ہوئی تھی اور رو شنی اس کے بعد سے سونچنک پول کے کنارے بیٹھی یہ ہی سوچ رہی تھی۔ اس کا ضمیر اسے بار بار ملامت کر رہا تھا۔ اور یہ سب سوچتے ہوئے اس کی اپنی ماں اور بہن سے شکایتیں بڑھتی جا رہی تھیں جن کی بے حسی اسے اس مقام پر لے گئی تھی۔

”تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“ سو قار کی آواز سن کر وہ ٹھک گئی تھی۔ وہ کافی دیر پہلے آفس سے آیا تھا اور کمرے میں آکر اس نے رو شنی کو پول کے کنارے بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ کپڑے بدلنے کے بعد بھی وہ اسے اسی پوزیشن میں بیٹھی نظر آئی۔ اس کے لیے خوب

صورت ہل کر پہلے ہوئے تھے۔ بہت دیر تک جب وہ کمرے میں نہیں آئی تو وقار خود اس کے پاس چلا آیا تھا۔

”میں۔ میں ایسے ہی یہاں بیٹھی تھی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”عائشہ آپلی تمہارا پوچھ رہی تھیں۔“ کمرے میں آکر اس نے کہا۔

”مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔“

”بولو۔“ کمرے کا دروازہ کھولتے کھولتے وہ واپس مڑا۔

دوشنی نے الماری میں سے ایک جیولری باکس نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ عائشہ آپلی نے مجھے دیا ہے۔ شادی کا منی۔“

وہ اسے ڈبا پکڑا نا چلا رہی تھی۔

”اچھا ہے۔“ اس نے سرسری سی نگہ ڈال کر تبصرو کیا، لیکن ڈبے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

”یہ آپ رکھ لیں۔“ دوشنی نے اگلی بات کہی۔

”میں اس کا کیا کروں گا۔ آپلی نے یہ تمہیں دیا ہے۔“

”اس نے یہ آپ کی بیوی کو دیا ہے۔“ اس کی بات سن کر وقار خاموش ہو گیا تھا۔

”آپلی تمہیں بلاری ہیں۔“ اسے کوئی بھی جواب دینے کے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ رات کو وقار دن سب کو ڈنر پر باہر لے گیا تھا۔ اس کے بعد کپڑے بدل کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ دوشنی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی وقار کب تک وہاں آئے گا۔ کللی

پینے کا دل چاہ رہا تھا، لیکن اس وقت کسی ملازم کو کہنا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ یہ ہی سوچ کر وہ خود کچن میں آگئی تھی۔ اپنے لیے کللی دہاتے ہوئے اسے انٹرکام بجنے کی تواز آئی۔ اس وقت کچن میں اس کے علاوہ کوئی ملازم نہیں تھا۔ اس نے انٹرکام اٹھایا۔

”ایک کپ کللی اسٹڈی میں لے آؤ۔“ یہ جانے بغیر کہ وہ سری طرف کون ہے۔ وقار نے مختصراً کہا

تھا۔ اسے اس کے اتنی دیر تک کمرے میں نہ آنے کی وجہ اب سمجھ میں آئی تھی۔ اپنی کللی کا کپ اٹھا کر اسے اسٹڈی میں دینے چلی گئی تھی۔

”بڑی جلدی میں گئی کللی۔“ اپنی ٹیبل پر رکھا کللی کا کپ اٹھاتے اس نے کللی لانے والے کی طرف دیکھا۔ وہ کپڑے پر مصروف تھا۔ مختلف فائلز اور نقشے پھیلے ہوئے تھے۔

”تم کللی کللی لائیں، میں نے تو مشرت سے کہا تھا۔“

”کچن میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے لیے کللی بنا رہی تھی تو آپ کے لیے بھی بیٹلی۔“ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنا کللی کا کپ اس کے لیے لے آئی ہے۔

”تھینک یو۔“ وہ تکلف سے بولا تھا۔

آنے والے دنوں میں دوشنی اس کمرے کا ایک اہم رکن بن چکی تھی۔ وہ نہ صرف عائشہ کی پسندیدگی حاصل کر چکی تھی بلکہ اس کمرے کے ملازموں کے دل میں بھی اس کے لیے بہت عزت اور احترام تھا۔ آٹھ

دس دن میں کبھی اس نے ان پر حکم نہیں چلایا تھا۔ ان کے ساتھ بہت مہذب اور شائستہ لہجے میں بات کرنے والی اپنی بیگم صاحبہ کو وہ کبھی نہ پسند کرتی تھی اس بات کے بعد اگر وہ اسٹڈی میں ہوتا تو دوشنی اس کے بغیر

کے اسے کللی کا کپ دے آتی تھی۔ وقار کے حلق اس نے جب جب سوچا کہ اسے بہت کم کو لو رہے ضرر

سا انسان لگا۔ کبھی کبھی وہ اسے بہت لو اس لگتا تھا۔

بہت بار اس نے اسے ڈسٹرب نہ کیا۔ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ ایسی کون سی تکلیف لو رہے ہے جو اس کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔ دوشنی کی زندگی کا سب سے

بڑا البیہ غموت تھی۔ وہ ترجیح بھی لے کر وہاں کی بے

اختیالی کا ذمہ دار اپنے معاشی حالات کو سمجھتی تھی۔ وہ

دکھی تھی لو رہی ہے وہ اسے وقار کی آنکھوں میں بھی

نظر آتا تھا، لیکن وقار کے پاس تو سب کچھ تھا۔ دولت

جو سب کچھ خرید سکتی تھی پھر اسے کیا پریشانی تھی۔

غلط تھی، دولت سے وقار کی لو رہی غلوں میں نہیں خریدا

ذیورالت واپس کر دی تھی جو وقار اور عانت نے اسے
 دیے تھے۔
 ”یہ بھی آپ کا ہے۔“ اس کا سواپل فون واپس
 کرتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
 ”یہ کچھ پیسے رکھ لو روشنی۔“ چند نوٹ اس کی
 طرف پھلتے ہوئے وقار نے نظریں چرائیں۔
 ”آپ اگر اس سب کا سواضہ لو کرنا چاہتے ہیں تو
 وہ آپ پہلے ہی مجھ سے کہے ہیں۔“
 ”یہ قیمت نہیں بلکہ اس احسان کے لیے ہے جو تم
 نے مجھ پر کیا۔“

”احسان تو آپ نے کیا ہے مجھ پر میں نے تو صرف
 بدلہ چکایا ہے۔ میرا خیال ہے فلائٹ کا نام ہو رہا ہے
 ہمیں چننا چاہیے۔“ مسکراتے ہوئے اس نے اپنا
 سامان اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ آج واپس
 جاری تھی وہ جانے کے لیے ہی آئی تھی۔



صبح کے چار بج رہے تھے۔ ایک چوکیدار کے سوا
 کسی نے اسے وہاں سے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ باہر
 جانے سے پہلے اس نے ایک نظر اس گھر کو دیکھا جہاں
 اسے دوبارہ بھی نہیں آنا تھا۔ اس گھر اور یہاں کے
 مکینوں نے اسے بہت عزت دی تھی۔ یہاں رک کر وہ
 زندگی کے اس خوب صورت رنگ سے آشنا ہوئی تھی
 جس سے پہلے وہ انجان تھی۔ اس کا تعارف محبت سے
 ہوا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی اس محبت کا کوئی انجام
 نہیں ہے۔ یہ ایک طرفہ جذبہ ہے وہ اپنے دل کو دیکھ
 نہیں پاتی تھی۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔
 جانے سے پہلے وہ اس سے آنکھیں نہیں ملا پاتی تھی۔
 اسے لگا تھا وہ اس کی طرف دیکھے گی تو وقار ضرور جہاں
 جائے گا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ وہ اس کی دی ہوئی
 ہر چیز وہاں چھوڑ آئی تھی۔ اس کے سارے کپڑے اسی
 وارڈروپ میں لٹکے تھے۔ جاتے ہوئے وہ اپنے دو سال
 پرانے کائن کے سوٹ اور کالی چادر میں تھی لیکن وہ
 وہاں سے خالی ہاتھ نہیں آئی تھی۔

جاسکتا تھا۔ محبت نہیں خریدی جاسکتی تھی۔
 عانت اس دوران حاصل پور کا چکر بھی لگا آئی
 تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ روشنی بھی ان کے ساتھ
 ملے، جہاں ان کے چند دھیالی رشتے دار رہتے تھے۔
 لیکن وقار نے کہا تھا کہ وہ آج کل مصروف ہے اور وہ
 چاہتا ہے کہ روشنی اس کے ساتھ ہی جائے عانت نے
 اس کی خواہش کا احترام کیا تھا اور دوبارہ اسے چلنے کے
 لیے نہیں کہا تھا۔ ولیمہ کی بات کو بھی وقار نے اسی
 طرح ملا تھا۔ عانت خود بھی وقار کے نئے پروجیکٹ
 سے واقف تھیں اور اس کی مصروفیت کے پیش نظر وہ
 اسے مجبور نہیں کر سکتی تھیں۔

”ولیمہ ہم آپ کے اگلے وزن پر رکھ لیں گے۔
 ابھی تو مجھے اتنے کلم ہیں کہ یہ تو آپ کی وجہ سے میں
 آج کل پاکستان میں ہوں ورنہ وہی میں ہوتی۔“
 اور وہ اتنا غلط کہ بھی نہیں رہا تھا۔ اس دوران نہ
 چاہتے ہوئے بھی اسے ایک دن کے لیے دینی جانا پڑا
 تھا۔

”ہاں ولیمہ سر ایڈیٹر میں کر لیں گے مہل اس
 وقت پلا بھی ہمارے ساتھ آئیں گے۔“ سحر نے کہا
 تھا۔

وہ سب اس کی بات سن کر مسکرائے تھے سوائے
 روشنی کے۔ چند دن میں وہ اس نئے مسکراتے پچھر
 پریکٹ سین سے غائب ہو جائے گی اور دوبارہ کبھی ان
 سے مل نہیں پائے گی۔

اس گھر میں اس کی پسندیدہ ترین جگہ وہ سونگ
 پول تھا۔ پانی کے پاس بیٹھے اسے وقت کے گزرنے کا
 احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ وقار نے اسے کئی بار اس
 جگہ بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیا سوچ رہی ہے۔ وہ
 اس کے حالات سے واقف تھا۔ اس کی زندگی کے
 ایک تاریخی گوشہ کا چشم دید گواہ تھا۔ اسے اس مصوم
 لڑکی پر ترس آتا تھا جو مطلق رشتوں کی جینٹ چڑھی
 ہوئی ہے۔

عانت کے جانے کے دو دن بعد روشنی کی دینی کی
 فلائٹ کنفرم تھی۔ جانے سے پہلے وہ وقار کو وہ سارے

وہ نہ دکھائی دے۔ ایک بار پھر اس کے ساتھ دسی ہو رہا تھا جو پچھلے دنوں میں کئی بار ہو چکا تھا۔ یہ اسے دوبارہ دیکھنے کی امید تھی جو وہ بار بار اسے اپنے ارد گرد پھرتے لوگوں میں دھونڈنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس دن وہ مل سے نکل رہی تھی جب اسے لگا وہ اس کے پاس سے تیزی سے گزرا۔ وہ رازقہ تھا۔ اس نے وہی جیکب شرٹ پہن رکھی تھی۔ جیسی اس نے وقار کو پہنے دیکھی تھی وہ بے تحاشا اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ اس کے ساتھ اسٹور سے اپنی شفٹ ختم کر کے نکلنے والا عملہ اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

”وقار! کیسے۔“ اس کے قریب پہنچ کر وہ چلائی تھی۔ اس شخص نے مڑ کر اسے دیکھا، لیکن وہ کوئی اور تھا۔

”صوف کیجئے گا مجھے قلعہ فنی ہوئی تھی۔“ حضرت کرتی وہ دلہن اپنے کو لیز کے پاس آگئی تھی اور یہ ایک بار نہیں بار بار ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی ہائے کام کے سلسلے میں وہ آئے دن دسی آتا رہتا ہے اور یہ کوئی حیرانی والی بات نہ ہوتی، اگر وہ اسے اس پھوٹے سے شہر میں مل بھی جاتا، لیکن وہ اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ سر کو جھٹک کر اس نے بلڈنگ کے اسٹینڈیہ پاؤں رکھا۔

”روشنی!“ وقار کی آواز پر روشنی کے پردے قدم رک گئے تھے۔ بے یقینی سے مڑ کر اس نے اندھیرے میں کھڑے شخص کو دیکھا۔ یہ اختیار اس کی طرف آئی تھی۔ آنکھوں میں ناقابل یقین حیرت ہے وہ اسے ایک ننگا دیکھ رہی تھی۔

”تپ یہاں؟“ چند لمحوں کے بعد دیکھتے رہنے کے بعد اس نے خود پہچانے ہوئے کہا۔

وہ اس کی بات سن کر مسکرایا تھا۔ اپنی اسی چھابانے والی شخصیت کے ساتھ وہ گرے شرٹ اور بلیک پیٹ میں پورے صبح بے بعد اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”مگر تم فری ہو تو کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ چل سکتی ہو؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

بے اختیار اس میں اس کا سر اٹھتا تھا۔ وہ اسے انکار کرتی نہیں سکتی تھی۔

دسی پہنچ کر وہ اپنی جگہ میں مصروف ہو گئی تھی۔ وقار نہ مل سے لکھا تھا نہ دل سے اور جب یاد آتا تھا تو بہت یاد آتا تھا۔ آج کل وہ اور ٹائم بھی کر رہی تھی اور بغیر کسی چھٹی کے لگاؤ رکھ کر اسے تیسرا ہفتہ تھا۔ آخر کی فیس کے لیے اسے کٹھن کرنے کے لیے اسے یہ سب کرنا تھا۔ رات کو تھک کر بستر پہ لیٹی تو سونے سے پہلے جو آخری شبہ ذہن کے پردے پہ بنتی وہ وقار کی ہوتی۔ صبح اٹھ کر جو پہلا شخص یاد آتا وہ وقار ہوتا۔ اس شخص نے اس کے دل کو کچھ ایسے اپنی گرفت میں لیا تھا کہ وہ اس شخص سے خود کو چھڑا ہی نہیں سکتی تھی نہ چھڑانا چاہتی بھی نہیں تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی اسے وقار سے محبت کیل ہوئی۔

وہ پرکشش شخصیت رکھتا تھا۔ خوب صورت تھا، شائستہ تھا، دل سے دور پر بھاگتا تھا۔ اس میں بہت سی خوبیاں تھیں، لیکن انکی خوبیاں تو اس نے یہاں بہت سے موبائل میں دیکھی تھیں۔ اس کے اسٹور پر آنے والے بے شمار کسٹمرز جو نہ صرف اچھی شخصیت کے مالک تھے، بلکہ شائستہ اور دوستانہ تھے۔ اسے ان سب سے مسکرا کر بات کرنا ہوتی تھی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے ذہن پر اپنا نقش نہیں چھوڑ پایا تھا۔ وہ اس کے دل میں بھول جاتی تھی۔ شاید وہ وقار کے ساتھ کلیننگ گزار کر آئی ہے۔ اس لیے اسے اس کی عادت ہو گئی ہے اور آہستہ آہستہ اسے بھول جائے گی۔ شروع شروع میں اس نے اپنے تپ کو یہی کہہ کر تسلی دی تھی، لیکن وہ اب بعد بھی وہ شخص اس کے حواس پر اسی طرح سوار تھا۔ آج بھی آنکھیں بند کرتی تو اسے اس کا چوسو چٹا نہیں پڑتا تھا، بلکہ خود بخود سامنے آجاتا تھا۔

آج اسے اسٹور سے واپس آئے کلین دیر ہو گئی تھی۔ وہ جلدی کمر آجاتی اگر راستے میں ایک حوٹے کی وجہ سے ٹریفک جام نہ ہوتا۔ بس سے اتر کر وہ بلڈنگ کے اندر جا چکی ہوئی، اگر اسے بلڈنگ کی باتیں طرف

وہ کچ بھی گاڑی اتنی ہی خاموشی اور انہماک سے
ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ دونوں اب ساحل پہ آگئے تھے۔
آسمان پہ چودھویں کا چاند پوری آبدار ملب کے ساتھ
چمک رہا تھا۔ سمندر کی تیز ہوا اور اس سے اٹھتی لہروں
کا شور۔ یہ سب کتنا بھلا لگ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک بیچ
چشمے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ایک دوسرے
کے دل کے حل سے بے نیاز۔

”مجھ سے شادی کرو گی روشنی؟“ اس نے کرنٹ
کھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس سے ہر بات کی امید
کر سکتی تھی سوائے اس بات کے
”کیا۔ کیا کہا آپ نے؟“

”شادی کرو گی مجھ سے؟ چند دنوں کے لیے نہیں
بلکہ عمر بھر کے لیے تمہیں اپنے گھر لے کر جانا چاہتا
ہوں۔ چلو گی میرے ساتھ؟“

”اچانک اس نیلے کی وجہ اس کے منہ سے نکلا تھا
حالانکہ کتنا تو چاہتی تھی یہ سوچتے لیکن یہ اتنا بھی
انسان کو کیسے استخوان میں ڈال دیتی ہے۔“

”گئے اس نیلے کی اصل وجہ تو میں بھی نہیں جانتا
لوریل نے پہلے تک میں یہ بھی نہیں جانتا تھا
کہ میں تمہیں شادی کا رونا پونا دلوں گا خود کو بہت
تو ملیں دے چکا ہوں کہ مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں
ہے لیکن جتنا تمہیں بھولنے کی کوشش کرتا ہوں تم
اتنا یاد آتی ہو بری طرح میرے حواس پہ چھا گئی ہو۔
میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں تمہارے بغیر نہیں
سکھتا مجھے تمہاری ضرورت ہے روشنی۔“

”جائش آہلی کی وجہ سے؟“
”نہیں۔ اپنے لیے۔“ اس کی بات سن کر مسکرا
دی تھی۔



”اسی ایس شادی کر رہی ہوں۔ وہ مجھے یہاں دعویٰ
میں ملا تھا اور اس نے مجھے پروپوز کیا ہے۔ میں اسے
آپ سے ملوانا چاہتی ہوں۔“
”تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو روشنی؟ اسی دن کا

خوف تھا مجھے پیشہ سے اس لیے میں نہیں چاہتی تھی۔
تم دعویٰ جاؤ کیا کہوں گی میں لوگوں سے کہ میری بیٹی
نے دعویٰ میں شادی کے لیے لڑا پسند کر لیا ہے۔“
”لیکن اسی ایس آپ کی مرضی لوریل سے اس
سے شادی کی بات کر رہی ہوں لوریل کوئی معیوب بات
نہیں ہے۔“

”تمہارے لیے نہیں ہے لیکن میرے لیے ہے۔
ویسے تو تم بڑا کہتی تھیں۔ ساری زندگی میں اور بہن کا
خیال رکھنے کے دعوے کرتی تھیں لیکن ایک لڑکا
پسند آتے ہی تمہیں میں لوریل بہن بھول گئی ہیں۔ سوچا
ہے میرا لوریل آتمہ کا کیا ہو گا۔ کس طرح گزر بسر ہو گی
ہماری۔ تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو روشنی۔“

”لن کی بات سن کر اس نے ایک گہری سانس لی لوریل
بھرا ایک آخری بات کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔“

”اسی ایس کل صبح نکاح کر رہی ہوں۔“ چہرہ پہلے
صابرہ لوریل آتمہ کے رویے کی تکلیف کو ذہن کا گھونٹ
سمجھ کر اپنی گلی تھی لیکن کج لستہ احساس ہو گیا تھا کہ
وہ دونوں اس کا استعمال کر رہی ہیں۔ اپنی ضروریات کی
وجہ سے اس کی ہاں اس کی شادی کے فیصلے سے بازو
تھی۔ انہیں خوف تھا کہ روشنی شادی کے بعد انہیں
سپورٹ نہیں کرے گی لوریل انہیں یہ نہیں بتلائی تھی
کہ وہ کار نے اس سے خود کہا تھا کہ وہ آتمہ کی تعلیم
کھل ہوئے تک اس کے گھر والوں کی ذمہ داری
اٹھائے گا۔ لن کی بے حس لوریل کو مزید بڑا اشت
نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنی ہاں کی مرضی لوریل شادی کے
بغیر شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن کبھی کبھی
جو ہم سوچ نہیں پاتے وہ قدرت کا طے کر رہا ہے۔

”لن کا نکاح دعویٰ میں ہوا تھا اور اپنی جاب سے
رہنوائی کر کے وہ اس کے ساتھ ایک بار پھر اسی گھر میں
واپس آگئی تھی۔ کنٹرول ختم کیے بغیر لوریل کسی جنگی
فوج کے بغیر فوجی سے اس طرح رہنوائی کرنے کا
مطلب بہت سے لیگل لٹریچر کی صورت میں سامنے
آتا ہے جس میں سب سے بڑا مسئلہ دعویٰ کے کوئز ہے
تاہم جن تھا لوریل یہ سب ہو بھی جاتا اگر اس کا شو ہو گا۔“

نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”لیکن مجھے ایک الجھن ہے۔“ اس نے سستی خیز
 لہجے میں کہا۔
 ”آپ کو کیا الجھن ہے؟“ وقار کی بات نے اسے
 حیران کر دیا تھا۔
 ”کیا تم آج رات بھی اسی صوفے پہ سونے والی
 ہو؟“ وہ شرارت سے بولا۔
 ”نہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سر جھکایا۔



”ہی پلیز۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں جانتی ہوں،
 میں نے آپ کا دل دکھایا ہے، لیکن جانیں میں ایسا کرنا
 نہیں چاہتی تھی، لیکن مجھے لگا آپ کی تشویش اور
 پرگمانی میرے ساتھ زیادتی ہے۔ میں کبھی آپ کو دکھ
 نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں کہے آپ سے اور اپنی بہن
 سے رشتہ ختم کر سکتی ہوں، مجھے احساس ہے کہ آپ کو
 میری کتنی ضرورت ہے، لیکن آپ کو بھی سوچنا
 چاہیے تھا کہ میں اپنی زندگی جینے کے لیے آپ کو بے
 آسرا نہیں چھوڑوں گی۔“

وہ وقار کے ساتھ آج صبح ہی اپنے گھر پہنچی تھی اور
 صابرو سے معافی مانگ رہی تھی۔ شروع میں صابرو اس
 کے ساتھ کافی سخت رہی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کا
 دل موم بڑنا شروع ہوا۔ وقار انہیں پہلی نظر میں ہی
 بہت اچھا لگا تھا۔ روشنی کو دیکھ کر تو وہ اسے پہچان ہی
 نہیں سکی تھیں۔ وہ اس کے قیمتی لباس اور مٹے
 زیورات دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی
 صابرو کی یہ تشویش بھی ختم ہو گئی تھی کہ روشنی شادی
 کے بعد انہیں خرچ نہیں دے گی، بلکہ اب تو انہیں
 یقین تھا کہ روشنی انہیں پہلے سے زیادہ سپورٹ کرے
 گی اور یہ ان کی خام خیالی ہی تھی۔

”آئوہ کہاں ہے؟“ وہ اپنی بہن کا پوچھ رہی تھی۔
 وقار آفس چلا گیا تھا اسے چند ضروری کام تھے اور
 روشنی دو سال بعد اپنے گھر والوں سے مل کر اپنی خوش
 تھی کہ وہ اسے چادر بھی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔

حسن نہ ہو تاہو خود وہاں ایک بہت بڑی کنسرکشن کمپنی
 کا مالک تھا اور ساری لیگل کمپلکیشنز کا حل اس
 کے پاس تھا۔ اس گھر میں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ عفت
 لی اسے دیکھ کر نمل ہو گئی تھیں۔ بانی کے ملازموں نے
 بھی اس کا رجوش استقبال کیا تھا۔ وہ سب یہ ہی جانتے
 تھے کہ روشنی اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے ایمر ہنسی
 میں دی گئی ہے۔ سائنس اور اس کے بچوں کی طرح گھر
 کے ملازم بھی اس سے ہانوس ہو گئے تھے اور اس کی
 واپسی پہ بہت خوش تھے۔ اس کی ہر چیز کرے میں اسی
 جگہ بڑی تھی، جہاں وہ بھوڑ کے گئی تھی۔

”جانتی ہو؟“ انہیں میرے علاوہ اس گھر میں سب
 سے زیادہ کس نے مس کیا ہے؟“ وقار نے اس کا ہاتھ
 پکڑ کر کہا۔ سلور گرے ساڑھی میں وہ بہت خوب
 صورت لگ رہی تھی۔ وقار نے ایک قیمتی بیروں
 جڑی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی۔
 ”آجھی لگ رہی ہے۔“ اس کے ہاتھ کی پشت کو
 چومتے ہوئے بولا تھا۔

”آپ نے بتایا نہیں مجھے گھر میں اور کس نے مس
 کیا۔“ وہ تجسس سے پوچھ رہی تھی۔
 ”سوسنگ پول نے، جہاں تم کھنڈوں بیٹھی ہا نہیں
 کیا تھا سو جی رہتی تھیں۔“ وہ مسکرا دی تھی۔
 ”مجھے وہ جگہ بہت پسند ہے، پراسکون ملتا تھا وہاں
 بیٹھ کر۔ زندگی میں اتنی الجھنیں تھیں، جنہیں سوچتے
 ہوئے میں خود الجھ جاتی تھی۔ ایسے میں دنیا سے
 ڈسکنکٹ ہو کر بیٹریلیکس لیل کرتی تھی میں۔“ وہ
 لو اس سے بولی۔

”تم بہت سلاو اور معصوم ہو، روشنی تمہارا دل بہت
 شفاف ہے، میں جانتا ہوں تم اپنی ای اور بہن کی
 ناراضی سے اب بیٹ ہو، لیکن ڈنٹ دہی، ہم کل
 جا کر انہیں منائیں گے۔“ اس نے اسے بھلاتے
 ہوئے کہا۔

”کیا اب بھی کوئی الجھن باقی ہے؟“ اس نے
 مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس

”آئمہ یونیورسٹی گئی ہوئی ہے۔ دو بجے تک آجائے گی۔“ صابرہ نے اسے بتایا۔ لیکن جب چار بجے تک بھی آئمہ کی واپسی نہیں ہوئی تو مجبوراً ”دوشنی“ کو واپس جانا پڑا۔ رقار کا ڈرائیور کلنی دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”میں اس سے اگلی بار مل لوں گی امی!“ صابرہ کو تسلی دیتی وہ وہاں سے چلی آئی تھی۔ صابرہ نے اس کے سامنے ہی اسے دوبارہ کلنی کی بھی اور دوشنی کی آمد کلبھایا تھا لیکن وہ کہہ رہی تھی کہ اسے یونیورسٹی میں کچھ کام ہے اور اسے دیر ہو جائے گی۔

کلنی کا کپ براہروالی میز پر رکھنے کے لیے وہ جھکی اس کے لیے بیل اس کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے ذرا آگے بڑھ کر اس نے دوشنی کے بالوں کو چوم لیا۔ ”مجھے تمہارے بیل بہت پسند ہیں۔“ ”مجھے پتا ہے۔“ مسکراتی نظروں سے اتنے دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا؟“ اس کے بالوں میں انگلیاں گھماتے اس نے پوچھا۔

”ننہا شائے بتایا تھا۔“ اس نے شرارت سے کہا۔ ”کیا بتایا تھا ننا شائے؟“ اسے کچھ حیرت ہوئی۔ ”یہ ہی کہ آپ نے اسے میرے بالوں سے متعلق ہدایت دی تھی کہ وہ انہیں کاٹنے یا خراب کرنے کی کوشش نہ کرے۔“

”ہیں!“ اس نے مطمئن انداز میں کہا۔

”اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ مجھ پر ڈارک میک اپ بالکل اچھا نہیں لگتا ہے۔“ یہ اسے شرمندہ کرنے کی ایک کوشش تھی لیکن وہ اس سے ہرگز متاثر نظر نہیں آیا۔

”بالکل ٹھیک۔“ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ ہنس پڑی۔

”ننہا شائے آپ نے میرے بارے میں کیا بتایا تھا؟“ کہہ رہی تھی اپنی شادی پر ضرور بلائے گئے اچانک

یاد آتا تھا۔

”کچھ نہیں“ ہنس رہی تھی کہ تم میری یاد کی کزن ہو اور حاصل پور میں رہ کر تمہاری گرومنگ نہیں ہو سکی اب شادی کے بعد امریکا جانا ہے۔ اس لیے تمہارا میک اپ اور کونٹا ہے۔“ کلنی کے گھونٹ بھرتے والے بتا رہا تھا۔

”ایک اور جھوٹ، اسٹوریاں بتانے میں کلنی مہارت ہے آپ کو۔“ وہ ہنس پڑا تھا۔

”چھا میری امی اور چھوٹی بہن آپ سے ملنے آتا چاہتی ہیں۔“ اسے صابرہ کے فون کا خیال کا آیا جو انہوں نے کل کیا تھا اور آئمہ بھی اس کے گھر آنے کی خواہش رکھتی تھی۔

”آج رات تو میں کراچی جا رہا ہوں اور پھر وہاں سے واپسی پر کل ایک میٹنگ ہے اور۔۔۔ پر سوں رجسٹر آ رہا ہے اس کے ساتھ مجھے اگلے دن دینی جانا ہے۔ اگلے ایک بلالو۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

”پھر دینی جا رہے ہیں؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”ڈارلنگ! وہاں میرا آفس ہے اور آؤہا مینہ میرا وہاں گزرتا ہے۔ ویسے بھی آج کل جو پرو جیکٹ شروع کیا ہوا ہے اس کی وجہ سے پاکستان سے زیادہ وہاں میری ضرورت ہے تمہیں بے کے جاؤں گا وہاں پھر رہنا کتنا بڑا پرو جیکٹ ہے وہ اور میں مصروف ہونے کا ڈراما نہیں کر رہا۔“ اس کی ٹھوڑی کو جو متھے ہوئے وہ اب بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔

کراچی سے واپسی پر وہ اسے ڈنر کے لیے باہر لے گیا تھا۔

”عائشہ آئی کی کل آرہی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اسلام علیکم آلی۔ کیسی ہیں آپ۔“

”وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں یہ تلو دوشنی کیسی ہے اس کی دینی سے واپسی ہو گئی یا ابھی وہیں ہے؟“ اس نے تو اسے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ”کن کی پلٹ سن کر نہ بتا تھا۔

”دوشنی میرے ساتھ ہی ہے اور ٹھیک بھی ہے۔“

تب خود بات کر لیں۔ "میں اس کو تمہارا خود کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
عائشہ اس سے کلنی دیر باتیں کرتی رہی۔ اتنے ماہ بعد اس کی عائشہ سے بات ہو رہی تھی۔ کئی بار عائشہ نے اس کا ہنر مانگا تھا اور وہ قار کسی نہ کسی طرح اس کی بات بیل جاتا تھا۔ اس سے بات کرتے ہوئے روشنی مسلسل مشکرا رہی تھی۔ عائشہ کے علاوہ اس کے دونوں بچوں نے بھی اپنی سوئٹ ماں سے بات کی تھی اور اسے چلایا تھا کہ وہ دونوں اسے کتنا مس کر رہے ہیں۔



اگلے ہفتے اس نے صابرو اور آئمہ کو ڈنپہ بلایا تھا۔ وہ دونوں اس وقت ملائیں تھیں۔ چھبہ قار گھر میں داخل ہوا۔ ان دونوں کو دیکھ کر انہیں سلام کرتے ہوئے وہ اپنے بڑے روم میں چلا گیا تھا۔ روشنی کے لیے وہ قار کا ان دونوں کو اس طرح نظر انداز کرتا حیران کن تھا۔ پچھلی بار صابرو سے بہت خلوص اور اپنائیت سے ملا تھا۔

"ہی ایس ابھی آئی ہوں۔" مہن سے معذرت کرتی وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

وہ فریخہ وغندہ سے سونٹنگ پول کو دیکھ رہا تھا۔ روشنی کی طرف اس کی پشت تھی۔ زندگی میں اگر وہ کسی چہرے کو دیکھنا نہ دیکھنے کی خواہش کرتا تھا تو وہ ایک چوتھا۔ اگر وہ قار کا بس چلتا تو ایک لمحہ بھی اسے اپنے گھر میں برداشت نہ کرتا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ غصے کا ہوائے کی کوشش میں اس کی مٹھیاں جھجھکی ہوئی تھیں۔ لیکن اچانک روشنی کے نرم بانوؤں کی محبت بھری گرفت نے اس کے تے ہوئے وجود کو موسم کی طرح پھلایا تھا۔

"لگتا ہے تب کلنی تھکے ہوئے ہیں۔ اسی اور آئمہ آپ سے ملنے آئی ہیں؟" اس کی کمر میں اپنے بانوؤں کا گہرا ڈال لیا۔ ہمارے ہی تھے۔
اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"آئمہ آپ سے ملنے کے لیے بہت ایکسٹینڈ تھی۔ اسی نے بہت تعریف کی ہے اس سے آپ کی۔"
وہ اس کی خاموشی سے کوئی نتیجہ اخذ کیے بغیر بولی۔ وہ اب بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی۔

"تم چلو" میں بس آ رہا تھا۔ "خود کو پر سکون کرتے اس نے سنجیدگی سے کہا۔ روشنی اس کی بات سن کر اب کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ کتنا فرق تھا مگر دونوں بہنوں میں ایک اتنی ساواہ اور معصوم دنیا کے ہر قریب سے پاک جس کا خلوص اس کے لیے جے جھلکا تھا۔ جس کی بے ریا آنکھوں میں اسے صرف سچ نظر آتا تھا اور آئمہ دھوکے باز لالچی، فکرت، جھوٹ کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اس کا وجود اور آج اس نے اس لڑکی کو اس کے ایک اور جھوٹ کے ساتھ پکڑا تھا۔ اسے اتنے دنوں میں ایک بار بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ آئمہ اور روشنی کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ جس آئمہ کو ایک سہل سے جانتا تھا۔ اس نے تو اپنا تعارف ایک امیر خاندان کی اکلوتی بیٹی کی حیثیت سے کر لیا تھا۔ اسے وہ دن یاد آیا تھا جب اسے رات کو اعظم کے ساتھ دیکھنے کے بعد اگلے دن اس سے ملے گیا تھا۔

"تم میری کل کیوں نہیں ریسو کر رہی تھیں آئمہ؟" پچھلی رات سے کئی بار وہ اسے کل کر چکا تھا اور بہت مشکل سے اس سے ملنے پہ لگا ہوئی تھی۔
"میں مصروف تھی۔" اس نے لاپرواہی سے کہا تھا۔

"اور علیا؟" اس مصروفیت کا نام اعظم مسخورد ہے۔
اس نے طنز سے لہجے میں کہا۔

"مجھے یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی کہ تم یہ سب جانتے ہو۔" وہ اس کی ڈھٹائی پر حیران ہوا تھا۔
"تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو آئمہ؟ کسی سے چند دن پہلے ملنے کے بعد تم میرے ساتھ اپنی ایک سہل پرانی کھٹکٹ کسے ختم کر سکتی ہو۔"

"میں اعظم مسخورد کو پچھلے دو سہل سے جانتی ہوں" میری فرزند کا کرن ہے وہ کلنی پرانی لڑکی ہے اس کے ساتھ میری۔ تمہارا نمبر تو اس کے بعد آتا ہے یا وہ ہے۔

کیسے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے بڑھ گئے تھے۔ میں نے سوچا چلو تھوڑے دن انجوائے کرتے ہیں۔ ورنہ کہاں تم اور کہاں اعظم مسعود۔" وہ تنفر سے بولی تھی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو آئمہ! حالانکہ تم جانتی ہو تمہاری وجہ سے میں نے آپنی سے کتنا بڑا جھوٹ بولا ہے تم راضی تھیں مجھ سے شادی کرنے کے لیے اپنی والدہ سے بات کر چکی تھیں اور اب تم کہہ رہی ہو کہ تمہارے لیے وہ سب نامناسب تھا۔ میں محبت کرتا ہوں تم سے اور یہ بات تم بھی جانتی ہو۔" وہ اس کی باتوں سے چکرا گیا تھا۔

"تو میں کیا کروں یہ تمہارا مسئلہ ہے اور تمہیں ایسا جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ مجھ سے بہت سے لوگ شادی کے خواہش مند ہیں کب ہر کسی سے تو میں شادی نہیں کر سکتی ہوں۔"

وہ طنز یہی کہتی رہتی تھی۔ اپنی یہ بے عزتی وہ سر کر بھی بھول نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنے سامنے بیٹھی اس حسن کی دیوی سے اس لمحے شدید نفرت ہوئی تھی۔ دیکھ محبت میں ٹھکرائے جانے کا نہیں تھا بلکہ شاک اس ذات نے دیا تھا جو کسی کے ہاتھوں سے بے وقوف بننے سے ملتی ہے۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ مندی اسے وہ سب چاہیے ہوتا تھا جو ایک بار منہ سے نکل دیتی تھی۔ وہ ذہین تھی اور اسی وجہ سے سب گھر والوں کے دلوں میں اس کا نام لیاں مقام تھا۔ روشنی اس کے برعکس پر معالیٰ میں بھی اتنی اچھی نہیں تھی۔ میٹرک تک اس کے گھر کے حالات دگرگوں تھے اور اس کی دنیا محدود۔ ایک سرکاری اسکول میں پڑھتے ہوئے اس کا لاپرواہی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس نے روشنی کو جان مارے دیکھا تھا۔ چند ہزار کی نوکری کے لیے جوتیاں چٹاتے دیکھا تھا۔ اسے روشنی نہیں بنتا تھا۔ وہ آئمہ تھی۔ اسے بہت کچھ حاصل کرنا تھا اور وہ بھی بغیر جدوجہد کے۔ روشنی کی قناعت یہ اسے غصہ آتا تھا۔ اس کی ماں بھی روشنی کی طرح تھوڑے سے پیسوں پہ مبر شکر کرتی اور وہ اندر ہی اندر ان کی اس حماقت پہ

خستہ تھی۔

روشنی دینی چلی گئی تو گھر میں اچانک کھلا پیسہ آنے لگا۔ روشنی کے جانے کے بعد صابر مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں تھیں۔ حالات بدلے تو صابر کی سوچ بھی بدل گئی تھی۔ کلج میں آکر اس کا ملنا جلنا جس کلاس کی لڑکیوں سے ہوا اس نے اسے اپنے موجودہ حالات سے اور بھی شاک کر دیا تھا۔ ان جیسی بننا چاہتی تھی۔ لڑکوں سے اس کی پہلی دوستی تھوڑا عرصہ میں شروع ہوئی۔ وہ اس کی کلاس فیلو کا بھائی تھا اور اس پہ بری طرح فریفت تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کر کے گھوم پھر کر اسے اچھا لگا تھا لیکن وہ اس سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں رکھتی تھی۔ وہ خود ابھی اسٹوڈنٹ تھا اور اس کی مالی حالت بھی مستحکم نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اس پہ کلج خرچا کرتا تھا۔ وہ جلد ہی اس سے پور ہو گئی تھی کیونکہ وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے بڑ گیا تھا۔ پھر کیے بعد دیگرے وہ چند اور لڑکوں سے دوستیاں کرتی رہی اور پہلے کی طرح ان کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی لیکن یہ دوستیاں محض ہولنگ اور سینما کے حد تک تھیں۔ اس وقت وہ صابر سے سہیلی کے ساتھ جانے کا لالچ میں ایکسٹرا کلاس کا بہانہ کر لیا کرتی تھی۔

اعظم مسعود وہ پہلا شخص تھا جس سے ملاقات کے بعد وہ خود اس سے رابطے کی کوششوں میں لگ گئی تھی۔ وہ ایک ایم این اے کا بیٹا تھا۔ اسٹنٹ کشنر تھا اور بے تحاشا امیر اور مضبوط خاندانی بیک گراؤنڈ رکھتا تھا۔ اس سے روشنی کی ملاقات دہلی کے گھر ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ وہ اس کا دور کارزن تھا۔ اگلی بار وہ اسے ایک ہوٹل میں ملا تھا جہاں وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ الٹی می کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اس بار اعظم مسعود کو بھی اس میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی اور اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ اسے ایک اور دنیا سے متعارف کرنا تھا۔ آزادی اور بے تحاشا دولت سے اس کا تعارف اعظم مسعود کی بدولت ہوا تھا۔ اسے سہیلی جیسی خرید کے دیوتا پر قوم جیتی سوٹ تھائیو اشار ہوٹلوں میں کھانے پورے نئے موبائل فون

اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کن الفاظ میں روشنی کو اپنے لور آئمہ کے بارے میں بتانا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس سے پہلے آئمہ روشنی کو کوئی بات بتائے کہ آئمہ سے کچھ بھی امید کر سکتا تھا۔

”روشنی کو لے کر آنا بیٹا۔“ صابرہ جانے سے پہلے اس سے کہہ رہی تھیں۔ روشنی جانتی تھی وہ بہت مصروف ہے اور پھر وقار کے لور ان کے اسٹیلز میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ اسے وہاں لے کر جانے کے لیے اصرار نہیں کر سکتی تھی۔

”اے اے وقار بہت مصروف ہیں آج کل اپنے کام کے سلسلے میں“ آپ فکر نہ کریں کچھ دن تک میں خود آبلوں کی آپ سے ملنے۔“ وقار کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

”میں جتنا بھی مصروف ہوں تمہارے لیے وقت نکال سکتا ہوں۔“ اس کی طرف پار سے دیکھتے وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے بے اعتبار روشنی نے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا تھا۔ یہ اظہار تشکر تھا جو وہ خود کو ملنے والے اس دن کے بدلے اس وقت کرنا چاہتی تھی۔

”آپ فکر نہ کریں اتنی اہم جلد ہی آپ کی طرف چکر لگائیں گے۔“ وہ اب صابرہ سے کہہ رہا تھا۔ آئمہ جب چپ کھڑی بن دوں گی تو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جسے روشنی سمجھ نہیں پاتی تھی۔

ان لوگوں کو ڈرائیو کے ذریعے گھر بھیجا کر وہ دونوں اپنے کمرے میں آگئے تھے۔

”روشنی! مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔“ وہ شیشے کے سامنے کھڑی اپنی جیولری اتار رہی تھی جب وقار نے کچھ سوچے ہوئے اپنی بات شروع کی لیکن اسی پہل اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا۔ رجڈ کی کل آدھی تھی۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسٹڈی میں آکر اسے کچھ ڈاکو منٹس دیکھنے تھے جو رجڈ اسے اسی میل کر چکا تھا۔ لن فائزر کو چیک کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر رجڈ کو کل کر لے بیٹھ گیا تھا۔ اپنے کاموں سے فائدہ ہو کر وہ جب تک کمرے

اسے اعظم کی موتی سے ملے تھے۔ اس میں ایسی کشش تھی کہ اعظم جیسا گھاگ اور غرٹ فطرت شخص بھی پوری طرح اس کے قبضے میں تھا۔ اس میوزیکل کسٹ کے ٹکٹ بھی اسے اعظم مسعود نے ہی بھجوائے تھے، کیونکہ اس نے وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ خود ایسی جگہوں پر نہیں جاتا تھا اور وہیں اسے وقار ملتا تھا۔ اسے وقار سے دوستی میں دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ اعظم مسعود جیسا حکم کا اکا گونا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن وقار اس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ اعظم کی پوسٹنگ حاصل پور میں تھی کون سا دن اس کی عمر لگی کر داتا تھا۔ اس لیے وقار کے ساتھ رقت گزاری میں کیا حرج تھا اور پھر وقار سے بھی اسے فائدہ ہی مل رہا تھا۔ وقار کو اس نے اپنی حقیقت نہیں بتائی تھی اسے ضرورت بھی نہیں تھی اعظم اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں سب جانتا تھا۔ دل کی وجہ سے اسے پتا چل جاتا اس لیے اس سے چھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔ شروع میں صابرہ اس سے لن منگے تھے تاکہ اس کی وجہ سے سوال جواب کرنی تھیں۔ آہستہ آہستہ انہیں بھی یہ سب قتل قبول ہو گیا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ لوگ تمام عمر ایک سے محاشی حالات کے ساتھ گزر بسر کرتے وقار کو آئمہ نے ایک آپشن کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ لیکن جس دن اعظم مسعود نے اسے شادی کے لیے پروپوز کیا اس نے وقار سے چیخا چہرہ لایا۔



کھانے کی میز پر بھی خاموشی سے بیٹھا تھا۔ باہر آتا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن وہ روشنی کو دکھ نہیں دے سکتا تھا۔ صابرہ کے ساتھ وہ معمول کے انداز میں بات چیت کرتا رہا تھا۔ آئمہ کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر بھی وہ جبن بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ روشنی یہ ہی سمجھ رہی تھی کہ وقار کا اسے نظر انداز کرنا اس لیے ہے کیونکہ اس کی ضد لورہ باؤ کی وجہ سے روشنی کو کلب جانا پڑا۔ وقار کی ذہنی کیفیت سے انجان تھی جو

میں آیا، روشنی تقریباً سو بجی تھی۔ ویسے بھی کلنی رات ہو چکی تھی اس نے سوچا وہ اسے پہلی فرصت میں کل سب کچھ بتا دے گا۔ صبح جلدی آفس آگیا تھا اور کلنی مصروف تھا۔

”آپ سچے گھر آجائیں وقار۔ آپ کی فوریٹوش بیماری ہوں میں۔“ روشنی اسے فون پر کہہ رہی تھی۔ اس کی بہت سن کر وہ مسکرایا تھا۔ آفس میں کلنی بڑی تھا۔ اسے سامنے بڑی فائلوں سے سر اٹھا کر اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے سرکری کی پشت پر ٹکرایا۔

”بھی ایک میننگ شروع ہونے والی ہے اس کے بعد گھر آؤں گا، پھر سچ کے بعد دوبارہ آفس کلنی وقت ضائع ہو جائے گا۔“ سوچتے ہوئے بولا۔

”آپ مطلب آپ نہیں آسکتے ہیں۔“ اس نے مرحلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ آپ میرے آفس آجائیں، آج میں آپ کے اپنی فوریٹ جگہ پہنچ کر اہل گا۔“ وہ اسی کے لہجے میں اسے کہہ رہا تھا۔

”میرے پیٹے کھانے کا کیا ہو گا؟“ وہ مصنوعی ناراضی سے بولی تھی۔

”وہ میں ڈنر میں کھا لوں گا۔“ جواب فوراً آیا تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر میں آپ کے آفس آجاتی ہوں۔“ وہ خوشی راضی ہو گئی تھی۔ اس سے فون پر بات کر کے وہ دوبارہ اپنے کلام میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس لڑکی میں جلو تھا۔ کتنی بھی تھکن اور مصروفیت ہوئی وہ اسے

منٹوں میں اپنی باتوں سے پرسکون کر دیتی تھی۔ میننگ سے فارغ ہو کر وہ اپنے آفس میں داخل ہوا تھا، جب اس کی سیکرٹری نے اسے ایک لڑکی کے بارے میں بتایا

تھا جو اس سے ملنا چاہتی تھی۔

”تم میرے آفس میں کیا کر رہی ہو؟“ اپنے دفتر میں آکر وہ دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ وہ اس کی ہٹ دھرمی پر حیران رہ گیا تھا۔

”میں تمہیں اتنے وقف نہیں سمجھتی تھی وقار حسن! تم مجھ سے بدلہ لینے کے لیے میری اس کم عقل

ہن سے شادی کر لو گے۔“

اسنو آکر وہ اب میرا دفتر ہے اور میں یہاں کوئی تماشہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا، تم یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔“



وقار اسے لہجے بلا رہا تھا اس لیے وہ ایک بجے اس کے آفس پہنچی تھی۔ وہ یہاں پہلے بھی آچکی تھی۔ اس لیے کسی کی معلومت کے بغیر وہ وقار کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ شیشے کی کیمین میں بیٹھی وقار کی سیکرٹری کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا تھا جو اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ اب وقار کے کمرے کا دروازہ کھول رہی تھی، جب اپنے کلاں میں پڑتی آکر وہ آواز سن کر ہلک گئی تھی۔

”مجھے اسے دیکھ کر ترس آتا ہے، کیسے بچوں کی طرح وہ اس لالی پاپ سے بھلی ہوئی ہے، جسے تم نے

محبت کا نام دیا ہے۔ بے چاری یہ بھی نہیں جانتی کہ چند ماہ پہلے تک اس کا محبت کرنے والا شوہر مجھ سے شادی

کرنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ میرے لیے دولت تھا“

میں دن کہتی تو وہ دن دہرا رہا تھا اور میرے رات کہنے پر اس کی رات ہوئی تھی۔ اب میں یہ کہے مان لوں کہ

اچانک تمہیں میری بہن سے محبت ہو گئی ہے، جو نہ صورت میں مجھ سے بہتر ہے اور نہ اس کے پاس

میرے جیسی تعلیم ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ مجھے جھلس کرنے کے لیے ہی کیا گیا ہو گا۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی تھی۔

”آکر تم۔“ اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ دروازے کے بند ہونے کی آواز پر اس نے چونک کر دیکھا۔

”میرے کمرے کے باہر کون تھا؟“ آکر وہ اپنی سیکرٹری سے معلوم کر رہا تھا۔

”سرا! آپ کی منہ نہیں۔“ وقار کے چہروں کے نیچے سے زہن نکل گئی تھی۔ اس کا دل بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ اسے جیتنا چاہتا تھا، لیکن یہ سب اس

انداز میں اس تک پہنچے گا۔

یہ آخری بات تھی جو اس نے سوچی تھی۔ اپنے موبائل سے اس کا نمبر ڈائل کرتے وہ باہر کی طرف بھاگا تھا۔ آئمہ اس کے آفس میں ہے اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ گھر جا رہا تھا اپنی شادی کے پہلے چند ہفتوں میں اپنے رشتے میں آئی اس غلط فہمی کو اسے فوراً دور کرنا تھا۔ اس کا موبائل بند تھا۔ اس کا اس طرح وقار سے بغیر ملے چلے جانا اسے لب سیٹ کر رہا تھا۔ ہا نہیں اس نے کتنی بات سنی تھی اور اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا تھا، لیکن وہ حیران تھا چند منٹ میں وہ ٹانگ کھلی ہو گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے بھی پوچھا، لیکن اس نے بھی اسے آفس ڈراپ کرنے کے بعد دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ گھر پہنچ چکا تھا، لیکن روشنی گھبر نہیں گئی۔ چند بار اس کے موبائل پر کھل کرنے کے بعد وہ صابروں کی طرف چلا گیا۔ وہ اگر گھر نہیں آئی تو اپنی والدہ کے پاس گئی ہوگی۔ یہی سوچ کر وہ صابروں کی طرف چلا گیا۔ بد قسمتی وہاں بھی نہیں گئی۔ صابروں اس کو دیکھ کر کان پریشان ہو گئی تھیں۔ وہ حیران تھیں کہ آخر ان دونوں کے درمیان ایسا کیا ہوا ہے کہ روشنی اسے بغیر ہٹائے کہیں چلی گئی ہے۔ بوجھل دل سے وہ وہاں سے نکلا تھا۔ بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے اس نے کئی بار گھر کھل کر کے ملازمہ سے روشنی کے بارے میں پوچھا۔

”روشنی بی بی ابھی تک نہیں آئی ہیں۔“ ہر بار کا وہ لایا یہ جملہ اس کے کانوں سے گھرا رہا تھا۔



وہ ہر جگہ اسے تلاش کر چکا تھا۔ سوائے اپنے دفتر کی پچھلی طرف کے جہاں وہ بہت دیر ایکلی بیٹھی رہی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر ایک نزدیکی پارک میں آگئی تھی۔

”تم وقار کو کب سے جانتی ہو؟“ چند جملے جو اس کے کانوں تک پہنچے تھے ان سے وہ اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ آئمہ اور وقار ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے

ہیں۔ وہ شاک کی کیفیت میں تھی۔ اس کا دل غ کاہم نہیں کر رہا تھا۔ بہت دیر تک قریبی پارک میں بیٹھے رہنے کے بعد آئمہ کے پاس گئی تھی۔

”ایک سال سے زیادہ ہو چکا ہے۔“

”کیا رشتہ تھا تم دونوں کے درمیان؟“

”کیا یہ تمہیں وقار نے نہیں بتایا کہ اس کا اور میرا کیا رشتہ تھا۔ محبت کرنا تھا وہ مجھ سے، مرنا تھا مل و جان سے مجھ پر شادی کرنا چاہتا تھا مجھ سے۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

”میں تم سے کیوں جھوٹ بولوں گی آئی؟“

”وقار بہت سی لڑکیوں سے ملے ہیں اپنے پروفیشن اور دوستانہ طبیعت کی وجہ سے ان کی کافی بے تکلفی سے لڑکیوں کے ساتھ ہو سکا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔“ اسے متاثر یاد آئی تھی۔

”آئی! تم اگر بے وقوفوں کی جنت میں رہنا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن میں کم سے کم تم سے یہ جھوٹ نہیں بولوں گی کہ ہاں اس کے دوستانہ رویے کی وجہ سے مجھے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ ایک سال میرے پیچھے پھرتا رہا ہے وہ اپنی بہن سے یہاں تک کہہ چکا تھا کہ اس نے مجھ سے شادی کر لی ہے، کیونکہ وہ اس کی شادی اپنی بہن کے ساتھ کروانے میں اثر رکھتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان تھوڑی سی مس اندر اسٹینڈنگ کیا ہو گئی اس نے تم سے شادی کر لی۔ وہ جانتا تھا میں اسے اپنی بہن کے ساتھ دیکھوں گی تو جیلس ہو جاؤں گی۔ اس سے بچ اپ کرنے کی کوشش کروں گی۔ میں تو پہلے ہی اس کے ساتھ جھگڑے کے بعد کافی شرمندہ تھی۔ تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تو مجھے اس پر اور بھی ترس آیا۔ اب کہاں تم اور کہاں میں۔ یہ وقار کا اسٹینڈرڈ تو نہیں ہے۔ تم جیسی سیدھی سادی اور معمولی شکل و صورت کی اثر ہاں ہوئی اس کے اسٹینڈس سے کہاں میچ کرتی ہے۔ لیکن مجھے تمہارے لیے بھی بہت افسوس ہوتا ہے اسے کم سے کم میری بہن کو ہتھیار نہیں ملنا چاہیے تھا اور اسی بات پر اس سے جھگڑا کرنے میں آج اس کے

آفس گئی تھی۔“

آئمہ کے انکشاف پہ اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ تو یہ تھی وہ جو وقار کو ہزاروں بکٹی ایک لڑکی کو اپنی بیوی بنا کر اپنے گھر لانا تھا، کتنی مختیر تھی آئمہ کی باتوں میں اس کے لیے یہ وہی آئمہ تھی جس کے روشن مستقبل کے لیے اس نے اپنی زندگی مختص کر دی تھی۔ جس کی خوشیوں پہ وہ اپنا آپ قربان کر سکتی تھی آج وہ اسے احساس دلا رہی تھی کہ اس کی بہن معمولی صورت اور کم تعلیم یافتہ ہے لیکن اس نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔ آئمہ ان تمام خصوصیات کی مالک تھی جو کسی بھی قتل اور کامیاب شخص کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ وہ سچ میں بے وقوفوں کی جنت میں ہی تو رہتی تھی جو یہ نہیں جان پاتی کہ اس کا اور وقار کا کیا مقابلہ۔ وہ زمین تھی اور وقار آسمان تھیں وہ لوں کا ملاپ کیسے ممکن تھا۔ زمین کتنی بھی خوب صورت ہو اس کا آسمان سے کیا مقابلہ۔ آئمہ کی باتوں سے وہ ڈھمکتی تھی۔ جو بھل قدموں سے چلتی وہ وہاں سے نکل گئی۔



”تم اس وقت کہاں ہو“ میں تم سے ابھی اور اس وقت ملنا چاہتا ہوں۔“
فون پہ اسے جگہ بتا کر وہ خود بھی آفس سے نکل گیا تھا اس سے بھی پہلے وہ وہاں موجود تھی۔ ہمیشہ کی طرح متاثر کن، خوب صورت اور مغرور اسے اپنی طرف آنادیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔ وہ جانتی تھی وقار اسے ضرور کل کرے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ حیرت سے مر جاتی۔

اب تک جتنے بھی لڑکیاں سے اس نے دوستی کی تھی وہ سب اس کے لیے اتنے ہی بے چین تھیں اس کے ایک اشارے پہ کھینچے چلے آتے تھے اور یہ شخص تو اس پہ دل رحمان سے فریفتہ تھا۔ اس کے ساتھ گزرا ہوا وقت وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ حالانکہ وہ بھی ان ہی بے وقوف مردوں کے قبیلے سے تھا جو لڑکیوں کی

خوب صورتی اور لہن کی لڑاؤں کے دیوانے ہوتے ہیں۔ اور اسے مردوں کو بے وقوف بنانا آتا تھا۔ شروع میں وہ اسے ایک اچھا نام پاس لگا تھا اور اسے اس سے شادی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اعظم مسود بھلے فکرت تھا لیکن اس جیسا اسٹینس اور مضبوط بیک گراؤ وقار کے پاس ہرگز نہیں تھا اور پھر اعظم مسود نے اسے شادی کی پیش کش کی تو وہ وقار سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچنے لگی لیکن اس کا یہ کلام اپنی آسانی سے ہو جانے کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

وقار نے اسے اعظم کے ساتھ دیکھ لیا تھا اور وہ خود ہی اس کی جان چھوڑ چکا تھا۔ اعظم کے ساتھ وہ بہت خوش تھی اور یہ خوشی قائم بھی رہتی اگر وہ وقار کے ساتھ رہ سکتی کو نہ دیکھتی۔ ہنگ سی ایک محسوس کی تھی اس نے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وقار اسے چھوڑنے کے بعد اس کی معمولی شکل و صورت کی کم تعلیم یافتہ بہن سے شادی کر لے گا۔ تھا کیا اس میں نہ شکل نہ تعلیم ساری زندگی بسوں کے دھکے کھانے والی عمر چند ہزار روپے کے لیے خود کو ہلکان کرنے والی اس بے وقوف سی دشمنی کو وہ وقار کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کتنے دن سے وہ اس کا ذکر کر رہی تھی، کس خور سے وہ اس کے بازو پہ اپنا ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ منظر دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کے منہ سے کپڑے، قیمتی ڈائمنڈ اور گہرے جملہ کسی ملکہ کی طرح جھپٹی تھی۔

حسد اور غم میں وہ اس گھر سے نکلی تھی۔ جس دشمنی کو ساری زندگی اس نے ایثار اور قربانی دیتے رہا دیکھا تھا۔ آئمہ کو خوش کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔

روشنی کو پریشان کر کے اسے مڑا آتا تھا۔ تسکین ملتی تھی۔ پچاس ہزار کیا حیثیت رکھتے تھے اس کے لیے وہ کسی سے نہ بھی کہتی تب بھی اس کے پاس اتنے بے شمار قیمتی تحائف موجود تھے جنہیں سچ کر وہ اپنی فیس ادا کر سکتی تھی لیکن وہ ایسا کیوں کرتی۔ اسے لوگوں کو آنانے میں مڑا آتا تھا اور اگر روشنی نے اس

”تم اس بے وقوف، جذباتی اور معمولی لڑکی کے لیے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہو؟“ وہ شاگ کے عالم میں تھی۔

”معمولی نہیں، بلکہ معمولی تم ہو۔ جس صورت پر اتنا غور ہے تمہیں اس میں تمہارا اپنا کوئی کمال نہیں ہے۔ اس صورت کے پیچھے مجھے اپنے گھٹاؤ نے چرے کو کبھی میری نظموں سے دیکھو؟ تمہیں خود سے نفرت ہو جائے گی۔ تم اسی دن میرے دل سے اتر گئی تھیں۔ آئمہ! جس دن تم میری نظموں سے گری تھیں، میں نے زندگی میں اگر کوئی دعا بچے دل سے کی ہے تو وہ یہی تھی کہ مجھے تمہاری شکل کبھی دیکھنی نہ پڑے۔ تم ہو کیا چیز؟ تم جیسی لڑکیوں کی عزت دار توئی کی بیوی تو کیا دوست بننے کے قاتل بھی نہیں ہیں۔“ وہ بہت سختی سے کہہ رہا تھا اور آئمہ کا غصے سے برا حل ہو رہا تھا۔

”کیا کہا تم نے۔ میں تمہاری دوست بننے کے بھی قاتل نہیں؟ تمہاری بہت کیسے ہوئی، مجھ سے ایسی بات کرنے کی۔ تم کیا سمجھتے ہو جس روشنی کی وجہ سے تم مجھے دھتکار رہے ہو؟ اب تمہارے ساتھ رہے گی۔ سب بتا چکی ہوں میں اسے اپنے اور تمہارے بارے میں، میں جانتی ہوں اسے وہ جمن ہے میری اور کتنی جذباتی اور بے وقوف ہے، اس کا شاید تمہیں اندازہ بھی نہیں۔ آج جو اسے پتا چلا ہے اس کے بعد وہ خود تمہیں چھوڑ دے گی۔ اسے مجھ سے زیادہ تم پر اعتبار نہیں ہے۔“ وہ فیسے سے پاگل ہو رہی تھی، یہ سوچے بغیر کہ ارد گرد کتنے لوگ اسے دیکھ رہے ہیں وہ ہنسی کی کیفیت میں بولے جا رہی تھی۔

”روشنی میرے ساتھ رہے یا نہ رہے، لیکن تم یہ بھول جاؤ کہ میں وہاں کبھی تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا لگا۔“ اپنی بات ختم کر کے وہ کرسی پر بے وحشیانہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ فیسے میں اپنی انگلیوں کو موڑتی وہ اسے وہاں سے جاتے دیکھتی رہی تھی۔

دکار گھر میں داخل ہوا تو وہ بری طرح ڈسٹرب تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر بے دلی سے ٹائی کی ناٹ

کی ذمہ داری اٹھاتی تھی تو یہ اس کو پوری کمری تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی روٹنی نے چیریل کا انتظام کمال سے کیا تھا، لیکن اس کی سوچ کے مطابق اس نے وہ پیسے بھجوائے تھے۔ لیکن اب کچھ ایسا ہو گیا تھا جو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ وہ کسی صورت روشنی کو دکار کے ساتھ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اچانک اسے دکار میں دلچسپی دوبارہ پیدا ہو گئی تھی اور اب اسے دکار چاہیے تھا۔ دکار کی ناراضی اس کی توقع کے عین مطابق تھی، لیکن وہ جلد اسے منسلک کی وہ اس سے اپنی محبت کرتا تھا کہ زیادہ دن ناراض نہیں رہ سکتا تھا اور روشنی کو تو جو کچھ دیکھتا تھا کبھی اس کے بعد اگر دکار اسے نہ بھی چھوڑتا تو روشنی اسے خود چھوڑ دے گی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے سامری پلاننگ کی تھی۔ وہ کرسی سمجھ کر اس کے بالکل سامنے بیٹھا بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں جانتی تھی تم مجھے ضرور کل کرو گے۔“ اس نے ایک بار اسے کہا۔

”تم نے ٹھیک سوچا تھا۔ کل تو مجھے کمری ہی تھی تم سے ایک ملاقات تو ضروری تھی۔“ وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”میں ایک ملاقات میں تو سمجھی تھی تمہیں مجھ سے بار بار ملنے میں دلچسپی ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”تم نے غلط سوچا۔ آج کے بعد نہ مجھے تم سے ملاقات میں دلچسپی ہے اور نہ ہی تمہاری شکل دیکھنے میں کوئی اہمیت ہے۔ میں نے تمہیں یہاں صرف یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ اگر تم نے میرے یا روشنی کے درمیان آنے کی کوشش کی تو اپنے انجام کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔ آج جو کچھ ہوا اس سے تم میرے اور روشنی کے درمیان دراڑ نہیں ڈال سکتی ہو۔ لیکن میری تمہیں وارننگ ہے، روشنی کو مجھ سے بدگمان کرنے کی کوشش کرو گی تو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔“ وہ بہت سخت اور ہموار لہجے میں اسے کہہ رہا تھا۔

رات سو نہیں پایا۔ بار بار میری نظر اس خالی صوفیہ جاتی اور میں رات بوجھ جاتا۔ اس سوختنک پول کے کنارے ہمیں بیٹھنے دیکھنے کی جیسے عادت سی ہو گئی تھی۔ مجھے یہ خالی جگہ پریشان کرتی۔ چند بار تمہارے ہاتھوں کی ہڈی کافی کاڑا لقمہ میں عفت لی کی پٹائی کافی میں گھونچا اور ہر بار پلو سی ہوتی۔ عانتہ آہی کو چاہ کر بھی میں یہ نہیں کہہ پایا کہ تمہیں چھوڑ چکا ہوں جیسا کہ میں نے پلان کیا تھا۔ تمہاری ہر چیز اس کمرے میں تمہاری امانت کی طرح رکھی رہی۔ میری الماری میں رکھے تمہارے کپڑوں سے لے کر میری ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا تمہارا مرفیوم اور کاسمینکس بھی میں وہاں سے ہٹا نہیں پایا۔ تمہارے جانے کے بعد میں کئی بار دعویٰ آیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم وہاں نہیں ہوئی میں وہ بار اس کلب میں گیا۔ میں تمہارا پتا جانتا تھا چاہتا تو تم سے مل سکتا تھا، لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں یہ لگے کہ میں تم

کھولتے اس نے اپنا کوٹ بند پہنچکا تھا۔ پچھلا دروازہ کھلا تھا اور وہ سوختنک پول کے کنارے کم صم بیٹھی تھی۔ دھیمے قدموں سے چلتا وہ اس کے قریب آیا، لیکن اس نے ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ کچھ کے بغیر وہ اس کے برابر بیٹھ گیا تھا۔ ”تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمہیں کب سے کل کر رہا تھا۔“

”زندگی ایک بار پھر بہت الجھ مٹی ہے۔ جتنا سلجھانے کی کوشش کر رہی ہوں، سربا تھا ہی نہیں آتا۔ اس کا لہجہ بہت نوتا ہوا تھا۔ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر بھی جانتا تھا کہ اس کی آواز میں لرزش کا سبب اس کے آنسو ہیں۔“

”روشنی! تم مجھ پہ اعتبار کرتی ہو؟“ یہ سوال تھا یا شکایت تو وہ جان نہیں پائی تھی۔ اس نے منہ اٹھا کر پہلی بار وقار کی طرف دیکھا۔ وہ اسے بہت تھکا اور بکھرا ہوا لگا تھا۔ کیا یہ شخص ناقابل اعتبار ہو سکتا ہے؟ کیا یہ شخص اس کی بہن سے بدلہ لینے کے لیے اس کا استدلال کر سکتا ہے؟ کیا یہ شخص اس کی بہن کے کہنے پہ اسے چھوڑ سکتا ہے؟ بہت سارے سوال تھے جو اس وقت سانپ کی طرح پھن اٹھائے اس کے دل میں اٹھے تھے اور ان — سب کا صرف ایک جواب تھا۔

”نہیں۔ یہ دھوکے باز نہیں ہے۔“ اس کے ہر لفظ پہ اسے آنکھیں بند کر کے یقین تھا۔ ”میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں روشنی! اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے تم سے محبت کب اور کیسے ہوئی میں نہیں جانتا، لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم ان لوگوں میں سے نہیں جو آپ کو پہلی نظر میں اپنا بنا لیتے ہیں، بلکہ تم اویں کی طرح قطروہ دل میں اترتی ہو۔ جب تم یہاں نہیں میں ایک بار بھی اس احساس سے نہیں گزرا“ اس نے کمرے میں تمہاری موجودگی مجھے پریشان کرتی تھی مجھے اپنی پرائیویسی میں خلل محسوس ہوتا تھا، لیکن جس دن تم یہاں سے نہیں میں تمام

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک مرد

دستِ کدھر

نوزیہ کسمین



قیمت - 750/- روپے

احساس کتری سے نکلو کہ تم آئمہ سے کسی طور کم ہو
بلکہ آئمہ کا تم سے کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے وہ جھوٹ
اور دھوکے کا پلندہ ہے اس کا ہر لفظ جھوٹ ہے اس
کی ہر ادا فریب میں آئمہ سے نہیں تم سے محبت کرنا
ہوں روشنی۔

”میں بھی آپ سے محبت کرتی ہوں وقار!“ اس
کے کندھے پہ سر ٹکائے وہ کہہ رہی تھی۔ وقار نے
زری سے اسے اپنے باندھوں کے گھیرے میں لے لیا
تھ۔



آدمی رات کو اس کا سوبائے مسلسل بچ رہا تھا بیڈ
سائڈ ٹیبل پر بڑا اپنا فون اٹھا کر اس نے ادھ کھلی
آنکھوں سے جھکی جھکی اسکرین کو دیکھا۔ صابرو کی کل
آ رہی تھی۔

”اسی اس وقت کیوں فون کر رہی ہیں۔“ اس نے
جلدی سے کل ریسیو کی۔ وقار نے پاس بڑا لیمپ کن
کیا اس بے وقت کی کل سے وہ بھی جاگ گیا تھا۔
”ہیلو ای۔“ روشنی نے کہا۔ دوسری طرف
صابرو بے تماشادوری تھیں۔

”اسی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟ سب خیریت تو
ہے؟“ وہ پریشانی اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں ان
سے پوچھ رہی تھی۔

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے روشنی! تم جلدی سے
آ جاؤ۔“ وہ روتے ہوئے اسے بتا رہی تھیں۔

”لیکن ہو کیا ہے اسی آئمہ تو ٹھیک ہے؟“
”مضمم مسعود نے آئمہ کے چہرے پر تیزاب
پھینک دیا ہے۔“ اسے لگا صابرو اپنے حواس میں نہیں
ہے۔

وہ دونوں ان کی کل آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی من
کے پاس آگئے تھے وہ راتے ہوئے انہیں بتا رہی تھی
کہ وہ آئمہ کو کئی دن سے ملنے کے لیے لا رہا تھا۔ آئمہ
اس سے بات کرنے کو بھی تیار نہیں تھی۔ ایک ہی

سے لپٹا لی گئی آہوں۔ بے مقصد بل میں
گھومتے ہوئے کسی سڑک پہ چلتے تم کہیں اچانک
میرے سامنے آ جاؤ اور میں تمہیں ایک نظر دیکھ
سکوں۔ یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ لیکن میں اپنی اس
خواہش کو پورا کرنا چاہتا تھا اور پھر مجھ پہ یہ انکشاف ہوا
کہ میں تمہیں بے پناہ چاہنے لگا ہوں اور تمہارے بغیر
میں نہ سک سک۔ میں تم سے پہلے کسی اور لڑکی کو پسند کرتا
تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات میں نے
تمہیں صرف اس لیے نہیں بتائی، کیونکہ میں تمہیں
اس بات سے تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں خود اس
دھوکے اور بے عزتی کو بھولنا چاہتا تھا۔ میں نہیں جانتا
تھا کہ آئمہ تمہاری بہن ہے، لیکن جب مجھے یہ پتا چلا تو
میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ جہاں تک آئمہ
سے میری وابستگی کا تعلق ہے میں اسے جھٹلا نہیں
سکتا۔ میں نے اس سے بچنے کی محبت کی تھی۔
لیکن وہ اسی دن میرے دل میں اپنا مقام کھو چکی تھی،
جب میں نے اسے اعظم مسعود کے ساتھ دیکھا تھا۔
تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرتے وقت وہ نہ میری
زندگی میں تھی اور نہ میرے دل میں۔“

”آئمہ کہتی ہے میں آپ کے قاتل نہیں ہوں۔
میں خوب سورت نہیں ہوں اور نہ ہی آپ کی طرح
لحلا تعلیم یافتہ میں کسی بھی طرح آپ کے معیار پہ
پوری نہیں اترتی۔“

”وہ غلط کہتی ہے۔ تم اس دنیا کی سب سے خوب
صورت لڑکی ہو کیونکہ تمہارا دل صاف ہے اس میں
دنیا کا سب سے حسین جذبہ، محبت بھرا ہوا ہے۔ تم ہر
طرح سے وقار حسن کی بیوی بننے کے لائق ہو۔ تم میں
وہ تمام خصوصیات ہیں جو کوئی بھی شخص اپنی بیوی میں
دیکھنا چاہتا ہے اور یہ صرف میں نہیں کہتا یہ عائشہ آہلی
بھی کہتی ہیں۔ تم سے چند دن کی ملاقات میں وہ تمہیں
مجھ سے زیادہ پیار کرنے لگیں، ان کے بچے تمہارے
فہم ہو گئے۔ خود کو آئمہ کی کہیں میری نگاہوں سے
دیکھو روشنی! پھر تمہیں پتا چلے گا تم کیا ہو۔ خود کو اس

ان کے پاس تھی۔ ان تین دنوں میں اس پر وہ سب انکشاف ہوئے تھے جن سے پچھلے دھماکی سے وہ بے خبر تھی۔ اسے صابرہ سے شکایت تھی لیکن وہ اس کی بات نہیں اور غم سے غافل تھیں۔ وہ ان سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ اس۔ وہ کہ میں شریک تھی۔

”خود کو سنبھالیں ای! جو ہو گیا اس پہ افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ کچھ باتیں اپنے وقت پر نہ ہوں تو محض بچہ راز رہ جاتا ہے۔ غلط رستوں پہ چلنے کا انجام صحیح کیسے ہو سکتا ہے۔“ صابرہ سے کہے بغیر نہیں رہ پائی تھی۔

”آتمہ کو معاف کرنا روشنی!“ صابرہ کے لفظ اس کے دل میں شریک کی طرح جیسے تھے۔ اب بھی اسی کی حمایت کر رہی تھیں۔ لیکن وہ آتمہ کو کیسے معاف کر دے جس نے اسے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اپنا انجام بھگت چکی تھی لیکن اس کا دل شاید اتنا برا نہیں تھا کہ وہ اسے معاف کیا۔ کچھ وقت لگے گا اسے بھولنے میں کہ اس کی سگی بہن نے اس کے ساتھ کتنا برا کرنے کی کوشش کی۔

وقار! آج اسے لینے آیا تھا۔ پچھلے دنوں وقار نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ایف آئی آر درج ہونے کے بعد پولیس ابھی تک اعظم مسعود کو دھوکہ نہیں پائی تھی

لوریہ وقار تھا جس کی بدولت وہ دنوں میں بیٹی پولیس کے چھپتے ہوئے سوالات سے بچ پائی تھیں۔ ہسپتال میں آتمہ کا بہترین علاج بھی اسی کی بدولت ہو رہا تھا اور وہ سب روشنی کی وجہ سے کر رہا تھا۔

”چلیں روشنی!“ وقار دروازے پہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے اپنے گھر واپس جانا تھا وہ گھر جس کی بنیاد اس نے غلوں اور محبت سے رکھی تھی۔

دھن سوار تھی اس کے سر پہ کہ اسے صرف وقار سے شادی کرنی ہے جس دن سے اس نے وقار کو تمہارے ساتھ دیکھا تھا وہ غصے سے پاگل ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وقار تمہارا نہیں روشنی کا نصیب ہے۔ اپنی بہن کا کمر مت برباد کرو لیکن اس پہ تو جیسے جنون سوار تھا۔ حسد اور غرور اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ وقار کو چھوڑنے کے بعد اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اعظم مسعود سے اس کا بہت جھگڑا ہوا تھا۔ شدید غصے کے عالم میں وہ یہاں آیا تھا اور پھر آتمہ کے یہ کہنے پہ کہ وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی ہے وہ غصے اور جنون میں آ گیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد اعظم مسعود فرار ہو چکا تھا۔ آتمہ کی حالت تشویش ناک تھی۔ وہ ہسپتال میں تھی بیچ مٹی تھی لیکن اس کا چہرہ بری طرح سوچا تھا۔ صابرہ کے گھر کمرام پر ہوا تھا۔ جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ روشنی صابرہ کو سنبھال رہی تھی لیکن وہ تو جیسے ڈھے گئی تھیں۔

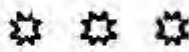
”یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ میں اس کی اچھی تربیت نہیں کر پائی۔ اس کی ضد کے آگے ارباب گئی اس کے دکھائے سبز باغ کے لالچ میں اگر میں نے اسے کھلی چھوٹ دے دی۔ وہ کیا کر رہی ہے۔ کس کس سے ملتی ہے میں سب جانتی تھی لیکن خاموش رہی۔ وہ پہلی بیڑھی پہ پاؤں رکھے بغیر آخری بیڑھی پہ پہنچ جانا چاہتی تھی اور میں اسے یہ نہیں بتا پائی کہ آخری بیڑھی سے گرنے والوں کو چوٹ بھی زیادہ لگتی ہے۔ سب میرا قصور ہے اپنی ایک بیٹی کو تو میں نے محنت کی بھٹی میں جھونک دیا اور دوسری کے لیے اپنا معیار بدل دیا۔“

وہ اپنے بل فوج رہی تھیں۔ ”سب میری غلطی ہے۔ میں نے اسے امیر لور آزاد خیال لڑکیوں سے دوستی کرنے سے روکا نہیں۔“ وہ یہ باتیں پچھلے تین دن میں دسیوں بار دہرائی تھیں۔ روشنی تین دن سے



عشق

”آج کل جو فیشن ہے اسی طرح کا کوئی لے لو۔“
انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق کہا۔
”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔ وہ
بغور اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔
”خیر چھوڑیں میں کل شہزاد کو ساتھ لے جاؤں گی
اور جو شاپنگ ہو گئی ہے وہ بھی کر لوں گی۔“
”ٹھیک ہے، اس کام کو اب ختم کرو، چند دن تو باقی
ہیں بس۔“ انہوں نے کہا تو اس نے سر ہلادیا اور کمرے
سے باہر نکل گئی۔ مگر سوچ میں گم ہو گئے۔



”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو زیدہ! پچھلے کئی سالوں سے
میں اور فلزائے بات جانتے ہیں کہ سعد کی شادی فلزا
سے ہی ہوگی اور آج تم کہہ رہی ہو کہ سعد کو سمجھانا
پڑے گا سارا خاندان یہ بات جانتا ہے، تم میری بیٹی کو
سارے خاندان میں رسوا کرنا چاہتی ہو۔“ وہ غصے سے
بچھڑے ہوئے تھے۔

”نہیں بھائی جان، خدا کے لیے ایسا مت کہیں۔
فلزا میری بھی بیٹی ہے، ماں بن کے پالا ہے میں نے
اسے۔“

”مگر ماں بن کے پالا ہے تو ماں بن کے سوجنا بھی
چاہیے تھا۔ تم جانتی ہو کہ کس قدر حساس ہے، کتنے
عرصے سے وہ سعد کو اسی خیال کے ساتھ سوچتی رہی
ہے۔ سعد اور یلمہ کے علاوہ اس کا کوئی دوست نہیں،
ان کے علاوہ وہ کسی پر اعتماد تک نہیں کرتی۔“ وہ
صوفے پر ڈھسے سے گئے۔ زیدہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”یاما۔“ وہ اسٹڈی ٹیبل کے پاس آکے بولی۔
”جی بیٹا۔“ انہوں نے اسلامک انسائیکلو پیڈیا سے
نظر اٹھا کے اسے جواب دیا اور دوبارہ نظریں کتاب پر
جمادیں۔

”کوئی بھی میری بات نہیں سنتا میں چلی جاتی ہوں
یہاں سے۔“ اس کی جھنجھلائی ہوئی سی آواز کاتوں میں
پڑی تو مسکرا دیے۔

”کس نہیں جانتی ہے۔“ وہ ہر بیٹھ کے میری بات
سنو۔ وہ جو دروازے کے پاس کھڑی تھی وہیں سے
پلٹ آتی۔

”کوئی میری بات نہیں سنتا، کسی کے پاس وقت ہی
نہیں کہ مجھے اور کچھ نہیں تو اچھا سا مشورہ ہی دے
دے۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔ پونی جھپٹاتی، آنکھیں گھماتی،
ناک چڑاتی، پریشان سی لگ رہی تھی۔
”تو کہاں ہے وہ تمہاری بلیمہ۔ اسے کہو سب کچھ
چھوڑ کے آجائے کچھ دن تمہارے پاس رہنے۔“
انہوں نے مٹھو دیا۔

”اس کے ایگرام چل رہے ہیں پاپا، بالکل ٹائم
میں اس کے پاس ڈرنے آپ جانتے ہیں مجھ سے زیادہ
وہ ایکسٹینڈ ہے۔“ اپنی عزیز ترین دوست کی حیات کرتے
ہوئے بولی۔

”اچھا چلیں آپ بتائیں کہ میرے لیے کیا حکم
ہے۔“ وہ دم تن گوش ہوئے۔

”مجھے سلطنت کے ڈریس کا کٹر سمجھ میں نہیں آ رہا
کہ کس طرح کاٹا، نہ ہی مجھے سعد کی پسند کا کوئی
انداز ہے۔“

گئیں۔
 وہ سعد کو جانتی تھیں جو فلزا کا بہت اچھا دوست تھا۔
 اس کا بہت خیال رکھتا تھا، لیکن یہ سب کچھ وہ صرف
 اس کا کزن ہونے کے ناتے کرتا تھا۔ اس سے شادی
 کے ذکر پر وہ تڑپ اٹھتا تھا کہ کبھی اس سے شادی نہیں
 کرے گا۔

”نہ میری نکل پک کرتا ہے نہ ہی اتنے دنوں سے
 گھر آیا نہ مجھ سے ملا اس نے مجھ سے بالکل بھی
 شادی کے فنکشن کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔
 شہزاد کا رویہ بھی کچھ عجیب سا ہے جیسے وہ یہ شاپنگ
 زبردستی کر رہی ہو۔“

ہر دفعہ وہ بھائی سے بات کرنے کا سوچتیں اور پھر
 رک جاتیں، لیکن کئی رات سعد کے دوستوں کے انکار نے
 اور پھر صبح ہی صبح بھائی کے بات کرنے پر انہوں نے
 بھی ہمت کر لی لی، لیکن ان کے رد عمل پر پھر پریشان
 ہو گئیں۔
 ”بات کرو اس سے اور پھر مجھے بتا دیا کیا کہتا ہے۔“

اور سعد مجھے انور کیوں کر رہا تھا اس کی آنکھیں
 اتنی سرخ کیوں تھیں جیسے وہ کئی دنوں سے سو نہ سکا ہو؟
 اس کے بلبل جو ہر وقت جیل کی تہ میں سٹے ہوتے تھے
 وہ بھرے بھرے سے کیوں تھے کیا۔ کیا سعد مجھ
 سے شادی کرنے پر خوش نہیں ہے۔ ”خود سے کئے
 آخری سوتل نے اس پر کبھی طاری کر دی۔
 ”اگر یہ واقعی سچ ہوا تو؟“ اس کے ساتھی پر سنے کے
 قطرے چلنے لگے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تب
 ہی گیت کھلے اور بند ہونے کی آواز آئی۔
 ”سعد“ بلیک پیٹ شرٹ میں لمبا چوڑا وجود سعد کا

نہیہ لے سعد سے کیا بات کی اسے کیسے سمجھایا ان
 کے گھر میں کیا ہوا یہ تو وہ نہیں جانتے تھے، لیکن نہیہ
 نے تاریخ طے کر دی تھی۔ اس دن سے سعد کا رویہ
 ان کے ساتھ اور فلزا کے ساتھ بھی بدل سا گیا تھا۔
 وہ فلزا کے چہرے کو با آسانی پڑھ سکتے تھے وہ جو ایک
 نیا سوٹ لینے کے لیے اتنی پر خوش ہوتی تھی وہ اپنی
 شادی کی ڈھیروں شاپنگ بدلتی سے کر رہی تھی۔ ایسے
 شخص کے ساتھ وہ کبھی بھی اپنی بیٹی کی شادی کرنے کو
 تیار نہ ہوتے جو بدلتی سے ان کی بیٹی کو اپنا رہا تھا، لیکن
 بیٹی کی محبت نے انہیں چپ رہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ
 شاید سعد بعد میں نکلوا کی طرف پلٹ آئے۔

”پاپا! آپ چائے نہیں گئے۔“ وہ اخبار پکڑے بیٹھے
 تھے جب فلزا نے ان سے پوچھا۔
 ”نہیں بیٹا دل نہیں کر رہا۔“ کہہ کر اٹھ گئے۔
 ”میں ذرا اشتیاق کی طرف جا رہا ہوں، تھوڑی دیر
 تک آ جاؤں گا۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گئے۔
 اس نے اپنے لیے چائے کا ایک کپ بنایا اور لے
 کر لاؤنچ میں آ گئی۔
 ”سعد ایسا کیوں کر رہا ہے میرے ساتھ۔“ بہت
 دنوں سے چلتا ہوا سوال پھر ذہن میں ابھرنا۔



"دوست تو ہونا دوستی کا رشتہ تو رہے گا۔ پیار نہ
بھی دے پائے تو کوئی بات نہیں۔"
"نہیں دوستی کا رشتہ بھی پھر ختم ہی سمجھو۔" اس

نے سر ہٹکا دیا۔ بس دیکھ کے رہ گئی۔
"میں بلائیہ کے بغیر نہیں رہ سکتا، پلیز تم میری بات
سمجھنے کی کوشش کرو، وہ مر جائے گی میرے بغیر۔ پھر میں
کیا کروں گا تم پلیز! ماموں سے کہہ دو کہ تم یہ شادی
نہیں کرنا چاہتیں، میں نے انکار کیا تو ماموں ہم سے
کھلے طور پر کٹ جائیں گے اور تم جانتی ہو امی! ماموں
سے کتنی الجھن ہے۔ پھر تم بھی تو امی کی اور ہماری
سب کی کتنی لڑائی ہو۔ شادی کے بعد تمہارے ساتھ
کچھ بھی برا ہو تو سب مجھ سے ناراض ہو جایا کریں گے۔
تو کیا اس سب سے بترید نہیں کہ ہم دونوں شادی ہی
نہ کریں۔" وہ ساکت سی بس اسے دیکھنے جا رہی تھی۔
"تم کسی اور سے شادی کرنا جو تمہیں خوش رکھ
سکے پلیز۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم آج ہی بات کرنا ماموں سے کیونکہ دن تو بستی
کم رہ گئے ہیں۔" وہ اپنی منگنی لے آیا تھا اور اپنی منگنی
چلا گیا۔

وہ کرسی سے اٹھ کر نیچے گھاس پر بیٹھ گئی، سر کرسی
کی ایک ٹانگ سے ٹکا دیا۔ وہ بالکل ایسے بے یار و مددگار
جیٹھی تھی جیسے کسی بیوہ کو اس کی عدت ختم ہونے
سے پہلے ہی گھر سے دھکے دے کر باہر نکل دیا ہو۔

خجکتے ہیں، بیشہ ساتھ رہنے کا ہنسنے بولنے کا دوستی
کا یہ مطلب کب ہوتا ہے کہ دو ریحوں کو ایک
دوسرے سے محبت ہو گئی ہے، جو رشتہ چند لمحوں میں
نہ بن پائے اسے ختم کے لیے پھر صدیاں بھی کم بڑ جاتی
ہیں۔ وہ یہ بات سمجھ گئی تھی اور جانتی تھی پلایا کو بھی یہ
بات سمجھالے گی یہ الگ بات کہ یہ محبت اس کی زندگی
کی داستان بن گئی تھی۔



ی قتل
"کیسے ہو تم اور ساتھ کون آیا ہے۔" اپنے ذہن
میں وہ آتے سہالیں سے بچنے کے لیے وہ جلدی جلدی
بولنے لگی۔

"کوئی بھی نہیں میں اکیلا ہوں۔" وہ اٹکائے
ہوئے لہجے میں بولا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔
"ہائے لاؤں۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی اس کا مدیہ
اسے ڈرا ہوا تھا۔ یوں جیسے کوئی انمولی ہونے والی ہو۔
"سدا" وہ ہلکے سے بولی۔ اس نے سر دونوں
ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

"تم کچھ کتنا چاہتے ہو۔" جاننے اسے کیسے بنا چل
گیا کہ وہ کچھ بہت اہم بات کرنے آیا ہے۔
"میلو میں چائے پتائی ہوں تمہارے لیے۔" وہ
ایسے اٹھی جیسے یہاں سے غائب ہو کے قہقہے لگے گی۔
"فکرا!" وہ جیسے بولا تو وہ رک گئی۔

"بیٹھ جاؤ مجھے تمہیں کچھ بات کرنی ہے۔" وہ بیٹھ
گئی اور ہزاروں سوال آنکھوں میں لیے اسے دیکھنے
لگی۔

"تم فکرا!" وہ پاؤں کو غیر ارادی طور پر گھاس پر
کھینچنے لگی۔

"فکرا تم شادی سے انکار کرو۔"
"کیوں؟"

"میں بلائیہ سے پیار کرتا ہوں۔"
"مور میں تم سے کرتی ہوں۔"

"میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی کرنے کا
سوچ بھی نہیں سکتی یہ میری کھٹ مٹ اور خواہش
ہے۔"

"میں بھی تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی کرنے
کا سوچ بھی نہیں سکتی یہ میری زندگی کا سوال ہے۔"

"تم بہت جذباتی ہو رہی ہو فکرا۔"

"اور تم بہت غلامی رہے ہو سدا۔"

"پلیز فکرا! مان جاؤ۔ میں کبھی تمہیں نہ خوشی نہیں
دے پائیں گا۔ تم ہیڑو کرتی ہو۔"

ایک رخصتا



”جب راجس جلے گا کوئی دردانہ نہیں بچا۔ پیچھے
مڑنے والے سارے راستے ختم ہو گئے ہیں۔“

”بھی بھئی کچھ نہیں بگڑا بیٹی!“
”نہیں دادی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں راجیل
کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور میں اس کے ساتھ خوش
گوار زندگی گزار کر می رہی رہے واضح کر دوں گی کہ خوشیوں
بھری زندگی دولت کے بغیر بھی گزارا جاسکتی ہے۔“
”حسن بیٹی۔“

”کج آپ مجھے نیلے دادی۔ می پاپا جیسے
جذبے کو کیسے جان سکتے ہیں بھلا۔ ساری زندگی دونوں
نے دولت کے علاوہ کسی چیز کو پرکھا ہی کب ہے۔
ٹھیک ہے لن کے سارے اعتراضات درست ہیں۔
لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میری محبت بے معنی
ہے۔ محض اسٹینس بیچ نہ ہونے کی وجہ سے میں
راجیل کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ یہ کوئی ٹھوس جواز تو
نہیں۔ نہ می پاپا کے لیے۔ اور نہ میرے دل کے
لیے۔“

”میں پاپ نے جو کچھ کمایا وہ تیرے لیے ہی تو
کمایا۔ تو اتنی نا سمجھ کب سے ہو گئی میری جان۔ تو
ایسی تو نہ تھی۔ ایسے تو نہ سوچتی تھی۔“ دادی کی یاد
اسے سمجھانے لگی اور اس کی گرم کلاں ٹھنڈی ہونے
لگی۔ برگر کھانے کو اس کا دل ویسے ہی نہیں چاہتا تھا۔
کل ہے اسے بھوک لگی ہی کہل رہی تھی۔

”تو تو در ثیاب ہے چننا۔ جانتی ہے اپنے نام کا
مطلب۔“ بچپن میں دادی اکثر اسے اپنی گود میں بٹھا کر
پوچھا کرتی تھیں۔

گھر سے نکلنے وقت وہ دونوں چابیاں اپنے ساتھ ہی
لیٹی تکی تھی۔ اس کا پادری نے والی یا اس سے سروکار کسی
چیز کی گھر میں موجودگی سے اب کسی کو کوئی فرق نہیں
پڑتا تھا۔

کم از کم در ثیاب ایسا ہی سوچتی تھی۔
”ٹھیک ہے بلا آخر ایسا ہی ہونا تھا۔ مجھے وہ گھر
چھوڑنا ہی تھا۔ لندن میں سب سے بڑی ریٹورنٹ
میں بیٹھے گرم کلاں کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے
ہوئے اس نے سوچا تھا۔ گزشتہ کئی دنوں سے وہ یہ ہی تو
سوچ رہی تھی۔

ج کا وقت تھا۔ لوگ گھروں سے نکلنے کے نکلے
تھے اس لیے ریٹورنٹ بھی تقریباً خالی ہی تھا اس
نے گھر سے نکلنے کے لیے صبح کا وقت منتخب کیا تھا اور
اب جب وہ اپنے سوچے سمجھے اقدام کو عملی شکل دے
چکی تھی تو بھلے کیوں دل جیسے دھڑکنے لگا تھا۔
”در ثیاب۔“ بے قرار دل کو سنبھالتے اپنی ہی
یادوں کے گزرے ملو سارے اسے دادی کی پکار سنائی
دی تھی۔ نرم پیار بھری پکار۔

یہ پکار بھی بہت سی کڑوی کسملی اور سمجھ بوجھ
والی باتوں کی طرح غجلے کب سے اس کے تعاقب
میں تھی۔ اس نے اس پکار سمیت کسی نصیحت کو
سمجھنے اور اس پر کاربند رہنے کے قائل نہیں سمجھا تھا۔
”در ثیاب۔“ دادی کی پکار پھر کہیں فضا میں گونج
کر چھوٹے چھوٹے گھنٹوں میں مٹ کر کم ہو گئی۔

”نہیں دادی۔ اب تو بالکل نہیں۔“ اس نے
فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”جی دادی!“ ان کی گود میں پھل کر بیٹھی ایک طرح سے قابض ہوتے ہوئے وہ بڑے پیار سے کہتی۔
 ”کیا۔۔۔“
 ”قیمتی موتی۔۔۔ بے مثل نایاب موتی۔۔۔“
 ”شباباش۔۔۔ میرے گھر کا یہ قیمتی موتی قیمتی رحمت میں جڑے گلہ ان شاء اللہ۔“
 ”قابض ہو جانے والی بچی نہیں رہی تھی۔ بڑی ہو گئی تھی۔ اتنی۔ اتنی کہ اسے اب ان دعاؤں کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔“
 ”ریٹورنٹ میں دادی کی پرچھائیں اس سے پھر وہی سوال کر رہی تھی۔۔۔ جھنجھلا گئی۔“
 ”ٹھک ہے دادی۔ میں مانتی ہوں کہ راحیل قیمتی رحمت نہیں۔ لیکن یہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اس کی محبت میں خود کو بھلا سکتی ہوں۔“



اس نے دونوں انداز میں کہا تھا۔ پھر جلدی سے
لٹھری کلنی کا آخری گھونٹ پی کر اپنا بیگ اٹھایا تھا اور
تیزی سے ریسنورنٹ سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ دلوئی
کے ساتھ مزید سوال جواب نہیں کر سکتی تھی۔ یہ
سوال جواب اب اس کے ارادے تو نہیں بدل سکتے
تھے۔ لیکن اسے پریشان ضرور کر رہے تھے۔
زین کی بیٹ سے پشت لگا کر اس نے گہرا سانس لیا
تھا اور اپنے ٹھکے ہوئے حواسوں کو تارل حال میں
لانے کی کوشش کی تھی۔

دلوئی اگر باطنی طور پر اس دنیا میں موجود ہوتی تو
واقعی اس کی اس پھرتی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔
لیکن وہ تالیاب کے دل و دماغ میں گھر کر چکی تھیں۔
اب چاہے وہ نسبت بدلتی یا جگہ دلوئی سے کیسے بچ
سکتی تھی۔

”زین چلنے والی ہے بیٹی۔“ دلوئی نے اندیشے
گھرے میں کہا۔

”زندگی کی ضروریات سچی اور سچی محبت پر بھی حاوی
ہو جاتی ہیں۔ چڑچڑاہن پیدا کر دیتی ہیں اندر تک۔ ہر
جذبہ بھلہ پن کو آڑ جاتا ہے۔ بچہ تلوے کی اداس سی
جاتی ہے پیچھے بھر۔“

دلوئی پیار سے بولتی چلی گئیں۔ وہ کھڑکی سے باہر
دیکھنے لگی۔

ایسے ہی پیار سے اسے مئی اور ڈیڈی نے بھی
سمجھایا تھا۔ جب تالیاب نے ان دونوں کے آگے
راہیل کا نام لیا تھا۔ حالانکہ خیر ضروری پیار سے اپنی
بات منوانا یا سمجھانا دونوں کا ہی خاصا نہیں تھا۔ خاص
طور پر مئی کا۔ ان کی ہر بات میں حکم کا عنصر نمایاں ہوتا
تھا۔ راہیل کے نام پر انہوں نے در تالیاب کو ایسے دکھا
جیسے ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ اس پر نہیں یا اس
کی عقل پر ماتم کریں۔

ڈیڈی نے عرصے سے گلاس فرش پر دے مارا تھا۔
یہ تالیاب کی زندگی کا اس گھر میں ہونے والا کسی بھی
فرد کا سب سے شدید رد عمل تھا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ ڈیڈی تقریباً

تقریباً چلائے۔
”اس لڑکے کو میں اپنی لیکچری میں آفس برائے کے
طور پر نہ رکھوں۔ اور تم اسے۔ اس گھر کا دایرہ بنانا
چاہتی ہو۔“

وہ جانتی تھی راہیل کا نام لیتے ہی اس طرح کی باتیں
کی جائیں گی۔ وہ ان ساری باتوں اور رویوں کے لیے
تیار تھی۔ پھر بھی ڈیڈی کے اس روپ سے وہ لمحے بھر
کے لیے ساکت ہو گئی۔

”دنیا میں ہر شخص آپ کے جتنا امیر نہیں ہوتا
ڈیڈی۔“

”جو ہمارے اسٹینس کے ہیں تم ان میں سے
چوائس کر لو۔“

”یہ اب ممکن نہیں۔“
”تم فیصلہ کر چکی ہو؟“

”جی۔“

”تو پھر ہمیں کیلے بتا رہی ہو۔“

”اس بارے میں آپ کا فیصلہ جتنا چاہتی ہوں۔“
”ہماری طرف سے انکار ہے۔ سچی۔“ اب کے
مئی بولی تھیں۔ موضوع کی شروعات سے ہی تالیاب
کی اس گستاخی کو جیسے برواشت کیے بیٹھی تھیں۔

بحث ختم ہو گئی۔ بے نتیجہ ہی۔ اور اگلے ایک
بہتے تک وہ تقریباً بیمار رہی تھی۔ راہیل سے اس نے
کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ تعلق ایسا تھا جس میں
ایک فریق بہت سے مرحلوں کو چھپا رہا تھا۔ اگلی زندگی
کو بہتر کرنے کے لیے۔

”تو یہ صلہ دے رہی ہو تم ہمارے پیار کا۔“ مئی
ڈیڈی دونوں ایک دن خود اس کے کمرے میں آئے۔
تالیاب نے کل دنوں سے خود کو اپنے کمرے میں قید کر
رکھا تھا۔

”بچپن میں تم اپنی کلاس کی غریب لڑکیوں کی مدد کیا
کرتی تھیں۔ آج یہ جذبہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ تم خود
کو ہی خیرات کر رہی ہو۔“

وہ خاموش لیوں اور بھگی آنکھوں کے ساتھ دونوں
کی کٹکٹو سنٹی دسی۔

”اپنے دھرم کے سارے بھائیوں کے سامنے کیا مثل قائم کر رہی ہو تم۔ کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں۔ ہماری تربیت کی اور خود اپنی بھی۔“

”کوئی ایک خوبی۔ کوئی ایک خوبی جو اس لڑکے کی۔“

”سوائے محبت اور شاعری کرنے کے۔“

وہ کوئی خوبی نہ جاسکی۔ راحیل میں جتنی خوبیاں تھیں۔ کوئی نظر آئی تھیں۔ وہ ساری محبت کی پیدا کردہ تھیں۔ مئی ڈیڈی لیکچرس اینڈ لیکچر سے ہر چیز کو جاننے والے۔ ان کے سامنے ان باتوں کا ذکر کرنا ہی لا حاصل ثابت ہوتا۔ پر اس نے ہمت کر کے ایک حل ضرور بتا دیا تھا۔ اور دونوں اسے مزید حیرت سے دیکھنے لگے۔ جیسے اب تو تباہ و تباہی ہی پاگل ہو گئی ہو۔

”اے گاؤ! ڈیڈی نے ایک طنز بھرا تہذیب لگایا۔“

”یعنی اب ہماری محنت سے لگائی گئی فیکٹری میں وہ لوگ کام کریں گے۔ جو شعرو شاعری سے رغبت رکھتے ہیں۔“

اسے ڈیڈی کا راحیل کی اس طرح بے عزتی کرنا بے حد برا لگا۔

”میں گھر منتس کا کام کرتا ہوں تباہ۔ میرا رونا کبھی بھی کوئی پہلی کیشنر ہوس کھولنے کا نہیں ہے۔“

”خزانوں میں مزید خزانے شامل نہ ہوں تو آخر میں بنجر زمین بھی اپنی نہیں رہتی۔ اور ہم اسے کیوں مہیلا کروائیں۔ جب ایک سے بڑھ کر ایک سہیل لڑکا تمہارے امیدوار کے طور پر موجود ہے۔“

مئی نے جھوٹ تو نہیں کہا تھا۔ تقریباً ”ہر پارٹی“ ہر گید رنگ میں وہ تباہ کو فلاں، فلاں اور فلاں دکھاتی رہتی تھیں۔ ان کی اعلا قابلیت اور کاروباری صلاحیتوں کا بوڑھا فراہم کرتی تھیں۔ خود وہ تباہ کے ایک اشارے کی بھڑک تھیں۔

”صرف تمہارے ہاں کرنے کی دیر ہے میری جان۔ مسز درانی میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔ راحت تو میری بہنوں کی طرح ہے۔ باتوں باتوں میں

تمہارا ذکر بھی کر چکی ہے۔ عدیل باڈنگ میں جانے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ اسے دیکھ کر تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ اس کے اندر تسلسلہ چارینے کے سارے وصف موجود ہیں۔“

مئی اسے اپنی نظریں پر لپکت لڑکے دکھاتی رہیں۔ ان کے بارے میں بتاتی رہیں۔ لیکن جو تباہ کی نظر میں سما چکا تھا اس کے لیے وہ دونوں ہی ہاں نہیں بھر رہے تھے۔

اس لیے وہ آج علی آئی تھی۔ گھر چھوڑ کر بیٹھ کے لپکے۔ رات ہی اس نے اپنا پھونٹا سا بیگ تیار کر لیا تھا اور صبح ناشتے سے پہلے نکل آئی تھی۔ بے باتوں یا چوری چھپے نہیں۔ نہ ہی اپنے کمرے میں کوئی خط چھوڑ کر۔ جس وقت وہ گھر سے نکلی، مئی اٹھ چکی تھیں۔ اگر تباہ نے ان کے پیار کے بدلے ان کی بات نہیں مانی تھی تو انہوں نے بھی تباہ سے پیار کے نائے تباہ کی ضد کو پورا نہیں کیا تھا۔

”ہیں سے اتر کر وہ تقریباً“ اپنے وجود کو کھینچتی ہوئی اسے اتر کر ٹنگ تک آئی تھی۔ لپٹ تو حسب معمول خراب ہی تھی۔ ساری بلڈنگ ناقص اور سستے فلیٹس سے پُر تھی۔ کوئی ایک آدھ چڑ خراب ہو جاتی تو مینوں ٹھیک ہونے کا ٹیم نہ لیتی۔ نہ کینٹن کے پاس اتنی گنجائش ہوتی کہ ٹھیک کر دلنے کے فخذ میں بڑھ چڑھ کر حصہ ڈال سکتے۔

دسویں فلور تک کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اور چھوٹے سے بیگ کو سنبھالتے سنبھالتے وہ جیسے صدیوں کا سفر کر کے آئی تھی۔ وہ بتل دینے پر بھی جب دروازہ نہ کھلا تو اسے احساس ہوا کہ راحیل اس وقت اپنی جانب پر گیا ہو گا۔ ہینڈ بیگ سے چابی نکل کر اس نے خود ہی دروازہ کھولا تھا۔

گھر سے نکلتے وقت وہ دونوں چابیاں اپنے ساتھ ہی لیتی آئی تھی۔ یہ دونوں ایک شرا چابیاں بیٹھ اس کے پاس ہی رہتی تھیں اور راحیل کے پاس ایک واحد اور آخری چابی ہوتی تھی۔

اندرو داخل ہو کر اس نے فلیٹ کو روشن نہیں کیا

قلہ باہر سے جتنی روشنی آ رہی تھی وہ اس کے لیے کافی تھی۔

اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ بیٹھ کی طرح آج بھی اسے یہ کہو بہت پیارا لگا۔ نیا نیا۔ اجلاس۔ ہر چیز صرف مینٹ پیلے ہی تو خریدی گئی تھی۔ نئی، ہنگامی اور تیس۔ ڈیڈی پر دوسرے لٹے کے لیے۔

ڈیڈی نے راحیل کو دس سال کا نام دیا تھا۔ ایک طرح کا ٹیاب کو بھی۔ اس کی ذہنی حالت پر ترس کھانے کے۔

”مگر وہ تم سے محبت کرتا ہے تو دس سال کے اندر اندر کچھ لچو کر کے دکھائے۔ میری سوچ، میرے مشاہدے کو غلط ثابت کر سکتا۔ ثابت کروے گا اگر اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہوا تو۔“ ڈیڈی نے کہا تھا اور سارا معاملہ دس سال کی محنت اور جدوجہد کے سپرد ہو گیا تھا۔

دس سال کیسے گزر گئے چاہی نہیں چلا۔ بے تحاشا کوششوں کا جس کی کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ سارے حالات جوں کے توں ہی رہے۔ بلکہ گھبرے پائی میں مزید کالی لگنا شروع ہو گئی۔ اور دونوں نے سوچا تھا کہ وہ بڑے سن میں ڈیڈی کو بوجھ بٹائیں گے۔

جتنی دیر ڈیڈی راحیل کے قلیٹ میں بیٹھے رہے۔ خاموش رہے۔ اور کچھ جھوٹ اور کچھ سچائی پر مبنی راحیل کی گفتگو سن رہے۔

ٹیاب نے اپنی دس سال کی ہانسی ہوئی سیوٹ کے لیے جیسے بھی راحیل کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے تھے اور قلیٹ کو بہتر کرنے کے لیے بھی دونوں نے بہت کچھ کیا تھا۔

اور ڈیڈی۔ سب کچھ صرف دیکھ نہیں رہے تھے۔ بلکہ یاد کر رہے تھے۔

مگر اگر انہوں نے ٹیاب کو ایک ایک چیز کی تحصیل دی تھی۔ خریدی گئی ہر چیز کی رقم اور خریدار کے اکاؤنٹ نمبر کے ساتھ بتایا تھا۔ وہ ٹیاب ہی تو تھی اور راحیل کے سارے جھوٹے جوہروں نے مل کر گھڑے تھے۔

ٹیاب شرمندہ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے یہ سب راحیل کی محبت میں ہی کیا تھا اور جو قدم اس نے آج اٹھایا تھا وہ بھی صرف راحیل کی محبت میں ہی اٹھایا تھا۔ قلیٹ میں داخل ہو کر اس نے راحیل کو گل کی۔ ”راحیل! میں آگئی ہوں۔ اپنا کمرہ چھوڑ کر بیٹھ کے لیجئے۔ پلیز اس وقت کوئی سوال جواب مت کرنا۔ بلکہ بات شام میں کرتے ہیں۔“

راحیل نے گہرا سانس لیا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ اتنی ہی کہہ پایا۔

فون بند کر کے وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دل جو صبح سے بُری طرح سے دھڑک رہا تھا اس کی رفتار بھی نارمل ہوئی۔ کچھ وہ کل رات سے جاگ رہی تھی اس وجہ سے بھی بیڈ پر بیٹھتے ہی سکون کی ایک کہری لہرنے اس کے پورے وجود کو اپنے احاطے میں گھیر لیا تھا۔ ”میں محبت کے سارے جی لوں گی۔“ اس نے ایک بار پھر خود کو یقین دلایا۔



”بکس کہاں ہیں میری؟“ کمرے میں تیزی سے داخل ہو کر راحیل نے ہانپتے ہوئے پوچھا تھا۔ جیسے وہ کمروں کے قلیٹ کا کوٹا کوٹا چیک کر چکا ہو۔

ٹیاب کپڑے استری کر رہی تھی۔ سوال جیسے اس نے سنایا نہیں۔

”میں پوچھ رہا ہوں، بکس کہاں ہیں میری۔“ وہ تیز ترین آواز میں گویا ہوا۔

”کوئی سی؟“ منہ کو قدرے انوکھے زاویے پر لے جاتے ہوئے ٹیاب نے پوچھا تھا۔

”پوٹری کی۔“ وہ نظریں نہ اٹانے لگا۔ ”پھینک دیں۔“ ٹیاب کو جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا تھا۔

”کیا۔“ وہ چلایا۔ ”پھینک دیں۔“ حیرانگی اس کی آنکھوں میں بھر گئی تھی۔

”نہیں۔ یاد آیا۔“ چپکلی نہیں۔ جلدی نہیں۔ ”کٹ دار لہجے میں بولتی وہ جیسے اس کا مسخرہ

اڑا رہی تھی۔ راحیل کا دل غم سے ہونے لگا۔
 ”کیا کو اس کر رہی ہو۔ تمہارا دل تو خراب نہیں
 ہو گیا۔“

”ہاں۔ بالکل۔ پاگل ہو گئی ہوں میں۔“
 ”تم ایک نفسیاتی مریضہ ہو۔“

”چلائف اور چلائو مجھ پر۔ تم چلانے کے سوا اور
 کام ہی کیا کر سکتے ہو۔“ اب کے بلیا ب بھی چینی تھی۔
 ”تمہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ تم
 مجھے تنگ کرنا چاہتی ہو۔ ہر وقت ستاتے رہنا چاہتی
 ہو۔ یہ بتانا چاہتی ہو کہ میرا تم سے شادی کرنے کا
 فیصلہ ہی غلط تھا۔“

”فیصلہ تو میرا غلط تھا مسٹر راحیل۔ تم خود کو کیوں
 دوش دیتے ہو۔ دل غم تو میرا خراب تھا۔ جو میں اپنا گھر
 چھوڑ کر تمہارے پاس چلی آئی۔“

”تو نہ آئی۔ کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ گھر
 چھوڑ آؤ اپنا میری خاطر۔ یہ قدم تم نے خود اٹھایا تھا۔
 میرے منع کرنے کے باوجود بھی۔“

”پھر تم نے اس فیصلے میں میرا ساتھ کیوں دیا۔ قلیٹ
 سے نکل دیتے مجھے۔ شاید میں اپنی غلطی کو سدھار
 لیتی۔ واپس چلی جاتی۔“

”تو اب چلی جاؤ۔ کس نے روکا ہے۔“
 ”جو غلطی کی ہے اس کی سزا تو بھگت لوں پہلے۔“

”تم تو کہتی تھیں کہ تم دولت اور آسائشوں کے بغیر
 بھی گزار کر لو گی۔ کبھی شکوہ نہیں کرو گی۔ میری
 محبت تمہارے لیے کافی ہے۔“

”یہی ہی غلط نہی مجھے بھی تو تھی تمہارے بارے
 میں۔“

”میں جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔ تم بدل گئی ہو۔
 میرے ساتھ جینا تمہارے لیے سہرا ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک کہا۔ تم جیسے تھے ویسے ہی ہو۔ بلکہ یوں
 کہنا چاہیے کہ جہاں تھے وہاں پر ہو۔ میں نے سوچا تھا
 زیادہ بہت سارا نہ سی۔ کچھ نہ کچھ بہتری تو ہو ہی
 جائے گی۔ لیکن بالکل ٹھیک کہتے تھے ڈیڈی کہ
 راحیل کی ررڑھ کی ہڈی ہی نہیں ہے۔ اور وہ تمہیں

اپنی ایک ہون بتانا چاہتا ہے۔“
 ”تمہیں اسے ڈیڈی کی باتیں اتنی ہی جتنی لگتی تھیں تو
 ہاں کیوں نہ لی ہاں کی بات۔“

”اسی غلطی کو تو کوستی ہوں بلب میں۔ اس بلیا ب
 دن کو تو یار بھی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے اپنا سوٹ
 ڈھنگ میں ڈالا تھا اور الماری میں لگانے کے لیے آگے
 بڑھی تھی۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اس نے
 صاف کیا تھا۔ راحیل اس کی شکل دیکھتا رہا تھا۔
 ”سمت سمجھایا تھا میرے دوستوں نے بھی مجھے کہ
 یہ امیر گھرانے کی لڑکی چار دن بعد تیری زندگی کو ختم ہونا
 دے گی۔“

”کیا تم نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ وہ امیر گھرانے کی
 لڑکی آج اپنے سمیت تمہیں بھی پھیل رہی ہے۔“ وہ طر
 سے بولی تھی۔ راحیل لمحے بھر کے لیے لاجواب ہو گیا
 تھا۔

”حسن کنواری ہو۔“
 ”اب تو وہ بھی گنوا کر تھک گئی ہوں۔“
 ”کیا میں کوشش نہیں کرتا تمہارے اس لائف
 اسٹائل کو بدلنے کے لیے اور تمہارے اس لائف
 اسٹائل جس کی تم علوی رہی ہو کے لیے جدوجہد نہیں
 کرتا۔“

”تمہاری ہر کوشش ہر جدوجہد سچی ہے
 راحیل۔ بڑی کامیابی کبھی تمہارے قدم نہیں چھو
 سکے گی۔ کیونکہ تم ایک سچی قوی ہو۔ اوسط درجے
 کے۔ تم چاہے شاعری کو چاہے پیشنگ بہت یا
 کچھ بھی لو۔ درمیانہ درجہ تمہاری فطرت میں رچ
 بس گیا ہے۔ تم کبھی ٹول درجے تک نہیں پہنچ سکتے۔
 اس اوسط درجے کے حصار کو نہیں توڑ سکتے۔ اوسط
 درجے کے قوی کی سوج ایک خاص رفتار سے آگے کا
 سفر نہیں کر سکتی۔ ہرن چاہے جتنا مرضی صحت مند
 ہو جائے زرا لے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ گدھا جتنا
 مرضی طاقت ور ہو گھوڑے کو دیکھ میں نہیں ہر
 سکتا۔ افسوس کہ مجھے ان باتوں کا احساس ہی دیر سے
 ہوا۔ ان چیزوں کی کچھ بڑی دیر سے لگی میری

”میں جانتی ہوں۔ تیری محبت پاکیزہ ہے۔ مقدس ہے۔ پر خلوص ہے۔ بے غرض ہے۔ بنا ٹنگ و شبہ کے ہے۔ ایسی محبتیں جن دلوں میں ہوں وہاں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔“

”تو پھر میں کیا کروں داوی اب؟“
”اس محبت کو وقت کی تمازت سے نفرت میں بدلنے سے روک لے۔ ابھی بھی وقت ہے۔ واپس چلی جاؤ۔“

”کیا میں راحیل کے بغیر جی پاؤں کی داوی؟“
”کیا تو اس کے ساتھ خوش رہ پائے گی؟“
”نہیں۔ نہیں داوی! بہت مشکل ہوگی۔ میں بہت جلد ہی تھک جاؤں گی۔“ وہ اعتراف جو وہ میٹروں سے خود سے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اب بند کرے میں پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کرنے لگی۔

”دیر نیا اب نہ رو میری بچی۔ تو نے والی بچی تو نہیں ہے۔ تجھے پتا ہے تیرے ہم کا کیا مطلب ہے۔“
”ہاں۔ داوی پتا ہے اور یہ بھی کہ اس قیمتی موتی کے لیے قیمتی دھات کا ہونا ہی ضروری ہے۔ مٹی بھر بھرا جائے گی اور کانسی اس کی ملائت پر ٹنگ نہیں پائے گی۔“

وہ بیڈ سے اٹھی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اسے گھر سے نکلے پورے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ اور اب وہ مزید دیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنا چھوٹا بیگ اس نے واپس اٹھا لیا اور گھر سے نکلنے کے لیے تیار ہو گئی۔
”مجھے تم سے بہت محبت ہے راحیل بہت زیادہ۔ اتنی کہ میں اس محبت کو نفرت، شکووں، چیختاؤں، دکھوں میں بدلتا نہیں دیکھ سکتی۔“ باہر نکل کر دروازے کو لاک کرتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔

گھر سے نکلے وقت وہ دونوں چابلیں اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی اور راحیل کالٹ چھوڑتے وقت اس نے دونوں چابیوں کو دروازے میں ہی نگارہنے دیا تھا۔

”جس چپ کرے۔ بند کر دے اپنی بکواس۔ بہت ہو گیا۔ داوی بھی ڈیڑی فریڈن۔ میں ان سب کے بیان سن سن کر تنگ آچکا ہوں۔ نہیں جی سکاس میں ایسی زندگی۔ نہیں جینا چاہتا۔“

”میں بھی کوئی خواہش مند نہیں رہی اب ایسی زندگی جینے کی۔“

”تو پھر ایسا کرو تم مجھ سے طلاق لے لو۔“ نیا اب کی طرف دیکھتے ہوئے وہ چلایا تھا۔ معاملہ ختم کرنے کا آسان طریقہ نیا تھا اس نے۔

”میری زندگی تمہارے گننے سے پہلے بھی بہتر تھی۔ تمہارے جانے کے بعد بھی یقیناً بہت بہتر ہو جائے گی۔ طلاق لے لو مجھ سے۔ خدا کے لیے۔ چلی جاؤ۔ میں سے۔ سکون لینے دیجھے۔“

نیا اب سن سی ہو کر راحیل کی صورت دیکھنے لگی تھی۔ جو اپنا سر پکڑے بند پر بیٹھا تھا۔ نیا اب کی آنکھیں اس کی حالت دیکھ کر اور اس کی بات سن کر آنسوؤں سے بھیک مٹی تھیں۔

وہ بیڈ پر اٹھی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھیک ہوئی تھیں۔ لینے لینے ہی اسے غینہ آگئی تھی۔ اب اٹھی تو چاروں طرف انجان نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیسے نجانے کتنے آگے کے سالوں کا سفر کر کے واپس چلی ہو۔ کمرے میں داوی کی گود کی گرائش پھیلی ہوئی تھی۔

”دیر نیا اب!“ داوی سے داوی کی پکار پھر گونجی۔
”بیش کی طرح دم اور پیار بھری۔ وہ حیرانگی کی جسم صورت بن گئی۔“

”دیر نیا اب۔“ پھر پکارا گیا۔
”داوی!“ اور سر ہلنے میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں داوی۔ بہت زیادہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔“





مکہ اکرم چوبیسی

حیات

سیا و حاشیہ پارت کرو۔ ”بچھاؤ کی۔ ایک نادرہ آواز دہکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی سیا و حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

ہرینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی نامی یادداشت اور نامی وفات درج ہوئی ہے۔ وہ یہی طرح الجھ جاتی ہے اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے گودے دی ہیں۔ ہرینہ کو ہستو کہ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبد اللہ ہے اس کے متعلق پوچھنے کی۔



ناولٹ

عبداللہ پابند صوم و صلوٰۃ وہ مسجد کا موزن بھی ہے اور اس نے علی میں ایم قل کر رکھا ہے عہدہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے عہدہ پہنچا ہوا ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

عہدہ کے والد مولوی رشتی کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دلاوی سے قریب ہے مونا اس کی کنکھ ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

عہدہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زعمی گزارنے والی صالحہ تپانے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بیات حیت کی اجازت نہیں دی۔

شانزے باؤل بننا چاہتی ہے۔ ریسپرڈاک کرتے ہوئے اس کا پاس مڑنا آتا ہے اور وہ مگر جاتی ہے۔

ڈاکٹر بینش نیلی کو بھی میں اپنے بیٹے ارجم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرمل ڈاکٹر معاد کا انتقال ہو چکا ہے۔

نیلی کو بھی کے دوسرے حصے میں ان کے تباہ ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی بے شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدہ کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیر ان کے پاس لندن میں ہے۔

اوریدہ اور ارجم کی دست دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔

عبداللہ عہدہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آباد کچھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر ہار کر بھیج دیتی ہیں۔

سہد اپنے دوست کے رزلٹ کن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دکھاتا ہے۔ شانزے اس کی فیس کر دی ہے کہ وہ ایک چائس اسے دے کر لے گئے۔

گئی۔ آج اسے ایک دفعہ پھر ماضی کی خوشگوار یادوں کے ساتھ ایک اذیت ناک سفر کرنا تھا۔



بڑے ابا کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے کمرے میں ٹھل رہے تھے اور وقتاً فوقتاً ایک بد گلن سی نگاہ بڑی اماں کے چہرے پر ڈال لیتے تھے جو اس وقت سخت بوکھلائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ خود کن کے ماتھے کے بل گھرے ہی ہوتے جا رہے تھے۔ ماہیر کی اچانک آمد کو انہوں نے ذہنی طور پر ابھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے بڑی اماں سارے معاملات سے باخبر تھیں۔ یہی سوچ کن کے غصے میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔

”اچھا تو اس وجہ سے آج گھر میں تفصیلی صفائیوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔“ انہوں نے فوراً ہی فرد جرم عائد کی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ بڑی اماں کو دمچکا سا لگا۔

”آپ کو پتا تھا تیمور کا بیٹا آج پاکستان آ رہا ہے اور آپ نے اس بات کو مجھ سے چھپایا۔“ کن کے اس الزام پر بڑی اماں تڑپ اٹھیں۔

”تم خواہو امیرے اور الزام مت لگائیں اس نے اور یہاں کی دفعہ کن سا مجھ سے پوچھا تھا جو ماہیر کی دفعہ میری اجازت لے گا۔“ انہوں نے بیزار سی سر جھٹک۔

”تو آخر آپ کے بیٹے کی ان حرکتوں کا مقصد کیا ہے؟“ ان کا بار ایک دم ہی بڑھا تھا۔

”مجھے کیا پتا ہو سکتا ہے ماہیر اپنی بہن سے ملنے آیا ہو؟ ظاہر ہے ہم اسے روک تھوڑی سکتے ہیں۔“ بڑی اماں کا مزاج بھی برہم ہوا۔

”کیوں نہیں روک سکتے۔“ وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔

”اس کے باپ کا گھر ہے کیا؟“ غصے میں کافی غلط جملہ بول گئے تھے بڑی اماں کو نہ چاہتے ہوئے بھی

ہنس اٹھتی۔ ”ظاہر ہے اس کے باپ کا ہی گھر ہے۔“ بڑی اماں نے ہنس کر انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔ جب کہ جلال صاحب کا موڈ ہنوز خراب تھا اور اب تو اس میں اور شدت آ گئی تھی۔

”نہیں ہوں میں اس ہانچار کا باپ، میری صرف ایک بیٹی ہے طیبہ جلال اور کوئی نہیں۔“ انہوں نے بھی بے رخی کے سارے ریکارڈ توڑے۔

”آپ کے اس طرح کہنے سے خون کا رشتہ ختم تھوڑی ہو جائے گا۔“ وہ محتاط انداز میں گویا ہوئیں۔

”ہونہ۔“ انہوں نے نفرت آمیز انداز سے ہنکارا بھرا۔ ”پہلے بیٹی کو بھجوا دیا اب بیٹا لے آ کر آگیا ہے کل کو خود تشریف لے آئے گا۔“

”آپ کچھ بھی کہیں لیکن میں تب کیہ تار ہی ہوں مجھے ماہیر کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔“ بڑی اماں نے اپنی طرف سے کن کا دل صاف کرنا چاہا۔

”وہ کھوشناتہ بیگم! آج سے کئی سال پہلے بھی تم نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی اور مجھے اندھیرے میں رکھا تھا جس کی بھاری قیمت مجھے خاندان کی عزت گنوا کے لوا کرنی پڑی، تم اب بھر۔“ مارے اشتعال کے کن سے اپنا جملہ عمل نہ ہوا۔

”ماضی کی باتوں پر بڑی گرد و مت جھاڑیں جلال صاحب۔“ وہ ناراضی سے کھڑی ہوئیں۔ ”کن میں سے کسی ایک آئینے میں آپ کو اپنا چہرہ بھی نظر آ جائے گا۔“ ان کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی غصہ جھلکا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ جلال صاحب تڑپ اٹھے۔

”مطلب و مطلب آپ کو اچھی طرح سے پتا ہے میں کبھی بھی اولاد کی غلطیوں کی چشم پوشی کی قائل نہیں، میں نے اسی رات آپ کو خبردار کر دیا تھا کہ ہوا میں کس رخ پر چل رہی ہیں۔“ بڑی اماں کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی ابھری۔

”ہاں اس وقت جب پلوں کے نیچے سے سارا پانی
بہہ چکا تھا۔“ جلال صاحب آج بھی اپنی غلطی ماننے
کو تیار نہیں تھے۔

”تو ٹھیک ہے۔ آپ کو اتنا ہی غصہ ہے تاہم پورے تو
علاقہ کر دیں اسے گھر سے نکال باہر کریں اس کی اولاد کو
دل کی جگہ پتھری تو رکھا ہوا ہے آپ نے۔“

بڑی اماں کا تو آج انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ جلال
صاحب ہلکا سا ٹھٹکے، غور سے اپنی زوجہ کا چہرہ دیکھا ان
کے چہرے کے ایک ایک بخش سے ناراضی اور غصہ
متضح تھا۔ وہ آج اپنی جون میں نہیں تھیں۔ اپنی بات
کھل کر کہہ رہی تھیں اور غصے سے دروازہ کھولا اور
پناہ کر کے بند کیا ایک لمحے کو تو جلال صاحب بھی ہل
سے گئے۔

بڑی اماں جیسے ہی جلال صاحب کے کمرے سے
ٹکٹیں، سامنے ماہیر لاؤنج میں اپنا بڑا سا بریف کیس
کھولے اس میں سے اور یہ اکو لائے ہوئے گفٹس
نکل کر دے رہا تھا۔ اور یہاں کے چہرے پر ایک بڑی بے
ساختہ فطری خوشی چھلک رہی تھی۔ وہ ان دونوں کو نظر
انداز کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں، ان کا
ارادہ تیسور سے بات کرنے کا تھا۔

”کم از کم تم مجھے تو بتا دیتے کہ ماہیر پاکستان آ رہا ہے۔“
بڑی اماں کے لہجے میں ایک دل کو دکھائی ہوئی
سنجیدگی تھی۔

”کیا ہوا اماں! ابانے کچھ کہا ہے کیا؟“ تیسور نے
بالکل درست انداز لگایا۔

”تو اور کیا گھر میں مارشل لا لگائے بیٹھے ہیں سارا
غصہ مجھ پر نکل رہے ہیں۔“ انہوں نے بھی صاف
صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

”انہیں تو لگتا ہے اس گھر میں دن رات ان کے
خلاف سازشیں ہوتی ہیں جن میں میرا بھی ہاتھ ہوتا
ہے۔“ وہ اتنی ہوتی تھیں۔

”ماہیر کا آنا ان کے نزدیک کوئی سازش ہے کیا؟“
تیسور کو بھی اب بے لگ بابت پر غصہ آگیا۔
”تمہارے بلا کو تو یہی لگ رہا ہے نا۔“ بڑی اماں

نے بیزاری سے گردن کو جھٹک دیا۔
”لیکن اماں! ماہیر کی تو طبیعت کے بیٹے سے گہری
دوستی ہے اور ابھی بھی وہ میرے کہنے پر نہیں سرب
کے کہنے پر پاکستان آیا ہے۔ دونوں مل کر کوئی پزیر کرنا
چاہتے ہیں۔“ تیسور نے جھنجھلا کر مغللی دی۔

”میاں! مجھے تو یہ سبق مت پر محلو! سب پتا ہے
مجھے جا کر اپنے بلا کے دل میں ڈالو! شام سے میرے
پچھے ہاتھ منہ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔“ انہوں نے چڑ
کر جواب دیا۔

”ابا کو پہلے کبھی کوئی بات اسمانی سے سمجھ آئی ہے
جو یہ آئے گی۔“ تیسور نے بھی کئی گلے دل میں پل
رکھے تھے۔

”جب بھی غصہ آتا ہے برائی کہانیاں کھول کر بیٹھ
جاتے ہیں آج تو میں نے بھی لحاظ نہیں کیا، ٹھیک
ٹھاک بنا کر آئی ہوں۔“ بڑی اماں کی بات پر تیسور کا دل
تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

”آپ کو پتا تو ہے ان کی عادت کا کیوں بحث کرتی
ہیں پھر۔“ تیسور افسردہ سے انداز میں گویا ہوئے۔
”ہاں تو میں نے کوئی ٹھیکہ تھوڑی لے رکھا ہے ان
کی جلی کٹی سننے کا۔“ انہوں نے بھی بے رخی سے
جواب دیا۔

”ان کی پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اوپر سے
آپ۔“ تیسور ناراضی کا اظہار کرتے کرتے چپ
ہوئے۔

”کچھ نہیں ہوا ان کی طبیعت کو؟ ابھی آجائے ان کی
چیمٹی بیٹش اور تھوڑی ہی دیر بعد قہقروں کی گوازیں
آئے لگیں گی۔“ بڑی اماں کو آج ضرورت سے زیادہ
ہی ان پر غصہ تھا اور کسی طور بھی ان کو بخشنے کو تیار نہیں
تھیں۔

”ماہیر ملا رہا ہے۔؟“ انہوں نے تھوڑا سا جھجک کر
پوچھا۔

”ارے کہاں ڈھنگ سے ملے ہیں اس بے
چارے سے؟ دیکھتے ہی ایسا سکھتا ہوا بولنے لگتا ہے
جا کر ہی ٹوٹ۔“ بڑی اماں کے ماتھے کے بل گہرے

ہوئے تیمور ہزاروں میل دور بیٹھا بھی صورت حال کا اندازہ کر سکتا تھا۔

”ویسے کتنے دن کے لیے کیا ہے ماہیر۔“ بڑی ماں کو آخر وہ سولہ یا آری گویا جس کے لیے انہوں نے فون کھڑا کیا تھا۔

”دن دن کا تو پتا نہیں، وہ تو مستقل رہنے کے ارادے سے ہی آیا ہے۔“ تیمور کی بات پر بڑی ماں کا دل دھک سے دھک۔

”مستقل۔؟“ وہ آنے والے دنوں کا سوچ کر ہی چپ ہو گئی۔

”ہاں اسٹریز تو اس کی کھیلٹ ہو گئی، کوئی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولنا چاہتا تھا سرمد کے ساتھ مل کر پاکستان میں۔“ تیمور نے شرمندگی سے وضاحت کی

”پاکستان کے کون سے بزنس کے حوالے سے حالات اچھے ہیں۔“ بڑی ماں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو ماہیر جب یہاں رہے گا تو خود دیکھ لے گا باقی اس کی مرضی۔“

تیمور نے بات کو لپیٹا تو بڑی ماں ایک دھمپی خاموش ہو گئیں۔ لگتا تو انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ماہیر اور گوریڈا کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے وہ اپنی سن کے مقابلے میں کہیں زیادہ پُراحتیو، بے باک اور کسی حد تک نہ بچت بھی واقع ہوا تھا۔ سوچ سکتی تھیں کہ مستقبل میں جلال صاحب اور ماہیر تیمور کے درمیان کتنی کتنی جھڑپیں ہونے والی ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی فکر کے تھے۔

”تمہیں جیسے بٹھائے پاکستان آنے کی کیا سوچیں؟“ اورید اپنے گفٹس، شور کر رہے آرام سے ماہیر سے پوچھ رہی تھی جو پھلوں کی ٹوکری سامنے رکھے، بے تکلفی سے بٹے کھانے میں مگن تھا اور ساتھ ساتھ ایک نظر سامنے دیوار پر لگی ایل سی ڈی پر

بھی ڈال لیتا تھا جہاں کسی اسپورٹس چینل پر ریسنگ کا ایک دلچسپ مقابلہ دکھایا جا رہا تھا۔

”پتا تو ہے تمہیں، مجھے ایڈوینسز کا کتنا شوق ہے۔“ اس نے ٹوکری سے سیب نکالا اور لاپرواہی سے کھانے لگا۔

”بڑے بابا کا موڈ خالص خراب ہے۔“ اورید نے اپنے سے پانچ سال بڑے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”سو اٹ۔“ وہ ناک چڑھا کر بولا۔ ”ان کا اپنا موڈ ہے، چاہے خراب کریں یا اچھا کر دیں، ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ ماہیر کسی بھی چیز کو اپنے سر پر سوار کرنے کا قائل نہیں تھا۔

”مجھے لگتا ہے انہوں نے بڑی ماں سے بھی جھگڑا کیا ہے۔“ اورید نے اسے ایک نئی اطلاع دی۔ جس کا کم از کم ماہیر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”ایک بات تو بتاؤ اورید۔“ وہ ریموٹ کنٹرول سے دی کی آواز آہستہ کرتے ہوئے سنبھل کر بولا تو اورید نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جس کے آنے سے کم از کم وہ خود کو بہت طاقتور سمجھنے لگی تھی۔

”تم نے بڑے بابا اور بڑی ماں کو ضرورت سے زیادہ کیوں اپنے حواسوں پر سوار کر رکھا ہے۔؟“ ماہیر نے اس کی نگاہیں لینے کا ارادہ کیا۔

”ظاہر ہے میں ان کے گھر میں جو رہتی ہوں۔“ اورید نے غصے سے انداز میں جواب دیا۔

”یہ ان کا ہی نہیں ہمارے بابا کا بھی گھر ہے اور فوج میں ہمارے بابا ہی اس گھر کے والی وراثت ہیں۔“

ماہیر کی بات نے اورید کو حیران کیا۔ ”مجھے تو سخت مایوسی ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر، تم اپنا سارا کانفیڈنس لوڑ کر چکی ہو اس سے کہیں زیادہ کانفیڈنس تم انکھینڈ میں تحمیں۔“

”مجھے بڑے بابا اور آئی بیس کی ناراضی سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ اورید اس کے منہ سے پھسلا۔

”اب یہ آئی بیس درمیان میں کہاں سے آئیں گی؟“

مسکرایا۔ ”پھر بھی آپ گیٹ میں ہیں اور اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ان کے بالکل پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹا گیٹ میں نہیں۔ آپ ہیں میں تو شروع سے ہی اسی گھر میں رہ رہی ہوں۔“ بینش کو سامنے کھڑے لڑکے کی پُر اعتماد نظروں سے الجھن ہو رہی تھی جو ان کی بات پر باقاعدہ ہنسا تھا۔

”ارے آئی میں گیٹ کھل سے ہوا؟ یہ گھر میرے پاپا تیمور جلال کے نام پر ہے اور میں تیمور جلال کا اکلوتا بیٹا ہوں“ اس حوالے سے اس گھر میں میری کیا حیثیت ہے، آپ خود اندازہ کر سکتی ہیں۔“ اس نے پہلی ہی بار پُر ڈاکٹر بینش کو بولنا شروع کیا تھا۔

”مطلب یہ کہ کوئی اس گھر میں ساری زندگی بھی گزار دے تو اس کی وہ حیثیت نہیں ہو سکتی جو ماہیر تیمور کی ہے۔ سہیل سی بات ہے۔“ بڑی امیں نے میز میزوں سے اترتے ہوئے ماہیر اور بینش کے درمیان ہونے والی اس بحث کو بڑے مزے سے سنتا۔

کشیدگی کے اس سخت ماحول میں بینش کے چہرے پر پھیلی خجالت نے بڑی امیں کے دل میں سکون کے کئی پھول کھلا دیے، ”انہیں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ ماہیر کی یہاں آمد میں قدرت کی طرف سے کوئی عہد چھپا ہے۔ انہیں اب سکون سے اس عہد کے کھلنے کا انتظار کرنا تھا۔ ڈاکٹر بینش نے ایک سروسی نگاہ ماہیر پر ڈالی اور تیزی سے ڈاکٹر جلال کی اسٹڈی کی طرف بڑھ گئیں۔ اور یہ انے خوفزدہ نگاہوں سے پہلے ماہیر اور پھر بڑی امیں کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

”میں اپنے چائے کے لیے رات کے کھانے پر کیا ہواؤں۔“ بڑی امیں کا شیرینی میں ڈوبا ہوا لہجہ اور یہاں اور ماہیر دونوں کو چونکا گیا۔

”اگودا لے چاہل نمو کی کارائتہ اور چکن کباب۔“ ماہیر بڑے مزے سے انہیں اپنا مینو بتاتے لگا، ”اور یہاں نے رشک بھری نگاہوں سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا، وہ مگر بھی اس کے جیسی نہیں بن سکتی تھی۔



”بس بھی کرو بیٹا، کیوں اپنا پی پی ہائی کر رہی ہو۔“

وہ اپنی سیکنڈ کزن ہیں، ہمارا ان سے کیا لینا دینا۔“ ماہیر کو قہقہہ لیا۔

”وہ ار صم کی ماما ہیں اور ار صم میرا بسٹ فرینڈ ہے“ اور یہ انے جھنجھلا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو ار صم کی ماما ہونے کا مطلب یہ تھوڑی سے کہ انہیں سب کو ڈی گریڈ کرنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔“ ماہیر کو وہ ڈھالکی سیل بعد اپنی بس سے ملنے کے بعد سخت مایوسی ہو رہی تھی، وہ دل ہی دل میں ماما سے بھی لڑنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ جنہوں نے اسے پاکستان بھجوا کر سخت زیادتی کی تھی۔

”میں نے ایسا تھوڑی کہا ہے۔“ اور یہ انے بوکھلا کر جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا، لیکن اس کے چہرے پر ناراضی کے رنگ نمایاں تھے۔ اسی لمحے بڑے مصروف انداز میں آئی بینش لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی ماہیر کو دیکھ کر انہیں جھٹکا سا لگا۔ وہ وہیں کھڑی ہو گئیں اور پچھلی پچھلی سی نگاہوں سے ماہیر کو دیکھنے لگیں۔

”تیمور!“ ان کے حلق سے بلی ہوئی سرگوشی کی صورت میں نکلا۔

”السلام علیکم، نئی ایم ماہیر تیمور۔“ وہ ایک دم ہی کھڑا ہوا اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا تعارف کر دیا تو ایک لمحے کو تو بینش کے بھی چھلکے چھڑا گیا۔

”د علیکم۔“ انہوں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور اس پر سے نظریں ہٹائیں، ”وہ اپنے باپ کی طرح پینڈ سم اور دراز قد تھا۔

”بڑے ابا کمال ہیں۔“ انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے لوریدارگی طرف دیکھا جس کا رنگ انہیں دیکھتے ہی حسب عادت فق ہو چکا تھا۔

”اسٹڈی میں۔“ ماہیر نے پُر اعتماد انداز میں جواب دیا۔ ”چلیں میں آپ کو لے چلا ہوں۔“

”نو تھینکس، مجھے معلوم ہے اسٹڈی کہاں ہے“ ڈاکٹر بینش کے جھٹاتے ہوئے انداز پر وہ ہلکا سا

تفاحی نے اخبار سے نظر سنا کر پیش کی طرف دیکھا۔
ارم سم بھی آج ویک اینڈ پر گھر پہنچا تھا اور پہلے دس
منٹ سے اپنی ماں کو گر حنا برستا دیکھ رہا تھا۔ ابھی کچھ
دیر پہلے ہی بڑے ابا کے پورشن سے لولی تھیں اور وہاں
ماہیر سے ہونے والی ملاقات نے ان کے جذبات کو
خالصا بخیر کیا تھا۔

”تپ سوچ نہیں سکتے تفاحی کتنی لمبی زبان ہے
تیمور کے بیٹے کی۔“ مسلسل ایک ہی بات کی
گردن کیے جا رہی تھیں۔ ارم سم نے ابھی کراچی میں کا
چہون کھا، بعض دفعہ وہ ان کے روئے کو خود بھی سمجھنے
سے قاصر ہو جاتا اور کبھی کبھی تو اسے اپنی ماں کی
ڈگریوں پر بھی شک ہونے لگا کیونکہ ان میں اور کسی
گھریلو لڑاکا خاتون میں کوئی فرق ہی باقی نہیں رہتا تھا۔

”ظاہر ہے ساری زندگی اس کی یورپ میں گزری
ہے وہاں کے بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھا ہے۔
کانفیڈنٹ تو ہو گا میں۔“ تفاحی کو ابھی تک ماہیر سے
لئے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

”کانفیڈنٹ نہیں اور کانفیڈنٹ کس کو رید اسے
کس زیادہ تمیز اور منہ پھٹ ہے۔“ ایک دفعہ پھر
غصے سے نکلے لگیں۔

”لوریہ کو خیر میں نے کسی سے بھی بد تمیزی کرتے تو
میں دیکھا اب تم غلط بات تو مت کرو پیش۔“

تفاحی بھی کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ ہی سچ
بولنے لگتے۔ پیش نے کہا جانے والی نگاہوں سے
سامنے بیٹھے اپنے والد اور اکلوتے بیٹے کو دیکھا من میں
سے کسی ایک نے بھی ان کی حمایت میں ایک بیان
نک جا رہی نہیں کیا تھا اس لیے وہ مل ہی مل میں خوب
ٹھلکاری تھیں۔

”مجھے تیمور کے بیٹے کے ارلوے کچھ اچھے نہیں
لگ رہے۔“ انہوں نے لوریہ کے متعلق مزید گل
ہنٹائی کرنے سے بہتر سمجھا کہ اپنی توجہ ایک جانب ہی
رکھیں۔

”مثلاً۔“ تفاحی کا سادہ سا انداز بھی انہیں چڑا

مید
”میں دیکھ رہی ہوں آغا جی! آپ مسلسل تیمور کے
بچوں کو فیور کر رہے ہیں۔“

”میں تم سے صرف اتنا بوجھ رہا ہوں کہ کس بات پر
تمہیں ماہیر کے ارادے مشکوک لگ رہے ہیں۔“ آغا
جی تھوڑا سنبھل کر نرمی سے بولے۔

”وہ بڑے ابا کے گھر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔“ پیش
کی بات پر تفاحی ایسے مسکرائے جیسے کوئی بڑا کسی
چھوٹے کی چکانہ بات پر مسکراتا ہے۔

”یہ پورا گھر تو شروع سے ہی تیمور کے نام پر ہے وہ
اس پر مزید کیا قبضہ کرے گا؟“ آغا جی نے انہیں لا
جواب کیا۔

”وہ ہمیں یہاں سے بدوخل کرنا چاہتا ہو گا۔“ وہ
ایک نکتہ تلاش کر ہی لائیں۔

”ماما پلیز بس کر دیں اب۔“ ارم سم سنبھل کر گویا
ہوا۔ ”میں ایک ہفتے بعد آیا ہوں اور آپ بجائے میرا
حل پوچھنے کے دو سروں کو فضل میں ڈسکس کیے جا
رہی ہیں۔“ ارم سم کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب ہوا۔

”میں تمہیں بتا رہی ہوں ارم سم! کوئی ضرورت
نہیں ہے ماہیر کو زیادہ منہ لگانے کی۔“ انہوں نے اس
کی ناراضی کو خاطر میں لائے بغیر الٹی اٹھا کر وارننگ
دی تو وہ جھنجھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”نی اٹلی تو آپ اس منہ میں ڈالنے کے لیے کچھ
دے دیں، کسم سے سخت بھوک لگ رہی ہے وہ پھر
میں ہاسٹل میں بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔“ ارم سم کی بات
پر وہ تھوڑی سی شرمندہ ہوئیں۔

”ملازمہ سے کہتی ہوں وہ کھانا لگا دیتی ہے تم جا کر
فریش ہو جاؤ۔“ پیش نے خدا خدا کر کے موضوع
بدلا اور بچن کی طرف بڑھ گئیں۔ تفاحی اور ارم سم
دونوں نے ہی پر سکون ہو کر سانس لیا۔

”تفاحی! ویسے کیسا ہے ماہیر؟“ ارم سم نے پیش
کے کمرے سے نکلتے ہی سرگوشی میں پوچھا تو اس کی
بے تلی پر ہنس پڑے۔

”وہ تو بہت خوش ہیں، مجھے تو فٹ نہیں کراتی تھیں اور ماہیر کے آگے پیچھے پھر رہی ہیں“ ظاہر ہے وہ ان کا پوتا جو ہوا۔ ”ارم سم کے سامنے آتے ہی اوریدا کو اپنے سارے دکھ یاد آ گئے۔

”شرم کرو اپنے گئے بھائی سے جیلس ہو رہی ہو۔“ ارم سم نے اسے جلن بوجھ کر چھڑا لورہ چھڑ بھی مٹی۔

”میں ماہیر سے جیلس نہیں ہو رہی ہوں بلکہ مجھے بڑی املاں کی زیادتی پر انفرس ہو رہا ہے، بھلا کئی ایسے بھی سنگی اولاد کے بچوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔“ اوریدا کے جل کر بولنے پر وہ ہنس اور ہنسنی چلا گیا۔

”تم کبھی نہیں بدل سکتی ہو اوریدا۔“ اس نے بمشکل اپنی ہسی پر قابو پا کر کہا۔

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو ناں۔“ اوریدا کو کافی دیر بعد احساس ہوا تو اس نے فوراً تردید کی۔ ”میں ایسی جرات کر سکتا ہوں بھلا، میں تو سوچ رہا تھا کہ تم اپنے سے پانچ سال بڑے ماہیر کو کیسے اس کا نام لے کر دھڑلے سے مخاطب کرتی ہو۔“

”تو اور کیا کہوں۔“ اوریدا حیران ہوئی۔

”کم از کم اس کے نام کے آگے پیچھے بھائی کا لفظ ہی لگاؤ، بڑی املاں نے سن لیا تو پھر جھاڑ پڑ جائے گی تمہیں۔“ ارم سم نے مفت مشورہ دیا۔

”وہ تو بڑ بھی چکی۔“ اوریدا نے مسکرا کر اطلاع دی، تو وہ ایک دفعہ پھر ہنس پڑا۔ اگلا ایک غصہ ان دونوں نے بے شمار بے معنی قسم کی باتوں میں گزار دیا۔

ملازمہ ارم سم کو بلانے کی توتب اس نے فون بند کیا تھا۔ دوسری طرف اوریدا پورے ایک ہفتے کی رودلو اسے سنا کر بالکل ہلکی پھلکی ہو چکی تھی لوراب وہ ماہیر کے سامنے ”ارم سم نامہ“ شروع کر چکی تھی۔

”اچھا دست ہے تمہارا“ ملنے تک تو تیا نہیں تم سے۔“ ماہیر نے اپنے آئی پیڈ سے نظریں ہٹائے بغیر اسے جھک کہا۔

”ابھی دو گھنٹے پہلے تو آیا ہے، کھانا انا کھا کر آئے گا ناں۔“ اوریدا نے فوراً اس کی جانب سے صفائی

”سوچ پوچھو تو بر خوردار“ ابھی تک ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا، لیکن تمہاری ماں کی باتوں سے لگ رہا ہے، خاصی مزے کی چیز ہے۔ سوچ رہا ہوں، کل بیٹش کے اسپتال جانے کے بعد اس سے مل کر آؤں۔“

اتفاقی نے دوستانہ انداز میں اپنے عزم سے آگاہ کیا۔ ”اور میں سوچ رہا ہوں کہ اوریدا کو کون کر کے اسے باہر کہیں کے ایف سی یا میکڈونلڈ پر بلوالوں۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اپنا منصوبہ بھی بتایا۔

”دھیان سے بیٹا، تمہاری ماں کو بتا چل گیا تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔“ اتفاقی نے اپنے نواسے کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا، کچھ بھی تھا انہیں اپنا یہ نواسا اپنی بیٹی سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ علوتا بالکل اپنے باپ لورہ مانا پر تھا، ماں کے مزاج سے اس نے کوئی چیز نہیں لیا تھی۔

”ٹینشن مت لیں اتفاقی، اب ملا کو قابو کرنے کے سارے طریقے آگئے ہیں مجھے۔“ ارم سم نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ان کی تسلی کروائی تو وہ مسکراتے ہوئے پھر اخبار پر جھک گئے۔

ارم سم نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی سلمان ایک طرف رکھا اور سیل فون پر اوریدا کا نمبر ملا کر کالوچ پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسری طرف اوریدا نے فوراً ہی اس کا فون اٹھا لیا تھا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے پہلے سے بے چین تھی۔

”تم سوچ نہیں سکتے ہو ارم سم، بڑے ابا کا موڈ کتنا خراب ہے۔“ اوریدا کے لہجے کی پریشانی سے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ بڑے ابا کا بار کس ڈگری پر ہو گا۔

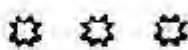
”انہوں نے ماہیر سے تو کچھ نہیں کہا نا۔“ ارم سم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ بڑے ابا اس کی والدہ کی طرح بد لحاظ ہونے میں بالکل بھی وقت نہیں لگاتے تھے۔

”نہیں۔“ اوریدا کی بات پر ارم سم کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔ ”اور بڑی املاں کا مزاج کیسا ہے۔“

”وہ تو میں نے یہاں آکر دیکھ لیا ہے کہ تم کتنا براہ
 رہی ہو“ اب روز میں خود تمہارے ٹیسٹ لیا کروں گا“
 میں دیکھتا ہوں“ تم کیسے تمہیں مار کس لیتی ہو۔“ ماہیر کی
 بات پر اورید اکا سا اس حلق میں ہی انک کیا آتا تو وہ بھی
 جانتی تھی کہ وہ اسٹڈی کے معاملے میں بالکل ارصہ کی
 طرح کر رہی تھی۔

”پاکستان آکر کوئی لفٹ ہی نہیں۔“ سرمد اچانک
 ہی دروازہ کھول کر لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ اورید کے
 لیے اس کی آمد کسی بڑی خوشی سے کم نہیں تھی کیونکہ
 ماہیر کی توجہ اس کی جانب سے ہٹ کر سرمد کی طرف ہو
 چکی تھی۔ سرمد اور ماہیر دونوں گرم خوشی سے مل رہے
 تھے دونوں کی اسکاٹ اور وائبر پر کالی فرینڈ شپ ہو چکی
 تھی دونوں تقریباً ”ہم عمر تھے۔“

”اورید! اسٹراہیری کا اچھا سا شیک تو پلاؤ۔“ ماہیر
 کی فرمائش پر اورید نے وہاں سے کھٹکے میں ہی عافیت
 جالی، لیکن سرمد کی نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب
 کیا تھا۔



موسم بدل چکا تھا۔ سردیوں کی آمد آئی تھی۔ تپا
 سالہ کو ہسپتال سے گھر آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔
 اورید پچھلے ایک ہفتے سے عدتہ بالکل خاموش تھی۔ وہ
 سارا سارا دن قرقر پاک کھولے اسے حفظ کرنے میں
 مصروف رہتی۔ وہ تیزی سے اسے ختم کر رہی تھی۔
 مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اکثر صحن میں لگے
 جاسن کے درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر لیٹ جاتی۔
 آج اس کا ٹھکانہ سٹی کا چولہا تھا جو بے نے اپنی
 سہولت کے لیے بنا رکھا تھا۔ انہیں سوئی ٹیبلٹ کے
 چولہے پر کام کرنے میں بالکل مزہ نہیں آتا تھا۔

”عدتہ بادی! ایک بات کہوں۔“ مونا اس کے
 پاس آکر بیٹھ گئی۔

”ہاں بولو۔“ عدتہ جمالہ کے تنکے سے راکھ کرید
 رہی تھی۔

”جو چیزیں صرف دکھ اور رنج کا باعث بنیں انسان

دی۔“ کھانا دانا کھا کر آئے گا یا اپنی ماما کو سلا کر اور
 اطمینان کر کے پھر چوری جیسے آئے گا۔“ ماہیر کا لہجہ تو
 شرارتی تھا لیکن اس کے بالکل درست اندازے پر وہ
 ایک لمحے کو بالکل ہکا بکا رہ گئی۔ ماہیر کو پاکستان آئے
 ہوئے بمشکل چند ہی گھنٹے ہوئے تھے لیکن وہ لہن چند
 گھنٹوں میں بہت سی چیزوں کو سمجھ چکا تھا جنہیں
 سمجھنے میں خود اورید نے کئی مہینے لگا دیے تھے۔

”ہاں اس کی بلاتو واقعی یہاں آنے پر بہت جڑتی ہیں۔“
 اس نے افسردگی سے بتایا۔

”ویسے لہن کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔؟ کیا مانع کا
 اوپر والا پورشن خالی ہے لہن کا۔“ ماہیر ابھی بھی غیر
 سنجیدہ تھا۔

”تمہیں پتا ہے ماہیر“ نئی پیش کی پپا کے ساتھ
 انکو جھٹ ہوئی تھی ماضی میں۔“ اورید نے اپنی
 طرف سے بڑا انکشاف کرنے کی کوشش کی۔

”تھینکس گاڈ! لپا کی ان کے ساتھ شادی نہیں
 ہوئی“ کم از کم اتنی بد مزاجی میں تو انور بھی نہیں کر سکا
 تھا۔ ”ماہیر نے اس بات پر اتنی لاپرواہی سے تبصرہ کیا کہ
 چند لمحے تک اورید اب کچھ بول ہی نہیں سکی۔“ تمہیں
 حیرت نہیں ہوتی؟“

”ہرگز نہیں۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے یہ تو
 عام سی بات ہے۔“ ماہیر پر مغربی رنگ کالی حد تک چڑھ
 چکا تھا۔ اورید کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں
 تھا۔ وہ سری طرف ماہیر نے جا بھتی نگاہوں سے اس کی
 طرف دیکھا۔

”اورید! میں نوٹ کر رہا ہوں تم اس گھریلو پالینکس
 میں کچھ ضرورت سے زیادہ سی پی پی لے رہی ہو۔“

”تو اور کیا کروں“ میرے علاوہ یہاں کوئی اور لڑکی
 بھی تو نہیں ہے۔“ اورید نے اپنی مجبوری بتائی۔

”اپنا ایف ایس سی کا زبردست سامیٹر بناؤ، تم
 اتنی ذہن تو نہیں تھیں، جتنی یہاں آکر ہو چکی ہو۔“ ماہیر
 نے اس کی کلاس لیا۔

”پڑھ تو رہی ہوں۔“ وہ بولے سے منمنائی۔

کو انہیں بھلا دینا چاہیے۔" موتا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن رات کو تو بیٹھ مگرتی ہے اور موسم سرد ہو جاتا ہے۔" موتا نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں، تم بالکل ٹھیک کہتی ہو، میں بھی عبد اللہ کو بھلانے کی کوشش کروں گی۔" اس کے متفق ہونے پر موتا ہکا بکا رہ گئی، اسے کہاں سے اس جملے کی امید تھی وہ تو ہر دفعہ اس بات کے جواب میں اسے محبت کے نام پر ایک لبا مارا پکڑ دینے لگتی تھی۔

عذرتہ نے بہت غور سے اپنی ہل کا تھرتوں سے بھرا چہرہ دیکھا، چند ہی دنوں میں بہت بوڑھی لگنے لگی تھیں۔ اس وقت وہ ایک ایسے کنڈر کی مانند لگ رہی تھیں جو اپنے زمانے میں پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہو۔ ان کے چہرے پر گلیاں نہیں تھا، وہ غم، پچھتاوا اور رنجیدگی۔

"مجھے لگتا ہے وہ واقعی زندہ نہیں ہے۔" عذرتہ بے شکل بولی تو موتا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

عذرتہ کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ اسے نہ جانے کیا ہوا، خاموشی سے تپا سالہ کی چارپائی پر ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ تپا سالہ کے ساٹ چہرے پر کوئی تغیر نہ تھا، وہ عذرتہ کے دل میں کوئی جوار بھانا تھا اور وہ ایک دم ہی تپا سالہ سے چمٹ گئی۔ موتا کے ساتھ ساتھ تپا سالہ بھی گھبرا سی گئیں۔ عذرتہ ان کے وجود کے ساتھ لیٹے ہوئے بلند آواز میں رو رہی تھی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر بے عشاء کی نماز اور عوری چھوڑ کر محسن کی طرف بھاگ کر آئیں۔ سانسے بڑا عجیب سا منظر تھا۔ رات کی چاندنی میں ایک جوان وجود ایک بوڑھے وجود سے لپٹا ہیکڑوں میں دو رہا تھا۔

"اگر عبد اللہ زندہ ہو تا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مجھ سے رابطہ نہ کرتا۔" عذرتہ کی خوش فہم محبت اعتماد بھرے انداز سے گویا ہوئی۔ موتا بالکل ہی لاجواب ہو گئی۔

"محبت میں اگر کھینٹ نہ ہو تو دل کی بات دل تک ضرور جاتی ہے ورنہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص سے آپ کے دل کے تار جڑے ہوں اور اسے دوسرے دل کی پریشانی اور دکھ کا اندازہ نہ ہو سکے۔" عذرتہ کے لہجے سے اسی ٹپکی۔

"ہاں کہتی تو آپ ٹھیک ہیں۔" موتا نے فوراً ہی اس کی تائید کی۔ اسی لمحے تپا سالہ ایک ٹکڑے اور چادر اٹھائے کمرے سے باہر نکلیں۔ انہوں نے صحن میں چارپائی بچھائی اور لیٹ گئیں۔ وہ کچھ عرصے سے بالکل ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ انہوں نے خود کو نماز اور عبادات میں مگن کر لیا تھا۔ بے ان سے باتیں کرتی جاتیں اور وہ ہوں ہاں سے زیادہ کسی بات کا جواب نہیں دیتی تھیں، تنگ آکر بے بے خودی من کے پاس سے اٹھ کر آ جاتیں۔

"ای! مجھے معاف کر دیں، پلیز۔ مجھے معاف کر دیں۔" عذرتہ نے پتا نہیں کتنے سالوں کے بعد انہیں "تپا" کے بجائے "ای" کہا تھا۔ تپا سالہ کے جلتے ہوئے وجود پر کوئی ٹھنڈی آبشار پوری قوت سے گری۔ ان کی آنکھوں سے بھی بے آواز آنسو بہنے لگے۔ موتا اور بے بے بھی یہ جذباتی منظر دیکھ کر رونے لگیں۔ کئی سال سے جمی سرد مہری کی برف اس چاندنی رات میں ایک دم ہی پگھلی گئی۔ آسمان پر موجود چاند بھی اس ملاپ پر مسکرایا۔

"تپا، باہر تو ٹھنڈ بڑھ جائے گی، آپ یہاں آکر کیوں لیٹ گئی ہیں۔" موتا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سونے کے ارادے سے آئی ہیں۔

"اندر میرا دم ٹھٹ رہا تھا۔" انہوں نے ساٹ لہجے میں جواب دیا، "موتا نے گھبرا کر عذرتہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خاموشی سے تپا سالہ کے سرانے آکر کھڑی ہو گئی۔

تپا سالہ کو لگا کہ جنت کی کسی کھڑکی کا پٹ من کی

جانب کھلا ہے۔ ایک دقرب ٹھنڈی ہوائے نہیں اپنے حصار میں لیا۔ ذہن میں جتنا ہوا اتنا دور ایک دم ہی سرد ہوا۔ وہ خواب نہیں دیکھ رہی تھیں لیکن خواب جیسی اس حقیقت پر یقین کرنا بھی تو مشکل تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کو نذر سے بچا اور پھر کھولا، سامنے وہی منظر تھا۔ آپا سالو کو لگا لگا لگا کے کرم کی دست کو تاپنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

”تب میرا میلنگ کلچ میں ایڈمیشن کروادیں، مجھے تب کا خواب یاد آکرنا ہے۔“ وہ ایک معصوم بچے کی طرح رو رہی تھی جسے ایک دم ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ اس درخواست کے بعد عہدہ کو اپنا وجود دہلی کے گالے کی طرح جھکا پھلکا سا محسوس ہوا۔ ”پگلی نہ ہو تو بھلا ایسے بھی کوئی رات کو رونا ہے۔“ بے بے نے آگے بڑھ کر آسٹری سے عہدہ کو آپا سالو سے علیحدہ کیا۔ وہ پھل کی پشت سے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھیں۔ آپا سالو نے ہاتھ کے اشارے سے بے بے کو منع کیا کہ وہ عہدہ کو علیحدہ نہ کریں، آج کتنے سالوں کے بعد ان کی مٹا کی تسکین ہوئی تھی، انہوں نے اپنی ذات پر جو خود ساختہ پیرے لگا رکھے تھے، وہ سارے ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے تھے۔

”پیلے قرآن پاک تو پورا حفظ کر لو، میں انشاء اللہ اگلے سال تمہارا ایڈمیشن کرا دوں گی۔“ عہدہ ان کی گود میں سر رکھ لٹھی تھی۔ انہوں نے نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ مونا لور بے بے دونوں اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ آج کی رات دونوں ہل بیٹی کے درمیان آنے والے صدیوں کے فاصلے ختم ہو جائیں۔

وہ فاصلے جنہوں نے دلوں پر بدگمانی کی کالی جادوی تھی، جنہوں نے آنکھوں کے آگے دھند کی چادر تن دی تھی۔ وہ دونوں ریل کی پٹری کی طرح صرف ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، کوئی ایسا ٹریک نہیں تھا جہاں یہ دونوں پٹریاں یکجا ہو جاتیں، لیکن آج شاید قدرت کو ان پر رحم آئی گیا تھا۔

”تب نے مجھے معاف کر دیا تھا۔“ عہدہ نے آپا سالو کا سر دہاتھ پکڑ کر التجائیہ انداز سے کہا۔ چاند کی دھیمی سی روشنی میں بھی وہ آپا سالو کے چہرے پر پھیلی چمک کو دیکھ سکتی تھی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے معلوم تھا، کوئی بھی میں اپنی اولاد سے زیادہ در تک ناراض نہیں رہ سکتی۔“ عہدہ روتے روتے مسکرائی۔ اس کی اس بات پر آپا سالو کو جھٹکا سا لگا۔

”ایسا نہیں ہے عہدہ۔“ آپا سالو اسے جانا چاہتی تھیں۔ ”کبھی کبھی مائیں بھی اپنے بچوں سے دل سے خفا ہو جاتی ہیں اور جب دل کا دل دیکھے تو اللہ بھی ان سے ناراض ہو جاتا ہے اور جس سے اللہ خفا ہو جائے، اسے دنیا کے کسی حصے میں امن نہیں ملتی۔ بد قسمتی، دکھ اور غم اس کے وجود کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور وہ نہانے کی ٹھوکروں کی زد میں آ جاتا ہے۔ اس کی حیثیت خرطوں کی زد میں آئے ہوئے ایک توابہ بچے سے زیادہ نہیں ہوتی۔“ آپا سالو بالکل خاموش تھیں، اور ان کی آنکھوں سے بے توا آٹسو رہے تھے۔ جسے پہلی دفعہ انہوں نے عہدہ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”آج تب کو کیا ہوا عہدہ باجی۔“ رات کو مونا اپنا ٹکڑا اٹھائے اس کے کمرے میں چلی آئی، عہدہ دیوار سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں تھی۔ ”مجھے لگا، میں نے آپا کا دل دکھایا ہے اور اسی کی اللہ نے مجھے سزا دی ہے۔“ عہدہ نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”کیسی سزا؟“ مونا حیران ہوئی۔ ”جب اللہ کسی سے دل کا سکون چھین لیتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ انسان کی بے قراری اور بے چینی بعض دفعہ بہت سے بدوانتہ طور پر کے گئے گناہوں کا بھی نتیجہ ہوتی ہے۔“ عہدہ خاموشی سے انھی لور و فلو کرنے کے لیے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

”پتا ہے عہدہ باجی، مجھے ایسا لگا جیسے آپ نے شادی سے بچنے کے لیے وہاں ایڈمیشن لینے کا ارادہ کیا

تھا کہ شانزے ہمیشہ کی طرح رونادھونا شروع کر دے گی۔
لیکن اس پر تو لگتا تھا جیسے صدمے سے سکتہ طاری ہو
گیا تھا۔

”آخر ہوا کیا۔؟“ رباب پریشان سے انداز میں
اس کے بالکل پاس آئی تھی۔ ”تمہاری مودی کا تو
سیونٹی پر سینٹ کام ہو چکا تھا۔“

”برڈیو سر کا اس فلم کے ہیرو اور ڈائریکٹر کے ساتھ
کوئی بڑا اختلاف ہو گیا ہے۔“ شانزے نے سرود کے
منہ سے سنی ہوئی بات یہاں بھی دہرا دی۔

”وہ لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے؟ اتنا کام کر کے اور اتنا
پیسہ لگا کر بیچ میں چھوڑ دیا۔“ رباب کو ایک دم ہی غصہ
آیا۔

”سرود بھائی بتا رہے تھے یہ انا کی جنگ ہے اور انا کی
جنگ میں روپیہ پیسہ وقت کچھ بھی نہیں دیکھا جاتا۔“
وہ اب بیدردی سے اپنے ناخنوں پر لگی پریل ٹکڑی نکل
پالش کر رہے تھے۔ جو صبح اس نے بڑی سخت سے لگائی
تھی۔

”تم بات کر کے دیکھو۔“ رباب سہاس کی
پریشان شکل دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

”کس سے۔؟“ شانزے نے الجھ کر اپنی مخلص
دوست کا بے غرض سا چہرہ کھلا۔

”بھئی برڈیو سر سے پوچھو، تمہارا کیا تصور ہے۔
آخر وہ اپنی فضول جنگ میں تمہارا مستقبل کیوں داؤ پر
لگا رہے ہیں؟“ رباب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود
اس سے بات کرنے پہنچ جائے۔

”میں نے مفلوات کی جنگ میں لوگ صرف اپنے
بارے میں سوچتے ہیں، دوسروں کے بارے میں کوئی
احتمال ہی سوچتا ہو گا۔“ شانزے ہلکا سا چکر بولی۔

”بس ٹھیک ہے، تم بھی دفع کرو اسے اور اپنی
اسٹڈی کی طرف دھیان لا۔“ رباب نے اٹھ کر کمرے
میں پھیل چيزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

”رباب، آج مجھے شدت سے ایک بات کا احساس
ہوا ہے۔“ شانزے دیوار سے ٹیک لگا کر سنجیدگی سے
گویا ہوئی۔

”وہ جیسے ہی وضو کر کے کمرے میں آئی، مونا نے
مسکراتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”اصل میں مجھے ایک بات سمجھ میں آگئی ہے۔“
عدینہ نے الماری کھول کر جائے نماز نکالی۔
”وہ کیا۔؟“ مونا بے تلی سے بولی۔

”کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ انسان کی قسمت میں انہی
سایہ سے لکھ دیتا ہے۔ وہاں پر تدبیر بھی بے بس ہو
جاتی ہے۔ اسے میں اللہ کی رضا میں راضی ہونے میں
ہی آسانی اور سکون ہوتا ہے۔“ عدینہ نے جائے نماز
بچھائی۔

”کیا اسی لیے آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟“ مونا
فورا ہی اس کے پاس آئی کھڑی ہوئی۔ وہ جو نیت کے
لے ہاتھ اٹھانے ہی والی تھی ایک لمبی سانس لے کر وہ
مٹی۔ اس نے سنجیدہ نظروں سے اپنی کزن کا حیران چہرہ
دیکھا۔

”جانتی نہیں۔“ عدینہ نے صاف گوئی سے کہا۔
”بعض فیصلے آپ سے صرف اللہ کر داتا ہے اور اللہ کے
کے کئے آسانی فیصلوں کے جواز میں پر نہیں دھوندا
کرتے۔“

عدینہ نے اپنی بات مکمل کرتے ہی نیت ہاتھ دلی۔
مونا اس کی بات پر تلی ہی دل میں متفق ہوتے ہوئے
دوبارہ جنگ پر آکر بیٹھ گئی۔ بعض دفعہ اسے عدینہ اور پاپا
ایک دم ہی حیران کر دیتی تھیں جیسے آج کل ان دونوں نے
پھر حیران کر دیا تھا۔



شانزے اور رباب کے کمرے میں موت کا سا
سکوت طاری تھا۔ پہلا موقع تھا کہ شانزے بالکل
خاموش اور سیٹ چرے کے ساتھ اپنی روم میٹ کو
اطلاع دے چکی تھی کہ اس کی فلم کا برڈیو سر کچھ
اختلافات کی وجہ سے ادھوری فلم چھوڑ کر ملک سے جا
چکا ہے اور یہ فلم بھی بہت سی دوسری موزیک کی طرح
کسی ڈبے میں پڑی اپنی بد قسمتی کو رو رہی تھی۔ سرود
نے بہت مشکل سے اسے یہ خبر دی تھی اس کا خیال

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ رکاوٹ نہ ہو بلکہ آزمائش ہو جو میرے جذبے کی طاقت کو پرکھنے کے لیے کی جا رہی ہو۔“

شازے سے بحث میں جیتنا آسان توڑی تھا۔ وہ آخری دم تک لڑنے کی قائل تھی۔

”ہر وہ کام جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو اگر اس میں کوئی مسئلہ آ رہا ہے تو صاف بات ہے یہ آزمائش نہیں بلکہ رکاوٹ ہے، ایک تنبیہ ہے جو اللہ اپنے کسی پیارے کو کسی کام سے بچانے کے لیے کر رہا ہے۔“

رباب نے سنجیدگی سے اپنی بات کی وضاحت کی تو شازے ایک دم لا جواب ہو گئی۔ اس نے کچھ لمحے رباب کا بے ریا چہرہ دیکھا اور پھر چادر اٹھائی اور سر پر لٹن لی، رباب کو ہل چل گیا تھا وہ اب ساری رات خاموشی سے اس ناکامی کا سوگ منائے گی اور صبح ہوتے ہی وہ ایک نئے جذبے کے ساتھ پھر نازم دم ہو چکی ہو گی۔ یہی شازے کی سب سے بڑی خلی تھی۔



”کیا کاہنم نے؟“ بخٹور فون سن کر اپنے کمرے میں آئی تو نکیم بے چینی سے اس کی خنجر تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے اور پورے بائیس گھنٹے تک خاموشی پڑے ڈال چکی تھی۔ ”تمہیں کس نے کہا کہ باہنم کی کل تھی۔“ بخٹور نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی روم میٹ کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر سے وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے دیکھ سکو کی ساہمی تھیں اور ایک دوسرے کی خوشیاں اور پریشانیاں انہماں کی طرف ان کے دل پر اترتی تھیں۔ ”خاہر ہے اس وقت تمہیں گھر سے توکل آنے سے رہی۔“ نکیم نے اپنا سر تھارتے ہوئے لاہوالی سے کہا۔

”باہنم ہی تھا۔“ لاہوالیوں سے انداز سے اپنے بستر پر بیٹھتی ہوئے چہرہ پر ہلکی سی نکیم نے میٹ کیا تھا۔ ”کیا کاہنم نے؟ کب بھجوائے گا اپنے گھر والوں کو

”کسی بات کا۔“ رباب حیران ہوئی۔ ”میری پچھو پیٹھ کتنی تھیں کہ میری ماں ایک بد قسمت عورت تھی مجھے لگا ہے مجھے بھی بد قسمتی جیتز میں اس کی طرف سے ملی ہے۔“

”ایسی فضول باتیں نہیں کرتے۔“ رباب نے اس کے ہلکی ہل سیٹھل اٹھا کر الماری میں رکھے۔

”رباب! قلی ایم سیرس۔“ وہ جھنجھلا سی گئی۔ ”تم میری زندگی کا جائزہ لو، تمہیں خود بخود احساس ہو جائے گا کہ کس طرح میرے بچے ہوئے کام بگڑ جاتے ہیں۔ میں سونے کو بھی ہاتھ لگاتی ہوں تو وہ ہینکل بن جاتا ہے مجھے یقین ہے میں کسی سرسبز درخت کو بھی ہاتھ لگاؤں گی تو وہ سوکھ کر تپہ ہو جائے گا۔“ وہ حد درجہ خود تری کا شکار ہو رہی تھی۔

”زندگی میں بہت سارے لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بد قسمت ہیں بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے ان کے لیے اس سے بہتر چیز رکھی ہوئی ہے۔“ رباب نے نرمی سے اسے سمجھنا چاہا۔

”یہ فصل خوش ہلانے کی باتیں ہیں عمور کچھ نہیں۔“ وہ استرا تیر انداز سے گویا ہوئی۔

”تم ان سب چیزوں کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔“ رباب نے نکتہ سا جھجک کر کہا۔

”تو بتاؤ کیا کہوں۔“ نکیم ہم بیٹوں یا اور لٹھ جیک میں جنب کر لی۔ ”شازے کو ایک دم ہی قصہ آ گیا۔“

”تم بس وہ کہو جو اللہ چاہتا ہے۔“ رباب نے اس سے اس کے منہ سے پراختہ رکھا۔

”مجھے کیسے پتا چلے گا کہ اللہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“ اس نے طنز سے اسے پوچھا۔ ”میں نہ تو کوئی ولی

اللہ ہوں جسے خواب آتے ہوں نہ میرا وجد ان اتنا پور فٹ ہے جو متعش کسی کی چیزوں کو جان سکے۔“ وہ

تہستہ تہستہ شدید پڑ پڑنے کی طرف جا رہی تھی۔ ”تمہیں وہ سب کام چھوڑنا بہن میں اللہ کی طرف سے رکاوٹیں آ رہی ہیں۔“ رباب نے غصے سے

کہا۔

تمہارے ہیں؟“ نیلم کی سوتی آج کل اسی ایک بات پر انکی ہوئی تھی۔

”کبھی بھی نہیں۔“ بخٹاور کے افسرہ سے انداز پر نیلم کو جھکا سا لگا۔ ”کیوں؟ کیا پر اہلم ہے اس کے ساتھ؟“ نیلم کا مزاج برہم ہوا۔

”اس کے اپنے والدین کے ساتھ کچھ اختلافات ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ان سے رابطہ کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا“ بخٹاور سر جھٹائے اسے سخت ذرا انداز میں بتا رہی تھی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ اسے کچھ ہاشم نے خاصا مایوس کیا تھا۔

”تو اس طرح چھڑے چھٹات کو کون رشتہ دے گا؟ اس سے کون منہ دھورے۔ کوئی ضرورت نہیں دیا وہ اس سے رابطہ کرنے کی۔“ نیلم نے غصے سے اپنے بند کی چادر ذرا زور سے جھاڑنا شروع کر دی۔ بخٹاور نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”پھر کیا سوچا ہے تم نے۔؟“ بخٹاور کو اس کی خاموشی سے کسی انہونی کا احساس ہوا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ایسا لگتا ہے جیسے کسی ہندو گلی میں آکر کھڑی ہو گئی ہوں۔“ بخٹاور بہت زیادہ دل گرفتہ تھی۔

”دیکھو بخٹاور! کوئی بھی ایسا فیصلہ مت کرنا جس سے تمہیں کل کو پچھتانا پڑے۔“ نیلم اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”میں ہاشم کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچتا بھی گناہ سمجھتی ہوں، تمہیں اندازہ نہیں ہے نیلم اس شخص کی میری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔“ بخٹاور جذباتی انداز سے گویا ہوئی۔

”لیکن تمہارے والدین کبھی بھی نہیں مانیں گے۔“ نیلم نے اسے یاد دلایا۔

”اگر ہاشم کے ساتھ میری شادی نہ ہوئی تو میں ساری زندگی شادی ہی نہیں کروں گی۔“ بخٹاور دلی ہی دل میں اپنے والدین سے ٹھیک ٹھاک تھا ہو چکی تھی۔ نیلم کو ایک دم ہی اس سے ہو رہی محسوس ہوئی۔

”تم ہاشم سے کوئی نہ تمہاری خاطر اپنے والدین کو

منال۔“ نیلم نے اسے اکسایا۔

”وہ کہتا ہے کہ تم میری خاطر اپنے والدین کو منالو“ بخٹاور زبردستی مسکرائی۔

”عجیب احسن شخص ہے، اسے نہیں معلوم محبت کے سفر میں اگر کوئی لڑکی کسی مرد کی ہل میں ہل ملے تو یہ کوئی بھولتی بات نہیں ہوتی وہ ایک آگ کا دریا عبور کر کے اپنے خاندان کی روایتوں سے انحراف کر کے اسے قبولیت کا درجہ بخشتی ہے تو اس مرد کو کم از کم اس سے مزید قربانیوں کی توقع تو نہیں رکھنی چاہیے۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ بخٹاور کی آنسو پڑے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ہی ماؤف ہو چکی تھیں۔

اگلے دن اتوار تھا اور صبح صبح ہی بخٹاور کی گھر سے نکل آگئی تھی اس کی بہن نے جھجکتے ہوئے اسے اطلاع دی تھی کہ بابا نے اس کا رشتہ طے کر دیا ہے اور اگلے ایک لینڈ پر اس کا نکاح ہے۔

”وہ مجھ سے بوجھ بغیر میرا رشتہ کیسے طے کر سکتے ہیں۔“ غصے سے اس کی تونا زبند ہوئی تو گور پٹور سے گذرتی دھڑکیں نے بے اختیار مڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ ریپیشن پر پانی سی ایل فون کھن سے لگائے کھڑکی تھی۔

”دیکھو آئی! مجھے تو انہوں نے سختی سے منع کیا تھا کہ آپ کو نہ بتاؤں لیکن میں نے سوچا کہ آپ کو اندازہ کرنا بہتر ہے تاکہ آپ ذہنی طور پر تیار ہو کر آئیں۔“ اس کی بہن نے محاط انداز سے اپنا نقطہ نظر بتایا۔

”کس کے ساتھ طے کیا ہے انہوں نے میرا رشتہ؟“ بخٹاور نے استہالی خراب موڑ کے ساتھ پوچھا۔

”انکل عہد کے بیٹے فیصل کے ساتھ جو فرزند بن رہے ہیں۔“ اس اطلاع نے بخٹاور کا مزاج مزید برہم کیا انکل عہد کی پوری فیملی اسے سخت پسند تھی۔

”بابا کا تو لگتا ہے واقعی بلخ خراب ہو گیا ہے۔“ اس نے پوری قوت سے ریسیور کیڈل پر دھکا لور دھپ دھپ کرتی ہوئی فرسٹ فلور پر واقع اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹکیہ اٹھا کر زمین پر مارا تھا الیکٹرک کھل پر چائے

باتی نیلم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ سے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

"بخاور کیا ہوا؟" وہ سریشان ہوئی۔

"یہاں نے میری بات گلے کر دی ہے اور نکاح کا پروگرام سیٹ کر رہے ہیں۔" نیلم کے ہاتھ میں پکڑے گپ سے تھوڑی سی چائے چھلکی۔

"کس کے ساتھ؟" نیلم کی پریشانی فطری تھی۔

"اپنے کسی فریڈ کے بیٹے کے ساتھ۔" بخاور نے منہ مارا اطلاع دی۔

"لیکن اتنی جلدی۔"

"ہاں ڈر گئے ہوں گے کہیں ہاشم ان کے پس رشتہ مانگنے نہ آجائے۔" بخاور ان سے حد درجہ بدگمان ہو چکی تھی۔

"تم اپنی اسی سے بات کر کے دیکھو اور انہیں سمجھاؤ وہ یہ سب اتنی جلدی میں مت کریں تم کون سا کہیں بھانگی جا رہی ہو۔"

نیلم کے آخری جملے پر بخاور ایک دم جوگی اور کچھ بھی کہنے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے قدم اب ٹیلی فون بوتھ کی طرف تھے۔ اس نے کارڈ خریدا اور ابو بکر ہال کا نمبر ملایا جو بڑی جا رہا تھا۔ وہ آدھا گھنٹہ انتظار کیا رہی تب جا کر نمبر ملا اور اگلے پانچ منٹ کے بعد ہاشم ٹیلی فون پر تھا۔

"ہاشم! مجھے تم سے ابھی اور اسی وقت ملنا ہے۔"

بخاور نے سلام دعا کیے بغیر اسے کہا تو وہ اس کے لہجے کی سنجیدگی پر تھوڑا سا پریشان ہوا۔

"تو تھیک ہے آجائے میں سینٹرل کینٹین کی طرف آ رہا ہوں۔" ہاشم کی بات پر اس نے فوراً فون رکھا اور واش روم میں جا کر دو چار لمکے سے چھپا کے مارے اور اپنے کمرے میں جا کر الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔

"کہیں جا رہی ہو کیا؟" نیلم نے اسے ریس شدہ سوٹ اٹھا کر واش روم کی طرف جاتے دیکھا تو پوچھے بھانہ رہ سکی۔ بخاور نے ہلکا سا لہجہ میں سر ہلایا۔ "ہاں ہاشم سے ملنے۔"

"کہیں میں آ رہا ہے؟" نیلم حیران ہوئی

کیونکہ وہ چھٹی والے دن بخاور سے ملنے نہیں آتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بخاور نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔ یقیناً وہ اس سے اپنے رشتے کی بات ڈسکس کرنے والی تھی۔ اگلے کوٹھے کھٹے میں وہ ہاشم کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔

"معاف کرنا بخاور تمہارے گھر والوں کا رویہ مجھے بہت عجیب لگا ہے۔" ہاشم نے ساری بات سن کر بے تکلفانہ تبصرہ کیا۔ بخاور شرمندگی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس نے اس بات پر کوئی رائے نہیں دی۔

"تمہیں اتنی دیر آکر بڑھنے کی اجازت تو دے دی لیکن اپنی مرضی سے جینے کا حق نہیں دے رہے۔"

ہاشم ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوا۔

"یہاں کا مزاج شروع سے ہی ایسا ہے انہوں نے میرے بھائی کی معافی بھی نہ دے سکی میرے بچپن کے پس رکھی ہے۔" بخاور نے دھیمے سے انداز میں اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ دونوں اس وقت سینٹرل لائبریری کے لان میں بیٹھے تھے۔ ہاشم نے ہاتھ میں چائے کا کپ اٹھا رکھا تھا اور بخاور کے سامنے رکھی چائے بالکل ٹھنڈی بن چکی تھی۔

"کتنی زیادتی کی بات ہے انہوں نے مجھ سے ایک دفعہ ملنا بھی گوارا نہیں کیا اور تمہاری زندگی کا فیصلہ کر دیا۔" ہاشم کا شکوہ بخاور کو بالکل جائز محسوس ہوا۔

"میں کیا کر سکتی ہوں ہاشم۔" اس نے بے بس نظروں سے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو اس وقت اسے پوری دنیا سے زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔

"اگر وہ تمہاری خواہش کا احترام نہیں کر رہے تو کیا تم نے سب کی امیدوں پر پورا اترنے کا شکیک لے رکھا ہے۔" ہاشم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بخاور کے پایا کو اٹھا کر کسی کتابت پر بے پریچشنگ آتا جو ان دونوں کی زندگی میں ولن بن کر آگئے تھے۔

"میں اگر کوئی ایسا قدم اٹھاؤں گی تو میرے خاندان کی بقی لڑکیوں پر تعلیم کے رستے بند کر دیے جائیں گے۔" بخاور حد درجہ حساس تھی۔

"تمہاری زندگی برباد کر دی جائے گی ایک ناپسندیدہ

فصل سوم پر مسلط کر دیا جائے گا تو خاندان کی باقی لڑکیاں
 تمہیں بچانے آئیں گی کیا۔" ہاشم کو ایک دم ہی غصہ
 آیا۔

"لیکن ہاشم۔" بخاور تذبذب کا شکار ہوئی۔
 "لیکن لیکن کو چھوڑو بخاور یہ تمہاری زندگی ہے
 اور زندگی بار بار نہیں ملتی جب کوئی تمہارا خیال نہیں
 کر رہا تو تم اپنی زندگی کیوں داؤ پر لگا رہی ہو۔" ہاشم نے
 اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں بیماری مرضی کے بغیر اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی
 ہوں۔" بخاور نے جھجک کر سامنے بیٹھے شخص کو
 دیکھا۔

"تو ٹھیک ہے پھر ان کی مرضی کے مطابق ڈاکٹر
 فیصل سے شادی کر لو۔" وہ ناراضی سے کھڑا ہوا۔
 بخاور کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"تم کہاں جا رہے ہو۔؟" وہ بوکھلا سی گئی۔
 "ہاسل۔" وہ ٹھٹھا ہو چکا تھا۔

"تم مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو ہاشم یہ مسئلہ حل
 کرو۔ میں اسی لیے تو تمہارے پاس آئی ہوں۔" بخاور
 کی آنکھیں ایک دم بھیگ گئیں۔ وہ تھوڑا سا نرم ہو گیا
 "اگر میری بات نہیں مانتی تو میرے سامنے رونا بھی
 مت۔ اوکے۔" اس نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ
 دی۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں؟"
 بخاور کی آنکھوں سے نہ جاتے ہوئے بھی آنسو
 پھسل گئے۔ ہاشم بے بس انداز سے دوبارہ کرسی پر بیٹھ
 گیا اور سامنے بیٹھی لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا وہ جزیب
 ہوئی۔ "ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔؟"

"دیکھ رہا ہوں کہ لوگ کہتے ہیں محبت انسان کو بہادر
 بناتی ہے لیکن تم پر تو اس کا الٹا ہی اثر ہوا ہے۔" اس
 نے ہراساں منہ بنایا وہ خاموشی سے روئی رہی۔

"یہ رونا دھونا بند کرو پلیز۔ تمہیں پتا ہے میں
 تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔" ہاشم کا محبت
 بھرا انداز بخاور کے دل کا چین اڑا کر لے گیا۔ اس کا
 بھی حق جتنا انداز اسے بھا گیا تھا۔ اس کی کہی

نظروں سے وہ کسی موم کی گڑیا کی طرح کھیلنے لگتی تھی۔
 "میں تمہیں بہت خوش رکھو گا بخاور! میری بات
 مان لو ہم دونوں ایک نئی دنیا بناتے ہیں اپنا ایک چھوٹا
 سا پارا سا گھر بناتے ہیں۔" ہاشم نے ایک دفعہ پھر اسے
 دن میں خواب دکھانے شروع کر دیے بخاور نے
 بے بس انداز سے سر جھکا لیا۔

"یہ ماں باپ اولاد سے زیادہ دیر تک ناراض رہتی
 نہیں سکتے اور پھر تمہیں اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی
 گزارنے دیکھ کر وہ خود اپنے فیصلے پر پچھتا میں گے۔"
 ابن آدم نے بنت حوا کی پلکوں پر ایک اور خوشنما خواب
 ٹانکا۔

"کیا واقعی ایسا ہو گا۔؟" بخاور اس کے سحر میں آ
 چکی تھی ہاشم نے سر ہلا کر فوراً اس کی تائید کی۔ "تم
 یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ تمہارے والدین
 تمہارے ساتھ اچھا نہیں کر رہے وہ بس کسی طرح تم
 پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن نیلم کہتی ہے والدین اولاد کے لیے ہمیشہ غلط
 فیصلے نہیں کرتے۔" بخاور جھجک کر بولی۔

"نیلم کو کیا پتا۔" ہاشم استہزائیہ انداز میں ہنسلا
 "بھئی بھئی والدین صرف اپنی انا کو بچانے کے لیے اپنے
 بچوں کی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں۔ جیسے میرے
 پیرس نے کیا۔"

"پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔" بخاور افسردہ
 ہوئی۔

"تم چھوڑو ان سب باتوں کو یہ بتاؤ کہ پھر کیا سوچا
 ہے تم نے۔" ہاشم نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اپنی محبت کی خاطر ساری کشتیاں جلا چکی ہوں
 ہاشم۔"

اس کے لہجے میں چھپا اقرار ہاشم کو سمجھا گیا تھا کہ
 اس نے اب مزید کیا کرنا ہے وہ اب سنجیدگی سے اگلا
 لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔ وہ دونوں بغاوت کا مکمل
 ارادہ کر چکے تھے۔



مارگلہ کی پہاڑیوں پر اترتی وہ ایک خوب صورت

صبح تھی۔ ابھی سورج طلوع ہونے میں کافی دقت تھا۔
ڈاکٹر جلال اپنے نریک سوٹ میں ملبوس لاؤنج کادرمانہ
کھول کر باہر نکلے۔ سامنے لان میں ماہیر بھی سفید
ٹرلوزر پر سفید ہی ٹی شرٹ پہنے ایکسرسائز کر رہا تھا۔
جلال صاحب کی طرف دیکھ کر اس نے مسکرا کر ہاتھ
ہلایا اور بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔

”بڑے بابا جو رنگ کے لیے جارہے ہیں کیا؟“ وہ
اس طرح بے تکلفی سے ان سے پوچھ رہا تھا جیسے
دونوں کے درمیان بہت خوشگوار تعلقات رہے ہوں۔
بڑے بابا نے بمشکل سہلا کر ہاں میں جواب دیا۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلا ہوں، یہاں گھر پر
ایکسرسائز کا مزا نہیں آتا۔“ وہ لان کے ساتھ ہی چلنے
لگا۔ بڑے بابا کے چہرے پر کوفت کا بدوارا صبح تاثر ابھرا تھا،
لیکن وہ اب بھی خاموش رہے۔ ”یہاں کتنے تھے کہ میں
فٹنس کے معاملے میں بالکل آپ کی طرح کریری
ہوں، وہاں انگلینڈ میں بھی موسم جیسا بھی ہو، میں
ایکسرسائز کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔“ ”یہی اس
علوت سے بہت جڑتے تھے۔“ وہ بہت مزے سے ان
کو تارہا تھا۔

”ظاہر ہے وہ خود جو دنیا جہاں کاست انسان تھا اس
معاملے میں۔“ بڑے بابا کے منہ سے پھسلا، ماہیر فقہ
لگا کر نہلا۔ بڑے بابا نے ایک دم چونک کر اس کی طرف
دیکھا اس کے چہرے کا اسٹائل بالکل اپنے باب پر تھا۔

”ویسے یہاں ابھی تک آپ سے بہت ڈرتے ہیں اور
میں انجوائے کرتا ہوں اس چیز کو۔“ وہ چلتے چلتے
بوونگ کے اسٹائل میں اپنا ہاند فضا میں لہرا رہا تھا۔

”کیوں تم نہیں ڈرتے ہو اس سے؟“ بڑے بابا
نے چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ کھٹکوں میں شریک ہو
چکے تھے۔

”نور۔“ ہی ازملی اسٹ فرینڈ۔ ”ماہیر کے
لبے میں چھپی محبت اس بات کی گواہ تھی کہ وہ جھوٹ
نہیں بول رہا۔ وہ دونوں ایف ٹائن پارک میں داخل ہو
چکے تھے۔ گھاس پر ہلکی ہلکی نمی تھی اور فضا میں جنگلی
پھولوں کی مہک۔

”السلام علیکم جلال صاحب! کیسے ہیں۔“ جو رنگ
شریک رہ بھاگتا ہوا بڑے بابا کی عمر کا ایک شخص ان کے
پاس رنگ اس کی سانسیں پھولتا ہوا تھا۔
”وعلیکم السلام“ حامد صاحب! کیسے ہیں آپ۔“
بڑے بابا ایک دم ہی خوش ہوئے، شاید ان کے حامد
صاحب سے اچھے تعلقات تھے۔

”یہ تیمور کا بیٹا ہے علی۔“ حامد صاحب خوشگوار
حیرت کا شکار ہوئے۔

”تمہیں کیسے پتا چلا۔؟“ جلال صاحب نے
حیرانگی سے پوچھا۔

”بھئی۔“ چلتی پھرتی، تمہاری اور تیمور کی فوٹو اسٹیٹ
کاپی ہے یہ ابھی بھی پتا نہ چلے۔“ ”ہاؤ آر یو جمنٹل مین!“
وہ بڑی خوش دلی سے ماہیر سے ہاتھ ملارہے تھے۔
”انکل! آپ کو اپنا اسمبلینا اسپرو کرنے کی
ضرورت ہے، جو رنگ کے اشارت میں ہی سانس
پھولتا اچھی علامت نہیں۔“ ماہیر نے بے تکلفی سے
ان کو مشورہ دیا تو وہ تھکے لگا کر ہنسنے لگا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ میرا پہلا چکر ہے۔“ وہ
ایک دم حیران ہوئے۔

”جب میں اور بڑے بابا گھر سے نکلے تھے تو آپ کی
گاڑی ہمارے پاس سے گزری تھی اس کا مطلب ہے
کہ آپ بائچدس منٹ پہلے ہی یہاں پہنچے ہوں گے۔“
ماہیر نے تفصیلاً جواب دیا۔

”بھئی جلال! تمہارا پوتا بہت جمنٹل ہے اس کا
باب تو اتنا کوئڈنٹ نہیں تھا۔“ حامد صاحب ان کے
ساتھ ہی جو رنگ شروع کر چکے تھے۔ بڑے بابا نے ان
کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”انکل حامد! آپ اسمبلینا برو جانے کے لیے کچھ
عرصہ جم جوائن کر لیں۔“ وہ ان کے ساتھ بھاگتا ہوا
انہیں مفت مشورے دے رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں پر
مسلل مسکرا رہے تھے۔ وہ چکر تو اس نے ان دونوں
کے ساتھ لگائے تھے اور پھر ان سے آگے نکل گیا۔ وہ
ایک محنت جو رنگ کر کے گاڑوں میں کھڑا ایکسرسائز کر رہا
تھا جب بڑے بابا اپنے دوست کے ساتھ وہاں پہنچے۔

”ہاں بھئی، کیا ارادے ہیں تمہارے؟ ہمیں پاکستان میں رہو گے یا بلجی کی طرح یورپ بھاگ جاؤ گے؟“ انکل حامد نے دوبارہ اسے انٹرویو کا سلسلہ جوڑا۔

”میں کسی بھی جوشن میں بھاگنے کا قائل نہیں ہوں، بلکہ میدان جنگ میں کھڑے ہو کر آخری دم تک لڑنے پر یقین رکھتا ہوں۔“ اس کی حاضر جوابی حامد صاحب کو لطف دے رہی تھی جبکہ بڑے لپا ہونہ خیرے پر نوٹس کا بورڈ چکائے کھڑے تھے۔

”یہ تو اچھی بات ہے، ویسے بھی جلال کو ضرورت تھی کوئی اس کے پاس رہے۔ تیمور نہ سہی اس کا بیٹا ہی سہی۔“ حامد صاحب کی بات پر جلال صاحب کے ماتھے کاٹل فوراً ہی گہرا ہوا۔

”معاف کرنا حامد! تمہاری بات کاٹ رہا ہوں، الحمد للہ مجھے کسی کی ضرورت نہیں، میں اپنی زندگی میں سیٹ ہوں۔“ جلال صاحب کے لہجے کی بے رخی پر حامد صاحب ایک دم گڑبڑا سے گئے۔

”تو تمہیک ہے یار! لیکن عمر کا تقاضا بھی تو ہوتا ہے۔“

”انکل! بری بات، آپ میرے بڑے لپا کو بوڑھا کر رہے ہیں۔“ ماہیر کے شرارتی انداز پر حامد صاحب کا مزاج کچھ خوش گوار ہوا، ماہیر نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ بات کا رخ بدل دیا تھا۔ حامد صاحب مسکراتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے اور ماہیر جلال صاحب کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

واپسی کے سفر میں وہ دونوں ہی چپ تھے۔

”ارے آپ دونوں اکٹھے جو ٹھنگ کے لیے گئے تھے کیا؟“ بڑی املا کچن سے نکل رہی تھیں۔ ان دونوں کو اکٹھے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

”کیوں، بڑی املا! ہمارا ایک ساتھ جانا منع ہے کیا؟“ وہ بے تکلفی سے ان کو اپنے بازوؤں میں لے کر ماتھے پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔ بڑے لپا نے چونک کر یہ منظر دیکھا، ایک لمحے کو تو بڑی املا بھی ساکت رہ گئیں۔ ان کی بوڑھی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ آج کتنے سالوں کے بعد ان کو کسی نے تیمور کے اشامل میں بے

ساختہ چار کیا تھا۔

”اتھما اچھا پیچھے ہو، یہ جیس بھی اپنے ہاتھ کی طرح چٹکنے کی بیماری ہے، تجھے تو ہاتھ نہیں تھا۔“ بڑی املا کے لہجے میں پیاری پیاری تھا۔

”یہ بھی ایسے کرتے تھے کیا۔؟“ وہ لاپرواہی سے ڈانٹنگ میز پر روکھی پہلوں کی نوکری سے سیب نکل کر کھانے لگا۔

”اور کیا۔ بہت چڑتی تھی میں اس کی علوت سے۔“ بڑی املا کے لہجے میں چھپی حسرت سے ماہیر کو انداز ہوا کہ وہ اب اسی علوت کے لیے کتنا تڑپ رہی ہیں۔ بڑے لپا اپنے کمرے کی جانب بڑھ چکے تھے۔

”کتنے سال ہو گئے لپا کو پاکستان سے گئے ہوئے؟“ ماہیر نے یونہی پوچھا۔

”چوبیس سال۔“ بڑی املا نے بے ساختہ جواب دیا۔

”اور میرا خیال ہے اتنے عرصے میں وہ ایک دفعہ بھی واپس نہیں آئے۔؟“ ماہیر نے ہلکا سا سوچ کر کہا۔

”ہوں۔“ بڑی املا کے لہجے میں یاسیت تھی۔

”چلیں اب میری شادی پر بلوائیجے گا انیس۔“ وہ مزے سے ان کے سامنے بیٹھا سیب کھا رہا تھا۔

”تمہاری شادی۔؟“ بڑے لپا نے ڈانٹنگ روہم کی طرف آتے ہوئے اس کا جملہ بغور سنا تھا۔ جبکہ بڑی املا حیرانی سے اپنے پوتے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

”پاکستان میں کوئی لڑکی پسند کرلی ہے کیا۔؟“ وہ بھٹس کھارے بالکل اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

”نہیں تو۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔ بڑے لپا تازہ جوس کا گلاس لے کر لائنڈج میں آکر بیٹھ گئے تھے اور اخبار اٹھا لیا۔

”پھر شادی کس سے کرو گے۔؟“ بڑی املا بالجمہن کا شکار ہوئیں۔

”جس سے آپ اور بڑے لپا کہیں گے۔“ وہ ریموٹ کنٹرول سے کوئی اسپورٹس چینل تلاش کرتا ہوا بے تکلف انداز سے بولا۔

نہیں لیکن خدارا! میرا اور لورڈا سے اپنا رویہ ٹھیک رکھیں۔ کسی اور کی سزا ان معصوم بچوں کو کیوں دے رہے ہیں۔ ”بڑی ماں کے ضبط کا یہاں نہ لبریز ہوا۔“
”تو میں نے کون سا کلا شکوفہ تن رکھی ہے ان پر؟“
”ہا جیزاری سے گویا ہوئے۔“ اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے رکھی ہے یہ تھوڑا احسان ہے ان پر۔“

”اس میں احسان کی کیا بات ہے؟“ باب کی گھر میں رہ رہے ہیں۔ ”بڑی ماں چڑ کر بویس اور کمرے سے نکل گئیں۔ جلال صاحب انداز سے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ انہیں نہ جانے کیوں بے تحاشا غصہ آئے ہی جا رہا تھا۔



بخٹور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بڑے بے چین انداز سے اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ کھانے کی ٹرے لے اندر داخل ہوئی نیلم چونک گئی۔
”آج صبح سے بخٹور کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے نیلم ’وارڈن سے پوچھ کر کھانا اپنے روم میں لے آئی تھی۔ عام حالات میں میں سے باہر کھانا لے جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن خاص صورتوں میں وارڈن سے اجازت لینا لازمی ہوتی تھی۔“
”نیلم! میرے سر میں شدید درد رہے ہیں۔“
دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبائے لگی۔ نیلم نے زے میز پر رکھی اور پریشانی سے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
”لیکن تم تو اچھی بھلی سوری تھیں پھر ایک دم کیا ہوا؟“ نیلم نے فکر مند انداز سے اس کے ہاتھ کو چھوا۔

”وہی عجیب منحوس قسم کا خواب شروع ہو گیا تھا۔“ بخٹور نے رنجیدہ انداز سے اطلاع دی۔
”وہی صحرائیں جھاڑیوں والا۔“ نیلم نے تصدیق چاہی۔ بخٹور نے آہستگی سے ہاں میں سر ہلادیا۔ پچھلے تین چار دن سے بخٹور کو اتار سے ایک ہی خواب آ رہا تھا کہ وہ کسی صحرائیں بھاگ رہی ہے اور کوئی ٹلویہ آواز

”لو ہمیں کیا پتا۔“ بڑی ماں کو نہ جانے کیوں لگا تھا ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔
”کمل کرتی ہیں بڑی ماں! آپ کو کیسے نہیں پتا۔“
وہ سیریس ہوا بڑی ماں بھونچکا رہ گئیں۔ ”شروع سے مانے ایک ہی بات مجھے حفظ کروادی تھی کہ میری شادی آپ لوگوں کی پسند سے ہوگی اس لیے مجھے ادھر تو حیر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ لاپرواہ انداز سے انہیں بتا رہا تھا۔

بڑی ماں کے ساتھ ساتھ بڑے ابا کو بھی شاک سا لگا۔ بڑے لالہ ہاتھ میں پکڑا اخبار غصے سے سائیڈ میز پر پٹا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔
”ابن کو گیا ہوا۔؟“ ماہیر ان کے انداز پر پریشان ہوا۔

”تم ایسی باتیں ابن کے سامنے مت کیا کرو۔“
بڑی ماں نے نظریں چرا کر آہستگی سے کہا اور اپنے میاں کے پیچھے ابن کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔
جلد وہ آتش فشاں بنے گھوم رہے تھے۔

”بہت مکار ہے نیور“ بھٹابے ایسی باتیں اپنی اولاد کو سکھا کر ہمارا دل جیت لے گا“ تارنالا سے گھاس نہیں کھودتے رہے ہم یہاں۔“ انہوں نے ناراض نگاہوں سے اپنی ندوچہ محترمہ کو دیکھا۔

”لب بس بھی کروں اور کتنا خفا رہیں گے اس سے؟“
بڑی ماں نے افسردگی سے جواب دیا۔
”ساری زندگی اس ہانچار کی شکل نہیں دیکھوں گا“
قسم کھا رکھی ہے میں نے۔“ وہ غصے بھرے انداز سے گویا ہوئے۔

”ہاں۔ اپنے ساتھ مجھے بھی خود ساختہ جدائی کی سزا دے رکھی ہے۔ میرا کیا تصور تھا۔؟“ بڑی ماں عمر کے اس حصے میں اب انہیں دوبارہ جواب دینے لگی تھیں۔ ابن کے اندر برداشت کا ماں ختم ہوتا جا رہا تھا۔
”میں نے منع توڑی کیا ہے؟“ ہاں میں کل ہی کوا رتا ہوں انگلیں کا ٹکڑ۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا لائٹر غصے سے بیڈ پر پھینکا۔

”مجھے جس دن جانا ہوگا“ آپ سے پوچھوں گی بھی

اسے روک رہی ہے۔
 ”ہمیں کسی سے اس خواب کی تعبیر پوچھنی
 چاہیے۔“ نیلم کے مشورے پر وہ استہزائیہ انداز میں
 مسکرائی۔

”تم یہ منحوس قسم کے ٹائٹل والی کتاب سامنے
 سے بناؤ مجھے لگتا ہے اسے دیکھ دیکھ کر ہی میرے ذہن
 میں یہ تصویر نقش ہو گئی ہے۔“ بخٹور کے توجہ دلانے
 پر نیلم انہی سامنے ہی شایف پر کتابیں اس طرح
 سے رکھی ہوئی تھیں کہ ”سیاہ ماحیہ“ کتاب کا سرورق
 بالکل سامنے تھا۔ نیلم نے خاموشی سے وہ کتاب اٹھا کر
 دراز میں رکھ دی۔ بخٹور نے سکون کا سانس لیا۔
 ”تم نے لگتا ہے مئے رشتے والی بات کی ٹینشن
 لے رکھی ہے۔“ نیلم کھانے کی ٹرے لیے اس کے
 پاس آن بیٹھی۔

”ہاں، ذہن پر سوار ہو کر رہ گئی ہے وہ بات۔“
 بخٹور نے بھی جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔
 ”اللہ بستر کرے گا تمہیں اپنی حالت خراب کر رہی
 ہو۔ ذرا آئینے میں اپنی شکل دیکھو جا کر۔“ نیلم کو اسے
 دیکھ دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔
 ”اچھا، تم کھانا تو کھاؤ ناں۔“ نیلم نے اس کے
 لیے چاول پلیٹ میں نکالے۔

”نہیں یاز! میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ بخٹور نے بے
 دلی سے پلیٹ دوبار اترے میں رکھ دی اور دیوار سے
 ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
 ”صبح صبح شہناز کا میٹ بھی ہے۔“ نیلم نے
 اسے یاد دلایا تو بخٹور نے بے چینی سے پاس رکھی کتاب
 اٹھالی۔ سارے لفظ اور سارے ٹاپک اسے اجنبی سے
 لگ رہے تھے۔ کچھ عرصے سے اس کی توجہ کتابوں
 سے بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ اینول سسٹم
 تھا ورنہ اس کے لیے بہت برا مسئلہ بنتا۔

”اچھا۔ یہ دودھ تو لی لو ناں۔“ نیلم کو اس کی بہت
 فکر تھی۔ بخٹور نے کچھ سوچ کر گلاس پکڑ لیا اور
 خاموشی سے پی بھی گئی۔ دودھ پینے کے بعد ہی اسے
 احساس ہوا کہ وہ صبح سے بھوکی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں

سے اس کی بھوک بالکل ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی، نیلم
 کے احساس دلانے پر وہ کچھ کھاپی لیتی اور نہ سارا سارا
 دن سوچوں میں گم پریشان رہتی۔
 ”میں تو اپنی آنے والی سات نسلوں کو نصیحت کروں
 گی کہ وہ کھریں بھینس پال لیں یا بیکری، لیکن محبت ہم
 کی کوئی چیز اپنے دل میں مت پالیں۔“ نیلم کے جل کر
 بولنے پر اسے ہنسی آئی۔

”وہ کیوں بھلا۔؟“ وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی جو
 برہم لگتا ہوں سے اسے ہی گھور رہی تھی۔

”محبت تو اچھے خاصے انسان کی مت مار رہی ہے،
 اچھی بھلی تھیں تم اپنا بالکل ہی بڑا غرق کر لیا ہے تم
 نے ایک شخص کے پیچھے۔“ نیلم جھنجھلا سی گئی۔
 ”اس میں محبت کا تو کوئی قصور نہیں یہ تو انسان کی
 اپنی کمزوری ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا
 ہے۔“ بخٹور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بس بس رہتے وہ زیادہ مفاتیل دینے کی ضرورت
 نہیں، میں سب جانتی ہوں۔“ نیلم نے فوراً ہی اسے
 جھاڑ کر رکھ دیا۔ اسی لمحے ساتھ دلے کمرے کی لڑکی نے
 بخٹور کو اس کا فون آنے کی اطلاع دی۔

”ہاشم کی بی بی کل ہوگی لیکن پلیز کال سن کر بیش کی
 طرح گونگی، بھری ہو کر مت آجانا۔“ نیلم کو آج کل
 ہاشم پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔

”اچھا اچھا اب زیادہ خفاست ہو، اچھی سی چائے
 بناؤ، دونوں مل کر پیتے ہیں۔“ وہ جاتے جاتے بھی اس
 سے فرمائش کرتا نہیں بھولی تھی۔

”تمہارا بخٹور کچھ کم ہوا کہ نہیں۔“ بخٹور نے
 جیسے ہی ریسیور کلن سے لگایا، وہ سری جانب ہاشم ہی
 تھا۔

”ہاں۔ اب تو پہلے سے بہت بہتر ہے۔“ بخٹور
 نے اس کی تسلی کروائی۔

”یقین مانو بخٹور! تمہاری شکل دیکھ کر مجھے
 بہت گلٹی مل ہونے لگا ہے۔“ ہاشم سخت زندہ انداز میں
 اسے بتا رہا تھا۔

”اچھی بھلی فریش لڑکی تھیں تم، کچھ ہی دنوں میں

مرحبا کر رہی تھی۔ "ہاسم کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور دودھ چونک گیا۔

"تم میری بات پر ہنس کیوں رہی ہو؟"

"اس لیے کہ تھوڑی دیر پہلے ہاسم بھی یہی بات کر رہی تھی۔" بخٹور کے بتانے پر وہ مزید سنجیدہ ہوا۔

"اس کا مطلب ہے وہ مجھے بھی کوس رہی ہوگی۔"

"وہ کیوں بھلا؟" بخٹور کو اس کے درست انداز پر دل ہی دل میں تعجب ہوا۔

"ظاہر ہے میری ہی وجہ سے تو تمہاری یہ حالت ہوئی ہے۔" بدل کرتے انداز میں گویا ہوا۔

"ارے نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں میں تو بابا کے سخت رویے سے دل برداشتہ تھی۔ اسی چیز نے مجھے آج کل پریشان کر رکھا ہے۔" بخٹور نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟" وہ اسی بات کی طرف اہمیت دیتا تھا جس کی وجہ سے بخٹور کا دن رات کاسکون غارت ہو چکا تھا۔

"ابھی تک کھنڈوز ہوں۔" بخٹور کی صاف کوئی اس کا دل دکھانے کا باعث بنی۔

"دیکھو بخٹور! ہمارے پاس زیادہ نام نہیں ہے یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ اس کے بعد اگر کچھ ہو گیا تو تم مجھے قصور وار نہیں ٹھہرو گی۔" وہ اب دو ٹوک انداز میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"میں آج آخری دفعہ اپنے گھریات کرنا چاہتی ہوں۔" بخٹور نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تو ٹھیک ہے تمہارا جو بھی فیصلہ ہو مجھے صبح نو بجے آکر بتانا یقین مانو تم انکار بھی کر دو گی تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا اور میرا وعدہ ہے کہ کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔" وہ ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر اس کی سامتوں میں انداز میں رہا تھا۔ بخٹور نے خاموشی سے ریسور رکھ دیا۔

وہ نیلی فون بوتھ کا کارڈ خرید کر لے آئی اور اب اپنے گھر کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ دوسری طرف اس نے فون اٹھایا۔ اس کی آواز سننے ہی وہ پرجوش انداز میں

گویا ہوئی۔

"اگلے جمعے پر گھر ضرور آجانا تمہارے باپ نے تمہارے نکاح کی تاریخ طے کر دی ہے۔"

"لیکن مجھے فیصل سے شادی نہیں کرنی امی۔"

اس نے اپنا کمزور سا احتجاج رکاوڑ کر دینے کی کوشش کی۔

"فضول مت بولو بخٹور! تمہارا باپ میری جان نکال لے گا۔ دوبارہ یہ بات کی تو اپنا دودھ نہیں بخشوں گی تمہیں۔" دوسری طرف اس جذباتی انداز میں شروع ہو چکی تھیں۔ بخٹور کا دل ٹامف کے گھرے احساس سے بھر گیا۔

"لیکن امی! بابا کو ایک دفعہ تو ہاشم سے ملنا چاہیے تھا؟" بخٹور نے ناراض انداز میں گلہ کیا۔

"ارے بے وقوف لڑکی! امی ڈالو اس ہاشم پر بیٹھ ایک پرمنا لکھا اسٹیشن فیمیل کالز کا ہے تم تلاش کرو گی رہیں پر۔" اس نے اسے خواب دکھانے شروع کر دیے۔

"لیکن فیصل مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس نے عقلی سے کہا۔

"نکاح کے دو بولوں میں بہت طاقت ہوتی ہے بیٹا! تم دیکھنا تو سہی کیسے تمہارا دل بدل جائے گا۔" امی اسے رضامند کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا نذر لگا رہی تھیں۔

اس نے اگلے پانچ منٹ تک انہیں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف انہوں نے بھی اس کی کوئی بات نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ ہاشم کا نام لیتی تو دوسری طرف "فیصل نامہ" شروع ہو جاتا۔ تنگ آکر بخٹور نے فون بند کر دیا۔ وہ ان کی طرف سے سخت مایوس ہو چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے باپ نے اس کے پر کانٹے کے لیے کھل ہو کر ام ترتیب دے دیا ہے اور وہ ہاشم والی بات کے بعد بخٹور کو کسی بھی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھے اور فن کے نزدیک اس کا بہترین حل یہی تھا کہ بخٹور کو کسی اور کے نکاح کے بندھن میں باندھ دیا

جائے اس کا دل تاسف رنج اور دکھ کے طے طے
جذبات سے بھر گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کل اسے
ماہم کو کیا جواب دینا ہے۔ یہ سوچ کر وہ کچھ مطمئن ہو
گئی۔

~ ~ ~

”آپ تو بڑے مزے کی چیزیں۔“ ارصم کی ماہیر
کے ساتھ پہلی ملاقات تھی اور یہ ملاقات خاصی
دیرپ تھی۔ اس وقت وہ اورید اور ماہیر تینوں کے
ایف سی میں موجود تھے اور ماہیر ان دونوں کو اپنے کانچ
کے واقعات مزے سے سن رہا تھا۔

”یار ارصم! ایک بات کہوں۔“

ماہیر کی بات پر ارصم چونکا۔ ”جی جی ضرور۔“
”باتو تم مجھے“ آپ آپ مت کہو یا پھر اورید اسے
کہہ دو مجھے تم تم نہ کہے، قسم سے پچھلے ایک کھٹے
سے مجھے لگ رہا ہے جیسے میں دنیا کی سب سے بد تمیز
لڑکی کا بھائی ہوں۔“ ماہیر کے شرارتی انداز پر دونوں
بے ساختہ ہنس پڑے۔

”بھئی۔ اورید اوالے معاملے میں تو میں بے بس
ہوں، کلیتہ میں اپنے احترام والے رشتے سے دست
بردار ہونا ہوں۔“ ارصم اپنے کزن کی کمپنی کو خوب
انجوائے کر رہا تھا۔

”اب یار! اتنا بھی بڑا نہیں ہوں تم سے، صرف
ڈھائی تین سال کا تو فرق ہے ہم دونوں میں۔“ ماہیر
ڈنگر کر کے بھرپور انصاف کرتے ہوئے بولا۔ ارصم
اور ماہیر کے درمیان خوب بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اس
دن ان تینوں نے خوب انجوائے کیا۔

”پھر تم نے کیا سوچا ہے، پاکستان میں کیا کرو گے۔“
وہ تینوں اس وقت دامن کوہ پر موجود تھے۔ ارصم
نے اچانک ہی ماہیر سے پوچھا۔ اورید ان دونوں سے
ذرا فاصلے پر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی تھی۔

”سہید کے ساتھ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی بنانے
پر غور و فکر ہو رہا ہے۔“ ماہیر نے بے تکلفی سے اپنا
آراء بتایا۔ آج کل ماہیر اور سہید دونوں سارا سارا دن

اسی منصوبے پر بلا تھک کر رہے تھے۔
”ہاں اچھا آئیڈیا ہے، سہید بھائی اس معاملے میں
آپ کی کل ہیلپ کر سکتے ہیں اور میڈیا سائنسز کی
ڈگری تو ویسے ہی آپ کے پاس ہے۔“ ارصم نے اسے
سرایا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ماہیر خالص تخلیقی مزاج
کا بندہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اپنے
باپ کی مکمل سپورٹ حاصل تھی اور کوئی معاشی
مسائل بھی نہیں تھے۔ وہ اور سہید پیچہ ورک مکمل کر
چکے تھے۔ اسی دن شام کو ارصم ایک دفعہ پھر اورید کے
پورشن کی طرف چلا آیا۔

”ماہیر تم سے بہت مختلف ہے۔“ ارصم اس وقت
اورید کے کمرے میں موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں
ایک بڑے سائز کا فریم تھا جس میں اورید، ماہیر اور
اس کے لانا لاپا کی ایک یادگار تصویر تھی۔

”وہ کیسے بھلا۔؟“ اورید نے اپنے کپڑوں کی
الٹاری سیٹ کرتے ہوئے لاپرواہی سے پوچھا۔

”وہ بہت ذہین دل، ذہین اور کونفیڈنٹ ہے۔“
ارصم نے مکمل کر ماہیر کی تعریف کی، اسی لمحے اورید کو
محسوس ہوا، لوگ ماہیر سے واقعی امپرپس ہو جاتے
تھے۔ اس نے دو چار دنوں میں ہی بڑی اہل کو بھی اپنا
گرویدہ کر لیا تھا۔

”ہاں وہ واقعی مجھ سے بہت مختلف ہے، کسی بھی
چیز کو ذہن پر سوار نہیں کرتا، ہینکوں میں اڑا رہا ہے۔“
اورید نے مکمل دل سے اعتراف کیا۔

”تم ویسی کیوں نہیں بن جاتیں ہو یار۔“ ارصم
نے لپکا سا جھجک کر کہا۔

”کوئی انسان کسی دوسرے جیسا کیسے بن سکتا ہے،
ہر انسان کی اپنی فطرت اور مزاج ہوتا ہے۔ ایک ہی
والدین کے بچے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے
ہیں۔“ اورید اگر ارصم کی فرمائش بہت عجیب سی تھی۔

”پھر بھی تم کو شش تو کر سکتی ہو تلو۔“ ارصم اپنی
ہی بات پر اڑا ہوا تھا۔

”ہرگز نہیں ارصم۔“ ماہیر بھائی ضرور ہے لیکن
مجھ سے بہت ڈفرنٹ۔ جب وہ میرے جیسا نہیں بن

سکتا تو میں کیسے اس کے جیسی ہو سکتی ہوں۔" وہ اب کھل کر اپنا موقف بیان کر رہی تھی۔

"ہوں۔ شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" ارصم نے ہار لی۔

"ہو سکتا ہے" نے دل لے دتوں میں میرے اندر ماہیر جیسی تہ سہی اس سے ملتی جلتی کچھ خصوصیات پیدا ہو جائیں۔ "لوریدا کو لے کھل مایوس کرنا اچھا نہیں لگا تھا اس لیے اس نے امیز کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھامی وہ ایک دم خوش ہو گیا۔

"آئی بیٹش نے کچھ کہا تو نہیں ماہیر کے بارے میں؟" لوریدا کو بڑے ہی غلط موافقے پر یہ بات یاد آئی۔

"کیوں؟" کچھ کہنا ضروری تھا کیا۔ "اس نے بات ملنے کی کوشش کی۔

"اصل میں ماہیر کے ساتھ ان کی پہلی گفتگو کوئی خوش گوار نہیں ہوئی تھی بلکہ میرا تو خیال تھا آئی بیٹش خوب خفا ہوئی ہوں گی کھر جا کر۔" لوریدا اس کی ملا کے مزاج کو اب کافی سمجھنے لگی تھی۔

"تو کیا ہوا؟ کون سا ماہیر ان کے سامنے تھا۔" جیسا "لوریدا ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا اسے افسوس ہوا۔

"تمہاری شکل پر کیوں بارہ بج گئے ہیں۔" ارصم اٹھ کر اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے ایک دم ہی احساس ہوا کہ لوریدا اب اس کی طرف دیکھ کر کم کہنی بات کرتی تھی اور زبان تراش سے فون پر ہی بات کرنے کو ترجیح دینے لگی تھی۔ ارصم کے دماغ میں گھنٹیوں کی بجنگ۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔ "کچھ نہیں۔" وہ ہچکے سے انداز سے سٹرا دی۔

"تمہیں تو بھوت بولنا بھی نہیں آتا لوریدا۔" وہ اس کے بالکل سامنے تن کھڑا ہوا۔ اور بغور اس کی شکل دیکھنے لگا۔ "توڑی سی کنفیوز ہوئی۔

"جیسے کوئی بھی کام ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا۔" اس نے صاف کوئی سے اعتراف کیا۔

"پھر محبت جیسا مشکل کام کیوں کرنے لگی ہو۔"

ارصم کی زبان پھسل اور وہ بوکھلا سی گئی۔ "میں تو نہیں کر رہی کچھ ایسا ویسا۔" وہ نظریں جھکائے بولی۔ ارصم کی نظریں بے ساختہ اس کے رخساروں پر گرتی لمبی سیاہ پلکوں میں اٹک گئیں۔ اس کی پلکیں اس وقت مرتعش تھیں اور وجود سارا کسی زلزلے کی زد میں۔ ارصم کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا لیکن وہ خود بھی اس معاملے میں اورید کی طرح بے بس ہو چکا تھا۔ دونوں کے درمیان بے معنی سی گفتگو کا دورانیہ بڑھنے لگا تھا۔

"ہیلو۔ ہیلو۔" لوریدا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ماہیر بے تکلفی سے اندر داخل ہوا۔ لوریدا فوراً ہی اپنی رازدروہ کھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اس چہرہ قوس قزح کے سارے رنگوں سے سجا ہوا تھا۔

"بھئی ارصم! تم یہاں ہو؟ لوھر بڑے لیا نے تمہاری تلاش میں کنوؤں میں ہانس ڈلوایے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے لوریدا کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

"کیوں کیا ہوا۔" ارصم خود کو سنبھال چکا تھا۔ "پتا نہیں ہارٹ سرجری کی ٹیکس پر کوئی نیا آرٹیکل آیا ہے وہ تمہیں پڑھانا چاہ رہے ہیں۔ اس لیے پڑی لیں تمہاری تلاش میں مجھے اوھر اوھر دوڑا رہی تھیں شکر ہے ملازمہ نے بتا دیا کہ تم یہاں ہو۔" ماہیر نے لوریدا کا سیل فون اٹھا کر گیم کھیلتا شروع کر دی۔

"ہارٹ سرجری پر۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"یہ ہارٹ پر اتنا زور کیوں دے رہے ہو خیر تو ہے میں کوئی چکر نہ کر تو نہیں۔" ماہیر نے سیل فون بیڈ پر رکھا اور شرارت سے ارصم کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں یار! دل کے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں میں سیراف اینڈ لف بندہ۔" وہ اتنی جلدی قابو کرنے والا تھوڑی تھا۔

"اچھا کوئی ایسا ایکسپرنس ہو جائے تو مجھ سے ضرور شیئر کرنا۔"

ماہیر کی بات پر وہ خوشگوار حیرت کا شکار ہوا۔ "وہ کیوں؟"

”میں تمہیں لڑکیوں کو امپریس کرنے کے ایک سو ایک طریقے بتاؤں گا۔“ ماہیر کے شرارتی انداز پر وہ ہنسا۔

”بھئی مجھے تو معافی رکھو، میری ہانکوں میں لانا لکھو اور اس کی۔“ ارصم نے فوراً کٹوں کو ہاتھ لگائے۔
 ”بہت ہی ادا، اقم ہوئے، ہو تم بہت مایوس کیا ہے تم نے۔“ ماہیر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شخ بے میں بولا۔

”آپ اسے الٹی سیدھی بیٹیاں ست پڑھائیں۔“ اورید اصل کر بولی۔
 ”ارصم! تم نے کچھ سنا؟ اورید! نے مجھے“ آپ“
 کہا ہے یا میرے کٹوں کو وہم ہوا ہے۔“ ماہیر نے اسے اچھا خاصا شرمندہ کر دیا۔

”بڑی لہلی کے ڈر سے کہہ رہی ہوں ورنہ۔“ اورید نے سخت زہ انداز میں صفائی دی اور ناراضی کے اظہار کے طور پر کمرے سے نکل آئی۔ وہ اب پچھلے محن کے برآمدے میں رکھے لکڑی کے بڑے سارے جھولے پر بیٹھ گئی تھی۔

”ارصم کو کیسے پتا چلا کہ میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔“ اس سوچ نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

”کہیں اس نے ہوا میں تیر تو نہیں چلایا۔“ اس نے خود کو تسلی دینے کے لیے سوچا لیکن دل تھا کہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

اورید اگو پہلی دفعہ احساس ہوا۔ انسان ساری دنیا کو بے وقوف بنا سکتا ہے لیکن اپنے دل کے سامنے اس کی ساری منطقیں، دلیلیں اور جواز بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دل کے اندر ایک آئینہ لگا ہوتا ہے اور اس آئینے میں وہی عکس نظر آتا ہے جسے آپ ساری دنیا سے اور خود اپنے آپ سے چھپانا چاہتے ہیں۔

”ہزار دفعہ کہا ہے مغرب کے وقت یہاں آکر مت بیٹھا کرو۔“ بڑی لہلی نے جیسے ہی پچھلے لان کا دروازہ کھولا سامنے ہی اورید اچھولے پر بیٹھ گئی

تھی۔
 ”مغرب کے وقت یہاں کیا ہوتا ہے۔“ اورید نے برا سامندہ بنایا۔

”کسی دن کوئی باہر کی چیز چٹ مٹی تو پتا لگ جائے گا۔“ انہوں نے ناراضی سے اپنی اس پوتی کو گھورا جس پر کسی چیز کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

”اچھا لہلی بڑی لہلی جارہی ہوں اندر۔“ وہ ست ہے انداز سے اٹھی۔ کوریڈور سے گزر کر وہ جیسے ہی لاؤنج میں پہنچی سامنے ارصم، ماہیر اور بڑے ابا ٹھہرے کی بازی بچائے بیٹھے تھے۔ کھیل تو ارصم اور بڑے ابا کے درمیان ہو رہا تھا لیکن ماہیر کی فٹ سپورٹ بڑے ابا کے ساتھ تھی۔ بڑے ابا کو کچھ ہی دیر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ ماہیر بہت زہین ہے اور سوچ سمجھ کر چال چلنے کا عادی بھی۔

”بس۔ اسٹاپ! اب تم نہیں بولو گے۔“ ارصم اپنی مات پر جل کر بولا تھا بڑے ابا کے لیوں پر ایک جسم سی مسکراہٹ ابھری۔

”ہار کو تسلیم کرنا سیکھو چنٹل مین، جس دن یہ سوچ لو گے کہ تمہاری بار کسی کی جیت کی وجہ سے ہے، یقین مانو، زیادہ دکھ نہیں ہو گا۔“ ماہیر بڑے سنجیدہ انداز سے ارصم کو مشورہ دے رہا تھا۔ اورید اگن تینوں کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

”تو ٹھیک ہے تم کھیل لو، تمہیں بھی پتا چلے۔ بڑے ابا سے جیتنا آسان نہیں۔“ ارصم نے فوراً ہی میدان چھوڑ دیا۔ ماہیر نے بڑی سرعت سے اس کی نشست سنبولی تھی۔ کھیل تو دلچسپ انداز میں اب شروع ہوا تھا۔ بڑے ابا کو اگلے دس منٹ میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کھیل میں خاصی مہارت رکھتا ہے۔ جب اس کی جیت یقینی تھی اس نے ایک دم ہی غلط چل چل دی۔ ارصم اور اورید اگو ہوا سی ہوئی۔

”تم جیسے انسان سے ایسی فضول چال کی توقع نہیں تھی مجھے۔“ بڑے ابا جیت کر اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور اب کسی کام سے دوبارہ اگلے تو لاؤنج سے آئی ارصم کی ناراض آواز پر وہیں ٹھکے۔

”میں نے جن بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ ماہیر بڑے مزے سے کہہ رہا تھا۔ بڑے ابا کو دھوکا سا لگا۔
 ”وہ کس خوشی میں۔“ اور یہ ایک دم جڑی گئی۔
 ”میں بڑے ابا کو کسی بھی میدان میں ہارتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ میرے آئیڈیل ہیں اور مجھے ان سے سو دفعہ بھی ہارنا ہوتا تو میں ہاروں گا۔“ ماہیر کے لہجے کی سچائی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا۔ بڑے ابا کے دل کو کچھ ہواؤں خاصو شی سے اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئے۔ ساری رات انہیں ماہیر کے ان جملوں نے سونے نہیں دیا۔ وہ جھنجھلا کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نیند ان کے کمرے کا راستہ بھول چکی تھی۔ انہیں اب ساری رات جاگ کر گزارنا تھی۔

”تم بد قسمت نہیں ہو شانزے۔“ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اسے سمجھانے میں مصروف تھا۔ دونوں اس وقت میسرے ہوٹل میں موجود تھے۔ سرد کو اس کی فلم کے لوہورے رہنے کا اس سے زیادہ افسوس تھا۔ یہی غم غلط کرنے کے لیے اسے لچ پر یہاں لے کر آیا تھا۔

”اگر ایسا نہیں ہے تو میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟“ شانزے نے برا سامنے بتایا۔

”کسی بد قسمتیت کے لیے۔“ سرد نے مسکرا کر اس کا معصوم چہرہ دیکھا۔ کسی بچی کی طرح ہونٹ باہر نکالے تھا۔ خفا سے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس نے سامنے ٹیبل پر موجود کھانے کی کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

”مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ کوئی اچھی اور بہترین چیز کم از کم میری قسمت میں نہیں ہے۔“ شانزے کا لہجہ جی میں ڈوبا ہوا تھا۔

”بس لڑکی اسٹاپ! آج کے دن کے لیے اتنی ہی نصیحتیں کافی ہیں۔“ سرد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔

”آپ سے آپ کی کوئی پسندیدہ چیز چھنی ہو تو آپ

وہ انداز تھا۔ وہ بچا۔ اسے انداز پر ہنسنا پڑا۔

”تم اپنے بھائی کے لیے ایسا سوچتی ہو۔“ سرد نے مصنوعی ناراضی سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بوکھلا سی گئی۔

”نہیں میں آپ کو بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ آپ کو میرے جذبات کا اندازہ نہیں ہے۔“

”مجھے بدست اچھی سر۔“ کباب آرام سے کھانا کھاؤ۔ میرے پاس مہارے لیے ایک اور آپشن بھی ہے۔“ سرد نے اسے لالچ دیا لیکن اس دفعہ شانزے پر اس کی کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ فلم والے واقعے نے واقعی اس کے جذبات کو مجروح کر کے رکھ دیا تھا۔

”میں نے سوچ لیا ہے مجھے اب شو بزم میں کام نہیں کرتا۔“ شانزے کی بات نے سرد کو اتنا حیران کیا کہ اس کا جج منہ کی طرف لے جاتا ہوا ہاتھ فضا میں ہی معلق ہو گیا۔ سرد کو محسوس ہوا کہ بدست ہی زیادہ دل برداشتہ تھی۔

”کیا کا تم نے؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑا جیج پلیٹ میں رکھ کر شانزے کا بنجید چہرہ دیکھا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے شو بزم میں نہیں جانا۔“ وہ اپنی بات پر قائم تھی۔

”پھر کیا کرو گی۔؟“
 ”پتا نہیں۔“ وہ حد درجہ مایوس، دل گرفتہ اور رنجیدہ سی تھی۔

”تم میڈیا میں کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتی ہو۔“ سرد نے پتھ سوچ کر کہا تو ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔

”کون دے گا مجھے جاب؟ ہر جگہ تو پرچی سسٹم ہے اور میرے پاس تو کوئی سفارش بھی نہیں آج تک جتنے چانس ملے ہمارے آپ کی بوجھ سے۔“ وہ ہزاروں مایوسی کی انتہا پر تھی۔

”ویسے تمہارے لیے ایک جاب بھی ہے میرے پاس۔“ سرد مسکرایا تو چونک گئی۔

”جواب۔“

”میرا ماںوں زاد کزن ہائیر انٹیکنڈ سے ایڈورٹائزنگ کی ڈگری لے کر آیا ہے اور اپنی کوئی ایجنسی بنانا چاہتا ہے۔“ سرد نے ہماری کتاب اس کی پلیٹ میں ڈالے اور آہستہ آہستہ جیس اس کی طرف برحانے لگا۔ ”اچھا پھر؟“ شانزے نے آخر کار اپنی دلچسپی کا اظہار کر دی دیا۔

”لیکن میں نے اسے مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی نیو ایجنسی بنانے کے بجائے کسی کے ساتھ پارٹنرشپ کر لے۔“ سرد نے سنجیدگی سے بتایا۔

”ہاں یہ اچھا مشورہ ہے۔“ شانزے نے فوراً ہی اس کی تائید کی۔

”وہ اپنے ساتھ کچھ نئے بندے ہائر کرے گا تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو جانا۔“ سرد نے بے تکلفی سے اسے مشورہ دیا۔

”ہاں نہیں من کی جوائس کیا ہو۔ آپ مجھے زیر سی ان پر مسلط کریں گے کیا؟“ شانزے نے صاف گوئی سے گماؤدہنس دیا۔

”اب ایسے بھی حالات نہیں ہیں یار اب کزنز میں اتنی تو فرینک نس ہوتی ہے کہ بندہ اپنی بات زبردستی بھی منوالے تو کوئی ہرج نہیں۔“

”چلیں آپ بات کر کے دیکھ لیں۔“ شانزے نے تھوڑا سا سوچ کر آموی ظاہر کر دی، سرد کے لبوں سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی، وہ اب مزے سے لہجہ کر رہا تھا۔

”آپ کی اس کزن کا کیا حال ہے؟ کوئی معاملہ آگے بڑھا۔“ شانزے کو ایک دم ہی یاد آیا۔

”اور یدا۔“ سرد کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی جگنو جھکے ”ارے یار! ہائیر اسی کا ہی تو بھائی ہے۔“ لیکن آپ والے معاملے کا کیا بنا۔؟“ شانزے کی سولی وہیں اچھی ہوئی تھی۔

”بھئی۔ اس معاملے میں میں اتنا خوش قسمت کماں، وہ تو اپنا پری میڈیکل کامیٹ بنانے کے چکر میں ہے اس لیے رامیں با میں ذرا کم ہی دیکھتی ہے۔“

سرد نے ہلکے ہلکے انداز سے ہجویشن دہائی۔

”ذرا دھیان سے کیا نہ ہو،“ آپ اس کے میرٹ کے چکر میں رہیں اور وہ کہیں اور گھٹنٹ کر لے۔“ شانزے نے اسے چھیڑا، کچھ بھی سی اسے سرد حقیقت میں بھائیوں کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ ہلکی ہلکی چھیڑ چھاڑ جاری رکھتی تھی۔

”ان شاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا، میں اسی کے کلن میں یہ بات ڈال چکا ہوں، وہ موقع دیکھ کر بڑی امان سے بھی بات کر لیں گی۔“ سرد بالکل مطمئن تھا۔

”آپ تو بہت تیز نکلے۔“ شانزے ہنس۔

”ظاہر ہے بھائی کس کا ہوں۔“ سرد نے شرارت سے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دونوں نے بہت اچھے ماحول میں کھانا کھایا۔ شانزے قلم والے صدمے سے کافی حد تک باہر نکل چکی تھی۔ اس لیے جب وہ ہوٹل آئی تو اس کا موڈ خاصا خوشوار تھا۔

”شکر ہے تمہارے چہرے پر بھی مسکراہٹ آئی۔“ رباب نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر شکر کا سانس لیا۔ وہ لب اپنے بستر پر بیٹھی اپنے اونچی ایڑی کے میٹھل اتار رہی تھی۔

”میں نے سوچا ہے رباب! میں شوز چھوڑ کر کوئی جاب کر لوں۔“ شانزے کی بات پر رباب مسکرائی۔

”یہ کم از کم بہت ستر فیمل ہے۔“ ویسے کہاں جاب کرنے کا ارادہ ہے۔؟“ رباب نے اس کی پھیلائی ہوئی چیز پر سیٹنا شروع کر دی۔

”سرد بھائی کا ایک کزن کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں پارٹنرشپ کر رہا ہے۔“ شانزے نے لاپرواہی سے اطلاع دی۔

”یعنی کہ تم نے قسم کھالی ہے کہ شوز کا پچھا نہیں چھوڑنا،“ خبر یہ اس کام سے ہزار درجے بہتر ہے۔“ رباب نے بے تکلفی سے جھوٹا کیا۔

”تم ہی تو دن رات سچ کرتی تھیں مجھے میں نے سوچا بات مان لینے میں کوئی ہرج نہیں۔“ شانزے کا

نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت ساری دنیا سے بیزار لگ رہی تھی۔

”آپ جاب کے بجائے بلا لنگ کیوں نہیں کرتیں؟“
ماہیر نے اپنے سامنے بیٹھی دلکش خدو خال کی حامل لڑکی کو مزے سے مشورہ دیا۔ سرمد نے ماہیر کا یہ جملہ اس کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے بغور سنا اور مسکرا دیا۔

”تم پلیز اس کا انٹرویو لو“ اسے مشورے مت دو۔
وہ اپنے لپ ٹاپ کا بیگ میز پر رکھتے ہوئے شانزے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔
”کیسی ہو چھٹی۔؟“ سرمد کے بے تکلف انداز پر ماہیر چونکا۔

”فائن۔ اینڈ آپ۔“ وہ ماہیر کی وجہ سے ذرا تکلف سے بات کر رہی تھی۔
”بس ٹریک جیم میں پھنس گیا تھا یا اس لیے دیر ہو گئی۔“ اس نے ماہیر کے سامنے رکھے جگ سے پانی گلاس میں ڈالا اور ماہیر کی طرف متوجہ ہوا۔
”ایسا کرو یا راتم شانزے کا لائنمنٹ لیٹر بنواؤ“
انٹرویو بعد میں کرتے رہتا۔ ”سرمد کے دو ٹوک انداز پر ماہیر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔
”لیکن۔“ ماہیر کچھ شش و پنج کا شکار ہوا۔

”دو بندے میں نے پائنٹ کرنے تھے ناں، تم شانزے کا کام میری لسٹ میں ڈال دو۔“ سرمد طے کر چکا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ شانزے نے چونک کر ماہیر کی طرف دیکھا جو الجھن کا شکار لگ رہا تھا۔
شانزے کو لگا جیسے اسے زبردستی یہاں پر ایڈجسٹ کیا جا رہا ہے۔ اس سوچ نے اس کا سارا مودعارت کر دیا۔
دوسری جانب ماہیر تو اس کے دلکش خدو خال میں الجھا ہوا تھا۔

”خیر امن کا کام تو میں تمہاری لسٹ میں نہیں ڈال سکتا۔“ ماہیر کے معنی خیر انداز پر شانزے نے نرم دستانہ انداز میں چوکی۔ ٹھنکا تو سرمد بھی تھا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔
شانزے کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ اس نے

موڈ آج واقعی خوش گوار تھا۔
”بھئی شانزے! اب دن و سارا بے جھوٹ تونہ بولو“
رباب نے اسے شرارت سے گھورا۔ ”وہ تو اللہ کی ہی مرضی نہیں تھی اور نہ تم نے تو اپنی طرف سے کافی زور لگایا تھا۔“ رباب کی صاف گوئی پر وہ کھلکھلا کر ہنس۔ اس کی بات کوئی اتنی غلط بھی نہیں تھی۔

چند دن کے بعد ہی سرمد کی کل آگئی تھی۔ اس کے گزن کے ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے مالک سے سارے معاملات طے ہو چکے تھے۔ وہ اب اپنا آفس سیٹ کر رہا تھا اور ایک مہینے کے بعد شانزے انٹرویو کے لیے اس کے آفس میں موجود تھی۔ سیاہ رنگ کے ٹیٹ کے سوٹ میں وہ اس قدر دلکش لگ رہی تھی کہ ایجنسی کی رسیشن پر موجود لڑکی سمجھی کہ وہ یہاں کسی کمرشل کے ٹوڈیشن کے لیے آئی ہے۔ ایک پھلکی سی مسکراہٹ شانزے کے لبوں پر پھیل گئی۔ سرمد کے کہنے پر یہاں آگئی تھی لیکن وہ خود کسی قریبی سنگل پر ٹریک جیم میں پھنسا ہوا تھا۔ جب کہ سرمد نے اسے وینکلائن میں بیٹھا رکھا تھا۔ شانزے وہاں بیٹھے بیٹھے اکاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

”سرمد بھائی! وہ تو مجھے انٹرویو کے لیے ہی نہیں بلا رہے، میں ایک گھنٹے سے ویٹ کر رہی ہوں۔“ اس نے تنگ آکر سرمد کا نمبر لایا۔

”ڈونٹ ٹیک مینیشن“ میں پہنچ رہا ہوں دو منٹ میں۔“ سرمد نے اسے تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ وہ وینک لایا میں بیٹھی ہوئی تھی کئی مشہور ماڈلز کو پہلے پہل تو اس نے بہت شوق سے دیکھا اور پھر بیزار ہو کر اپنا یہ مشغلہ بھی ترک کر دیا۔

آخر کار ماہیر نے اسے اپنے آفس میں بلوایا تھا۔ اسے اندر جا کر احساس ہوا کہ واقعی بہت بڑی تھا۔ شانزے کی طرف دیکھ کر وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور اسی وقت اس کے سیل فون پر کل آگئی۔ دو منٹ بات کر کے اس نے فون بند کیا اور شانزے کو دلچسپ

میر پر رھا اپنا بچ اٹھایا اور کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ سرد ایک دم ہی پریشان ہوا۔

”سرد بھائی! مجھے یہ جاب نہیں کرنی۔“ شانزے

اپنی بات کہہ کر تیزی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر

نکل گئی۔ سرد لورا بیر دونوں ہی ہکا بکا ہو گئے۔

دونوں کو ہی اس سے اس قدر شدید رد عمل کی توقع

نہیں تھی۔ بیر کو لگا جیسے کمرے کی ساری ہی روشتیاں

مدھم پڑ گئی تھیں۔

۔۔۔۔۔

وہ ایک عجیب سا طن تھا۔ سورج گرہن نے کچھ

لحوں کے لیے پورے ملک کو تاریک کر دیا تھا اور ایسی

ی تاریکی بخٹور کے دل و دماغ پر بھی طاری تھی۔

بدگمانی کی دھند نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ

میں لے رکھا تھا۔ وہ خود سر محبت کا ہاتھ تھام کر اپنی دور آ

گئی تھی جس سے مننے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

”میرا آج کلاسز لینے کا کوئی موڈ نہیں۔“ وہ ست

انداز سے خار میں ڈیپارٹمنٹ کے پاس تن کر کھڑی ہو

گئی۔ ”لیکن آج تو بہت اہم پیکرز ہیں بخٹور۔“ نیلم

نے اسے سمجھنے کی کوشش کی۔

”تو تم لے لو میں جا کر۔“ بخٹور نے اسے منت

مشورہ دیا۔

”لورا تم کیا کرو گی۔“ نیلم نے سوالیہ انداز سے

اپنی دوست کو دیکھا جس کے رنگ و چنگ آج بدلے

ہوئے تھے۔

”میں ہاشم کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہی ہوں۔“

اس کا آج تھیسس کا وائسوا ہے۔“ بخٹور نے فوراً

بہا ملایا اور تہ ہاشم کا وائسوا ہو چکا تھا۔

”چلو ٹھیک ہے تم جاؤ وہاں سے ہاسٹل جاؤ گی یا

ڈیپارٹمنٹ۔“ نیلم نے اس کا لگا پروگرام جانتا چاہا۔

”ہاسٹل۔“ بخٹور آج ضرورت سے زیادہ سنجیدہ

تھی۔

”چو ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا۔“ نیلم نے فکر

مند انداز سے اس کی طرف دیکھا اور کیمسٹری

ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل پڑی۔ راستے میں

ایک دفعہ اس کا دل چاہا کہ وہ پلٹ جائے اور بخٹور کے

ساتھ ہی رہے۔ لیکن پھر اس نے سر جھٹک کر

ڈیپارٹمنٹ میں قدم رکھ ہی دیا تھا۔

بخٹور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمپیوٹر سائنس

ڈیپارٹمنٹ کی طرف آگئی جس میں طے شدہ وقت کے

مطابق ہاشم کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے رستہ و لاج

پر ایک نظر ڈالی اور اس کی طرف چل پڑا۔

”اپنا آئی ڈی کارڈ لائی ہوئی۔“ ہاشم نے سلام دے

کے بغیر اس سے پوچھا۔ بخٹور نے اثبات میں سر ہلا

دیا۔

”چلو پھر۔“ وہ اسے ساتھ لیے پارکنگ کی طرف

برہم گیا۔ بخٹور کا دل بجھا بجھا سا تھا۔ وہ بالکل خاموشی

سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ ہاشم ایک سفید

رنگ کی مہرین گاڑی کے پاس رکا اور چابی سے اس کا

دروازہ کھولنے لگا۔

”یہ گاڑی کس کی ہے۔“ بخٹور حیران ہوئی۔

”میرے دوست کی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہہ

کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”لیکن ہم اس میں کیوں جا رہے ہیں۔“ بخٹور

نے ابھرنے آمیز نظروں سے ہاشم کی طرف دیکھا جو

گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔

”بے وقوف لڑکی! میں صبح سویرے تمہیں کسی

پبلک ٹرانسپورٹ پر تو پکھری میں نہیں لے جاسکتا

تھا۔“ ہاشم نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

”پریشان کیوں ہو بخٹور۔“ وہ بہت دھیان سے

گاڑی چلاتے ہوئے بولا۔

”جی نہیں کیوں بہت عجیب لگ رہا ہے۔“ بخٹور

نے صاف گوئی سے کہا تو وہ جیسے سے انداز میں مسکرا

دیا۔

”کچھ نہیں ہو گا تم کسی بھی چیز کو ذہن پر سوار مت

کرو۔“ وہ ستلہ انداز میں اسے تسلی دے رہا تھا۔

”ہاشم! ہم کچھ غلط تو نہیں کر رہے۔“ بخٹور نے

دیکھ رہی تھی اور وہ بھی اس کی طرف متوجہ تھے۔ بخاور کو لگا جیسے وہ رکتے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ اس نے جھرا کر ہاتھ میں پکڑی فائل کو مضبوطی سے پکڑ لیا جس میں اس کے نکاح نامے کی ایک کاپی موجود تھی۔

❖ ❖

(پلی آنسداوان شاعری)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت	نویسنہ	عنوان
500/-	آمنہ ڈس	بمادل
750/-	ماہد جی	درم
500/-	رضانہ رحمان	زندگی اک مدنی
200/-	رضانہ رحمان	خوشبو کا کوئی کرکٹ
500/-	شاہدہ رحمان	شہر دل کے دروازے
250/-	شاہدہ رحمان	تمہارے سہلی
450/-	آمینہ مرزا	دل ایک شہر
500/-	فاطمہ خان	آنند کا فم
600/-	فاطمہ خان	بہل سلیوں میری ہیں
250/-	فاطمہ خان	بہل سے بگ کالے
300/-	فاطمہ خان	پگیاں سے بارے
200/-	نوروز	میں سے محبت
350/-	آمینہ دلی	دل سے لڑائی
200/-	آمینہ دلی	نکھرنا ایک خواب
250/-	نوروز	دل کو دھکی سہلی سے
200/-	بھری سید	لوں کا جادو
500/-	انوار علی	رنگ خوشبو کا ناول

ناول پڑھنے کے لیے کتاب خانہ عرقہ سہیل

کتاب خانہ

کتاب خانہ عرقہ سہیل 370، 371، 372، 373، 374، 375، 376، 377، 378، 379، 380، 381، 382، 383، 384، 385، 386، 387، 388، 389، 390، 391، 392، 393، 394، 395، 396، 397، 398، 399، 400، 401، 402، 403، 404، 405، 406، 407، 408، 409، 410، 411، 412، 413، 414، 415، 416، 417، 418، 419، 420، 421، 422، 423، 424، 425، 426، 427، 428، 429، 430، 431، 432، 433، 434، 435، 436، 437، 438، 439، 440، 441، 442، 443، 444، 445، 446، 447، 448، 449، 450، 451، 452، 453، 454، 455، 456، 457، 458، 459، 460، 461، 462، 463، 464، 465، 466، 467، 468، 469، 470، 471، 472، 473، 474، 475، 476، 477، 478، 479، 480، 481، 482، 483، 484، 485، 486، 487، 488، 489، 490، 491، 492، 493، 494، 495، 496، 497، 498، 499، 500، 501، 502، 503، 504، 505، 506، 507، 508، 509، 510، 511، 512، 513، 514، 515، 516، 517، 518، 519، 520، 521، 522، 523، 524، 525، 526، 527، 528، 529، 530، 531، 532، 533، 534، 535، 536، 537، 538، 539، 540، 541، 542، 543، 544، 545، 546، 547، 548، 549، 550، 551، 552، 553، 554، 555، 556، 557، 558، 559، 560، 561، 562، 563، 564، 565، 566، 567، 568، 569، 570، 571، 572، 573، 574، 575، 576، 577، 578، 579، 580، 581، 582، 583، 584، 585، 586، 587، 588، 589، 590، 591، 592، 593، 594، 595، 596، 597، 598، 599، 600، 601، 602، 603، 604، 605، 606، 607، 608، 609، 610، 611، 612، 613، 614، 615، 616، 617، 618، 619، 620، 621، 622، 623، 624، 625، 626، 627، 628، 629، 630، 631، 632، 633، 634، 635، 636، 637، 638، 639، 640، 641، 642، 643، 644، 645، 646، 647، 648، 649، 650، 651، 652، 653، 654، 655، 656، 657، 658، 659، 660، 661، 662، 663، 664، 665، 666، 667، 668، 669، 670، 671، 672، 673، 674، 675، 676، 677، 678، 679، 680، 681، 682، 683، 684، 685، 686، 687، 688، 689، 690، 691، 692، 693، 694، 695، 696، 697، 698، 699، 700، 701، 702، 703، 704، 705، 706، 707، 708، 709، 710، 711، 712، 713، 714، 715، 716، 717، 718، 719، 720، 721، 722، 723، 724، 725، 726، 727، 728، 729، 730، 731، 732، 733، 734، 735، 736، 737، 738، 739، 740، 741، 742، 743، 744، 745، 746، 747، 748، 749، 750، 751، 752، 753، 754، 755، 756، 757، 758، 759، 760، 761، 762، 763، 764، 765، 766، 767، 768، 769، 770، 771، 772، 773، 774، 775، 776، 777، 778، 779، 780، 781، 782، 783، 784، 785، 786، 787، 788، 789، 790، 791، 792، 793، 794، 795، 796، 797، 798، 799، 800، 801، 802، 803، 804، 805، 806، 807، 808، 809، 810، 811، 812، 813، 814، 815، 816، 817، 818، 819، 820، 821، 822، 823، 824، 825، 826، 827، 828، 829، 830، 831، 832، 833، 834، 835، 836، 837، 838، 839، 840، 841، 842، 843، 844، 845، 846، 847، 848، 849، 850، 851، 852، 853، 854، 855، 856، 857، 858، 859، 860، 861، 862، 863، 864، 865، 866، 867، 868، 869، 870، 871، 872، 873، 874، 875، 876، 877، 878، 879، 880، 881، 882، 883، 884، 885، 886، 887، 888، 889، 890، 891، 892، 893، 894، 895، 896، 897، 898، 899، 900، 901، 902، 903، 904، 905، 906، 907، 908، 909، 910، 911، 912، 913، 914، 915، 916، 917، 918، 919، 920، 921، 922، 923، 924، 925، 926، 927، 928، 929، 930، 931، 932، 933، 934، 935، 936، 937، 938، 939، 940، 941، 942، 943، 944، 945، 946، 947، 948، 949، 950، 951، 952، 953، 954، 955، 956، 957، 958، 959، 960، 961، 962، 963، 964، 965، 966، 967، 968، 969، 970، 971، 972، 973، 974، 975، 976، 977، 978، 979، 980، 981، 982، 983، 984، 985، 986، 987، 988، 989، 990، 991، 992، 993، 994، 995، 996، 997، 998، 999، 1000

32216261

سروپوں کے موسم میں بھی اپنے ماتھے پر آئے سینے کو صاف کرتے ہوئے جھک کر پوچھا۔ ہاشم کا مود ایک دم ہی تبدیل ہوا۔ اس نے بوسن روڈ پر اچانک ہی گاڑی ایک طرف گھڑی کر دی۔

”کیا ہوا؟“ بخاور۔

”دیکھو! اگر تمہیں لگ رہا ہے۔“ بخاور۔
”جے جے تو میں گاڑی واپس موڑ لیتا ہوں۔“ وہ آن کل پھوٹی پھوٹی باتوں پر خفا ہو جاتا تھا۔

”میں نے ایسا تو نہیں کیا۔“ اس کا یہ انداز بخاور کی جان نکال لیتا تھا۔ ”آپ کو اندازہ تو ہے میں کس ذہنی کیفیت کا شکار ہوں، پلیز میری باتوں کا برداشت کر لیں۔“ وہ جذباتی ہوتی۔

”تمہاری ایسی باتوں سے مجھے لگتا ہے جیسے تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے، یقین مانو میں اپنی ہی نظروں میں مگر جاتا ہوں۔“

ہاشم نے گاڑی دوبار اشارت کی تھی اور پھر سارا راستہ دونوں کے درمیان میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ بخاور نے نکاح نامے پر بھی بڑی خاموشی سے دستخط کر دیے۔ وہ دونوں جب دوبار گاڑی میں بیٹھے۔ ایک ہو چکے تھے۔ بخاور جس مرحلے کو احتمالی دشوار گن سمجھ رہی تھی وہ اتنے آرام سے گزر گیا کہ اسے احساس تک نہیں ہوا۔

”کیسا محسوس کر رہی ہو۔؟“ ہاشم نے پہلی دفعہ اسے پورے استحقاق سے دیکھا۔

”چھوڑو تو ابھی کسی بھی قسم کی فینکس پیدا نہیں ہو رہی، اپنا آپ خالی خالی سا محسوس ہو رہا ہے۔“ بخاور نے صاف گوئی سے جواب دیا تو وہ سکرا دیا۔

”تہہ تہہ جھک ہو جاؤ گی۔“ وہ دونوں دوبارہ کیمپس میں آچکے تھے۔ ہاشم نے اس کے کہنے پر اسے بینک چوک پر چھوڑ دیا تھا وہ بو جمل قدموں کے ساتھ اپنے پار ٹنٹ کی طرف آرہی تھی جب اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ٹیکم کو بلایا اور اسی کے ساتھ آتے دیکھا۔ بخاور کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے ان تینوں کو



کے تو اور زیادہ دیں گے۔ ضرور دیں گے۔
اور وہ دیے جا رہا تھا۔ دیے جا رہا تھا۔ جیسے کوئی
دونوں ہاتھوں سے تمام خزانے اس پر نچھاور کر رہا
ہے۔ نہ بل و دولت کی کمی تھی نہ عزت و شہرت کی
پھر کمی کہاں تھی۔
ہاں ایک کمی تھی اگر اسے کمی کہا جاسکتا ہے تو۔
عدنان طارق۔ اس کے میاں کی طرف سے گوکہ
وہ بہت ہی اچھا تھا۔ وہ سو روپے ماہی تو عدنان پانچ سو

سے کم پھیل پر نہ رکھتا۔
وہ بچوں سے کپ کھیا کے سوئی ہوتی تو عدنان
جو کیدار بنا اس کے بیڈ روم کے باہر سروریل امتحانات
کے دوران امتحان گاہ کے باہر اتنا کڑا پرسو نہیں ہوتا تھا
جتنا ایلا کی آنکھ کھلنے تک وہ عدنان رکھتا۔ لینڈ لائن کا
ریسیور ایک طرف رکھ دیا جاتا۔ سیل فون سائلنٹ پر
ہوتا۔ کمرے کا دروازہ بند کر دیا جاتا اور بچے سامنے
والے پارک میں بھیج دیے جاتے۔
عید بقر عید پر بیویاں عیدی مانگ کر لیتی ہیں عدنان
بن مانگے اسے نقدی کے علاوہ زیورات اور کپڑوں کے
تحائف سے نوازتا۔ صرف اس کے لیے ہی کہیں وہ
توسلت غیروں کے لیے بھی دل کا غنی تھا۔
خواتین کو عام طور پر ایک مسئلہ میکے جانے کی
اجازت نہ ملتا ہوتا ہے۔ اچھے سے اپنے شوہر بیویوں
کے جانے کے نام پر ماتھے پر بل لے آتے ہیں عدنان
غیر یقینی حد تک اس کے ساتھ اس معاملہ میں تعاون
کرنا تھا۔ ایلا کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والہ اپنے

ایلا کو ترجیح سے چپ سی لگی ہوئی تھی۔
گوکہ اس کی شادی کو سات سال اور چار ماہ گزر چکے
تھے اور وہ تین بچوں قلزا، عقیق اور فائز کی امی تھی۔
سسرال میں بھی اتنے عرصہ میں اس نے جس جس کے
دل میں جو مقام پیدا کرنا تھا وہ کر چکی تھی۔ جس جس کی
نظر میں اس کی جو حیثیت تھی وہ واضح ہو چکی تھی۔
پھر بھی۔ اس کو بسا اوقات اپنے دل میں خالی پن سا
محسوس ہوتا۔

کئی دفعہ اس نے وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر
ناکام رہی۔ اچھا، علمی گھرانہ، شستر مزاج کے ساس
سر بیٹے، بیٹی کی نعمت اور رحمت، وسیع رزق، ہر چیز تو
مسا بھی پھر اس کے دل سے شکر کے جتنے کیوں نہیں
اچھے تھے؟ عام طور پر عورتیں جن سسرالی مسائل کا
شکار ہوتی ہیں وہ ان سے کوسوں نہیں کھریں میل دور
تھی۔ سسرال کے بھرے پرے گھرانے میں محبت
اعتماد سب ہی میسر تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر اکثر یہی
قلل لگ جاتا۔ وہ گھنٹوں کے نہیں، دنوں بلکہ ہفتوں
کے حساب سے چپ رہتی۔ خللی خللی نظروں سے
سب کو نکلتی۔ اس کی گفتگو بس ”ہوں“ ”نہیں“ ”تک
محدود رہتی۔

کیا وہ ناشکری تھی؟ یہ سوچتے ہی وہ استغفار پڑھ کر
”کر اے اللہ“

پیتا جو کچھ ملا تھا یہ اس کی شکر گزاری کو ہی
شرف قبولت بخشا گیا تھا۔

”اوپر والے“ نے اپنی کتاب میں فارمولہ تصدیقوں
پیلے دے رکھا تھا۔ لیکن شکر ثم ازید نکم۔ تم شکر کرو

جو مانگو گئے تھے، آفس کریم مکلاؤں کا پارک لے کر
جاؤں گا، ریموش دلی گاڑی لے کر لوں گا۔“
شروع شروع میں تو انیلا روایتی بیویوں کی طرح اسی
غلط فہمی میں رہی کہ ہر شوہر کی طرح عدین بھی ”چھڑا
چھانٹ“ ہونے کے مزے لینے کے لیے میکے جانے

اندرونیاریوں کا پورا اسپتال رکھتی تھی۔ معدا صحیح کام
کرنا تھا نہ جگر، ٹائٹس چلنے سے جواب دے چکی تھیں
تو آنکھیں دیکھنے سے ایسے میں جو نئی عدین کو پتا
چلا کہ بورڈ میسز کی طبیعت ہمارے وہ سب کچھ
چھوڑ چھاڑ کے گاڑی نکال لیتا۔ شور مچاتا۔

”جلدی کرو جلدی۔“ بچے منہ بسورتے، دس
طرح کی سوتیلیں اور چھازار، تباہ زار، بہن بھائیوں کو
چھوڑ کر بار، اگلوئی نالی کے پرانے گھر میں جانے پر دل
نہ مانتا تو عدین انہیں طرح طرح کے لالچ دیتا۔
”او میرے شہزادے، نئی ماہی کی خدمت کرو، واپسی پر



اس نے ٹوٹ کیا اکثر تو اسے خوشیوں میں جھونکا
نہیں آتی تھیں۔ خوشیوں کے ہندو لے میں جھونکا
تھانے ایک دم کڑی دھوپ میں لاکھڑا کرتا۔ عجیب

مراج کا تھا اس کا شوہر ایسی پہلی بوجھنے پر آئے تو
صدیاں بیت جا میں۔ ایسی بھارت کہ جواب دنیا میں
کوئی بھی نہ دے سکے

بڑا بڑا بڑا

روتے روتے جلتے کلسنے اس نے زندگی کے سات
سال جیسے گزارے اسے ہی پتا تھا گویا کھنے کا نہ
سمجھانے کا۔ شوہر نام ہے اک دیوانے کا۔ مذاق ہی
مذاق میں وہ شوہر رے شوہر تیری کون سی کل سیدھی
کہہ کر مزہ بھی خود ہی لیتی۔

لیکن کل جو ہوا۔ وہ بہت سی اذیت ناک تھا۔ اس
کا دل ہی دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ یہ بھی کوئی زندگی
ہے؟ مر مر کے جیو۔ یا جی جی کے مر۔ اپنے قرب
دجوار میں بسنے والی تمام کزنز کے شوہر اس کی آنکھوں
کے سامنے آگئے۔ کیا مثالی زندگی ہے ان کی بھی۔
یہاں تو کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ ہوا بھی وہ جس کی وہ توقع
ہی نہیں کیا رہی تھی۔

ناشتے کے بعد ایک دم آرڈر ملے۔ جلدی سے تیار
ہو جائے۔ تیاری اس نے کیا کرتا تھی جلدی سے گھر
میں پہننے والی چپل اتار کر سینٹل پہنی۔ چادر لی اور
جہاں راہبر لے جائے۔ وہ چلنے کو تیار۔ ڈولمن میں
پہنچ کر جس چیز پر اس نے انگلی رکھی، میاں نے خرید کر
لے دی۔ بالکل نئے انداز میں ڈیزائنڈ کاشانہ آر سوٹ
جو تا میک اپ کا سالن، بچوں کے کپڑے لے کر گھر
پہنچی تو وہ واقعی ہوا اس میں اڑ رہی تھی۔ اپنی خوش
حالی پر اسے رشک آ رہا تھا۔ جلدی ہی یہ رشک
اشکوں میں بدل گیا۔ گھر پہنچتے ہی ریک پر نیلی ٹون کاٹل
نظر آیا۔

وہ ہزار نو سو بیچانوے روپے
انیلانے بھی اچک کر بد کھا۔ بل زیادہ تھا، لیکن عام

میں رکھوت نہیں بنتا، لیکن یہ اس کی غلط نہیں تھی جب
عدین نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ”فرش پر تلاوت کرو گی
(ہاں کی خدمت کرو گی) اور عرش پر آواز جائے گی۔“

”کیا مطلب؟“ انیلانے چونکتے ہوئے پوچھا۔
”بھئی، مطلب صاف ظاہر ہے، شب معراج
محبوب خدا کو جنت میں قرآن کی تلاوت کی آواز آتی
تھی۔“ حیرانی سے پوچھا۔

”جبریل امین۔ یہ کس کی آواز آرہی ہے؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”عہد بن حارثہ کی۔ اللہ
کو یہ اتنی ہاں کی خدمت کی وجہ سے بے حد محبوب ہیں
اس لیے فرش پر تلاوت کرتے ہیں آواز عرشوں پر سنی
جاتی ہے۔“

انیلانے سن کر کتنے دن اپنے آپ سے مددھی رہی
تھی۔ کتنی بدگن تھی وہ شوہر سے؟
پھر آخر معاملہ کیا تھا؟ کی کس تھی؟

عدین کا مزاج۔! پل میں تو کہ پل میں ماشہ۔
نواز نے پر آئے تو وال رول پر شائسی خلعت عطا کر دے
ڈانٹنے پر آئے تو دس لوازمات کی موجودگی میں سب کے
سامنے اٹھاؤ دے۔ جہاں وہ شلباشی کی توقع رکھتی وہاں
کو تہیہ گوا دی جاتیں اور جہاں کو تہی پر ڈور رہی
ہوتی وہاں اعزاز و تکریم کے ساتھ بخشش دی جاتی۔

کوئی ایک واقعہ تھا جو انیلانے ہر رات۔ کبھی پوچھوں کو وہ
واقعہ دن میں پانی دینے پر عدین نے ہنگامہ کھڑا کیا تو اسی
روز دس ہزار کی نئی پریم ٹوٹنے پر ”کوئی بات نہیں“
کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ کبھی چند بیگ کی زپ کھول کر
بھرے بازار میں اس کا برس نکال لیا جائے تو ایک لفظ
نہ کہے یہ بھی نہ پوچھے کہ ”مندر تھا کیا۔“ بس کہے تو
صرف یہ کہ ”چنو اللہ نے اس سے بڑے نقصان سے
بچایا اور کبھی دودھ اٹل جلنے پر بھی ہنگامہ کھڑا
کر دے۔ کبھی انعام محبت سے خیال رکھنے کے نیت
نئے طور طریقوں سے دل موہ لے تو کبھی جلتے جلتے
فقرے زہری طرح اگل کے چھوٹی سی رانی جتنی بات
پر سنا کے دکھ دے۔

طور پر ہزار بار سو سے کم بھی نہیں ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو ہزار۔ اب چپ کا نفل عدنان کے ہونٹوں پر لگ گیا۔ عورت کو خوشی نے سوٹ میں ملتی ہے سوانیلا بھی خوشیوں میں مگن تھی اس نے غور ہی نہ کیا کہ یہ چپ کیس کی طوفان کا ہی پیش خیمہ نہ ہو۔

مراہن رات نہ دینا کے کئی تھے۔ تانہ چپاتی تو بے پر ڈالی ہی تھی کہ عدنان کے دھاڑنے کی آواز آئی۔

”بلد کھا ہے لون کا؟“

”جی۔“ نے سوٹ کی خوشی کا مزہ ماند پڑا دیا۔

”کیا میں حرام کاتا ہوں یا درختوں سے پیسے توڑتا ہوں؟“ اگلا جملہ آیا۔

انیلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس آنکھوں میں تر مرے سے بھر گئے۔ ایک دم ہی جلن ہو گئی آنکھوں میں۔

”آئندہ ٹیلی فون کاٹل ہزار گیارہ سو سے زیادہ ہوا تو فون کٹا دوں گا۔ سمجھیں؟ یہ میری حق حلال اور محنت کی کمائی چغلیوں، غیبتوں کا ٹیکس دینے کے لیے نہیں ہے۔ حد ہو گئی، چھینکے کھانے اور گھر والوں کی غیبتوں کے علاوہ کس چیز پر بات ہوتی ہے تمہاری اپنی چھینکوں سے۔“ اس نے ایک دوا اور کیا۔

یہ انیلا کی دو سیلیوں فرخندہ اور نمو کی طرف اشارہ تھا جن سے وہ ہر چھوٹی بڑی بات ڈسکس کرتی تھی۔

انیلا کے اندر طوفان اٹھ رہا تھا۔ دس بندہ منٹ بولنے کے بعد عدنان تن فن کرنا گھر سے نکل گیا، بچے اسکول سے آئے تو اس نے ان کو کھانا کھلایا اور چھوٹے بیٹے کی انگلی پکڑ کر گھر سے نکل گئی۔

بے مقصد پھرتے پھرتے اس نے میکے کا رخ کیا۔ ان سات سالوں میں شوہر سے پوچھے بغیر یہ سلا سکے کا دورہ تھا۔ سیل فون وہ جاں بوجھ کر ساتھ نہیں لے کر آئی تھی۔ نکلنے وقت بس غصہ بھرے جذبات تھے۔ اب ایک دم اسے پریشانی لاحق ہو گئی۔ شوہر سے رنجش تھی بچوں کو تو کچھ بتا کر آنا چاہیے تھا۔ مغرب

کی نماز کے بعد نکلنے کو تھی کہ عدنان کی گاڑی کا ہارن بجائی دیا۔

اس نے لمبا سانس لے کر اپنے آپ کو نارمل کرنا چاہا۔ کتنا مشکل ہے اپنے آپ کو سنبھالنا اور سمیٹنا۔ اس نے بے بسی سے سوچا بلاشبہ وہ بہترین بیٹی بہترین بہو بہترین نند اور بہترین بھانجی ہے۔ لیکن بیوی۔ بہترین تو کیا بہتر بر بھی بات نہ بن پائے۔

اندر ساس کے پاس دو چار منٹ بیٹھ کے عدنان نے ساس کو اللہ حافظ کہہ کر اجازت لی۔ گاڑی کی چابی اٹھائی، نیلا بھی خاموشی سے سوئے بچے کو گود میں اٹھائے پیچھے چل دی۔ سارا سفر خاموشی میں کٹا۔

گھر پہنچتے ہی بچوں نے ”امی ابھوک لگی ہے“ کا شور مچایا۔ اس نے دوپہر والا کھانا گرم کیا۔ چپاتیاں بنائیں اور میز پر کھانا لگا دیا۔

عدنان کو چائے کا کپ کھانے کے بعد لازمی چاہیے ہوتا تھا۔ ساس پین میں پانی ڈال کر اس نے دودھ لینے کے لیے فریج کا دروازہ کھولنا چاہا۔

لف۔ ایک اور بل۔ فریج کے ساتھ پڑی بڑی بل پر سجا ہوا تھا۔ دودھ لینے کا اسے یاد نہ رہا اس نے بل اٹھایا۔ سوئی گیس کا بل تھا۔ ”سات ہزار چار سو پچیس روپے۔“

اسے یقین نہ آیا اس نے دبا دبا بل پر نظر ڈالی۔

”اف۔“ وہ وہیں قریب پڑے صوفے پر دم سے بیٹھ گئی۔ تین ہزار بل پر یہ بل تھا تب تو خدا جلے کیا معاملہ ہو گا۔ وہ بری طرح سسم گئی۔

کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

بل پر نظر ڈالی۔ کل اتوار تھا۔ اور پیر آخری تاریخ تھی ادائیگی کی۔ اس کا مطلب ہے ”آج کا کام کل پر ڈالنے کی حماقت نہیں کرنی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ کیسے بتائے؟ کسی بچے کے ذریعے عدنان تک بھجوائے یا خود بات کرنے کا آغاز کرے۔ کس طرح پورا مہینہ بچوں کی وجہ سے گیزر میٹر اور موسم سرا کی سوغات کے لیے چولہا غریب کے دل کی طرح دھڑ دھڑ

چلتی رہا ہے۔
 "میں اچانک کا برتن جل رہا ہے" آواز آرہی ہے۔
 "اس کی بیٹی چلائی۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ برتن
 میں موجود پانی خشک ہو کر جل چکا تھا۔ برتن سے دھواں
 اٹھ رہا تھا۔
 (کاش اس کے دل سے اٹھنے والا دھواں بھی کسی کو

نظر آجائے)

بلاخرہ پائے کوڑے کی طرح اسے ترکیب سوجھی
 اس نے نئے سرے سے چائے کا پانی رکھا چائے کا
 کپ فٹسری میں رکھا۔ ساتھ ہی کسی دھڑک کی طرح
 بل بھی رکھ کر چائے میاں کے آگے رکھ دی۔ برتن
 اٹھانے کے بدلے اسے وہاں سے کھکنے میں عافیت ہی
 نظر آئی۔

کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے اپنی سی نظر میاں
 کے چہرے پر ڈالی۔ کوئی تیوری نہ مل۔ بل دیکھ کر اس
 نے ایک طرف رکھ رکھا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے بچوں کا ہوم ورک
 چیک کیا۔ برتن سمیٹے بچوں کے یونیفارم استری کرنے
 اور لوح و حجر کے کاموں میں اس نے رات کے دس
 بجائے۔ کاش۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔
 آج رات میاں کے کمرے میں جانے کے بل صراط پر
 سے گزرتا ہے۔

اے کاش! وہ خواہتا وہ بچوں کے کمرے میں
 مصروف دکھائی دیتی رہی۔ سدھن نے ایک دفعہ جھانک
 کر دیکھا۔ کہا کچھ نہیں۔

اور جب وہ بچوں کے ساتھ سونے کے لیے لیٹ
 گئی تھی اس کے بل فون پر مہج ٹون ہوئی۔ اس
 نے جلدی سے ان باکس چیک کیا۔ عدی۔ عدنان کا
 تک۔ نیمہ۔ مہج میں ایک روٹی کرائی، منہ بسورتی
 سمبل تھی۔ آگے لکھا تھا سوری آگینے۔ اور کوئی
 وقت ہوتا تو اس "آگینے" والے ٹائٹل پر وہ گردن
 اکڑاتی لہراتی۔ خوشی سے بے حال ہو جاتی۔ یہ آگینے کا
 ٹائٹل اسے پہلی دفعہ نہیں ملا تھا۔ کئی دفعہ مل چکا تھا۔

شروع میں اسے وہ ایک نام ہی سمجھی جیسے اشکبار
 شکار۔ آگینے پھر اس کی نظروں سے رسول اللہ کی
 حدیث گزری، عورتیں تو نازک آگینے میں امن کی قدر
 کر وہ حیران ہوتی۔ اب اس قدر احساس تھا عدنان کو
 اس کی عزت نفس کا جب بھی وہ دل میں اس کے لیے
 خفگی لاتی یا رجش ہوتی، دور دم سے آکر کہتا۔
 "میری آگینے"

وہ شامت ہو جاتی۔ ٹھیک ہے مردوں کی کھل مونی
 ہوتی ہے مگر دل تو احساس رکھتا ہے۔ اور بات ہے ہی
 صرف احساس کی۔ لیکن آج وہ حالت اطمینان میں
 نہیں بحالت مجبوری تھی۔ انھنا ہی تھا درتہ۔ بخشنے
 کا سامان کہاں سے ہوتا۔ ہائے ری عورت۔ اس نے
 نئی آنکاش کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔ پہلے بل نے
 دلایا تھا یہ والا بلالائے گایا کیا کرے گا۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ بیڈ روم میں داخل
 ہوئی۔ بیڈ پر چنبیلی موتیا کے بچے بڑے تھے۔
 عدنان نے اسے دیکھا۔ اور گجرا اٹھایا۔

وہاں کھڑی تھی۔ اے بے رنج جسم کے ساتھ۔!!
 "آؤ بیٹھو۔" عدنان نے اسے بازو سے پکڑ کر پاس
 بٹھایا۔

"مجھے پتا ہے تم بہت خفا ہو مجھ سے ہونا بھی
 چاہیے۔" بہت نرم لہجے میں اس نے معذرت بھی
 پیش کر دی۔

دونوں باتوں میں منہ چپا کر وہ بے اختیار رو پڑی۔
 "میں تھک گئی ہوں۔ بہت مشکل ہے میرے
 لیے" اس کے آنسو رخسار بھگو رہے تھے۔ "کہہ
 لیں سوئی گیس کے بل پر جو کہتا ہے" وہ روتے روتے
 بولی۔

"کیوں کہوں؟" اس نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔
 "کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئی؟ "ان سات سالوں
 میں میں آپ کو سمجھ نہیں سکی۔ کہل تو بیوی کو ایک
 شاپنگ سینٹر سے پچیس ہزار کی شاپنگ کیواری اور
 کہیں تین ہزار کے بل پر اس کی عزت نفس کے

چیتھڑے اڑا دے۔“

”واقعی تم مجھے سمجھی ہی نہیں ان سات سالوں میں۔“ عدنان نے اس کے آنسو پونچھے۔ ”تم اب تک یہ ہی نہیں سمجھ سکیں مجھے کیا اچھا لگتا ہے اور کیا اچھا نہیں لگتا۔؟ عدنان نے دیکھتے دیکھتے کہا۔

”ابھی چاہتا ہوں میں گھر سے نکلوں تو دنیا کی کوئی عورت کتنی ہی بن سنور کر سامنے کیوں نہ آئے میری توجہ نہ دینے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں میری

پوری سب سے اچھی لگے جو پہننا اور ڈھنسا چاہے اسے کھلی آزادی ہے۔ ویسے بھی شوہر کے لیے زیب و زینت پسند یہ ہے اور سبکی کیس کے بل پر میں اس لیے نہیں بھڑکا کہ مجھے پتا ہے جو لہا کھانے کے لیے چلا ہو گا۔ بیٹر بھی کہہ کر مرنے کے لیے استہلال ہوا ہو گا۔ یہ تو میرے آقا کا بھی فرما ہے انسان کتنا ہے میرا مال میرا مال، خلا تک مال بس اس کا وہی ہے جو کھلیا پہن اور ڈھنسا لیا اور آگے بھیج دیا۔ باقی سب تو اس کے وارثوں کا ہے۔ اس لیے میری اینٹا شنزادی! اٹھانے پینے پینے اور ڈھنسنے پر خرچا کرتا مجھے پسند ہے۔ ہاں اللہ قبل کرے اس کی توفیق سے آگے کا بھی کچھ نہ کچھ سامان کرتا ہی ہوں۔ باقی رہا نیلی فون کاٹل وہ شاید تمہارے نوٹ نہیں کیا وہ ہزار پانچ سو روپے صرف لوکل کالز کے تھے۔ ان میں صرف اور صرف بے وقوفی باتیں ہوتی ہوں گی، موسم پر تبصرے ہوتے ہوں گے، کپڑوں کے ڈیزائن پر نٹ پر سیر حاصل گفتگو ہوئی ہوگی۔ گھریلو حالات ”ٹوسکس“ کرنے کا خوب صورت ایبل لگا کر غیبتیں، چغلیاں بھی ہوتی ہوں گی۔ تو میں نہیں چاہتا۔“

ایک دم ہی عدنان کی آواز بھرا گئی۔ اینٹا نے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی جھلک کر رہا تھا۔

”میں نہیں چاہتا۔“ عدنان نے شہادت کی انگلی کی پور سے آنکھوں کا گیلیا پانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں چاہتا کہ ان بے معنی لفظوں پر جن کی اللہ کے ہاں روزِ حشر کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔ میری

نیوی کپڑ میں آجائے۔ تمہیں پتا ہے ہاں نیلو اس کی کپڑ کتنی شدید ہے۔“ بتاؤ میں کیا جواب دوں گا؟ جب وہ مجھ سے پوچھتے گا کہ عدنان کی کھلی فضا کی گمانہ کے کاموں میں کیوں اڑائی؟؟؟

عدنان کا لہجہ تسبیح اور آواز میں بندش تھی۔ اس نے کہا۔ ”اینٹا اس لیے میں نا تو لب نہیں جلتے دیتا“ پٹکھا کمرے سے نکلے ہوئے بند کر دیتا ہوں پانی کا ایک قطرہ ضائع کرنا مجھے گوارا نہیں۔ بات کم خرچے بچت یا بل کی زیادتی کی نہیں بات صرف اور صرف نعمتوں کی پاز پر اس کی ہے۔ میں اس کی اپنے اندر بہت نہیں پاتا۔ تم تو پھر مصنف نازک ہو تم جواب دے سکو گی؟“

عدنان نے اینٹا سے سوال کیا۔

اینٹا گم صم اسے دیکھ رہی تھی۔!!

واقعی سات سالوں میں اسے وہ سمجھ نہیں پائی تھی؟ اس نے سوچا۔ کاش اس کے بس میں ہو تو مخلوق میں سے کس کو دلی بناتا ہے تو اس لمحہ وہ اپنے شوہر کو۔ منصب ولایت پر نامزد کر دے۔ یہ عہدہ صرف جب وہ دستار کے لیے ہی تو مخصوص نہیں!! غلطی پر اور غلطی بھی کیل۔ سخت لہجے میں چند کلمے پر اظہارِ ندامت، گجروں کی صورت میں تلانی۔ دل جوئی۔ دنیا کا ہی نہیں آخرت کا بھی ساتھ چاہنے کے لیے ایک ایک بل اور ایک ایک عمل پر نظر رکھنا کیا ولایت اس سے بڑھ کر ہوتی ہے؟

اس کی تمام غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں۔ بعید پایا تھا سرما زامی رقص کی کیفیت میں سرشار اس نے اپنا سر اپنے شوہر کے شانے سے ٹکا دیا۔ چند لمحے قبل حد درجہ معصوب اسے تھا شامِ محبوب لگ رہا تھا۔



حاکمِ درد

رہے تھے، لیکن درد میں وہ شدت نہ رہی تھی۔ سوئی جاگتی کیفیت میں اس نے اپنے بے وزن وجود کو ہوا میں اٹھتا محسوس کیا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ پوری طاقت سے کھرے کے ڈھیر پہ پھینک دیا گیا تھا۔
اس کا سر بڑی زور سے کسی چیز سے ٹکرایا تھا اور لبوں سے بے اختیار اک کراہ نکلی تھی۔ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ ایک آخری احساس بڑی شدت سے اس کے اندر جاگتا تھا۔ نقصن کا گریہ احساس۔
نقصن۔ جو اس کے ناک اور منہ میں کھنسنے لگا تھا اس کے شان دار وجود سے لٹنے لگا تھا۔ مگر

زمین پہ مگر اس کا وجود ٹھوکر کی زو میں تھا۔ جو اس کے جسم پہ اندھا دھند اور انتہائی بے رحمی سے لگائی جا رہی تھی۔ وہ تڑپ رہا تھا، چیخ رہا تھا، لیکن وہاں کوئی اس کا مددگار نہ تھا۔ درد کی شدت ہر ضرب پہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے برآمد ڈکڑے خاک اور خون سے اٹنے لگے تھے۔ جبکہ وجہ چرے کے چٹکے اور مغرور خدوخل، آنسوؤں، خون اور گرد کے پیچھے چھپ گئے تھے۔
رفتہ رفتہ اس کا جسم ٹپل ہونے لگا تھا۔ مزاحمت دم توڑتی جا رہی تھی۔ لن کے جوڑے لب بھی اسے رگید

مکمل ناول





سبز بیلیوں سے ڈھکے خوب صورت سے بچکے کے سیاہ گٹ پر ہر ادب سے چوکیدار نے جانے بچانے ہارن مستعدی سے آگے بڑھ کے گٹ کھولا تھا اور باہر ٹکھڑ کڑی گاڑی سبک رفتاری سے اندر داخل ہوئی۔

میدھی سامنے پورج میں جا کھڑی ہوئی تھی۔
”سلام بی بی۔“ وہ پرس، الپ الپ اور دوائیں اٹھائے باہر نکل کر گٹ بند کرتے دل شیر نے پلٹ کے اسے سلام کیا۔

”وہیکم السلام۔“ کسے بول شیر؟“ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ لیے اپنے مخصوص نرم لہجے میں استفسار کیا۔

”اللہ کا شکر ہے بی بی۔“ جواباً وہ مسکرا کر بولا تو ان اثبات میں سر ہلاتی، ثمارت کے داخلی دروازے کی جانب چلی آئی، لیکن اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ دروازے کو چھو جاتے دروازہ اندر سے کھل گیا۔
”سلام علیکم۔“ مہاجران کے شفیق چہرے پر یہ نظر پڑتے ہی اس کے لب خود بخود مسکرا دے۔

”وہیکم السلام۔“ آج اتنی دیر کیوں ہو گئی تھیں؟“ دروازہ بند کرتے وہ اس کے پیچھے چلی آئی تھیں۔ ان کے منکر لہجے نے مہاجران کی مسکراہٹ گہری کر دی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا اسلام کا حق پہنچ کر تھوڑا سا خود بھی قریب ہی گری گئی تھی۔

”جس آج پر پہل نے اچانک مینٹک کے لیے بلایا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔“ اس نے جواب دیتے ہوئے پاس بڑا دواؤں والا شاپر اٹھا کر ان کی جانب بڑھایا۔
”آپ کی دوائیں۔“

”کیا ضرورت تھی آج لانے کی۔ کل آتیا تھیں۔“ وہ شاپر لیتے ہوئے خفگی سے بولیں۔ مہر مسکراتے ہوئے جھک کر بیٹھل اتارنے لگی۔

”مہاجران میں کچھ کھلیا تھا یا نہیں؟“ ان کے سوال پر اس کا جھکا سر غمی میں مل گیا۔
”صرف دواؤں کا تھا۔“

”تو بیٹا لوہ بھی نہ تھیں۔“ خواہ مخواہ زحمت کی۔“ وہ سیدھی ہوئی تو نظریں ان کے خفا چہرے سے جا ٹکرائیں۔ ایسے ٹھنڈے ٹھنڈے انداز میں کلاس لینا ان کا ہی خاصا تھا۔ مہر نے بے اختیار اپنی گہری ہوتی مسکراہٹ کا کھانا کھوٹا۔

”پاپا نے صبح اپنی شوگر چیک کی تھی؟“ اس کے استفسار نے انجم بیگم کے چہرے پر پچھائی خفگی میں اضافہ کر دیا۔

”ایک سوائے اپنے سب کی فکر ہے۔“ ان کی قہقہائی نظروں پر اس نے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

”میری فکر کرنے کے لیے آپ جو ہیں۔“ وہ لاڈ سے بولی تو انجم بے اختیار اک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئیں۔

”میں کھانا لگواتی ہوں۔ تم فریٹس ہو جاؤ۔“ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولیں تو مہراجان کا کھل چومتی اٹھ کر اپنی چیریں سینے لگی۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو کر ڈائننگ ٹیبل پر آئی تو خنجر بیٹھی انجم بیگم نے اس کے آگے چاولوں کی ڈش بڑھائی۔

”مہاجران تھوڑی دیر پہلے زب کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھی کہ آج جانکے کے سرسوال والوں کا فون آیا تھا۔“ اس جیسے کو ممکنہ کافنکشن رکھنا چاہ رہے ہیں۔“ ان کی بات پر مہراجان کا کھانا ہاتھ یک لخت ساکت ہو گیا۔

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ وہ لہجے کا توقف کیے بنا سپاٹ لہجے میں بولی تو انجم بیگم کی نظریں اس کے چہرے پر جا ٹھہریں۔

”بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ تم جانتی ہو کہ تمہارا وہاں جانا کتنا ضروری ہے۔“ انہوں نے دھیسے لہجے میں اسے ٹوکا۔

”مگر مہاجران! میں اس فحصر۔“
”وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔“ انہوں نے اس کی

بات کاٹے۔

سے سوال کیا کیا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔
 ”جی۔ ہاں۔ میرا دوست ہے۔ سب ٹھیک تو
 ہے؟“ اس نے تشویش سے پوچھا۔

”معذور نہیں ہیں۔“

آپ پلیر نہیں جا
رہے

”کیا یہ“ میں سے کسی سے والی اطلاع نے لفظ

مرواس کے اتھ پاؤں پھلا رہے۔

”اگلے میں۔ میں قح رہا ہوں۔ آپ کس لیونٹی سینٹر سے بات کر رہی ہیں؟“ خود کو سنجاتے ہوئے اس نے

یہ سب بات کر رہی ہیں: خود کو سنبھالنے ہوئے اس نے دریافت کیا اور پھر وہ مری جانب کا جواب من کر

س نے آنا "فانا" گاڑی مطلوبہ سینٹر کی جانب موڑ

”بہن کی منگنی تک تو لازماً لوٹ آئے گا۔“ اس

نے اتمہ میں پکڑا لیچ واپس دُش میں بٹھا۔

”مشکل ہے۔ زیب بیاری کبھی کہ کسی فارن کمپنی

سے ذیل ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ شاید مرتبہ کر سکا۔

لڑنے کا۔ اس کے برعکس لا محمل طور پر پر سکون

”اور اگر کیا تو؟“

”تو آجائے ہم کیا اس سے ڈرتے ہیں؟“ اب

کے انہوں نے غلطی سے اسے دیکھا تو مہر کے چہرے پر

بے بسی پھیل گئی۔

”اگر مہاجن۔“

”گوئی اگر نکر نہیں۔ تمہارا اس معاملے میں خود کو مضبوط کرنا ہے۔ جو ضروری ہو وہ کرنا ہے۔“

مقبوضہ کرنا ہے جد ضروری ہے مہربانہ زندگی بہت
شکل ہو جائے گی بیٹا! انہوں نے دھڑے سے

سکھیا ترجمہ کر کے ان کے لیے لکھتا ہے۔

بجھاتے ہوئے اس کے ہاتھ۔ اپنا ہاتھ دھوا کر صبر ہے۔
 ختم ہوا اک بوجھل ہنس، سلیخ کے رگڑے

حیاء الہیہ جو اس سلسلے میں رہی۔

1950年11月1日

تیویازک میں ظلوئے ہونے والی یہ ایک معمول کی

نہ ملے گی۔ مارک نے اپنی بیوی جوزین کو روک دیا۔

سب گڑبی برصا نے کو تھا کہ اس کا سوا کل رنج اٹھلے۔

میان سے گاڑی ایک طرف کرتے ہوئے اس نے

نت میں اپنا سیل فون جیب سے نکالا جس کی اسکرین

لوئی انجائیمبر جگر رہا تھا۔

”جیلو! کل ریسو کرتے ہوئے اس نے ایک نظر

”نہیں مار کر دیتا کہ مرے“؟“ ”مرے“

”سٹر مارل بات کر رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے کسی خاتون کا آواز آیا تو وہ نے اختیار چک گیا۔

”جی۔“

”میں کیونٹی ہیلتھ کیئر سینٹر سے بات کر رہی ہوں۔

پس کسی سیم تابی شخص کو جانتے ہیں؟" دو مری جانب

...

۱۱۱۱ شعلہ شبر

1. *Chlorophyll a* (Chl a) is the primary photosynthetic pigment in most plants and algae. It is a green pigment that absorbs light energy in the blue and red regions of the visible spectrum. Chl a is essential for the light-dependent reactions of photosynthesis, where it converts light energy into chemical energy in the form of ATP and NADPH.

میں نے ایک بار

حیثیت ملی محرم

سمیر احمد



قیمت - 300/- روپے

کتابخانه عمومی - ۱۱۷ - مسجد جامع - تهران

جانب کھلا۔
”ہی کیا بات ہوئی بھلا، آپ لوگوں نے انہیں
اگلے جسے لے لیے کیوں نہیں کہا۔“

”یہاں اگلے سینے پر ہاتھ لگا کر دیکھو۔“
تمہاری ساری ساری باتیں سن کر وہ چاروں نے
ان کے پاس۔ انہوں نے والی منہ کا
حوالہ دیا تو جانش کو غصہ آگیا۔

”اور جو میرا بھائی یہاں نہیں ہے؟“
”جاشی تمہک کہہ رہی ہے امی! احسن بھائی کے بغیر
بھلا کیا اچھا لگے گا۔“ نور نے بڑی ہنس کی تائید کی۔
زب اب گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔
”مجبوری ہے بیٹا۔ اب ہم انہیں منع تو نہیں
کر سکتے تھے تاہم پھر تمہارے ڈیڈی نے حنا کے
مشورے سے ہی ہامی بھری ہے۔“

”بھائی نے تو ساری بات سن کے یہی کہنا تھا مگر میں
ان کے بغیر یہ فنکشن نہیں کرنے والی۔“ جانش قلعی
لہجے میں بولی۔

”تم لیا کرو بھائی! کہو کہ وہ ہر دن میں نئے نئے
شام تک یہاں پہنچ جائیں۔“ فنکشن اینڈ کریز اور پھر
اگلے دن واپس چلے جائیں۔“ نور نے ات دیکھتے
ہوئے مشورہ دیا تو زب بیگم کا مشین دل یک نعت
پریشان ہو گیا۔

”کوئی ضرورت نہیں اسے پاگلوں کی طرح یہاں
وہاں دوڑانے کی۔ ہم نے کون سا کوئی بہت بڑا فنکشن
کرنا ہے ایک جھولی سی تقریب ہوئی ہے اور بس۔“
”تھیں امی۔“

”فصل کی بحث مت کرو جانش۔ حنا اگر مجھے
بیک فاسٹ ہو گیا تو پہنچ جائے گا۔ وہ کہہ چکا ہے تمہارے
ڈیڈی سے۔“ زب قطعیت سے بولیں تو دونوں
بہنیں ایک دوسرے کو دیکھتی خاموش ہو گئیں۔

حیران پریشان چٹھے مارک نے نظریں اٹھاتے
ہوئے ایک بار پھر شیشے کی دیوار کے پار بیٹوں میں

جکڑے اور شیشوں میں گھرے وجود کی جانب دیکھا اور
اس کا ذہن نئے سرے سے ماؤف ہونے لگا۔ وہ یعنی
سیم اور نیویارک کے ایک مخموش بدنام زمانہ علاقے
کے کچرے کے ڈھیر پر اپنا ٹیلا ہونٹ دانٹوں تلے
بند۔ وہ نئی ہی در خالی اللہ ہی کے عالم میں اسے نکلتا
رہا اور پھر اس نے تمک کر بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔

کچھ دیر تک اپنی گاڑی اسپتال کی جانب دوڑاتے
ہوئے اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ
وہاں اسے سیم اس درجہ بری حالت میں ملے گا۔ اسے
آئی سی یو میں دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل
گئی تھی لیکن جب وہاں کی انتظامیہ کے ذریعے اسے
وہاں پہنچانے والی خاتون کا بیان سننے کو ملتا تھا تب تو وہ صبح
میں مارے حیرت کے سکتے میں آگیا تھا اور اس کی یہ بے
یعنی ماحول پر قرار تھی۔

وہ جتنی بار نظر اٹھا کر اس کے بے سدھ وجود کی
طرف دیکھتا، اتنی ہی بار نئے سرے سے حیرت کے
سندر میں غوطہ زن ہو جاتا۔ اس وقت بھی اس کے
کانوں میں ڈاکٹری آواز گونج رہی تھی۔ جب انہوں
نے پہلے پہل پوری بات اس کے گوش گزار کی تھی۔

”انہیں یہاں ایک خاتون لے کر آئی تھیں۔ یہ
انہیں آج صبح اپنے گھر کی پچھلی گلی میں موجود کچرے
کے ڈھیر کے درمیان کوڑے کے ڈھیر پر انتہائی زخمی
حالت میں ملے تھے۔ ان کا کافی سے زانہ خون بہہ چکا
تھا۔ اس لیے ان کی حالت خاصی نازک تھی۔ ہم نے
انہیں ٹریمنٹ دینے کے بعد ان کے کپڑوں کی تلاش
لی تھی۔ تب ہمیں ان کی جیب سے ایک واحد ورڈنگ
کارڈ ملا تھا جس پر ”مارک اینڈ سیم“ پرائیویٹ لمیٹڈ لکھا
ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ چونکہ سیم نام کا ایک ٹیو
(TATTOO) موجود تھا اس لیے ہم سمجھ گئے تھے
کہ یہ کارڈ ان ہی کے آفس کا ہے۔ اس کارڈ پر لکھے نمبر
سے ہی ہم نے آپ سے رابطہ کیا تھا اور صد شکر کہ
آپ ہمیں وقت پر مل گئے۔ ورنہ تو یہ کیس مزید الجھ
جاتا۔“ اور آنکھیں پھاڑے بیٹھے مارک کا منہ کھلا کا
نکلا رہ گیا تھا۔ اس تفصیل نے حقیقت ”اس کی بولنے

کی صلاحیت سلب کر لی تھی۔

”ہم نے روڈز کے مطابق ان کے بارے میں پولیس کو انکار کر دیا ہے۔ وہ یہاں کچھ ہی دیر میں پہنچنے والی ہے۔“ ڈاکٹر کی اگلی اطلاع یہ رہی کہ پولیس کے پاس اس کے سر کو اثبات میں ہوا تھا۔

”کیا آپ جانتے ہیں مسٹر مارک! کہ یہ اس علاقے میں کیا کرتے تھے؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ تو اس کا سر میکانیکی انداز میں نفی میں مل گیا۔

”مجھے مجھے کچھ اندازہ نہیں۔“ اس کی بات پر ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔

”اس کا مطلب ہے کہ اصل صورت حال ان کے ہوش میں آنے کے بعد ہی واضح ہوگی۔“ انہوں نے پر سوچ لیجے میں کہا تو اس کے شل ہوتے ذہن میں سیم کی حالت کا احساس جاگا۔

”کب تک ہوش میں آجائے گا ڈاکٹر؟“
”کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بلڈ ٹنگ کی زیادتی کی وجہ سے اگلے چوبیس گھنٹے خاصے کڑی شکل (Critical) میں رہے۔“

”کوئی اندرونی چوٹیں تو نہیں ہیں نا؟“ اس نے پریشانی سے سوال کیا۔

”سر کے پچھلے حصے میں خاصی گہری چوٹ آئی ہے، لیکن اس کے ذریعے پتا چلا ہے کہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ زخم تو کافی ہیں، لیکن شکر ہے کہ لور کوئی سیریس انجری نہیں ہوئی۔“ ڈاکٹر کی بات پر اس کے دل کو تھوڑی تسلی ہوئی۔

”میں کاسیل فون والٹ ڈرائیونگ لائسنس؟“
”کچھ بھی ان کے پاس نہیں تھا۔“ ڈاکٹر نے رسالہ سے جواب دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا، ان کا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل آیا۔ جوزفین کو اس کے آفس میں فون کر کے مطلع کرنے کے بعد اس نے آنے والے پولیس آفیسرز کو اپنا بیان دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد لائن ہی سوچوں کا ایک سلسلہ تھا جس نے اس کے ذہن کو پرانگندہ کر دیا تھا۔

ان میں سب سے عجیب اور تلخ احساس اس کا بچہ کے ڈھیر پایا جانا تھا۔ یہ سب کیسے ہوا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ اور سب سے بڑی بات وہ کل رات اس علاقے میں کیا کر رہا تھا؟ یہ وہ سوالات تھے جنہوں نے اس کے اندر ادھم مچا رکھا تھا، مگر اب اس کے پاس سوائے صبر اور انتظار کے دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔



مگنی کی تقریب کو زیب بیگم اور صغیر صاحب نے محدود پیمانے تک رکھنے کی کالی کوشش کی تھی، مگر نہ کرنے کے باوجود سب ہی لوازمات اکٹھے ہوتے چلے گئے تھے۔ نتیجتاً ”جمعے کی شام تک“ کا منی رول میں رنگ و نور کی بھرپور تقریب منعقد ہو گئی تھی جسے دیکھ کر جائش کا موڈ مزید خراب ہو گیا تھا۔ وہ صبح سے کتنی بار جنین سے رابطے کی کوشش کر چکی تھی، مگر جناب نے ایسی کون سی مصروفیت تھی کہ اس کا فون تک نہیں اٹھا رہا تھا۔

جائش کی فرمائش پر اسے مراد نور نے مل کر گھر ہی تیار کیا تھا۔ دو دو گلابی کاپی الی سوٹ میں وہ کھلی کھلی سی بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی تیاری سے فراغت پائے کے مہراپے کپڑے اٹھائے، دھواں روم میں گھس گئی تھی۔

شاور لینے کے بعد اس نے اپنے اسٹیمپ میں کئی چمک دار باتوں کو بلوڈرائی کر کے کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مناسب میک اپ اور نازک سی ڈائمنڈ جیوری پہننے کے بعد وہ شیفون کے برل آف وائٹ اور ڈل گولڈن سوٹ میں نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

سمانوں کی آمد کے ساتھ ہر طرف پیملی رونق میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مگنی کی رسم کی ادائیگی کے لیے جائش کو لا کے اس کے ہونے والے منگیتر کے پہلو میں بٹھایا گیا تو محفل کو گوا چار چاند لگ گئے۔ رسم کی ادائیگی کے بعد تصویروں کا سلسلہ چل نکلا جس کے بعد سمانوں کے لیے آج کیا کیلنڈر لگا دیا گیا تھا۔

کر بھی اپنی زندگی کی کتاب سے بچاؤ کر الگ نہیں کر سکتی تھی۔ اس شخص نے رشتوں پہ اعتبار کے لائق نہ چھوڑا تھا۔

وہ اس بل بیٹہ کی طرح خود کو بہت بے بس اور کمزور محسوس کر رہی تھی۔ جس کے پاس کوئی راہ فرار نہ تھی۔ ذہن تھا کہ ابھٹا چلا جا رہا تھا۔ تب ہی باہر سے حنا کے ہنسنے اور نورہ اور جائشہ کی حیرت سے بھرپور خوش گوار چکاریں سنائی دی تھیں۔ یقیناً وہ اندر جائشہ کے کمرے میں آچکا تھا اور بھائی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کے دونوں خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔

باہر چمچے ہنگامے نے اس کے اندر دکھ کی نئی لہر پیدا کر دی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی نظروں سے خود کو چھانے کے لیے وہ اس کمرے کی تنہائی میں آئینہ بھی یا پھر ہر مردی وہ ہرے معیار کا قائل ہوتا ہے اپنی بہنوں بیٹیوں کے لیے کچھ اور۔ اور دوسروں کی عزتوں کے لیے کچھ اور۔

موبائل کی اچانک بیل نے اس کی رخ سوجوں کو بکھیر دیا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے پرس میں رکھافون نکالا۔ جس کی اسکرین پہ انجم بیگم کا نام دیکھ کے اس کے لبوں پہ زخم خوردہ مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ کتنی کے چند ناموں کے سوا بھلا اس کی فکر کرنے والا تھا ہی کون؟

”کہاں ہو تم صرا؟ میں اور زیب کب سے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔“ اس کی ”جی ماما“ کے جواب میں وہ پریشانی سے بولیں تو وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

”میں اندر نورہ کے کمرے میں ہوں۔“

”وہاں اکیلی کیا کر رہی ہو بیٹا۔ باہر آ کے سب کے درمیان بیٹھو۔“ ان کے رسلن سے کہنے پہ وہ چڑھی گئی۔

”پلیز ماما جان! میں اس فضول شخص کی نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔“ اس کی بات پہ انجم نے بھر کو خاموش ہو گئیں۔

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ وہ لانا“ پہنچے گا۔“

جنجلاہٹ نے اسے غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔

زیب بیگم کی بدایت یہ مراد نورہ، جائشہ کو اندر لے آئی تھیں۔ جس میں اس کی فرزند زاور خاندان کی دیگر لڑکیوں نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ اندر باہر ہر طرف مسکراہٹوں اور خوش چہیوں کا سلسلہ تھا۔ مگر بھی جائشہ کی دونوں ہندوں کے ساتھ لان میں کھڑی باتوں میں مصروف تھی جب انجم اور زیب اس کے پاس چلی آئیں۔ انہیں آنا دیکھ کر سر دونوں لڑکیوں سے معذرت کرتی ہیں اور خالہ کی جانب بڑھی۔

”بیٹا! تم ایسا کرو اندر جاؤ۔ اور نجیب سے کہہ کر میرے کمرے میں رکھے مہمانوں کے تحفے باہر لے آؤ۔“ زیب بیگم کی بات پہ وہ لثبات میں سر ہلائی اندر چلی دی۔

نجیب (ملازم) سے سارے تحائف اٹھوانے کے بعد وہ اسے ساتھ لیے واپس لان میں چلی تو وہاں خوش گواری پہلچل دیکھ کے ایک بل کو الجھ سی گئی، لیکن جوں ہی اس کی نظر جائشہ کے سرالوں سے پرپاک انداز میں ملے حنا سے نکرائی اس کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھر اور قدم غیرارادی طور پہ ساکت ہو گئے۔ وہ یوں رہتا ہے پہنچ جاتے گا اس بات کا کسی کو انداز نہ تھا۔

”کیا بیٹی؟ یہ کہاں رکھوں؟“ اسے اپنی جگہ پہ جما دیکھ کے حیرت اٹھائے کھڑے نجیب نے آہستگی سے سوال کیا تو وہ خود کو سنبھالتی، سامنے لگے صوفوں کے درمیان میں رسمی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”وہاں رکھ دو۔ اور امی کو بتا دو۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ ایک لمبے کاؤتف کیے ہالٹ کر تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھی۔

وہ اس شخص کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے جائشہ کے کمرے میں جانے کے بجائے سیدھا نورہ کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے غصے میں لب پیچھے بند پہ آکے گریبی گئی تھی۔

یہ شخص اس کی زندگی کا وہ سیاہ باب تھا جسے وہ چاہ

اسے ان حالات تک پہنچانے والے بے انتہا غم
آ رہا تھا۔ لب بٹھکے ہوئے دھیان میں آگے بڑھی تھی
لیکن جوں ہی اس کی نظر سامنے کو اٹھی تھی اس کا دل
دھک سے رہ گیا تھا۔

اس کے مقابل عمارت کی دوسری جانب سے بلیک
ٹوپس میں ملبوس حنا، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ
ڈالے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اسی کی طرف آ رہا
تھا۔

”جانتا تھا کہ مجھے اچانک سامنے پا کر تم یوں فرار کی
راہ اختیار کرو گی، لیکن جان حنا! تم بیٹھ یہ بات بھول
جاتی ہو کہ تمہارے معاملے میں میں ایک سیری آنکھ
بھی رکھتا ہوں اور وہ آنکھ میں بھی بند نہیں کرتی۔“
اس سے محض چند فٹ کے فاصلے پر رکتے ہوئے وہ
کمبیسر لمبے میں کھتا استہزائیہ انداز میں مسکراتا تو مہر کی
ہتھیلیاں پیچ گھسیں۔ وہ اس سے اس درجہ جو کسی کی
امید نہیں رکھتی تھی۔

”پھر کو کیسا لگا میرا سر راز؟ آئی میں دونوں
سر راز؟“ اس کے اڑے اڑے چہرے پر نگاہیں
جمائے وہ حنا اٹھاتے ہوئے بولا۔ مرنے کوئی نظروں
سے اس کے تیر دیکھے اور بنا کوئی جواب دیے پلٹ کر
واپس اندر جاتے دروازے کی جانب بڑھی تھی کہ
اس کی کلائی حنا کی مضبوط گرفت میں آگئی۔
”ہاتھ چھو نہ میرا!“ اشتعال سے پلٹتے ہوئے اس
نے غصے سے حنا کی طرف دیکھا۔

”تمہیں معلوم ہے! تمہاری یہ ضد یہ گریز میری
محبت کو اور بھی ہوا دیتا ہے۔ اتنی ہوا کہ مجھے تم سے ہی
نفرت ہونے لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے تمہیں توڑ موڑ
کے وہاں پھینک دوں۔ جہاں سے تمہارا خیال تک
واپس نہ آئے۔“ لبوں پر یہ زمر خند مسکراہٹ لور
آنکھوں میں عجیب سی برودت لیے اس نے مہر کی کلائی
پر اچانک استارہاؤ برھایا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔
”حنا!“

”کیوں آ رہا ہو جان حنا؟“ اس کے چہرے سے
جھلکتی تکلیف کو دیکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں زیب سے کہتی ہوں کہ وہ
تمہیں ڈرائیور کے ساتھ گھر بھجوا دے۔“
وہ لمبے بھر کے توقف کے بعد نو لیس جلا تک وہ چاہتی
تھیں کہ مہر باہر آئے اور بالکل نارمل فنکشن اینڈ
کریے، مگر ہر کیف وہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں
کر سکتی تھیں۔

”نق سے کہیے گا کہ وہ پورج میں میرا انتظار
کرتے ہیں دس پندرہ منٹ تک باہر آتی ہوں۔“
اس نے ایک نظر دروازے کی جانب دیکھا۔

”ٹھیک ہے، لیکن نکلنے سے پہلے مجھے کل کر دینا۔“
”جی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گھڑی
کی طرف دیکھا۔ رات کے پونے دس ہونے کو تھے۔
فون بند کر کے وہ دروازے کی جانب چلی آئی جس کی
دوسری طرف سے اب بھی پٹنے بولنے کی آوازیں
آ رہی تھیں۔ تقریباً ”دس منٹ بعد باہر سے آتے شور
میں کی واضح ہوئی تو مہر نے آہستگی سے دروازہ کھولتے
ہوئے احتیاط سے باہر جھانکا اور راہداری خالی دیکھ کے
بے اختیار اطمینان بھری سانس لیتی باہر نکل آئی۔

اپنے پیچھے دروازہ بند کرتی وہ تیز قدموں سے داخلی
دروازے کے بجائے راہداری کے دوسرے سرے پر
موجود دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ جو گھر کے عقبی لان
میں کھتا تھا۔ وہاں سے وہ با آسانی کسی کی نظروں میں
آئے بنا گھوم کر پورج تک پہنچ سکتی تھی۔ محتاط انداز
میں دروازہ کھول کے اس نے باہر نکل کر انجم بیگم کو کل
ملائی۔

”مما! میں جا رہی ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ تمہارے پیپا سے میں نے کہہ
دیا ہے کہ تمہارے سر میں شدید درد ہے۔ اس لیے
زیب تمہیں ڈرائیور کے ساتھ گھر بھجوا رہی ہے۔“
ان کے سمجھانے پر مہر نے بنکارا بھرتے ہوئے فون بند
کر دیا۔

اپنے کے درمیان سے یوں چوری چھپے نکلنا اس
کے اندر پرمردگی کے ساتھ غم و غصے کی شدید لہر پھا کر گیا
تھا۔ اسے خود پہ ”اپنی بے بسی پر اور سب سے بڑھ کے“

اور پھر اپنی گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے بے اختیار اس کا سرخ پڑا ہاتھ لیوں سے لگا لیا۔

”بہت بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ اس کی یہ حرکت اتنی اچانک اور اتنی غیر متوقع تھی کہ سر کا پورا وجود سنانے میں آیا لیکن محض لمحے بھر کے لیے۔ اگلے ہی بل اس کے اندر گویا دشت سی بھر گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ کھوٹا کر اس سے پہلے کہ حنا کے چہرے پر اپنا نشان چھوڑنا اس نے ہوا میں ہی سر کا ہاتھ روک لیا۔

”اے ہوں۔ یہ غلطی کبھی مت کرنا۔ ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔“ سرد تعبے میں کہتے ہوئے اس نے جھٹکے کے انداز میں اس کے دونوں ہاتھ چھوڑے تو وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے کھوئی تیزی سے پیچھے ہٹی۔

”حنان قاضی! اپنے اندر کی غلاطی کو اپنی ذات تک محدود رکھو۔“

”الفاظ وہ بولو جن کی چھین کو بعد میں برداشت کر سکو۔ کیونکہ میں اپنی توہین کرنے والوں کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کیا کرتا۔“ اس کی بات پہ سر کے لیوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو جن ان کی ہوا کرتی ہے جن کی کوئی عزت ہو۔ اپنے گھر میں نقب لگانے والے بے ایمان کو تو کوئی لٹیرا بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔“

”کیا شعلہ بیانی ہے بہت خوب!“ اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔

”لگتا ہے خاصی بہت بند حالی مٹی ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ تم اور تمہاری یہ دونوں زمینی جگہاں اگر چاہیں بھی تو تمہیں مجھ سے چھین نہیں سکتیں!“

”تم نے مجھے یا مٹی کس وطن تھا؟“ مہر نے تسخرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ جواب دیا۔ تو حنا ایک بل کو واقعی لہ جواب ہو گیا۔ اس کے چہرے پہ پھیلتی ناگواری مہر کو اندر تک برسکون کر گئی۔

”حنان صاحب! حقیقت آپ کے نہ ماننے سے

بدل نہیں جائے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مہر کی زندگی میں کسی حنا قاضی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ آپ اپنی ہار تسلیم کر لیں اور میرے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ جائیں۔“

”حقیقت تو تمہارے نہ ماننے سے بھی نہیں بدلے گی جان حنا۔ کیونکہ ایک حقیقت تو یہ بھی ہے کہ بے نشان لوگوں کو اتنے بڑے بڑے دعوے زیب نہیں دیتے!“ اتنی کاری ضرب پہ سر کا سارا خون چہرے سے سمٹ گیا تھا۔ ”اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ خود کو خوش گمانی کی اس تصویر اتنی دنیا سے باہر نکال کر ہمیشہ کے لیے میرا ہاتھ تمام لوا ”کٹ ڈار مسکراہٹ لیوں پہ سجائے اس نے اپنا ہاتھ مہر کی جانب پھیلا دیا۔ اس کا ایک ایک لفظ مہر کے اندر چنگاریاں ہی بھر گیا۔

”یہ ہاتھ تھامنے سے بہتر ہے کہ میں نامہروں ہی بے نشان کھڑی رہوں۔ کیونکہ تم میری زندگی کا وہ ماسور ہو حنا قاضی۔ جس نے میرا رشتوں پہ سے اعتبار ہی ختم کر دیا۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں! شدید نفرت!“ اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر جاتے دروازے کی جانب بڑھی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کے قدم دروازے پر کرتے حنا کی سرد آواز نے لحظہ بھر کو اس کی رفتار دھیمی کر دی تھی۔

”نفرت کا یہ اظہار تمہیں بہت مزگازنے کا مہلہ ملی!“ اب دیکھنا میں تمہاری ہر خوش فہمی کی کیسے دھجیاں اڑاتا ہوں۔“ اور مہر کا دل اس کی بات پہ تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا۔

مہر کا رخ کے دروازہ کھول کر اس کی نظروں سے اوچھل ہو گئی تھی۔



تاریک انجمن گلیوں میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے اس نے خوف زدہ نظروں سے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔ اور ان خوفناک بھوکے کتوں کو اپنے پیچھے پوری رفتار سے آنا دیکھ کے اس کا سارا وجود کانپ اٹھا تھا۔ ایک جھٹکے سے رخ موڑتے ہوئے اس نے دشت زدہ

اس کے چہرے پر جمائے نہ ٹھیک لیکن متوجہ نہ تھیں
میں بولا تو نرس نے قہقہہ انداز میں اس کا ہاتھ تھام
لیا۔

”ریلیکس مسٹر سیم۔“

”یہ غلامت مجھے کندہ کر رہی ہے۔ وہ دیکھو۔ وہ
کتے مجھے توجہ کھائیں گے۔ مہ مجھے یہاں سے
نکلے۔ بھاؤ! بھاؤ!“ وہ اچانک بے قابو ہو کے زور زور
سے چلانے لگا۔

اس کے ہسٹریائی انداز نے نرس کے ہاتھ پاؤں پھلا
دیے اس نے سرعت سے آگے بڑھ کے ایمر جنسی
نیل کاٹن دیا۔ چند ہی سیکنڈ میں ڈیولٹی پہ موجود وہ
ڈاکٹر مزاج اسٹاف کے وہاں بھاگے چلے آئے تھے۔ اس
کی بگڑتی حالت کے پیش نظر ڈاکٹر نے اسے سکون
آوراٹیشن لگایا تھا۔ جس کے زیر اثر وہ تھوڑی ہی
دیر میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔



اعصاب شکن شکن مہر کے اندر رات آئی تھی۔ وہ
چپ چاپ آگے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ انجم اور زیب
اس تمام واقعے سے لاعلم تھیں۔ سو اس نے انہیں
لاعلم رکھتے کا ہی فیصلہ کیا تھا۔ کیا فائدہ تھا انہیں بھی
اسے ساتھ چلانے کا۔

گاڑی کی خاموش فضا میں اس کے بے آواز آنسو
قطرہ قطرہ بہتے رہے تھے۔ لیکن اپنے کمرے کی چار
دیواری میں پہنچ کر اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ
پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

حنان نے کچھ بھی تو غلط نہیں کہا تھا۔ کیوں کی طرح
آنکھیں بند کرنے سے بھلا حقیقت تھوڑی بدل جاتی
ہے۔ اور وہ گزشتہ کئی سالوں سے یہی تو کر رہی تھی۔
حالاںکہ وہ جانتی تھی کہ ایسا کرتے ہوئے دنیا کی نظر میں
وہ کتنی ’احسن‘ کتنی قابل رحم لگ رہی تھی۔ مگر پھر
بھی ایسا کر رہی تھی۔ زب کے لیے۔ ماما جان کے
لیے۔ پاپا کے لیے۔ اور شاید اپنے لیے بھی۔ کہ اس
کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

نظروں سے ارد گرد موجود ہندو دواؤں اور کھڑکیوں کو
دیکھتے ہوئے چلا کر مدد کی استدعا کی تھی۔ لیکن اس کی
صدالہ بوریان نگاہوں میں گونج کر واپس لوٹ آئی تھی۔
اس کی تانیں بھاگ بھاگ کر شل ہونے لگی تھیں۔
بے تحاشا بھولتی سانس اور جھل جھل اس کی برداشت کو
آخری حد پہ لے آیا تھا۔ اس کی رفتار کم ہونے لگی
تھی۔ ریل ٹپکاتے ’غزاتے ہوئے کتے قریب آنے لگے
تھے۔ تب ہی اچانک سامنے ایک دروازہ نمودار ہوا
تھا۔ جو اس کی مدد کے لیے کھول دیا گیا تھا۔

کھلا دروازہ دیکھ کے اس کے پست ہوئے وجود میں
نئی جان پڑ گئی تھی۔ وہ دیوانہ وار اپنی پہلی اور شاید
آخری بے گناہ نگاہ کی جانب بھاگنے لگا تھا۔ اس کے قدموں
نے دہلیز کو چھو لیا تھا۔ لیکن۔ اندر جانے کے بجائے
وہ وہاں ساکت ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحوں میں وہ مڑا تھا اور
اس نے دوسری جانب دوڑ لگادی تھی۔ کھلا دروازہ کھلا
ہی رہ گیا تھا۔

تاریکی بڑھنے لگی تھی۔ اچانک اس کا پاؤں کسی
خاردار چیز میں الجھا تھا۔ اور وہ منہ کے بل کچرے کے
ڈھیر میں جا گرا تھا۔ تیز بدبو اس کے ناک اور منہ میں
ٹپکنے لگی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ قابض ہونے لگی
تھی۔ دہارے اذیت اور کراہیت کے چلا اٹھا تھا۔

”بھاؤ!“

انٹارہٹھنے سے بے سدھ پڑے سیم کی آنکھیں
ایک جھٹکے سے کھل گئی تھیں۔ اس کی سانس دھونکنی
کی طرح چل رہی تھی۔ جبکہ ہونٹ بالکل سوکے
پڑے تھے۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے
بے قراری سے اپنے سر کو جنبش دینا چاہی تھی۔ لیکن
اس کو شش میں بے اختیار کراہ اس کے لبوں سے نکل
گئی تھی۔

اس کی آواز پہ اپنے کام میں مصروف نرس نے
پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اور اسے ہوش میں دیکھ کر
وہ تیزی سے اس کے قریب چلی آئی تھی۔

”مجھے۔ مجھے نکلو یہاں سے۔ یہاں۔ یہاں بہت
بدبو ہے۔“ ہر طرح کی پہچان سے عاری ’خللی نظرس‘

لیکن صحن کے منہ سے یہ سچائی اس کے دل و دماغ
کوڑے کی طرح برسی تھی۔ کیونکہ یہ وہ شخص تھا
جس کے سامنے وہ اپنا بھرپور حال میں قائم رکھنا چاہتی
تھی۔ پھر ہاے ساری دنیا کتنی باتیں کیوں نہ بتا سکی۔
لیکن یہ ایک شخص کبھی نہیں!

بے اختیار اپنا غصہ دبا کر رہ گیا۔ وہ ایک سو ایک فیصد
جانتا تھا کہ سیم غلط بیانی کر رہا ہے۔
”آپ کی گاڑی انشورڈ تھی؟“ نہیں آفسیئر نے
ایک بار پھر سیم کی جانب دیکھا۔
”جی۔“

”تم نے آفسیئر سے جموٹ کیوں بولا۔“
وہ اسے دس کرنا کرے سے باہر نکل گیا مارک جیسے
پھٹ پڑا۔

صلین سے اپنا ہاتھ مل مل کے دھوئے ہوئے اس
کی آنکھوں سے نہ تو آنسو رگ رہے تھے اور نہ ہی
ہاتھ کی پشت سے ان لیوں کا احساس مٹ رہا تھا۔
آنسو اپنی بھانگ تینوں چیزیں اسٹھی سک میں برہ
رہی تھیں۔ ہاتھ کی جلد سرخ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی
بے قراری کو چین نہیں آ رہا تھا۔ اور آتا بھی کیونکر۔
اسے کوئی ایک تو نہیں بلکہ کئی نقصان مل کر رہا ہے
تھوڑے نقصان جن کا کھوم بھر کر سارا خسارہ صرف اس
کے حصے میں آیا تھا۔ اور وہ اس خسارے کو برداشت
کرتے کرتے اب بے عمل ہو گئی تھی۔

”سیری مرضی۔“ اس کی طرف دیکھے بنا جواب دیا۔
مارک کا دماغ گھوم گیا۔

اپنے تھکے ہوئے وجود کو تھکیتی وہ بند یہ آکے کر رہی
تھی۔ اس کا دل شدت سے اس بل فن تمام انتہوں
سے فرار کا خواہش مند تھا۔ مگر چونکہ اسے بھلانے کا
کوئی سلسلہ اس کے پاس نہ تھا۔ اس لیے وہ ابراہیم
صاحب کے کمرے سے جا کر عیند کی ایک گونڈ لے گئی
تھی۔

”سیم اچھے مزیدار گل مت کرو۔ تم نہیں جانتے،
میں نے یہ دو دن کس ذہنی اذیت میں بسر کر
تمہارے ہوش و حواس بھل ہو جانے کا انتظار کیا
ہے۔“
”جانتا ہوں۔“

پانی کے ساتھ اس گولی کو تھتے ہوئے اسے مراحم
کے اس انجام پہ بے اختیار دونا آیا تھا۔

”تو پھر تم بتاتے کیوں نہیں کہ تم اس رات اس
علاقے میں کیا کر رہے تھے؟“ وہ جھجھکا کر بولا تو سیم
کے وجود سے تعفن کا وہ کرب ناک احساس پھر سے لپٹنے
لگا۔

☆ ☆ ☆

بے اختیار مٹھیاں بچھنے اس نے اپنا بازو آنکھوں پر
رکھ لیا۔

”کیا آپ یقین سے کہہ رہے ہیں مسٹر سیم کہ میں
سب کچھ ہوا تھا؟“ آفسیئر نے اس کا بیان قلم بند کرنے کے
بعد بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ جو تکیوں کے
سارے غمور ہو رہا تھا۔

”پلیز مارک؟ مجھے پریشان مت کرو!“ اور مارک
اسے بے بس نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ تب ہی
موبائل کی بیل نے اس کا دھیان اپنی جانب کھینچ لیا۔
اسکرین پر جوزفین کا نام دیکھ کے اس نے فون کلن سے
لگا لیا۔

”جی۔“ وہ بتا کسی تاثر کے دھڑکنے سے بولا تو آفسیئر
نے اس کے پاس کھڑے مارک کو دیکھتے ہوئے کندھوں
کو خفیف سی جھنجھکی دی۔

”سناتم نے اس شخص کا کارنامہ۔ آفسیئر کو بیان دیا
ہے کہ میں ایک پرانے دوست کو ڈھونڈنے اس
علاقے میں گیا تھا۔ جب اس گلی میں مجھے کچھ غنڈوں
نے گھیر لیا اور مار پیٹ کرنے کے بعد میری قیمتی
چیزیں چھین لیں۔“ اس کی ”جیلو“ کے جواب میں وہ
کھوتے لہجے میں بولا تو آنکھیں موندے سیم نے بے
اختیار اپنا نچلا لب دانتوں تلے دب لیا۔ وہ اسے کیسے جانتا

”اس صورت میں تو کسی کے خلاف کوئی پرچہ نہیں
بتلا۔“ اور مارک جو اتنی دیر سے سیم کی کہانی سن رہا تھا،

کہ یہ ذکر اس کے لیے کئی ذہنی اذیت کا باعث بن رہا تھا۔

”کیا فضول بات کر رہی ہو۔ کیا میں نہیں جانتا کہ اس کے کتنے دوست اس کلاس سے لی لائگ کرتے ہیں؟ ویسے بھی میرے پوچھنے پہ بتا چکا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے۔“ اس نے ایک چپتی نگاہ سامنے لیئے سیم ڈالی۔

”آؤ مجھے کیا معلوم ایسا کیوں کر رہا ہے میں تو خود بریٹن ہو کر رہ گیا ہوں۔“ وہ لہجہ بھر کورک کر جوزفین کی بات سننے کے بعد گویا ہوا۔

”اچھا یاد آیا۔ تم سیم کے لیے کیٹ روم تیار کر رہا ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ کل چیک اپ کے بعد۔“

”کل یا پرسوں۔ میں تمہاری طرف نہیں جاؤں گا۔“ وہ آنکھیں بند کیے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ تو مارک نے غصے سے اس کی جانب دیکھا۔

”تو کہاں جاؤ گے؟“

”اپنے گھر۔“

”بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ وہاں کون تمہارا خیال رکھے گا؟“ مارک نے اب کے اپنے غصے کو ایک طرف رکھتے ہوئے تحمل سے کام لیا۔

”میں کر لوں گا منہج۔ تم جانتے ہو مجھے کسی کی پرسل لائف ڈسٹرب کرنا پسند نہیں۔“ اب کے وہ آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے کی قطعیت مارک کو اک گہری سانس لینے پہ مجبور کر گئی۔

”وہ نہیں مان رہا۔ تم ایسا کرنا آفس سے واپسی پہ سیم کے گھر کی ایکسٹرا چابی گھر جا کے اٹھا لینا اور وہاں جا کے گرو سری وغیرہ چیک کر لینا۔“ اس نے جوزفین سے کہتے ہوئے پرسوج نظروں سے سیم کو دیکھا اور ایک آدھ مزید بات کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

”تم جانتے ہو اتم خدی اور من ملی کرنے والے تو پہلے ہی تھے لیکن اس ایکسپلانٹ کے بعد سے تو تمہارا رویہ بہت عجیب ہو گیا ہے۔“ اس پر نظریں

جمائے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا سیم کے منہ نے آکھڑا ہوا تو وہ اک بوجھل سانس لیتا چو جھکا گیا۔

”کیا بات ہے سیم سب ٹھیک تو ہے؟“ اس کی خاموشی مارک کو تشویش میں مبتلا کر گئی تھی۔ یہ خاموشی اس کی آزاد شوخ و شنگ اور سیمالی طبیعت کے بالکل برعکس تھی۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں۔“ وہ دل گرفتگی سے فقط اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ اپنے اندر اتر آنے والے خوف کوئی الوقت نہیں دینے کا اس میں حوصلہ نہ تھا۔

”کیا مطلب؟“ مارک نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔

”کوئی مطلب نہیں۔ میں خود نہیں جانتا مجھے کیا ہو رہا ہے۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے پھر سے آنکھوں پہ بازو رکھ لیے اس کے ناقابل فہم انداز نے مارک کو بریٹن کر دیا۔ وہ کہتے ہی بل اسے ابھی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر کچھ سوچنے ہوئے ڈاکٹر سے ڈسکس کرنے کے ارادے سے باہر نکل گیا۔

اس کی غیر موجودگی کے احساس پہ سیم نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بھیجی بھیجی سی خیالی نگاہیں بے تاثر انداز میں سامنے دیوار پہ جا ٹھہری تھیں۔ سفید سفید میڈھی اور سیاہ دیوار۔ بجائے کیوں اس کمرے اور اس بستر کے آگے زندگی یک لخت ماسک ہو گئی تھی۔ یوں جیسے وہ کسی ”روٹر کوئسٹر“ سے اچانک نیچے اتر آیا ہو جو اسے لیے اوپر نیچے دائیں بائیں بھاگ چلی جا رہی تھی تیز اور تیز بہت تیز!

لوراب جو یہ شور مچاتا غوطے کھاتا سفر ایک جھٹکے سے رکھتا تو وہ خود بھی بھونچکا سا رہ گیا تھا۔ وہاں ہوں اور اندیشوں میں گمراہ ایک دم اکیلا۔ ملاحظہ اس کی زندگی کا محور و مرکز تو ہمیشہ سے صرف اس کی اپنی ذات ہی رہی تھی۔ پھر ایسے میں اس زندگی میں کیا ایک یہ تھلائی کا احساس کہیں سے اتر آیا تھا۔ وہ حیران تھا۔ بہت حیران۔

وہ اپنے دل باپ کی اکلوتی لولہ تھا جس کی ہنسی

نے بڑے بھرپور انداز میں پرورش کی تھی اور یہ اس کے نزدیک ان کا کوئی احسان نہ تھا، اس کا باپ ایک دولت مند انسان تھا، مگر انہوں نے اسے زندگی کی ہر آسائش مہیا کی تھی تو کوئی انوکھا کام نہیں کیا تھا۔ رہا ان کا پیار و محبت تو وہ بھی ایک قدرتی امر تھا جس کے بدلے میں اس نے بھی انہیں چاہا تھا۔ پھر بھلا وہ اب اور کیا کرنا؟ کیا اس کی اپنی کوئی زندگی، کوئی خواہش نہ تھی؟

وہ آگے بڑھا تھا اور اپنی ترجیحات کے مطابق آگے
بڑھا تھا۔ دولت کو اس نے اپنی زندگی میں اولین ترجیح
پر رکھا تھا۔ جس کی طاقت اور اہمیت سے وہ ہمیشہ بہ خوبی
واقف رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امریکا جیسے ملک میں جو طرز
زندگی وہ گزار رہا ہے وہ فقط اس کے باپ کی جانب سے
ملنے والی دولت کے ثمر پر ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اس
لیے اس نے اپنے دوست مارک کے ساتھ مل کر اپنی
ذاتی فرم بنائی تھی جس نے اس پر کامیابی کے نئے
دروازے کھول دیے تھے۔ اپنی ذات کے حوالے سے
اس کے فیصلے ہمیشہ جوش کے بجائے ہوش پر مبنی رہے
تھے اس نے رشتے ہاتھوں کو کبھی بھی اپنی کمزوری نہیں
منہ دیا تھا۔

نتیجتاً وہ توج اپنی مرضی کی ایک کاسیاب اور
بھریور زندگی گزار رہا تھا۔

لیکن اس حلوئے نے یکایک اس کی اس کامیاب اور بھرپور زندگی پر سوالیہ نشان گھڑا کر دیا تھا۔ اسے اس خوف سے دوچار کر دیا تھا جس کے بارے میں اس نے آج تک سوجھ بوجھ نہ کیا۔

اس رات کچرے کے ڈھیر پر صرف وہی نہیں بلکہ خود بے جڑی اس کی بست سی خوش فہمیاں بھی ڈھیر ہوئی تھیں۔ لوگوں کی ہر طرح کی گندگی نے جب اس کے تن کو بستر کی طرح چھوا تھا اور اس چھبتی ہوئی نہایت تیز دلو نے جب اس کی ہانگ اور منہ میں راست بٹایا تھا۔ تب اسے حقیقی معنوں میں اپنی اوقات اور اپنی ملاقات کا احساس ہوا تھا۔ وہ کیا تھا اور حالات اسے لمحوں میں بے بسی کی کس انتہا پر پہنچا سکتے تھے یہ اسے

READING
Section

READING
Section

اسے کر کے بول نذر سے اڑنک نیل پہ پختی تھی۔

”ٹھیک ہے مرصاحب! آج اس آنکھ مچولی کا بھی اختتام کرتے ہیں۔“ اس نے ایک آخری نظر خود پہ ڈالی اور مطمئن سا کرے سے نکل کر نیچے ڈانٹنگ روم کی طرف چلا آیا تھا۔ جہاں اس وقت سب ہی گھر والے ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔

”السلام علیکم! سب کو سلام کر لیا باپ کے بایں جانب اپنی خصوص کر سی کی طرف بڑھا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ ایسے ہو بیٹا؟“ صغیر صاحب نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھ کر دیکھا۔

”فائن فائن! میں کل ذیل فائنل کر کے آیا تھا۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میرا رز کے چکر میں میں کام کسی اور کے ذمے چھوڑ آیا ہوں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا تو صغیر صاحب مسکرا دیے۔

”تمہیں مجھ سے بہت سے گلے سہی، لیکن تمہارے پروفیشنل ازم پر میں نے کبھی شک نہیں کیا۔“

”چلیں فکر ہے۔ آپ کو میری کوئی ارا تو بھائی۔“ اس نے سلائس پلیٹ میں رکھا۔

”اوب ہوں۔ صبح صبح کوئی تلخ بات نہیں۔“ نورہ نے نرمی سے ٹوکے ہوئے بھائی کے لیے پلیٹ میں انڈہ نکالا۔

”کل ہر نظر نہیں آئی مجھے کیا اس نے فنکشن اینڈ نہیں کیا؟“ اس نے ایک نظر چائے بناتی زیب بیگم پہ ڈالتے ہوئے نورہ کی جانب دیکھا اس کے منہ سے ہر کام سن کے حسب توقع زیب کا چہرہ تن گیا۔ جسے حنان نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے خاما حظ اٹھایا تھا۔

”نہیں ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟ جاشی کو“ آپی اور میں نے ہی مل کر تیار کیا تھا۔“ نورہ کے جواب پر اس نے چرتکے کا آثار دیا۔

”اچھا! تو پھر وہ مجھے نظر کیوں نہیں آئی؟“ اس کے سر میں درد تھا۔ اس لیے وہ جلدی چلی گئی

تھی۔“ جواب نورہ کے بجائے زیب بیگم کی طرف سے آیا تو حنان کی سرنگاہیں ان کی پریش نگاہوں سے جا کر اٹھیں۔

”جلدی چلی گئی تھی یا بیج دی گئی تھی؟“ اس کے استہزاء نے زیب بیگم کو اندر ہی اندر خائف کر دیا۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے ایک اچشتی نظر صغیر صاحب پہ ڈالی۔ حنان انہیں کوئی جواب دیے بنا باپ کی جانب رخ پھیر گیا۔

”جانتی نہیں آپ لوگوں نے محسوس کیا ہے یا نہیں، لیکن مجھے لگتا ہے انجم آنٹی کو مر کا یہاں زیادہ آنا پسند نہیں۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ صغیر صاحب نے الجھ کر بیوی کی جانب دیکھا۔ جو خود بھی حنان کی اس بات سے پریشان ہو گئی تھیں۔ چائٹ اور نورہ بھی ہاتھ روکے بھائی کی طرف متوجہ تھیں۔

”ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ان لکھتے مجھے تو میری ڈپریشن کا شکار کتنے لگی ہے۔“ وہ اپنی بات پہ نذر دیتے ہوئے بولا تو صغیر صاحب پریشان ہو گئے۔

”ہو سکتا ہے بیٹا! آخر وہ بھی تو انسان ہی ہے۔“ ”تو آپ لوگ اس مسئلے کو حل کیوں نہیں کرتے؟“ اور زیب لہجے میں بھنب گئیں کہ وہ کس ارادے کے تحت یہ ساری گفتگو کر رہا تھا۔

اگر صغیر قاضی اور دونوں بچیاں وہاں موجود نہ ہوتیں تو اس لڑکے کا دل غ ٹھکے لگا دیتیں۔ اندر ہی اندر کھولتے ہوئے انہوں نے فوراً سے ہمشرد اختلا ضروری سمجھی تھی۔

”وہ اپنے مسئلے خود حل کر سکتے ہیں۔“

”آپ شاید بھول رہی ہیں یہ ہمارا بھی مسئلہ ہے۔“ رہیں انجم آنٹی اور ابراہیم انکل تو ان لوگوں کی نیت اگر حل کرنے کی ہوتی تو بہت پہلے اس معاملے کو حل کر چکے ہوتے۔“ حنان نے پلیٹ کر جتایا تو زیب نا چاہتے ہوئے بھی خاموش ہو گئیں۔ ان کی خاموشی پر حنان کی آنکھوں میں کٹ دار سی چمک بھرنی۔ جسے

دباؤ کا نتیجہ قرار دیا تھا جو اس کے بقول رفتہ رفتہ ہی
زا کم ہوتا۔ ڈاکٹر کی بات سے مارک کو خالص اطمینان
ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر مزید اسپتال میں ٹھہرنے کے بعد
آفس چلا آیا تھا۔

سیم کی غیر موجودگی کے باعث کام کا سارا بوجھ اس
پر آ پڑا تھا۔ وہ ان بڑھائی تین دنوں میں اسپتال اور دفتر
کے درمیان حقیقتاً کھن چکر بن کے رہ گیا تھا۔ لیکن
اس کے باوجود اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی
تھی۔ وجہ اس کی حد سے زیادہ پر خلوص اور نرم طبیعت
تھی۔ وہ خود سے بڑے سب سے لوگوں کا جن میں اس
کے دوست بھی شامل تھے خیال رکھنا اپنا اخلاقی فرض
سمجھتا تھا۔

اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے مغرب کے سردینے
میں مشرقی اقدار نے پر حدت لاف روشن کر دیا ہے۔
اس کی اس درجہ جذباتی طبیعت کا سیم اکثر مذاق
ازلیا کرتا تھا۔ لیکن وہ پرامن غیر مسکراوا کرتا تھا۔ ابھی
بھی وہ کام کرتے ہوئے مسلسل اسی نقطے پر سوچ رہا تھا
کہ کیا اسے اس حادثے کے بارے میں سیم کے
والدین کو آگاہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جب اس کے سہیل
پہنچے تو والدین جو زمین کی کل نے اس کو حیران مٹا دیا تھا۔
”ہاں جوری! کہو۔“

”ممکنہ اتنے جلدی سے سیم کے گھر پہنچو۔ یہاں
بست گڑبڑ ہوئی ہے۔“ جوزفین کی گھبرائی ہوئی آواز
نے مارک کو پریشان کر دیا تھا۔

”کیسی گڑبڑ؟“ اس نے متفکر لہجے میں سوال کیا۔
”مارک! یہاں۔ یہاں چوری ہو گئی ہے۔“
”کیا؟“ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا
تھا۔



”کیا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب کیا
ہو گا۔ اگر بھائی جان نے بھی صغیر صاحب کی تائید کی تو
ہم کیا کریں گے؟“ مائی ہوئی زیب نے بے اختیار اپنا
سر تھام لیا۔

زیب بیگم کے سوا وہاں بیٹھا کوئی بھی شخص محسوس
نہیں کر سکتا تھا۔ سارے منہ کے من کے لب سختی سے
ایک دوسرے میں پھنس چکے تھے۔

”ویسے اگر وہ کھا جائے زہی! تو حناں ٹھیک کہہ رہا
ہے۔ ہمیں اب اس بارے میں تپا اور بھائی جان سے
بات کرنا چاہیے۔“ اور باپ کی بات پر حناں کا دل چاہا
تھا کہ وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔ اس کی مسخراؤ والی
نظروں نے اختیار زیب بیگم کی جانب اٹھی تھیں۔
جنہیں انہوں نے مکمل حوصلے سے نظر انداز کر دیا تھا۔
”کوئی کام نہیں صغیر صاحب! ہر اس معاملے میں
کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔“

”وہ بچی ہے زہی! اور ابھی اتنی دور اندیش نہیں
ہوئی کہ اس کے فیصلوں کو ہم حتمی مان کر خاموش بیٹھے
رہیں۔“ وہ قدرے خشکی سے گویا ہوئے تو زیب گہری
سانس لیتے ہوئے بولیں۔

”چلتی ٹھیک ہے۔ نہیں مانتے اس کی بات، لیکن
آپ نے سوچا ہے اس نور زہی کی کیا نتیجہ نکلے گا؟“
”جو بھی نکلے گا موجود صورت حال سے تو بہتری
ہو گا۔“ انہوں نے چائے کی پیالی اپنی جانب سرکائی۔
”تم آج تپا کو انعام کرنے کا کل ہم من کی طرف
چکر لگائیں گے اس کے علاوہ کچھ بھی کہنے کی ضرورت
نہیں۔ جو بھی بات ہوگی مدد ہوگی۔“ ان کے حتمی
لہجے پر زیب بیگم نے پریشان نظروں سے شوہر کی
جانب دیکھا تھا۔

جبکہ حناں کا دل اپنی اس فتح پر اندر تک سرشار
ہو گیا تھا۔ بات نے بہت جلدی اور بہت آسانی سے
اس کی مرضی کا رخ لے لیا تھا اس نے ایک فائنل نگاہ
زیب بیگم کے مضطرب چہرے پر ڈالی اور لبوں پر در
آنے والی کٹ دار مسکراہٹ کا اظہار گھونٹنے کو چائے کا
کپ اٹھا کے لبوں سے لگا لیا تھا۔



ڈاکٹر نے سیم کی ذہنی حالت کو اس کے ساتھ پیش
آنے والے حادثے سے منسوب کرتے ہوئے ذہنی

صغیر قاضی نور حنن کی دفتر روانگی کے بعد زب ہائی بلڈ پریشر کا بلانہ کیے کرے میں چلی آئی تھیں۔ اندر آنے کے بعد انہوں نے ملازمہ سے کارڈ لیس منگوا کر بن کو فون ملایا تھا اور صغیر صاحب کے پیغام سے لے کر پوری بات ان کے گوش گزار کر دی تھی۔ ”مگر نہیں۔ وہ بھی کریں گے میں جانتی ہوں۔“ انجم دل گرفتہ لہجے میں بولیں تو زب بیگم رونے لگی۔

”بائے آبا اب پھر ہم کیا کریں؟“ ان کی پریشانی سوا ہو گئی تھی۔ انجم نے بے اختیار ایک کمری سا سر ہلایا۔ ”دکڑا کیا ہے۔ ہم کھل طور پر بے بس ہیں زب بیگم! بوجھو تو میرے پاس صغیر کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں۔“

”تو پھر کل کیا ہو گا؟“ ان کے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔ ”اللہ جانے۔“ بوجھل انداز میں کہتی وہ پل بھر کو رکیں۔

”ویسے زب بیگم! اگر رکھا جائے تو اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی پڑے گا۔ ہم کب تک آنکھوں پر پٹی باندھے حقیقت کو نظر انداز کرتے رہیں گے؟“ انہوں نے استہلاکی حوصلے سے بن کو سبھلایا۔ ”اب کا کیا خیال ہے کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ ہر کی ہر تکلیف کا خاتمہ ہو جائے؟“ انہوں نے دپٹے سے آنسو صاف کیے۔

”لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟ یہ بھی تو سوچیں۔“ ”ہونا کیا ہے۔ اگر حنن ہرے اتنی ہی محبت کا دعوے دار ہے تو ٹھیک ہے اسے بھی آنا لیتے ہیں۔“ ”وہ میرے بولیں تو زب بیگم! سنا کر ادیں۔“ ”یہ محبت نہیں صرف خد ہے۔ زیر کرنے کی ہوس ہے اور آپ یہ بات اچھی طرح سے جانتی ہیں۔“ برسوں کے آنے ہوئے کو بھلا کیا آنا تھا کیا۔ اور مزہ آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ اس کے لیے سنا جائے گی؟ وہ تو اس کے سائے تک سے دور بھاگتی ہے۔ کبھی بھی حنن کے لیے راضی نہیں ہوگی۔ ”حنن کی بات پر انجم

بیگم کو حنن اپنے دوم دوم میں با ترقی محسوس ہوئی۔ ”زندگی اس عمر میں آگے اتنی رخ اتنی شہت بھری ہو جائے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ زب بیگم نے لفظ نے ہم دونوں بھول کی قسمت میں لولہ کا سکہ کیوں نہیں لکھا؟“ حنن کے دل گرفتہ لہجے پر زب بیگم کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئیں۔ ”میں اگر حنن کے آج کے عمل و عمل اور خوشی کو ایک طرف رکھ دوں۔ تب بھی صغیر نے ایک نہ ایک دن تو یہ سوال اٹھانے ہی ہیں پھر کیوں نہ ابھی سہی۔ تم آئے دولے دیکھتے ہیں حل ایسا ایم کیا بول ب دیتے ہیں۔“

”مگر مرے؟“ زب کو فکر لاحق ہوئی۔ ”میں نے فی الوقت پریشان نہیں کرنا چاہتی بات تو ویسے بھی ہم چاروں کے درمیان ہی ہوئی ہے۔“ ”لیکن میں آج حنن سے ضروریات کہیں گی۔“ زب کے تصور میں اس کا سر شاہ جہ اور حنن کی نظریں گھومیں تو حنن کا غصہ پھر سے تازہ ہو گیا۔ ”کیا فائدہ۔ کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔“ انجم بیگم نے سبھلانا چاہا۔

”نہیں پلہ۔ آج جو اس لڑکے نے کیا ہے اس کے بعد مجھے ہر حل میں اس سے بات کرنی ہے۔“ ”جیسی تمہاری مرضی۔“ حنن کے قلعی لہجے پر ”فطرتاً ہی کہہ پائی تھیں۔“



سیم کے بیڈ روم میں بارک گنگ سلاہوں ہاتھوں سے سر تھامے بیڈ پہ بیٹھا تھا۔ اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی بے جبری یہ خود کو کوسے یا سیم کے راز دار کی بدست پر اس سے سوال کرے۔ دیر سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے بے چینی سے ایک بار پھر سلاہ بھلی پر رکھے نوٹو فریم کی طرف دیکھا اور اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں بکریست ہو گئے تھے۔ جو زمین کی کل سننے کے بعد وہ اندر ماحضہ گاڑی

وڈا اسم کے پارٹنٹ پہنچا تھا۔ طرح طرح کے
ولے لورڈ سو سے سارا دستہ اسے پریشان کرتے رہے
تھے۔ یہ سب آخر ہو کیا رہا تھا؟

جوزی اسے پریشان کے عالم میں پارٹنٹ کے باہر
ی شعلی نظر آئی مارک کو دیکھ کر وہ بے اختیار اس کی
جانب لپکی تھی۔ جوزفین کا ہاتھ تھلے وہ گھر کے اندر
چلا آیا تھا اس کی توقع کے برعکس اندر کسی قسم کی کوئی
بے ترتیبی نہ تھی بلکہ پہلی نظر میں کہیں کسی کڑی کے
آمار نہ تھے مگر جوزفین کے بتانے پر اسے بہت سی
نئی چیزیں اپنی جگہ سے غائب نظر آنے لگی تھیں۔

کام والی نہایت اطمینان اور طریقے سے کیا گیا
تھا۔ یوں جیسے تانے والے کو سیم کی اچانک آمد کا کوئی
دھڑکنہ نہ ہو۔ تو کیا چوریہ جانتا تھا کہ سیم زخمی ہے یا زخمی
حالت میں اسپتال میں پڑا ہے؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ
سیم کے ساتھ ہونے والے حادثے اور گھر میں ہونے
والی چوری کے پیچھے ایک سی شخصیت ملوث تھی؟ اس
خیال سے مارک کو جو ٹھوہرا تھا۔

دھڑکنے والے کے ساتھ وہ سیم کے بیڈ روم کی جانب
بھاگا تھا تاکہ اس کی الماری میں موجود لاکر کو چیک
کر سکے تاکہ سیم کے عالم میں جوزفین بھی اس کے پیچھے
لپکی تھی۔ ڈرائنگ روم میں موجود دیوار گیر الماری
کھول کر اس نے لاکر کو چھوا تھا اور وہیں آٹو جنک کھڈ
ولا سیم دیکھ کے اس نے بے اختیار اطمینان بھری
کمری سے اس کی تھی۔

”شکر ہے یہ تو محفوظ رہا۔“ جوزفین نے بھی شکر کا
کلمہ لیا ایک مارک لب ایک ایک کر کے باقی خانے اور
دراڑ کھول کے دیکھ رہا تھا۔

”جب ان میں سے کیا کچھ غائب ہے یہ تو سیم ہی بتا
سکتا ہے۔“ جوزفین نے کہتے ہوئے آگے پیچھے کر
الماری کا آخری کونہ کھولا۔

”تو۔۔۔ یہ کس کے کپڑے ہیں؟“ ترتیب سے
لٹے لٹے بزار سز کو دیکھتے ہوئے وہ ایک ہل کے لیے
ٹھک گئی تھی۔ اس کی بات۔ مارک سب کچھ چھوڑ
چھاڑ اس کے پیچھے آگرا ہوا اور غور سامنے لٹکے کپڑوں

کو دیکھنے لگا۔

”کیا پتا سوزی کے ہوں۔“ اس نے خیال آرائی
کی۔

”سوزی کے؟ اور اتنے سستے سے کپڑے۔“
جوزفین نے پلٹ کر اسے دیکھا اور ہاتھ پر سحا کے ایک
شرٹ کی اسٹین اوٹنی کرتے ہوئے مارک کو دکھائی۔

”تو پھر یہ کس کے ہو سکتے ہیں؟“ مارک کی آنکھوں
میں الجھن دور آئی۔ اس نے جوزفین کو ایک طرف کیا
اور آگے بڑھ کے اندر موجود دیگر خانوں کو کھنگالنے لگا۔
مگر سوائے ایک ٹوٹے ہوئے پرس اور دو جوڑی سستے
سے استعمال شدہ جوتوں کے وہاں اور کچھ نہ تھا۔ اس
دوران جوزفین اندر بیڈ روم میں جا چکی تھی۔

”مارک! جلدی لوھر آؤ!“ چند لمحوں بعد اسے
جوزی کی پکار سنائی دی تو وہ تیزی سے کمرے کی جانب
پلٹا جہاں جوزفین سائیڈ ٹیبل کے پاس ہاتھ میں فونو فریم
لیے کھڑی تھی۔

”یہ سیم کے ساتھ کون ہے؟“ گور مارک نے آگے
بڑھ کے فریم اس کے ہاتھ سے لے لیا جس میں ایک
مسکراتا ہوا گندی چہرہ سیاہ چمکتے بالوں کے درمیان سیم
کے شانے سے نکلا ہوا تھا۔ اس چہرے کو دیکھتے ہوئے
مارک کی آنکھیں بے اختیاری کے عالم میں پھیل گئی
تھیں اور اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔
”یہ۔۔۔ یہ تو۔۔۔“



”اے! بھولی قل۔“ سامنے موجود چہرے کو شمار
تکونہ ہوں سے نکلتے ہوئے وہ اس کی جانب جھکا تو اس
کے برابر کھڑے مارک نے بے اختیار اس کا بازو تھام
لیا۔

”سیم!“ اس کی تنہا پکار پہ گلاس ہاتھ میں
تھلے کھڑے سیم نے بد مزگی سے اس کی جانب
دیکھا۔

”کیا سیم؟ دیکھ نہیں رہے ہمارے سامنے کیسی
حسین خاتون کھڑی ہیں۔“ اور اس کی اس بر ملا تعریف

www.urdusoftbooks.com

یہ جہاں مقابلے کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہیں مارک ایک کمری سانس کے کر رہ گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے کمری لڑکی کو جانے کے لیے کہہ کر توجہ منکراہٹ دیا تو وہاں سے ہٹ گئی۔

”تم بھی نا کتنے بد رفتاری آدمی ہو۔ آج تو جوتی بھی تمہارے ساتھ نہیں۔“ سیم نے ایک بوے سے گھونٹ میں گلاس ختم کرتے ہوئے پاس سے گزرتے دیکھ کر تھمیا۔

”مارک بھی۔“ اس کے نئے آڈر پہ مارک نے بے اختیار اسے گھورا۔

”تم غالباً اس پارٹی کے میزبان ہو۔“ مارک نے جھٹکایا۔

”تو یہ کہ کچھ تو حواس قائم رہنے دو۔“ اور مارک کے یوں چل کر کہنے پر وہ تفسیر لگا کے ہنس پڑا۔

”جیسے مسمان ویسا میزبان۔ یہ میری فریڈ سپارٹی ہے اور میں یہاں پوری آزادی سے انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ صرف انجوائے! وہ اپنی بات کر کے ایک طرف بنائے گئے اسوشل ڈانس فلوور کی جانب تھم رہا ہوا دیکھ گیا۔ تو مارک اس کی دیوانگی پر بے اختیار مسکرا دیا۔

آج یہاں شہر کے بہترین ہوٹل میں سیم نے اپنی اور سوزی کی طلاق کی خوشی میں اپنے تمام دوستوں کو بہت بڑی پارٹی دی تھی۔

ڈھلتی سسل قبل ان دونوں کے متعلق کبھی کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ محض تیس ماہ بعد ان کی اس طوفانی محبت کا اختتام اس نقطے پر آئے ہوگا۔

سوزی، سیم کے دل کو اور سیم، سوزی کے دل کو ایسا نور اس حد تک بھلیا تھا کہ دونوں نے اپنی فیملی کے خلاف جا کے ایک دوسرے سے شادی کر لی تھی۔ شادی کے بعد دونوں نے بڑے بھرپور محبت بھرے انداز میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا، لیکن پھر وہی ہوا تھا جو اس سرد معاشرے میں ہوتا آیا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی محبت اپنی رعنائی کھو گئی تھی۔ دونوں کا دل ایک دوسرے سے بھرنے لگا تھا اور دونوں نے ہی اپنی

دوستیوں کے نئے سالن ڈھونڈ لیے تھے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے جان چھڑانے کے شدت سے خواہش مند ہو گئے تھے، مگر مسئلہ یہ تھا کہ طلاق کی صورت میں سیم کو یہاں کے قوانین کے مطابق اپنی ساری جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جو اسے کسی طور منظور نہ تھا۔ رات دن کی سوچ بچار اور وکیل کے مشورے سے سیم کو ایک حل سوچ ہی گیا۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے اور مارک کے بھروسے پر غیر قانونی ڈاکو متش بنوا کر عدالت میں خود کو مارک کا مقروض ظاہر کروایا۔ یوں سوزی کے ہاتھ سوائے آزادی کے پروانے کے اور کچھ نہ آسکا اور سیم اپنی دوسری کامیابی کے نشے میں خوشی سے جموٹ اٹھا۔ اس کی زندگی سے سوزی نام کی پریشانی بغیر کسی نقصان کے دور ہو گئی تھی۔ اس نئی الونگ اور کیا چاہیے تھا؟

اپنی اسی کامیابی کو سہیلپرٹ کرنے کے لیے اس نے اپنے دوستوں کی فرمائش پر تاج شہر کے مشہور ہوٹل میں پول سائیڈ پر بہترین پرائیویٹ پارٹی اورنج کروائی تھی۔ جہاں مسمانوں کی نفرین کے لیے شراب اور شباب دونوں کی کمی نہ تھی۔ نتیجتاً اس وقت ہوٹل کے پول ایریا میں رونق اپنے عروج پر تھی۔ فلک شکنک میوزک اور جلتی بجھتی لائٹوں کے درمیان کئی جوڑے ایک طرف بنائے گئے خاص ڈانس فلوور پہ محو رقص تھے۔ جو زمین چونک کر شہر سے باہر اپنی بہن سے ملنے گئی ہوئی تھی اس لیے وہ سیم کی اس پارٹی میں شریک نہ ہو سکی تھی۔

سیم اپنے کمرے کے مطابق ڈانس فلوور پہ پوری آزادی سے انجوائے کر رہا تھا۔ اس کی حرکتوں نے جلد ہی مارک کو بھی اس کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ سب ہی بڑے بھرپور انداز میں کھانے پینے اور خاص طور پر بلوائی گئی ڈانسز میں مگن تھے۔ ایسے میں ان کے چند دوستوں کو نئی شرارت سوچی تو انہوں نے مارک کو اٹھا کر پول میں پھینک دیا۔ اس کے بعد تو جیسے وہاں نیا تماشا شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک سب ہی پول میں غوطے کھانے لگے۔

پانگوں کی طرح ہنستا، سیم اپنی ہادی بھلا کے
ڈنگلے تہ میں سے ہل سے باہر آیا تو ایک نازک
سی لڑکی اس سے آنکرائی۔
”دیکھ کے ڈارنگ! اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے
سیم نے نظریں اٹھائیں اور بے اختیار جو تک گیا۔
”ہرے تم تو وہی خوب صورت خاتون ہو۔“ چلے
نقوش سے بچ گئی چہرے پر نظریں جمائے نہ
مسکرا کر دلا۔ تو وہ بھی مسکراتی ہوئی سنبھل کر پیچھے
ہٹی۔

”جی میں وہی ہوں مسٹر سیم۔“ گور سیم اس کے فیر
مکی لہجے میں اپنا نام سن کے چونک گیا۔
”سیم میرا نام کیسے جانتی ہو؟“
”کیونکہ آپ اس پارٹی کے میزبان ہیں اور میں
یہاں آپ کی لور آپ کے مہمانوں کی خدمت پر مامور
ہوں۔“ اس کی بات پر پہلی بار سیم کی نظریں اس کے
چہرے سے ہٹ کر اس کے جسم پر بچے دیشس کے
یونیفارم پر جا پھریں لیکن محض لمحہ بھر کو اس کے لب
وہ دوبارہ اس کے پرکشش چہرے کی جانب لوٹ
آئیں۔

”تمہیں کس بے وقوف نے دیشس بتایا ہے؟“
آنکھوں میں ستاش لیے وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ
کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
اس کے سفید موتوں کے سے دانت اور چہرے پر
پھیلی چمک نے سامنے کھڑے سیم کو مبسوت سا کر دیا۔
وہ کسی بڑا س کی کیفیت میں ایک لمحہ اسے دیکھے کیا تو
اس کی ہنسی کو بیک لگ گیا۔
”تمہارا نام کیا ہے؟“ اس کے گہیر لہجے پر متاثر
کے کاٹھ پر ہلکی سی سرخی اتر آئی۔
”گورین۔“

”گورین فرام۔؟“ جان گیا تھا کہ وہ امریکن نہ
تھی۔
”فرام اجین۔“

”گو کے تولورین فرام اجین کیا تم میرے ساتھ
ڈانس کر سکتی؟“ شری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سیم

نے مسکرا کر اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اس کی سیاہ
آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔
”نگر میں سہل ڈیوٹی پر۔“
”تمہاری سہل ڈیوٹی صرف میری بات مانتا ہے۔ سو
بتاؤ میرے ساتھ ڈانس کر سکتی؟“ اس کی بات گلے
ہوئے سیم نے اپنا سوال دہرایا تو لورین کے پاس مزید
انکار کی کوئی وجہ نہ رہی۔ اس نے جھجھکتے ہوئے
سیم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جسے اس نے دیر سے
سے لمحوں سے لگا کر لورین کے چہرے کو مسخ ہونے پر
مجبور کر دیا۔

وہ اسے اپنے ساتھ لیے ڈانسنگ فلور پر چلا آیا اور
سب کی حیرت بھری نظروں کی پردا کیے بتا اس کے
ساتھ ڈانس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ رات دیر سے
دیر سے ڈھلنے لگی مگر سیم کی بانہوں نے اسے خود سے
دور نہ جانے دیا اور جب صبح کے وقت پارٹی اپنے اختتام
کو پہنچی تو وہ مدھوش سالورین کو ساتھ لگائے اپنی شان
دار گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس وقت پارکنگ میں موجود
اس کے سب سے دوست یہ بات خبری جانتے تھے کہ
دونوں کی منہ بانی الوقت ایک سی ہے۔



”مارک! تم صحیح کہتے ہو۔ وہ یہاں شفٹ ہو چکی
ہے۔ پورے گھر میں اس کی چہرے موجود ہیں۔“ لارڈ
سے آئی جوزفین کی آواز نے مارک کو ایک گہری سانس
لینے پر مجبور کر دیا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پر دھرے ڈوڈو فریم پہ سے
نظریں ہٹائیں اور بیڈ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سیم کی اس
رازداری نے حیرت سے دھچکا پہنچایا تھا۔ جب سے
ان دونوں کی دوستی اعتبار کی ایک خاص منہ کو پہنچی
تھی۔ انہوں نے کبھی بھی ایک دوسرے سے کوئی بات
نہیں چھپائی تھی۔ پھر اس معاملے میں سیم نے ایسا
کیوں کیا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر ہونے کے ساتھ
ساتھ مل میں دیکھی لور جوزفین کے سامنے عجیب سی
شرمندی بھی محسوس کر رہا تھا حالانکہ ساری تفصیل

سننے کے بعد اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی مگر پھر بھی سیم کی اس حرکت نے اسے اندر ہی اندر غم کھدیا تھا۔

”صرف چہرے ہی موجود ہیں۔ مختصر سی بات سے بھی شفت ہو گئی ہیں۔“ مارک باہر آیا تو اندر کی کھٹی بنا چاہتے ہوئے بھی کچھ میں باز آئی۔

”مطلب یہ کہ یہ سب اسی کا کارنامہ ہے۔“
”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ جوزفین نے حیرت سے غصے میں بھرے شہر کا چہرہ دکھا۔
”عد ہے۔ تمہیں وہ سیل کہیں یا سیم کے ارد گرد نظر آ رہی ہے؟“
”لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس چوری میں اسی کا ہاتھ ہے۔“

”صرف اس چوری میں نہیں بلکہ سیم کے ساتھ ہونے والے حادثے میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔“ مارک یقین سے بولا تو جوزفین کی آنکھوں میں موجود حیرت دوچند ہو گئی۔

”اگر ایسی بات ہوتی مارک ابھی سیم اس لڑکی کو بخشا؟ تو ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے اس کے خلاف رپورٹ لکھوانا۔“ جوزفین کی بات پر مارک ایک لمبے گوناموش ہو گیا۔

”تو پھر وہ کہاں ہے؟“ اس نے نیا سوال اٹھایا۔
”اب یہ تو سیم ہی بتا سکتا ہے۔“ جوزفین نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی۔
”لوہ سیم صاحبہ سے کچھ پھوٹنے کو تیار نہیں۔“ مارے اشتعال کے مارک نے پاس پڑی کرسی کو ٹھوکر لگائی۔

”میں پولیس کو کل کر رہا ہوں۔ میں اس سارے گورکھ دھندے سے تنگ آ چکا ہوں۔“ جوزفین کو دیکھتے ہوئے اس نے غصے سے جیب سے سیل نکالا۔
”بہتر ہو گا اگر تم یہ کام نہ کرو۔“ جوزفین کے سامنے سے کہنے پر اس کا ہاتھ ساکت ہو گیا۔
”کیوں؟“

”کیونکہ یہ ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام صرف سیم کو جانے کے مطلع کرنا ہے۔ آگے پولیس کو کل کرنا یا نہ کرنا اس کا ذاتی فیصلہ ہے۔“ اس نے جیسے کچھ میں اسے سمجھایا تو مارک نے ایک گہری سانس لی۔ جوزفین ٹھیک کہہ رہی تھی۔

”مطلے کو پولیس تک پہنچانا واقعی ایک بڑا فیصلہ تھا جسے کرنے کا حق صرف سیم کو تھا۔ ویسے بھی جس حد تک رازداری وہ اس سے برتر تھا تھا اس کے بعد تو ہمارے سیم کو اس کی اس درجہ مداخلت پسند آتی بھی یا نہیں؟“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں سیدھا سیم کے پاس جانا چاہیے۔“ اس نے قدرے پرسکون آواز میں کہا تو جوزفین نے اطمینان کی سانس لی اور پھر اپنی اسٹائپس اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔

رات تو مئی سے زیادہ بیت چکی تھی جب حلقہ کی گھر میں آمد ہوئی۔ پورچ میں اس کی گاڑی رکھنے کی تو اذیت اپنے کمرے میں اس کی مختصر سی بیگم نے ایک نظر سوئے ہوئے سفیر صاحب پر ڈالی اور آہستگی سے اٹھ کر باہر چلی آئیں۔ انہوں نے آج سارا دن جس اہم صاحب کی کیفیت میں گزارا تھا وہ اس بل سوا ہو گئی تھی۔

تیز قدموں سے چلتی وہ بیڑ حیاں اتر کر لائن میں داخل ہوئی تھیں کہ سامنے موجود اعلیٰ دیوانہ کھلا اور حلقہ نے اپنے حیاں میں اندر قدم رکھا تھا لیکن چل ہی اس کی نظر صوب بیگم پر پڑی تھی اس کی بھنویں استہزائیہ انداز میں لوہ پر اٹھ گئی تھیں اور لیول پہ بنی دل جلانے والی مسکراہٹ فن نصیری تھی۔ اس نے لمٹ کر اپنے پیچھے دیوانہ بند کر کے لاک لگایا اور اطمینان سے دروازے کے قفل آکر مڑا۔

”اسلام علیکم! یہ چل میں ہاتھ ڈالنے پر سکون انداز میں بولا تو صوب کا منہ جوبڑے گیا۔
”تم کیا سمجھتے ہو۔ تم یہ تمنا کرنا کر کے لپا مقصد

پلوگے؟ میرے مبر کو اتنا مت آزمائو جن میں تمہارے کردار کی اصلیت تمہارے باپ کے سامنے کھولنے پر مجبور ہو جاؤں۔" غصے سے سرخ آنکھیں اس پر جھانے لگیں، لیکن سر دلیج میں بولیں تو جن کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"آپ کے جوتی میں آئے وہ کریں، لیکن ایک بات یاد رکھیے گا، آپ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتیں جبکہ میں ہر بات یا آہلانی سر سے منسوب کر سکتا ہوں۔" اور اس کی بات پر زب یکم کا دل دھک سے دھک گیا۔

"میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم اتنی گہری ہوئی بات کر سکتے ہو۔" انہوں نے نوکھ میں ڈھیلی بے یقین نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا کریں، وہ کہتے ہیں تا سببت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے۔" اس نے کندھوں کو خیف سی جنبش دی۔

"صحت بھولو جن اب مارنے والے سے بچانے والی ذات ہمیشہ برتر رہی ہے، میں ابھی زندہ ہوں اور میری مرضی کے خلاف ہر کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"آپ اپنی مرضی کر چکیں۔ اب میری باری ہے۔ دیکھتا ہوں کون میری راہ کھولتی کرتا ہے۔" ان کی آنکھوں میں دیکھا وہ دیکھا ہوا۔

"پہلی راہ کھولنے کرنے والے تم خود ہو۔ تمہارا گندہ کردار ہے کل کو اگر حالات تمہاری مرضی کا رخ لے بھی لیتے ہیں تب بھی ہر کم از کم تمہارے حق میں فیصلہ دینے والی نہیں۔" انہوں نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر سچائی کا آئینہ اس کے سامنے رکھ دیا، لیکن وہ بجائے شرمندہ ہونے کے طنزہ انداز میں مسکرایا۔

"یہ آپ کی بھول ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس لڑکی کو میری ضد مت بنائیں، مگر آپ نے میری بات نہیں سنی۔ اب دیکھیں میں آپ لوگوں کی ہر خوش فہمی کا کیسے خاتمہ کرتا ہوں۔" اس کی بات اور انداز پر زب یکم کا دل اذیت سے بھر گیا۔

"میں میری ہر خوش فہمی کا خاتمہ بہت پہلے کر چکے ہو جن اہلش کہ تم میری آزمائش بننے کے بجائے میرا

مان، میرا تجربے ہوتے تو شاید آج وقت پہنچا اور ہو نہ۔" ایسا مان اور تجربے سے بہتر ہے کہ میں آپ کی آزمائش بنا رہوں۔ مجھے ویسے بھی غصوں سے ہاتھ ملانے کی عادت نہیں، کلٹ دار کچے میں وہ کتنا آگے بڑھ گیا تھا اور زب اس کے وار کی سختی پہ اپنا لچلا ب دانتوں سے دبا گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں نہ چاچے ہوئے بھی بھر آئی تھیں۔

"یا اللہ مجھے حوصلہ دے۔ میری مدد فرما میرے مالک۔" بتے اشکوں کے درمیان وہ بیٹھ کی طرح صرف اپنے رب کو ہی پکار پائی تھیں۔ اس لڑکے کی ہٹ دھرمی اور ان کی قسمت مزید کیا رنگ دکھانے والی تھی۔ ان کا دل یہ سوچ کر ہی ہولنے لگا تھا۔



رات کا ایک بڑا حصہ گزر چکا تھا، مگر خیر انجم یکم کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ نہ سوچوں میں کوئی ربط تھا اور نہ دل و دماغ کو یکسوئی حاصل تھی۔ گزرے وقت کی تلمیحوں کو یاد کر کے کبھی آنکھیں زار و قطار برسنے لگتی تھیں اور کبھی آنسو الے وقت سے جڑے تمام خوف انہیں یوں مجھد کر ڈالتے کہ ان پر وحشت میں ڈوبے بنجر صحرا کا گلن ہونے لگتا۔

در اصل وہ آج تک اپنے فیصلے کے لیے خود کو معاف ہی نہیں کرائی تھیں اور کرتیں بھی کیسے؟ اولاد کی ہر تکلیف آپ کو نئے سرے سے پچھتاوے کے چرکے لگاتی ہے یوں کہ آپ ساری زندگی کے لیے اپنی ہی نظروں میں مجرم بن جاتے ہیں۔

جرم کا ایسا ہی اذیت ناک احساس دن رات انجم یکم کو بھی کھائے جا رہا تھا۔ ان کی ایک غلطی نے مہر کی زندگی کو ایسے امتحان سے دوچار کر دیا تھا جس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

انہیں آج بھی اس دن کا ایک ایک لمحہ یاد تھا، جب اپنی محبت اور خلوص کے ہاتھوں مجبور ہو کے انہوں نے ایک ایسے کام کے لیے رضامندی دے دی تھی جو وہ جانتی تھیں کہ اتنا مناسب نہ تھا، لیکن یہ بھی ایک

حقیقت تھی کہ اگر آج بھی وقت انہیں اسی جگہ اور ان ہی حالات میں دیا نہ لے جاتا اور ان کے سامنے ان کی بیمار والدہ اٹنی ایک بظاہر بے ضرر سی خواہش کا اظہار اسی ماں سے کرتیں تو شاید وہ آج بھی ان کی خواہش کا احترام اسی طرح کرتیں جس طرح انہوں نے اس روز کیا تھا جب ماں جان کا نرم و ضیف ہاتھ ان کے ہاتھ پہ آن ٹھہرا تھا۔

”اچھ امیری ایک بات مانو گی؟“

”جی ہاں۔“ انہوں نے پاس بیٹھی ماں کی جانب محبت سے دیکھا تھا جو محض چند ہی ماہ میں مکمل کر آجی ہو گئی تھیں۔ سچ ہے مولاد کا غم اچھے اچھوں کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے جبکہ وہ تو پہلے ہی ایک بڑا سی عورت تھیں جنہیں ماں کے شریک سفر جوانی میں ہی دو کم سن بچوں کے ساتھ دنیا کے سرد گرم بھیلنے کو تھا چھوڑ گئے تھے گو کہ ان کی رفاقت کے بعد اس وضع داری اور انسانیت کے دار میں ان کے مرحوم شوہر کے بہن بھائیوں نے ان کا دلور ان کی بچیوں کا بھرپور طریقے سے خیال رکھا تھا مگر جو ماں اور جو بھروسا ایک شوہر اور ایک باپ کی موجودگی میں زندگی پر کیا جاسکتا ہے وہ حاجی صاحب کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا لیکن پھر بھی صد شکر تھا کہ ماں کی زندگی بہت اچھے اور باوقار انداز میں گزری تھی۔

بڑے ہونے پر اچھ کا رشتہ ان کے تایا نے اپنے اکلوتے بیٹے ابراہیم کے لیے مانگ لیا تھا۔ یوں وہ بڑی خوشیوں اور دموم و حام سے بیاہ کر اپنے تایا کے گھر چلی گئی تھیں۔ ابراہیم جو دیسے ہی اپنی چچی کا اپنی ماں کی طرح احترام کرتے تھے اور زیب کو اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح چاہتے تھے انہوں نے شادی کے بعد نفیسہ بیگم کی زندگی میں صحیح سسٹن میں ایک بیٹے کی کیوری کردی تھی۔ جس پہ وہ اپنے رب کی بے حد شکر گزار تھیں۔

زیب کے سمجھ دار ہونے پہ جب ماں کے لیے ایک غیر خاندان سے رشتہ تیا تب ابراہیم صاحب نے ہی ہر طرح کی ضروری چھان بین کروا کے نفیسہ بیگم کو

مطمئن کیا جس کے بعد زبید خست ہو کے اپنے گھر چلی گئیں۔

بیٹیوں سے فراغت کے بعد ماں جان ابراہیم اور اچھ کے بے حد اصرار کے باوجود ماں کے گھر منتقل نہ ہوئیں وہ ان نازک رشتوں کی ادھانج سے بہ خوبی واقف تھیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنے ہی گھر میں اپنے پرانے اور قاتل بھروسا ملازن کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تھا اور تب اچھ ایک ملازمت نے ایک ایسی کمٹ لی تھی کہ ماں سب کی پرسکون زندگیوں میں پھیل رہا ہو گئی تھی وارنٹا کاری تھا کہ ہفتوں وہ خود کو سنبھال نہ پاتے تھے لیکن آخر کب تک؟ نہ چاہتے ہوئے بھی ماں سب کو سنبھال رہا تھا مگر ماں جان کے ہاتھوں وجود میں گزری طاقت اور ہمت پھر لوٹ نہ پائی تھی۔

اس گزری آزمائش نے انہیں توڑ کے رکھ دیا تھا اور وہ محض چند ہی ماہ میں بستر سے اٹھ گئی تھیں۔ سوچوں اور پریشانوں نے ماں کی صحت کو کمزور کی طرح کھالیا تھا۔ اچھ اور ابراہیم ہر ممکن طریقے سے ماں کی سلی و تشفی میں لگے رہتے لیکن درود میں ڈوبا ماں کا دل کسی طور سنبھلنے میں نہ آتا تھا۔

پھر ایک روز ایک خیال نے اچھ کی ماں کا دامن تمام لیا جس کے محض تصور سے ہی ان کی بے چین روح کو قرار سا آنے لگا۔ اس روز انہوں نے سیر ہو کے کھانا بھی کھلایا اور زیب سے ذخیر ساری باتیں بھی کیں اور جب شام میں اچھ نے چکر لگایا تو ان کے اصرار پر وہ دونوں بیٹیوں کے سارے اپنے گھر سے نکل کر لان میں آ بیٹھی تھیں۔ اور تب انہوں نے اپنے دل کی بات کہنے کو اپنی کا ہاتھ تمام لیا تھا۔

”تم لوگ مجھے میرے نواسا تو اسی کی خوشی میری زندگی میں ہی دکھاؤ۔“

”میں کبھی نہیں ماں“ اچھ نے ابھی نظروں سے اٹھ کر امید چھوڑ رکھی۔

”میں چاہتی ہوں، مر اور اپنی کانٹھ ہو جائے۔“

لورن کی بات سنا دلوں نہیں چوک گئیں۔
مگر لورن نے دلوں تو ابھی بچے ہیں۔ "انجم حیرت سے مسکرائیں۔

"جانتی ہوں، لیکن کیا کروں میرے پاس مزید وقت نہیں ہے۔ یہ بیل گرجی سے بھیگی سی ہنسی نہیں تو دلوں کو کل جیسی کسی نے بھیج دیا۔
"کیسی باتیں کر رہی ہیں لورن ابھی تو آپ کو بہت سا بچا ہے۔" یہ بیل کل کلاؤ تھا۔

بیل بیل کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت بیل نہیں جانتی تھی۔ یہی حالت تم لوگوں کے سامنے ہے۔ تم جنہوں نے بچوں کے لیے جو فیصلہ کیا ہے اس نے مجھے کتنی خوشی دی ہے۔ تمہو لوں سوچ بھی نہیں سکتیں، لیکن میں تمہارے اس فیصلے کو بھی پورا ہوتا دیکھ سکوں گی۔ یہ اب نہیں لگتا۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ تم دلوں مجھے خوشی کی یہ گزیاں ابھی دکھا دو تاکہ میں اپنی پریشانی کے ایک بڑے حصے سے نجات پاسکوں۔ ورنہ وقت تو کتنی شائع شدہ میں بھی آئے گا۔ بس تمہاری بات نہ دیکھ سکے گی۔" بات کرتے کرتے لورن کی تواضع بھر پور ہوئی تو بخور لورن کی بات سنی انجم لورن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"آپ کی خواہش سر آنکھوں سے لورن مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" سکتے ہوئے انجم نے لورن کا ہاتھ لیں سے لگا لیا۔

"جیسی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ تمہو لوں کو تمہارے بچوں کی دیکھو خوشیوں دکھائے۔" انہوں نے جبکہ گرجی کا ہاتھ لیا۔

"ابراہیم کو صبح میرے پاس بھیج دتا میں اس سے خود بیت کرلوں گی۔" لورن کی بات سنا انجم نے مسکراتے ہوئے ثابت میں سر ہلا دیا۔

"جولو زنی اندر سے کچھ شعلے کر کو۔ میں لورن تمہاری سحر منہ شعا کریں گے۔" لورن کے مسکراتے لہجے سے دلوں کو کراہتیں پڑی تھیں۔ ان کی یہ ہنسی اس گھر کے دلوں کو بار بار سنا دلوں کو سنی

لورن جان نے ابراہیم صاحب سے کیا کہا تھا۔ چاہے نہیں، لیکن وہ پورے دل و جان سے نکاح کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ خاندان میں اس خبر پر لے جانے کے تاثرات آئے تھے۔ ہاں جنہوں نے اعتراض کیا تھا۔ انہیں ابراہیم صاحب نے خود جواب دے دیا تھا۔ یوں میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی کے مصداق سب سے بڑے والے خاموش ہو گئے تھے لورن و لورن بھی آگیا تھا جس کو سالہ ہر لورن بارہ سالہ ہنسی کو زرق برق کپڑے پہنا کر بلی کے دامن میں لایا تھا لیا گیا تھا لورن پھر لورن کی سوچوں میں ہی نکاح کی پوری کارروائی مکمل میں آئی تھی۔

اس دور لورن سب سے ہی کی آنکھیں کتنی ہی بار لٹک بار ہوئی تھیں لورن کتنی ہی بار وہ سب لورن دلوں کی شرارتوں لورن معصوم سوالوں پر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک یادگار دن تھا جس کے کئی یادگار لمحوں کو کیرے نے محفوظ کیا تھا۔ اس دن کا اختتام ڈھیلو دھولوں پر ہوا تھا۔

نقصہ بیگم کی خوشی دیدنی تھی۔ ان کی صحت کی جانب سے سب سے کولب سلی سی ہو چلی تھی، لیکن ہوا وہی تھا جو انہوں نے کہا تھا۔ اس تقریب کے محض ڈیڑھ گھنٹے بعد اللہ کو پہاڑی ہو گئی تھیں۔

لورن کے انتقال نے انجم لورن کی دنیا اندر گہری تھی۔ انہیں اس بات کا بھرپور اطمینان تھا کہ انہوں نے اپنی بات کی خواہش پوری کر کے انہیں خوش و خرم اس دنیا سے جانے کا موقع دیا تھا۔ مگر تب وہ نہیں جانتی تھیں کہ آنے والا وقت اپنے اندر کیسے کیسے طوفان سیٹھان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

لورن کی زندگیوں کے پرسکون ساحل اسے بھی یہ جیسے ہوئے طوفان بڑی زور سے آکر ٹکرائے تھے۔ جس کے نتیجے میں ہر سو دکھ لورن کو سکوئی پھیل گئی تھی۔ ایسی آنکھوں نے ان سب کو گھیرا تھا کہ انہیں سلجھانے کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی تھی۔ ایسے حالات

میں زندگی صرف آج تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ آئے
 دلا کل اپنے اندر کیا راز سمیٹے ہوئے تھا کسی میں
 کرپنے کی ہمت نہ تھی۔ اور گزرا ہوا کل جو انہیں
 چھوڑ گیا تھا انہیں اگر مل بیٹھ کر سلجھانے کی کوشش
 کی جاتی تو ایسی بہت سی گنجائیاں سامنے آ جاتیں
 جنہیں آج تک مصلحت کے روئے تلے نہ لب اور
 مرچ پائے بیٹھی تھیں اور ان کی یہی خاموشی سنن کو
 ان پر طوی کیسے دے رہی تھی۔

وہ زیب بیگم کو تو حوصلہ رکھنے کی تلقین کر چکی
 تھیں۔ لیکن خود لب ہمت پار بیٹھی تھیں۔ ان ہی
 سوچوں میں رات تمام ہوئی تھی۔ نتیجتاً صبح ان کی
 آنکھیں میں غور سرد سے پھٹ رہا تھا۔ مگر تو انہوں
 نے طبیعت خرابی کا بہانہ بنا کے زبردستی کل جاتے پر
 مجبور رہا تھا۔ لیکن ایراہیم صاحب کو مطلع کرنا ضروری
 تھا۔

”کل زیب کا فن کیا تھا۔ وہ اور صغیر مہر کے سلسلے
 میں بات کرنے کے لیے آج ہماری طرف آ رہے
 ہیں۔“ انہیں کے لیے تیار ہوتے ایراہیم صاحب کی
 طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے دھیسے لیجے میں کما تو ان
 کی نظرس اپنی شریک حیات کی جانب اٹھ گئیں۔

”چھانو تمہاری یہ حالت اس فن کا نتیجہ ہے۔“
 لیجے میں مولے کی تہ تک پہنچ گئے تھے۔

”کیوں آپ کو برٹانی نہیں ہوئی؟“ انہوں نے
 پوچھل لیجے میں سوال کیا۔

”ہماری برٹانی اپنی جگہ۔ لیکن صغیر بہر حال ہم
 سے ہر سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔“ ان کی بات پر
 انجم بیگم کے اندر بے چینی پھیل گئی۔

”میں جانتی ہوں کہ صغیر ہم سے ہر سوال کرنے کا
 حق رکھتا ہے۔ لیکن۔“ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ
 وہ کن الفاظ میں اپنا درد عاشوہر کے سامنے بیان کریں۔
 اس حقیقت سے داخل آگہ تھیں کہ ان کا ولاد کی
 طرف داری میں کما گیا ایک بھی لفظ ایراہیم صاحب

کے غصے کو بھڑکانے کے لیے کافی تھا۔ اسی لیے جبکہ
 کر خاموش ہو گئی تھیں۔

”جب تم یہ حقیقت جانتی ہو تو پھر اس ”لیکن“ کی
 کوئی معجائش تمہیں نہ جانی اچھے۔“ اور انجم بیگم کے
 چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔

”مانتی ہوں۔ لیکن پھر بھی آپ سے صرف دعا
 کہوں گی کہ مہر کے لیے بہتر مستقبل کی خواہش میں
 آپ کیس اس کی مشکلات میں لٹنا نہ کر دیجئے گا۔
 اس کے لیے نئے سرے سے کوئی اچھا اور مناسب
 شریک سرزد ہو جاتا ہمارے لیے آسان نہیں ہوگا۔“
 ان کی بات پر ایراہیم صاحب نے بھر کو خاموش ہو گئے۔
 ”تم نے مہر سے ان کے آئے کھڑ کر کیا؟“ چند لمحوں
 کے توقف کے بعد انہوں نے بنا کسی خیال آرائی کے
 نیا سوال کیا۔ انجم بیگم کا بوجھل حل مزید بوجھل ہو گیا۔
 ”نہیں۔“

”جہاں کیا تم زیب سے کہو کہ وہ بچیوں سے کہہ کر
 مہر کا کوئی پروگرام بنالوے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آج
 شام گھر پر رکے۔“ وہ گاڑی کی چلیاں اور عرف کیس
 اٹھاتے ہوئے بولے۔ انجم اک گہری سانس لیتی اٹھ
 کھڑی ہوئیں۔

”میں بھی لگا سوچ رہی تھی۔“

”بھی بات ہے۔ چلو پھر شام میں ملاقات ہوتی
 ہے۔“ وہ دو دروازے کی جانب بڑھے تو انجم بیگم کی
 طرف انہیں رخصت کرنے کو ان کے پیچھے چل دیں۔

”مبارک ہو سہم۔ تم کا بیاب ہو گئے۔ دست امیں
 لب اپنی حد میں رہوں گا۔“ مارک لور جو زمین ساتھ
 ساتھ چلتے سیم کے کمرے میں داخل ہوئے تھے اس
 کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مارک کا لیا ہوا انداز دھوڑ
 بن کے اڑ گیا تھا۔ خود کو گنجھونے سے روک نہ پایا
 تھا۔

”دیکھا مطلب؟“ بہتر۔ دروازہ سیم نے چونک کر اس
 کی طرف دکھاتو۔ کتنی سے مسکرایا۔

”میری فضول باتوں کے مطلب کو چھوڑو۔ اور یہ سن لو کہ تمہارے گھر میں جوڑی ہو گئی ہے۔“

”مارک!“ اس کی بدلی تھی۔ جوڑ فین دنگ رہ گئی تھی۔ جبکہ سیم بالکل سناکت ہو گیا تھا۔

”میں۔ میں معذرت چاہتی ہوں سیم! تم پلیز حوصلے سے کام لو۔ دیکھو وہ جو کوئی بھی ہے پولیس اسے دھوڑ لے گی۔“ شرمندگی کے مارے جوڑی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے بات کو سنبھالے۔ بھلا کوئی کسی مریض کے ساتھ ایسا سلوک کرتا ہے؟

”مجھے کسی کو نہیں دھوڑنا۔“ سیم کی بے تاثر توازن شرمندہ ہوتی جوڑ فین کی سماعتوں سے ٹکر لائی تو وہ ساری شرم بھول بھول حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جبکہ مارک طنز آمیز انداز میں قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم جوڑ کو اچھی طرح جانتے ہو سو دھوڑنا کیسا؟“ سیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے گاندھار لہجے میں حکایت تو سیم جیسے پختہ پڑا۔

”ہاں! جانتا ہوں پھر؟“

”پھر یہ کہ ذیل تو ہی! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم اس عورت کو اپنے گھر میں لے آئے ہو؟“ وہ غصے سے بولا تو گھبرائی ہوئی جوڑ فین نے ہوشیارانہ نظروں سے دوڑانے کی جانب دیکھا۔ یہ شور شرابا کیوں اسپتال کے عملے کو متوجہ کر لے گا۔

”میری مرضی!“ غصے سے کہتے ہوئے سیم نے آنکھیں پر بازو رکھ لیا۔ مگر مقبیل بھی مارک تھا وہ لے لے ڈگ بھرتا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اور ایک جھٹکے سے اس کا بازو نیچے گر لیا تو جوڑ فین کی سانس طپس میں ایک ٹپ۔

”تمہاری اس حالت کی زبرداری بھی وہی ہے؟“

”اور جوڑ فین کو لگا کہ اب تو دونوں دوستوں کے درمیان جھڑپ ہوئی ہی ہوئی۔ لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب سیم چند لمحوں خاموشی سے مارک کا چہرہ دیکھنے کے بعد مل کر فٹ لہجے میں بولا۔

”میں اپنی اس حالت کا میں خود بخود وار ہوں۔“

”پلیز سیم! اب تو بتاؤ مارک یہ۔ کیسے ہوا؟“ مارک کا غصہ بے بسی میں ڈھل گیا۔

”کیوں اور کیسے کے ذکر کو جانے دو۔ یہ پوچھو کہ کس لیے ہوا؟“ اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ بو بھل لہجے میں بولا تو مارک نے جیسے اربابانہ لی۔

”اچھا۔ یہی بتاؤ کہ کس لیے ہوا؟“

”مجھے موت کا احساس دلانے کے لیے۔“

”کیا؟“ مارک نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے ذہنی توازن بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

”کیوں یقین نہیں آیا؟“ اس کے تاثرات پہ سیم کے لبوں پہ پھسکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”مجھے بھی نہ آتا اگر میں اس رات بدبو سے بھرے اس کچرے کے ڈھیر پر بیارود گار نہ پڑا تھا۔“

”مجھے لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

مارک نے تشویش سے اسے دیکھا۔

”اول ہوں طبیعت ابھی تو صبح معنوں میں ٹھیک ہوئی ہے۔“ اس کے جواب پہ مارک کی پریشانی دوچند ہو گئی۔ چند سیکنڈ اس کی جانب دیکھنے کے بعد وہ ڈاکٹر سے بات کرنے کی نیت سے پلٹا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھاتا، سیم نے اس کی کلائی تھام کر اسے اپنی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

”اس بار تو میں اس عورت کو مل گیا۔ نور میری جان بچ گئی۔ لیکن اگر میں دوبارہ کسی کو نہ مل سکا تو؟“

”سیم! کھو تم اس حادثے کو ذہن پہ سوار۔“

”میری بات کا جواب دو مارک۔ اگر میں دوبارہ کسی کو نہ مل سکا تو؟“ اور مارک اسے بے بس نظروں سے دیکھا۔

”کوئی جواب نہیں ہے نا۔ مگر میرے پاس ہے۔ تو میں کسی کچرے کے ڈھیر یا کسی تیز رفتار گاڑی کے ٹانوں تلے آ کے یا اپنے فلیٹ کی تنہائی میں یا شراب کے نشے میں کسی بار میں ایک تنہا لاش کی صورت پرانہ جاؤں گا جس کے قریب جاتے ہوئے بھی ہر کوئی ڈرے گا۔ اس وقت اگر میری جیب سے کوئی نشانی نکل آئی تو شاید کہیں سے دھوڑ دھانڈ کے نہیں کل کر لیا جائے۔“

ایک کے بعد ایک نوالے منہ میں رکھتا جا رہا تھا اس کے سوال پہ مارک نے نظریں اٹھا کے جوی کی طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا کٹاپریشانی سے پلیٹ میں رکھ دیا۔

”میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے کیا ہو گیا ہے لیکن ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ وہ خوف کا شکار ہے اور ایسی حالت میں ہمیں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

”تو پھر؟“

”پھر یہ کہ اسے ڈسپانچ کروانے کے بعد میں کچھ دن اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہوں گا۔ اگر نہیں اعتراض نہ ہو تو۔“

”میں کیوں اعتراض کروں گی اس کی حالت نے تو مجھے خود پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اسے جلد از جلد کسی سلیکٹرٹ کو دکھانا ہو گا۔“ اس کے منظر انداز پہ مارک نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”بے فکر رہو۔ میں کل صبح ہی کسی اچھے سلیکٹرٹ سے ٹائم لیتا ہوں۔“ اس کی بات پہ جو زمین نے اک کمری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔



مرکاج میں تھی۔ جس وقت جائشہ کا فون آیا تھا اور نوریہ شام میں شاپنگ کا پروگرام پلے ہو چکی تھی۔ اور اسے ساتھ لے جانے پہ معر تھی۔ مجبوراً صبر کو ابی بھرنی پڑی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد اس نے کھانا کھا کے نماز پڑھی اور کچھ دیر سنانے کے بعد تیار ہو کے نیچے آئی تھی۔ لیکن لاؤنج میں انجم بیگم کو سوچوں میں غلغل بیٹھا دیکھ کے وہ چونک گئی تھی۔ یہ وقت تو ان کے آرام کا ہوتا ہے۔ پھر بھلا۔

”کیا بات ہے ماما جان۔ تب یوں کیوں بیٹھی ہیں؟“ تیز قد مول سے ان کے قہر سے تپتے ہوئے اس نے پریشان نظروں سے ان کی جانب دیکھا جو اس کی توازن پہ اختیار جو تک گئی تھی۔

گا۔ تم نہیں نہ ہو سکے یا سرے سے کوئی نشانی ہی نہ مل سکی تو کچھ پہ ایک لارڈارٹ لاش کا لہجہ ہلکا کے چند دنوں کے لیے سرد خانے میں پھینک دیا جائے گا۔ اور میری باری آنے پہ چند انجان لوگ ایک دن مجھے وہاں سے نکل کے ایک گناہم کھڑے میں ڈال دیں گے۔ جس پہ پہچان کا نہ تو کوئی کتبہ ہو گا اور نہ کوئی تحریر۔ پھر اگر تم بھی مجھے ڈھونڈنا چاہو گے تو ڈھونڈنا پاؤ گے۔ میں کہاں کھوجاؤں گا میرے اپنوں کو کبھی پتا نہ چل سکے گا۔ کیا میں ایسے ہی کسی بے کس اور گناہم انجام کے قاتل ہوں مارک؟“

بولتے بولتے اس نے اچانک سوال کیا تو دم سادھے کھڑا مارک اسے خاموشی سے ایک ٹک دیکھے گیا۔ اس منظر کشی نے اس کی رگ و پے میں عجیب سی سنسناہٹ ڈا دی تھی۔

”بولو مارک کیا میری موت کی خبر میری لاش کی بدلو لوگوں تک پہنچائے گی؟“ اس نے مارے وحشت کے اپنے ہاتھ میں دیا مارک کا ہاتھ دیا تو مارک خود بھی بے چین ہو گیا۔

”نہیں سیم! نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تم ایسے کسی انجام کے مستحق نہیں ہو۔“ اس نے جب تک کر شدت جذبات سے اس کا شانہ دیا۔ تو سیم کے پورے وجود میں در آنے والی بے قراری اور سراپا سنگی سمٹ سی گئی۔

”بس مجھے یہ سننا تھا۔ اب مجھے کوئی الجھن کوئی کشمکش نہیں۔“ کمری سانس لیتے ہوئے اس نے پرسکون انداز میں آئیکس موند لیں۔ اس کی اس پل پل بدلتی کیفیت پہ مارک نے گہرا کے جو زمین کی جانب دیکھا جو اسی کی طرح حیران پریشان سی کمرے کے وسط میں پھرائی کھڑی تھی۔



”یہ سیم کو کیا ہو گیا ہے؟“ خاموشی سے کھانا کھاتے ہوئے جو زمین نے اچانک سر اٹھا کے مقتل بیٹھے مارک کی جانب دیکھا جو اس کی طرح سوچوں میں گم

میں ہی غصہ نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے سوچا
تھوڑا سی۔ وی دیکھ لوں۔" توازن میں بٹاؤ پیدا
کرتے ہوئے مسکرائیں۔ مہر نے ایک نگاہ اندر بڑے
نہی۔ وی پہ ڈال کے کن کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا
گئیں۔

"کیا بات ہے مہاجن۔ تب مجھے صبح سے پریشان
لگ رہی ہیں۔" مہن کے برابر میں بیٹھتے ہوئے اس نے
کن کے شلے۔ ہاتھ رکھا تو انجم بیگم کی آنکھیں نہ
پا جتے ہوئے بھی نمز آئیں۔

"مہر ایسا کب تک ملے گا میرا؟" مہن کے استفسار پر
ایک پوچھ سانس اس کے لیوں سے ٹوٹ کر فضا میں
پھری گئی۔ جان گئی تھی کہ انہیں کن کی بات سنا رہی
تھی۔

"تب اس بات کو قیل کہیں نہیں کر لیتیں۔ مہا
جان کہ زندگی باب پونی گزرتی ہوئی ہے۔"

"زندگی کوئی بچوں کا کھیل ہے جو میں تمہاری اس
فصلیات کو قیل کر لیں؟ ہم آج ہیں کل نہیں ہمیں
کے بعد کبھی سوچا ہے کہ کیا ہو گا؟" انہوں نے غصے
سے دیکھا تو وہ نگاہیں جھکا گئی۔

"قرب لور صغیر کے سلتے ہم ملے کیا کم شرمندہ
ہیں جو تم ہمیں نزد شرمندہ کرنے کی ہوتی ہو۔"

"تب کہیں شرمندہ ہوتی ہیں۔" جاننے ہیں کہ یہ
میرا اپنا فیصلہ ہے۔" بکلیں اٹھاتے ہوئے جیسے لہجے
میں بول۔

"یہ بولانی بھرے فیصلوں کو کوئی نہیں مانتا۔
اگر اب تک خب ہیں تو صرف اس لیے کہ تم خود خوش
کے ناخن لو۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ میں خود ہی
کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔" مہن کے قلعی لہجے
مہر کے چہرے پر اضطراب بھرا۔

"ہیلز مہاجن! اب لوگ ایسا کوئی قدم نہیں
اٹھائیں گے۔" اس نے خطرہ ٹھہلے سے دیکھتے
ہوئے کن کا ہاتھ تھلا۔ لیکن اس سے پہلے کہ انجم کوئی
جواب دیتی سلاؤن کا دوا نہ کھلنے کی توانا نہ دواؤں نے
ایک ساتھ پلٹ کر دوا نہ کی جانب دیکھا۔

"مہر لیلیا ہر جاکشلیلی کی گاڑی آئی ہے۔" مہن
متوجہ دیکھ کے دل شیر نے اسے وہیں سے مطلع کیا تو
مہر بھلے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا مہاجن! میں جا رہی ہوں۔" اس کی نظریں
کن کے تھکے ہوئے چہرے پہ جا ٹھہریں۔ "آپ پلیز
کچھ دیر آرام کر لیں۔"

"اگر کئی ہوں۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولیں۔ مہر
بے بسی سے انہیں دیکھتی پلٹ کر پوچھ لیا تو مہن سے
باہر نکل گئی۔

اس کے ملے جانے کے بعد انجم کچھ لمحے پونی خالی
لذتہنی کے عالم میں بیٹھی رہیں لور پھر ہاتھ پر ہوا کر
سلنے رکھا تو ان اٹھایا۔ کن کی انگلیاں "قاضی دلا" کا
نمبر ملنے لگی تھیں۔



مہن نے تم سے بڑے وقوف اپنی زندگی میں
نہیں دیکھا سیم! لور زمین پہ گرے درد سے اٹھ لیں
ہوتے سیم کی آنکھیں ہر وقت بھلائے مارے بے چینی
کے پھٹنے کے قریب ہوتی تھیں۔

ہسپانوی نقوش سے سجا اس کا حسین چہرہ مسخ لور
حکارت کے رنگوں میں ڈوبا ایک لمحے کو اس کے قریب
جھکا تھا لور اگلے لمحے سیدھے ہوتے ہوئے اس نے
اپنی ٹانگ پوری طاقت سے سیم کی پسلیوں میں ماری
تھی۔ اس کے جوتے کی نوک نے سیم کو ہلایا ہے
مجبور کر دیا تھا اک کر لور اس کے لیوں سے ٹکلی تھی لور
سوئے ہوئے سیم کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی
تھی بے اختیار نموک نکتے ہوئے اس نے لیٹے لیٹے
کر کن تھماتے اپنے دائیں طرف دیکھا جہاں مارک
بے خبر سو رہا تھا سیم دیکھ کے اطمینان کا گرا احساس
سیم کو اپنے اندر اترا محسوس ہوا۔

دھڑ سے سب خود کر اس نے اپنا سینہ مسلا تاکہ
اس بے چینی لور گہرا ہٹ سے نجات پاسکے جو اس تلخ
حقیقت نے سوتے میں بھی اس کے اندر جگا دی تھی
مگر اس خوب صورت ناگن کا چہرہ لور اس کا دوا ہوا زہر

اس کے روم روم میں کھنچاؤ بپا کرنے لگا تھا یہ حادثہ تو جیسے اس کی مدح تک سے چٹ گیا تھا اور یہی نہ چٹا؟ وہ اس لڑکی کے ہاتھوں صرف لوٹا نہیں گیا تھا بلکہ ذلیل ہوا تھا۔ جسم سے لے کر احساسات تک اور احساسات سے لے کر مدح تک ذلیل!

لہجے جب اس پر اچانک پل پڑنے والے لڑکوں کے ہاتھ اور پاؤں لٹکا بھر کور کے تھے اور اس کی وردہ سے بند ہوتی آنکھوں نے لورین کو اپنے قریب دوڑا تو جھٹکا رکھ کے اس کا اپنی جانب بڑھتا ہاتھ تھامنا چاہا تھا اس یقین سے کہ شاید وہ نازک سی لڑکی اسے من غفلتوں کے نرغے سے نکل لینے میں کامیاب ہو جائے وہ اس کی زندگی کے سب سے کربناک لمحے تھے کیونکہ اگلے ہی پل لورین نے اس کی ہر خوش قسمی کی وہ جیاں اڑاتے ہوئے انتہائی بے رحمی سے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا تھا اور اس کے ہاتھ انتہائی سرعت سے اس کی جیبوں میں رینگنے لگے تھے جنہیں خالی کرنے کے بعد اس نے اس کی کلائی میں بندھی مٹی گھڑی اتار کے پیچھے کسی کو تھمائی تھی۔

تب اسے اٹھ کر دیکھ کے سیم نے اپنے غصہ میں پورے وجود کی پوری اہت صرف کر کے اس کی کلائی جکڑ لی تھی۔

بے اختیار لورین کی نظریں اس کی وحشت زدہ بے یقین نظروں سے ٹکرانی تھیں اور اس کے سرخ لب اسٹیک سے سجے ہوئے ٹول کی تراش میں بڑی بے رحمی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

”میں نے تم سے بڑا بے وقوف اپنی زندگی میں نہیں دیکھا سیم!“ اس کا تسخیر اور حقارت کے رکھوں میں ڈوبا حسین چہرہ پل بھر کو اس کے قریب جھٹکا تھا اور اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگ پوری طاقت سے سیم کی پسلیوں میں ماری تھی۔ اس کے جوتے کی ٹوک نے سیم کو بلبلانے پر مجبور کر دیا تھا اس کے لبوں سے اک کر لہ لگی تھی، لیکن لذت اور زلت کی جو کراہیں اس پل اس کے گلے و دل سے نکلی تھیں وہ نامل اس کے اندر گونج رہی تھیں۔

تھیں۔
احصاب کے تھوڑے اس کے اندر سگریٹ کی طلب بیدار کھڑی تھی۔ وہ کنیوں کے بل زور سے آہستگی سے اٹھ بیٹھا تھا۔

سینٹر نیمل کی دراز سے سگریٹ کا بیٹ لورین لائٹر نکل کے وہ سیدھا ہونے کو تھا کہ اس کی نظر نیمل کی ٹاپ پر پڑی، جہاں لب کے باں رکھا فوٹو فریم عتاب تھا۔ چہ غلط نیمل کی مسکراہٹ کو دیکھنے کے بعد اس نے پلٹ کر مارک کی طرف دیکھا تھا زندگی میں پہلی بار سیم کو اپنے دل میں کسی کے لیے تشکر کے احساسات اٹھتے محسوس ہوئے تھے بلاشبہ ایک مسرور انسان اور بالکل دوست تھا اسے مارک کا اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا ایک بالکل درست نکتہ لگا تھا۔

اس کے چہرے سے ٹائیں ہٹاتے ہوئے وہ خود سے لطف ہٹا کے آہستگی سے پیڑ سے نچا تر کیا تھا اور لب بجا کر ہٹ لب کی پوشی میں دھبے دھبے چلا کر وہاں کھل کے باہر لائٹ میں نکل گیا تھا۔

اپنے پیچھے کسی آہٹ کے دوا اندر کر کے اس نے لائٹ جلتی تھی لورین چلا ہوا صوفے پر بیٹھا تھا۔ سگریٹ جلا کے اس نے ایک کراکش لیا تھا۔ دست و پاں بعد سکھان کی ایک گہری لہر اسے اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی تھی۔ ایک سگریٹ ختم کر کے اس نے فوراً دوسرا سگریٹ جلا لیا تھا۔

اپنی حیاں میں دھوئیں پاڑتے ہوئے اس کی نظر سامنے رکھے سینٹر نیمل کی جانب اٹھی تھی اور وہ بے اختیار جھٹک گیا تھا۔

نیمل پہ سجے بیٹھ قیمت کرشل بھڑاب عتاب تھے، لیکن فن کے برابر میں ڈیرہ ہنر پہلے لاکر بھلے جانے والے نہایت سستے سے چھ ایک رنگ برنگے ڈیکوریشن ہسڈ ہیں موجود تھے یا ایک اس کا اپنے من کی جانب بڑھتا ہاتھ مانت ہو گیا تھا اور آئینے کو اس میں برجم سی گئی تھیں۔ ان ڈیکوریشن ہسڈ کو لورین کے گھر سے لاکر وہاں اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی محبت سے سجایا تھا وہ تب وہاں رکھے تھے

جیتی کر شل بس سے بھی زیادہ بچے۔ وہ کتنی دیر
لورین کے پہلو میں کھڑا نہیں رہا رہا تھا۔

لیکن اب رات کے اس پہر اسے چیریں اس جیتی
میر۔ اپنی اوقات آپ بتائی محسوس ہو رہی تھیں۔
دلوں میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ ”یہ فرق اسے
پہلے کیوں نظر نہیں آیا تھا؟“ جب سے سوچتے ہوئے
اس نے سگریٹ کا کراکس لیا تھا۔ بے اختیار وہ اپنی
جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے قدم اور اس کی
نظریں پورے گھر میں بھٹکتے لگی تھیں۔

ہر جگہ سے آسمان عائب تھا اور زمین مٹی تھی۔
یوں جیسے اس رات اپنی ذات سے متعلق اس کی تمام
خوش گلیاں عائب ہو گئی تھیں اور صرف اس کی
لاچاری اور بے بسی رہ گئی تھی۔

وہ یہ کیسا نقصان کا سودا کر بیٹھا تھا؟ واقعی شاید اس
سے بڑے وقوف اور کوئی نہ تھا جو خود کو عقل کل سمجھ
کے نجات کون کون سے پتروں اور کنکراؤں میں اب
تک بھرتا رہا تھا اور اب جو عقل لٹکانے آئی تھی تو
احساس ہوا تھا کہ وہ کتنے پانی میں تھا اور اپنے حق میں
کتنے غلط فیصلے کر چکا تھا۔ پہلا غلط فیصلہ سوزی کو اپنی
شریک سفر بنانے کا تھا۔ جس کی خود سر اور کھلی فطرت
اس کے سامنے تھی مگر پھر بھی اس نے سوزی کو ساری
دنیا سے گھر لے کر لایا تھا کیوں کہ ان دونوں کی لہجہ
ان کی شادی کے خلاف تھیں جبکہ انہیں یہ غلط فہمی
ہو گئی تھی کہ ان جیسی ذہنی ہم آہنگی شاید ہی کسی خوش
لیصیب جوڑے کے درمیان پائی جاتی ہوگی لیکن جب
سوزی ایک معشوقہ سے ایک بیوی کے روپ میں آئی
تھی تب سیم کو احساس ہوا تھا کہ دھونس جمانے اور
من مانی کر کے دلی بے باک فطرت عورت کے ساتھ
بلور شوہر اس کی ذہنی ہم آہنگی صفر کے برابر تھی۔
دونوں حکم دینے کے حوالی تھے لینے کے نہیں۔ وہ
پاک پاسکس دو گنا مڈل میں تبدیل ہو گئے تھے جو اپنی ہی
فطرت سے ایک میان میں آگئی تھیں اور اب ایک
دوسرے کو کٹ کھٹانے کے درپے تھیں۔ بچے جیسا
کئی مٹنا چر نہ سوزی نے پیدا ہی نہیں ہونے والا تھا۔

اس لیے دونوں نے مزید کسی مشکل کے اپنی اپنی راہوں
میں۔

یہ الگ بات تھی کہ سیم کو اپنی دولت بچانے کے
لیے بے تحاشا پاز بلیٹے پڑے تھے اور تب اس نے
شادی جیسی بقول اس کے بے ہوش اور توجہ جڑ سے بیٹھ
کے لیے توبہ کی تھی۔ لیکن وہ اپنی توبہ پر قائم نہیں رہ
سکا تھا۔

محض ایک ہی ہفتے بعد لورین کا چہرہ اس کے دل
ذہن اور اس کے حواسوں پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ یونہی
آنا ”فانا“ لوگوں اور چیزوں کے عشق میں گرفتار ہونے
کا عادی تھا۔ جب تک مقصود کو پا نہ لیتا، طلب کا بخار
ایک سو چار درجے پہ پہنچا رہتا اور جب چیز دسترس میں
آجاتی تو شوق کا پیمانہ بھرنے میں زیادہ دیر نہ لگتی اور
اب کے تو واسطے بھی لورین سے رہا تھا۔ جو کسی ساتھ
سے کم نہ تھی۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے سے
”زندگی“ کشید کرنا جانتی تھی۔ وہ اتنی متحرک اور
ایڈونچر پسند تھی کہ سیم جیسے بے میلی شخص کو بھی اس کا
ساتھ دینے کے لیے اپنی رفتار بڑھاتی پڑی تھی۔ اتنے
عرصے بعد بتا کسی زنجیر کے یوں اڑے اڑے پھرنا اس
کے لیے ایک بے حد دھواؤی اور بھرپور تجربہ تھا جو اس
نے لورین کے اصرار پہ ہی مارک تک سے چھپایا تھا۔
لورین کی امرای نے اس کی من موٹی اور بے نیاز
فطرت کو خوب ہوا دی تھی۔ وہ کون تھی؟ کس خاندان
سے تعلق رکھتی تھی؟ اس کا ماضی کیا تھا؟ سیم کو ان
باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

وہ بتا کسی کو بتائے خود جا کر اس کی ایک ایک چیز اس
کے ڈر بے نما مکان سے سمیٹ لایا تھا اور لا کر اس نے
وہ تمام چیزیں بڑی محبت سے اپنی چیزوں کے ساتھ سجھا
دی تھیں۔ ایک دوسرے کے پہلو میں بٹھنے کے بعد ان
کے درمیان موجود فرق اور بھی شدت سے ابھر کر آیا
تھا مگر تب بھلا سیم کو کب پروا تھی بلکہ اسے توبہ فرق
پرے سے نظری نہیں آیا تھا یا شاید ہی قدرت کی منشا
تھی۔

اور اب جب پٹی اترنے کا حکم آیا تھا تو وہ حق وق

Monthly Shuaa September 2015

بیٹھا اپنے سامنے موجود اس واضح ہوتے فرق کو دیکھ اور
پرکھ رہا تھا۔ اپنے پہلے جواسے کسی غلط نہ گئے تھے
رات کے اس پر اسے یکایک ان میں بہت سی خامیاں
بہت سی کمزوریاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ اپنی بدلتی
سوچ پر حیران تھا۔ انگلیوں میں دلی راکھ ہوتی سکرٹ
نے اس کی انگلیوں کو چھوا تھا تو وہ ایک جھٹکے سے ہوش
کی دنیا میں لوٹ آیا۔

”یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ سکرٹ الٹش ٹرے
میں مسلتے ہوئے اس نے پریشانی سے اپنا سر تھام لیا۔
”پہلے ہر زعم و حیر ہو اور اب۔۔۔ اب یہ احساس۔۔۔ او
گٹھ کیا میں ہر لحاظ سے غلط تھا؟“

نچلا لب و انتوں تلے دبائے اس نے ڈوبتے دل کے
ساتھ سوچا تب ہی ایک جھمکے کے ساتھ ذہن کی
اسکرین پر بے ہوشی کی حالت میں دکھا جانے والا
خواب واضح ہونے لگا۔

دوران تاریک گلیاں اس کے بھاگتے قدم خوف
ناک بھوکے کتے بند دروازے۔ اور ان سب کے
درمیان اس کی بند کے لیے کھٹنے والا نقطہ ایک دوسرے اس
کے قدموں کا اس دلیز کو چھوٹا۔ اور۔ اور اندر جانے
کے بجائے پلٹ جانا۔ واپس تاریکیوں میں پلٹ جانا۔
حیرت سے سوچتے ہوئے سیم بے اختیار پریشانی کے
عالم میں سیدھا ہوا۔

”یہ۔۔۔ یہ بھلا کیسا خواب تھا؟“ اس نے بے یقینی
سے چلیں۔ جھپکائیں۔ ”اور یہ وہ کس پناہ گاہ کے
دروازے کو کھلا چھوڑ آیا تھا۔ وہ بھی اندھیوں کی جانب
مشکلات کی جانب۔“ سب سے سوچتے ہوئے اس کا
دل سیم گیا تھا۔

نجاتے کیوں! لیکن اسے یہ خواب محض خواب نہ
لگ رہا تھا بلکہ ایک اشارہ لگ رہا تھا۔ ایسا اشارہ جو اس
کی ایک ناش غلطی کی جانب کیا جا رہا تھا۔ اب اتنی
بہت سی دریافت ہونے والی غلطیوں میں سے سب
سے بڑی غلطی کون سی تھی۔ سیم سمجھنے سے قاصر تھا۔
بالکل قاصر!



ڈرائنگ روم میں وہ چاروں ایک دوسرے کو دیکھتے
ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ رسمی گفتگو سمجھ چکی تھی
اور اس وقت تھا کہ اصل موضوع کی جانب پیش رفت
کی جاتی جس کا ہر پہلو مکمل کتاب کی طرح تھا۔ پھر بھی
صغیر قاضی کو بات شروع کرنے کے لیے الفاظ ترتیب
دینے پڑے تھے۔

”بھائی جان! اور کیا۔۔۔ تیر میری آمد کا مقصد صرف
میرا اور اپنی کے مسئلے کو حل کرنا ہے۔ آپ ہی بتائیں
آخر آپ دونوں نے اس بارے میں کیا سوچا ہے؟“
انہوں نے سامنے بیٹھے ابراہیم صاحب اور انجم بیگم کی
طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ابراہیم ملک نے اک
گہری سانس لی۔

”سوچنا کیا ہے صغیر! ہر چیز تمہارے سامنے ہے۔
میری ضد نے جیسے بے بس سا کر دیا ہے۔“

”وہ سچی ہے بھائی جان۔ اس کے پیچھے لگتا کہ کسی کی
عقل مندی ہے۔“ صغیر صاحب کی بات پر زیب بیگم
کی پریشان نگاہیں سیم کی جانب اٹھ گئیں۔ دونوں کی
نظریں ملیں تو انجم نے اک بے توازن جھل سی سانس
کھینچی۔

”تو کیا کروں؟ تم ہی بتاؤ؟“ ابراہیم صاحب نے
تھک کے صغیر قاضی کی جانب دیکھا۔

”میرے خیال میں تو آپ سب سے پہلے اسے
قاضی دلا رخصت کرنے کی تیاری کریں۔“ اور شوہر کی
بات پر زیب کا دل اس تیزی سے ڈوب کر ابھرا کہ فن
کی سانس ایک بل کورک سی گئی۔

”لیکن صغیر! امر ایسا نہیں چاہتی۔“ انجم بیگم نے
سرعت سے مداخلت کی۔

”جانا ہوں! لیکن اب تھوڑی سی سختی تو کرنی
پڑے گی آپ دونوں کو۔“

”پہلو میں لیا کہ ہم یہ سختی کر لیتے ہیں لیکن اس زور
زور سے اس کا دل تو نہیں بدلا جاسکتا۔“ انجم کی
بات پر زیب بیگم کو تھوڑا حوصلہ ہوا۔

”تم کابل ان حالات میں بدلے گا بھی نہیں۔
اب لوگ ذرا حالات کو نیا رخ دینے کی کوشش تو

لیوں سے دلی دلی سکی نکل گئی۔
بے اختیار انجم نے آگے بڑھ کے انہیں خود سے
لگا لیا۔

”مجھے معاف کر دو زبی۔ میں اہل کے پٹے
ہوئے رشتے کو بچانے سکی۔“ آنسو انجم بیکم کی آنکھوں
سے ٹوٹ کے بہہ نکلے تو بہن کے سینے سے مل کر کھڑی
زب کا ضبط بھی جواب دے گیا۔
جبکہ ایرایم ملک اپنی چچی کی روح سے شرمندہ
ہوتے چور چور دل لیے باہر نکل گئے۔

صبح کے آٹھ بج رہے تھے جب مارک فینڈ سے
بیدار ہوا تھا۔ اپنے برابر خللی بستری دیکھ کے یہی سمجھا تھا
کہ سیم ہاتھ دھو میں ہوگا مگر جب دس منٹ تک اندر
سے کوئی برآمد نہ ہوا تو وہ تیزی سے اٹھ کر ہاتھ دھو کی
جانب گیا اور اسے خالی دیکھ کر وہ یک لخت گھبرا گیا۔
اگلے ہیروں کمرے کا دروازہ کھول کے وہ تیز قدموں
سے لاونچ میں چلا آیا اور صوفے پر نظر پڑتے ہی اس
کے سینے سے اک سکون بھری سانس برآمد ہوئی۔ سیم
صوفے پر لٹا گری فینڈ سو رہا تھا۔
وہ مطمئن سا چلتا دسری طرف رکھے کاؤچ پر آگے
گر سا گیا۔ سوئے ہوئے سیم کو بے دھیانی سے دیکھتے
ہوئے وہ سیدھا ہوا تو نظریں صوفے کے ایک جانب
نیچے زمین پر رکھے درمیانے سائز کے گتے کے ڈبے
پڑیں۔

”یہ تو رات تک یہاں نہیں تھا۔“ بڑبڑاتے ہوئے
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس ڈبے کی جانب بڑھا۔ اور
اسے کھول کر دیکھنے کو جھکا لیکن جوں ہی اس کی نظر
اندر رکھی چیزوں سے ٹکرائی وہ بے اختیار ٹھٹک گیا۔
وہ سب لورین کا سامان تھا۔ یعنی سیم رات بھر اسی
حالت میں لور اسی عورت میں پھنسا رہا تھا۔ سیدھے
ہوتے ہوئے اس کی متفکر نگاہیں سیم پر جا گھری
تھیں۔ جو نجانے کب سویا تھا؟ اسے دکھانے کا ارادہ
ترک کر کے وہ ہاتھ دھو میں چلا آیا تھا اور جب فرش

کریں۔“ صغیر صاحب نے رسل سے کہتے ہوئے
انجم اور ایرایم صاحب کو دکھا۔
”حالات اتنی آسانی سے نیا رخ نہیں لیں گے
صغیر۔“ ایرایم ملک کے بوجھل لبچہ صغیر کا منہ بے
اختیار خاموش ہو گئے۔

”جو بس بھراس نام نہاد رشتے کو ختم کیجئے۔ معاملہ خود
عیہ دار لگ جائے گا۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد
صغیر صاحب دو ٹوک لبچے میں بولے تو ڈرائیونگ روم
میں موجود تینوں ہانڈ لوپ خاموشی چھا گئی۔

”معدرت کے ساتھ بھائی جیلن۔ لیکن میں لب اس
بات کو مزید لٹکانے کے حق میں نہیں لوریہ میرا آخری
فیصلہ ہے۔“ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ اٹھ
کھڑے ہوئے تو پریشان حال زب بھی شوہر کے انداز
پر اندر ہی اندر خائف ہوتی باہنی جگہ سے اٹھ گئیں۔
”جیسا صغیر اہم جینو تو سہی۔“ ہمنوی کا یوں اٹھ
جانا انجم کو بھی رشتن کر گیا وہ سرعت سے انہیں تو
ایر ایم ملک جیسے کسی نتیجے پہنچ گئے۔

”سیم صحیح کہتے ہو۔ اس نام نہاد رشتے کو واقعی اب
لے کر انجام تک پہنچ جانا چاہیے۔“ من کی بات صغیر
کا من نے سولے خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے
کے کوئی جواب نہ دیا لیکن انجم لور زب کے دل جیسے
بٹھسے گئے۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کچھ تو سمجھیں۔“ انجم
نے پلٹ کر ہائی دی۔ ایرایم صاحب بھی اٹھ کھڑے
ہوئے۔

”سوچ لیا ہے۔ مہر کی جان اس رشتے سے چھوٹے
کی تو کچھ ہوگا۔“ من کے فلسفی لبچہ انجم بے بسی سے
خاموش ہو گئیں۔

”میں کل ہی اپنے وکیل سے بات کرتا ہوں۔“
انہوں نے صغیر کا منی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جیسے آپ مطلب سمجھیں۔ ہمیں لب اجازت
دیں۔“ انہوں نے ایک نظر ساتھ کھڑی بیوی پر ڈالی
جن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ نگاہیں
چراغے داخلی انداز سے کی جانب بڑھ گئے تو زب کے

ہو کے واپس آیا تھا تب سیم آنکھیں کھولے موصوفیہ چٹ لیتا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ مارک اس کے چروں کی جانب آ کر۔

”ٹھیک ہوں۔ تم نے وہ تصویر کہاں رکھی ہے؟“ سیم کی نگاہیں چھت پہ سے ہٹ کے مارک کے چہرے پہ آنکس جو اس کے موٹل پہ بڑی طرح چونکا تھا۔ یعنی سیم جان گیا تھا کہ اس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے لن دولوں کی تصویر اس نے اٹھائی تھی۔

”اندر الماری میں ہے۔“ اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھتے ہوئے مارک نے جواب دیا۔

”لے آؤ پلیز۔“ وہ دھیرے سے بولا تو مارک بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔ الماری میں سے تصویر نکال کے وہ واپس آیا تو سیم اٹھ کر بیٹھ گیا اور خاموشی سے اس کے ہاتھ سے فریم پکڑ لیا۔

فریم میں جڑی تصویر پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا اس نے فریم کو الٹ کر اندر موجود تصویر نکالی اس کے کئی ٹکڑے کیے اور فریم کو بیٹھے بیٹھے بچے بڑے ڈبے میں اچھل دیا۔ اس کی اس حرکت پہ مارک غصہ بھر کو حیران رہ گیا، لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے قصداً ٹیبل لیمپ میں سوال کیا۔

”تم نے اپنی باقی چیزوں کو چیک کیا ہے؟“

”ہوں۔“ اس نے محض ہنکارا بھرا۔ ”زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟“ اور مارک کے سوال سیم کی خالی خالی سی نگاہیں اس کے چہرے پہ آنکھیں۔ اس کے تاثرات پر مارک پریشان ہو گیا۔ ”کیا زیادہ نقصان ہوا ہے؟“ وہ اس کے قریب چلا آیا۔

”بہت۔ بہت زیادہ۔“ اس نے دل گرفتگی سے جواب دیا۔

”مگر تمہارا لاکر تو محفوظ ہے۔“ مارک پریشانی سے بولا۔

”بس وہی محفوظ ہے، باقی تو سب ختم ہو گیا۔“ سیم نے سمجھے ہوئے انداز میں اپنا سر صوفے کی پشت پہ

ڈال دیا۔ ”سیم ایسا کرو، ٹھنڈا کر کے عتاب ہونے والی ساری چیزوں کی ایک لسٹ بنو۔ ہمیں لب پہ معاملہ ہر مل میں پولیس کے حوالے کرنا ہو گا۔“ مارک کی بات پہ ایک چمکی سی مسکراہٹ سیم کے لبوں پہ پھیل گئی۔ اس کی نظریں لوہر بھرت پہ جمی نچالے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

”ساری رات یہی تو کیا ہے۔“

”جی! مارک نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔ یہ تو بہت مشکل مندی کا کام کیا تم نے۔“

”جس ایک آخری چیز سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے نگاہوں کا زلویہ بدل کے مارک کو دیکھا۔

”کیا؟“

”یہ کہ میں کس پتہ لگاؤ کے دروازے کو کھلا چھوڑ آیا ہوں؟“ اور مارک کا تہ اس کی بات پہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

❁ ❁ ❁

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بیس کے لیے ایک مسئلہ



حک زہ محبت

ت - 300 روپے

”ڈاکٹر پلینز! مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔
وہ کبھی بھی میرے ساتھ یہاں آپ کے کلینک نہیں
آئے گا۔“ شام میں مارک سلیکٹرز کے سامنے
بیٹھا تھا۔ سیم کی حالت اس سے ڈسکس کرنے کے
بعد مارک نے پہلی بار لہجے میں کہا تو ڈاکٹر نے ایک
گہری سانس لی۔

”تو پھر؟“

”پھر یہ کہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا آپ میرے
کزن بن کے اس کے گھر میرے ساتھ چل سکتے
ہیں؟“ مارک نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔
پلینز کو خاموش ہو گیا۔

”ویکیس مسٹر مارک ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ویسے
بھی مجھے صرف ایک شنگ تو نہیں۔“

”میں جانتا ہوں سر! لیکن اگر آپ ایک بار اس
سے مل لیں گے تو شاید اگلی بار وہ خود آپ سے ملنے کے

لیے تیار ہو جائے۔ آپ پلینز۔ پلینز میری درخواست
قبول کر لیں۔ ویکیس! یہ ایک انسانی زندگی کا سوال
ہے۔“ اس کی بات نہ کرتے ہوئے مارک التجائیہ انداز میں
بولتا تو ڈاکٹر جیسے بے بس سا ہو گیا۔

”چھانٹ لیں۔ میں چلوں گا آپ کے ساتھ۔“
”جستجو بہت شکر ہے۔ میں آپ کی مدد کے لیے
ممنون ہوں۔“ مارک کا چہرہ کھل اٹھا۔

”آپ بس اتنا خیال رکھیے گا کہ آپ کی باتوں سے
اسے یہ شک نہ ہو کہ آپ ایک سلیکٹر ہیں۔“

”یہ فکر رہیں۔“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اپنے
مٹنے والے لب لباب پر انگلیاں چلائیں۔

”کل میں پانچ سے چھ کے درمیان فاسٹ ہوں۔
آپ پونے پانچ بجے تک یہاں پہنچ جائیے گا۔“ اس
نے اپنا شیڈ بول چیک کیا۔

”منور۔“ مارک مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایک بار پھر آپ کا بہت شکریہ۔“ وہ ممنون سا بولا
تو ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

رات کھانے کی میز پر وہ تینوں موجود تھے۔ مارک
جو تکہ جوزفین کو ساری بات سے آگاہ کر چکا تھا۔ اس
لیے اوپر ادھر کی باتوں کے درمیان اس نے قصداً انہوں
بات شروع کی جیسے ابھی ابھی کچھ یاد آیا ہو۔
”ہاں مہکھی تمہارے کزن کا کیا پایا؟“ اس نے کھانا
کھاتے ہوئے مارک کی طرف دیکھا۔

”پہنچ گیا ہے۔ کل ملنے کے لیے گھر رہا ہے۔“
”پھر؟“ جوزفین نے جواباً استفسار کیا۔

”سوچ رہا ہوں اسے کل شام یہاں انوائٹ
کر لوں۔ اگر سیم کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔“ مارک نے
سیم کی طرف دیکھا۔

”کیوں نہیں۔“ سیم نے جیسے لہجے میں کہا۔
”تم اس سے ملو گے نا۔“ مارک نے نرمی سے پوچھا

تو سیم جھک سا گیا۔ اس کی جو کیفیت تھی اس میں
فی الوقت کسی سے بھی ملنے لانے کا خواہش نہ تھا مگر وہ

یوں بد ٹوک انکار مارک کو نہیں کر سکتا تھا۔
”دیکھو۔“ وہ محض یہی کہہ پایا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ تمہارا گھر ہے اور تم ہی نہ ملو۔ یہ
تو اچھا نہیں لگے گا۔“ مارک کی بات پر وہ لفظ بھر کو
خاموش ہو گیا۔

”ویسے بھی تمہیں اب اپنی ٹارمل روٹین کی طرف
آنا چاہیے سیم۔“ جوزی نے بھی مداخلت کی تو وہ
خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

”شاید تم صحیح کہہ رہی ہو۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے
بولا۔ تو مارک بے اختیار مسکرا دیا۔

”زبردستی یہ کی نامزدیوں والی بات۔ تمہیں اپنی
دل پارے سے خود کو سنبھالنا ہو گا۔“ اس کے رسلان سے

کہنے پر سیم دھیرے سے مسکراتا اپنی پلیٹ کی جانب
متوجہ ہو گیا۔

”واقعی۔ مجھے اپنی قوتِ ارادی سے ہی خود کو ان
فصلوں سے بچنا ہو گا۔“ نوالہ منہ میں رکھتے

ہوئے اس نے سوچا۔

”تمہاری غلطیوں کی نشان دہی کرتی یہ سوچیں

اے کمرے میں اگر اس نے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر
گرنے کے انداز میں لیٹ گیا۔ وہ اس وقت کچھ بھی
سوچتا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بھی!
نحتی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے چہرے
پر بازو رکھ لیا۔ اب یہ اس کی کوشش تھی یا غصہ کی دوا کا
اثر کہ جلد ہی اسے اپنے اعصاب پر غصہ کی چھائی
محسوس ہوئی تھی اور اسی سوئی جاگی کیفیت میں اسے
دور سے ایک آواز ذہن پر دستک دیتی محسوس ہوئی
تھی۔

”ٹوٹا ہے جب جام آرنڈ
تبدیر آگئی کھلتا ہے۔“

”آں ہے یہ کس کی آواز ہے؟“ قویٰ توہن نے
سوچنے کی کوشش میں آنکھوں کو کھولنے کی سعی کی
تھی مگر پونوں نے گویا سنوں بوجھ آور تھا۔ اتنے میں
آواز دوبارہ نکلی تھی لیکن مزید دور سے۔
”ٹوٹا ہے جام آرنڈ
درا آگئی کھلتا۔“

”مطلب؟“ ایک اور آواز ابھری تھی اور اس کے
ساتھ ہی ہر طرف سناتا چھا گیا تھا۔ گرا سنا! (باقی آئندہ اعلان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

تمہاری اپنی لکھی ہوئی



فرحت اشتیاق

قیمت: 300/-

فضول ہیں کیا؟“ اندر سے ایک آواز سی نکلی تو اس کا
لوالہ چپا مانہ رک گیا۔
”فضول نہ سہی لیکن یہ میرا سوچنے کا انداز نہیں!
میں چیزوں کو اس نظریے سے دیکھنے کا عادی نہیں!“
اس نے غصے سے اس آواز کو بار بار کرایا۔

”تب ہی تو منہ کے بل گرے ہو۔“ آواز نے ٹھٹھا
لگایا تو سیم نے لب بچھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا کاشا پلیٹ
میں پھینک دیا۔

اس کی اس حرکت نے اپنے دھیان میں کھانا کھاتے
مارک اور جوزی نے چونک کر اس کی طرف اور پھر
ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

”سیم! تم ٹھیک تو ہو؟“ اور مارک کی آواز پر اسے
بھی جیسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ بری طرح
شرمندہ ہو گیا۔

”نکی ایم سوری۔ سو سوری یار۔“ چہرے پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے اس نے متقابل بیٹھے مارک کی طرف
دیکھا۔

”کوئی بات نہیں، لیکن تم ٹھیک تو ہونا؟“ مارک
نے نرمی سے اپنا سوال دہرایا۔

”ہاں نہیں۔ نہیں میں ٹھیک نہیں۔ شاید کل
رات کی بے آرامی نے مجھے تھکا دیا ہے۔“ مزید بات
بتانے کا اس میں حوصلہ نہ ہوا تو ٹھیک کر اس نے قبول
کر لیا۔

”میں تمہاری دوا میں لاتی ہوں۔“ جوزی سرعت
سے انھی۔

”تیند کی دوا بھی لاؤ۔ اس کے لیے بھرپور تیند بست
ضروری ہے۔“ مارک نے کچھ سوچتے ہوئے با آواز
بلند کہا تو جوزی اثبات میں سر ہلاتی کمرے کی طرف چل
دی۔

جوزی نے دوا میں لاکے اس کے سامنے رکھیں تو
سیم نے جب چاہا انہیں منہ میں رکھ لیا۔
”میں لینے جا رہا ہوں۔“ کرسی پیچھے دھکیلا وہ اٹھ
کھڑا ہوا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

بیت کی دیوار



کے سامنے کھانا لا کر رکھا تو سب معمول اس نے فرما دیا۔
 توڑنے سے پہلے ٹی وی کن کر لیا۔ سارے دن کی
 آنکھ محنت کے بعد رات کا یہ ابتدائی سر جیسے خوشگوار
 ہوا کا ایک جھونکا ہوا تھا اس کے لیے۔ حسہ کا
 سکرانا چو اور کھانے میں لذت بن کر کھلی اس کی
 محبت۔ جسے شوہر کی آمد کے بعد ہر ذرا سے ہر وہی
 سے بڑھ کر اسے رکھنا سننا اور اس کا خیال رکھنا دنیا کا
 سب سے اہم کام لگتا تھا اس سے ہلکی پھلکی گفتگو
 کے دوران اپنا من پسند کھانا کھاتے ہوئے گہے یہ
 گاہے بیوی پر نظر اٹاتا۔ اسے دنیا کی سب سے خوب
 صورت مصویت لگتی تھی۔

ایسی ہی مصویت میں حسہ کی کسی بات کا جواب
 دیتے ہوئے بیوی پر چلے اس منظر نے بالکل اچانک ہی
 اس کی توجہ اپنی جانب سمجھنے والی تھی اور وہ جیسے ہی آج
 کل کی عورتوں کے بدلے رنگ و روغنک سے خائف
 رہتا تھا سر جھکے بیٹا نہ رہ سکا۔

”ہم نہیں کیا ہو گیا ہے آج کل کی عورتوں کو نہ
 کوئی خلوع کی عزت ہے دل میں اور نہ ہی اس کی

”بس۔ میں اس موضوع پر اب اور کوئی بات
 نہیں سننا چاہتی۔ ایک بڑے ہوئے شخص کا ساتھ
 کبھی بھی میری خواہش نہیں تھا۔ مجھے ایک مکمل گھر
 مکمل انسان چاہیے۔ لہذا اب یہ فیصلہ جیس کرنا
 ہے کہ تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا اپنی ماں کی پسند
 کے ساتھ؟“

اس کا لہجہ حسہ اور دونوں تک تک جس نے مقلد کو
 مکمل طور پر بے بس کر دیا تھا۔

”پلیز نازی! ایسے تو مت کہو۔ تم جانتی ہو میں
 تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم میری محبت ہو اور وہ
 مجبوری۔ تمہارا اور اس کا مقابلہ ہی کیا ہے؟“

”یہ مقابلہ میں نے نہیں تم نے شروع کیا ہے فراز!
 اور اب اس کا انجام بھی تمہارے ہی ہاتھوں میں
 ہے۔ اور وہ تمام عہد و پیمان جو پچھلے دو سالوں میں ہم
 بار بار مجھ سے کر چکے ہو۔ مجھے امید دلا رہے ہیں کہ تم
 مجھے اپنے نہیں دو گے۔“ وہ خاموش ہو گیا۔



نیا زانجی ابھی اور کشاپ سے لوٹا تھا حسہ نے اس

مکمل ٹافل



برہمانی کو خیر یاد کہہ دیا۔ ایک تو چھوٹی سی زمین سے پہلے ہی بمشکل گزر لو وقت ہوتی تھی۔ دوسرا اس کا اپنا دماغ بھی برہمانی سے زیادہ کام میں چلتا تھا۔ اس لیے باپ اور چچا نے آواہ گردی میں وقت ضائع کرنے کا موقع دینے کے بجائے گاؤں کی واحد درکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے بٹھارایا۔

اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یہ اس کا من پسند کام تھا۔ جسے سیکھنے میں اس نے زیادہ وقت نہیں لیا، اور محض چند ہی مہینوں میں اس فن میں طاق ہو گیا۔

جب ہی ایک دن شہر سے نئی فصل کے بیج لینے گئے لبا اور چچا کسی عالم ترک ڈرائیور کی امدادی رفتار کی بجھٹ چڑھ گئے اور خون میں لت پت ان کی لاشوں نے گھر لوہا دل دونوں میں کرام برپا کر دیا۔

نیاز جیسے تیسے زمین پر کھم کر کے روزی روٹی کا سامان کرنے لگا اور حنہ نے مل کی حالت دیکھتے ہوئے گھر کا انتظام سنبھال لیا۔ سال پر سال گزرا اور شوہر کی دعائی کے محض چار برسوں بعد ہی نکت بھی راہ عدم سدھار گئی۔ مگر جاتے جاتے نیاز اور حنہ کو ایک بندھن میں باندھ گئی۔ ان دونوں کو بھلا کیا اعتراض ہونا تھا۔ نیاز کو حنہ بے حد عزیز تھی اور حنہ کے لیے تو ساری دنیا ہی فقط نیاز تھا۔ اس کا ہر لفظ حنہ کے لیے حرف آخر تھا اور وہ حقیقی سنوں میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔

نکت کے گزرنے کے بعد ان کی رشتے کی ایک پھوہ بھی خند بچہ نے ان کا بڑا ساتھ دیا تھا اور کئی ماہ ان کے پاس ٹھہری رہیں۔ دراصل ان کا اپنا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اس لیے شروع سے ہی حنہ اور نیاز کے والد انہیں اپنے بھائیوں کی طرح پیارے تھے۔ اسی تعلق نے انہیں ہمیشہ ان دونوں کا خیال رکھنے پر مجبور کیا، پھر نیاز گاؤں کی زمین سے منافع نہ پا کر قریبی شہر منتقل ہو گیا تو اس وقت بھی خند بچہ بھی کے بیٹے نے اس کی بھرپور مدد کی۔

مجبوریوں کا احساس۔ ہر معاملے میں بس اپنی ہی مرضی چلاتی ہے۔ فن کو۔ بھی بعد پوچھے کہ اگر اتنا ہی غلط کام ہے تو سرایاہ کرنا تو اللہ پاک نے چار شلوہوں کی اجازت کیوں دی ہے۔ موب کو۔ اور وہ برائے نکلنے کے موب بھی تو تھے۔ میں دو چھوڑ کئی کئی بیاہ کرتے تھے ایک وقت میں۔ بر شلش ہے۔ ان کی بیویوں کو۔ مہر سے بدداشت کرتی تھیں۔ ایک گھر میں تینے سالتے۔

وہ کمل کر اپنی ناگواری کا اظہار کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ تیرہ مٹر سے انصاف بھی۔ حنہ جو بڑے غور سے سنتی نیاز کا لفظ لفظ اپنے اندر اتار رہی تھی ہمیشہ کی طرح سرکشت میں ہلانے لگی۔

تو ٹھیک کہتا ہے نیاز آج کل کی عورت واقعی بڑی اتالی لور ہے۔ صبری ہو گئی ہے۔ لیکن ابھی بھی دنیا میں ایسی عورتیں موجود ہیں جن کے شوہر دو چھوڑ چار دیا ابھی کر لیں۔ تو انہیں فرق نہیں پڑتا۔

”اچھا!“ وہ اس کے پریشان لہجے پر دھڑکے سے ہنس کر سر جھٹک کر کھانا کھانے لگا۔



حنہ ”نیاز مل کے سکے چپاکی جی تو تھی ہی۔ ساتھ ساتھ بچپن سے آج تک ہل کی سٹی لور ہر خوش غمی کی سامی بھی تھی۔ حنہ کی مل نکت کی شلوہ کو ابھی دھلیسی ہوئے تھے جب نیاز کی بدانتہا پر اس کی مل زندگی کی بازی ہار گئی۔ نکت نے پناہی کے کہے تھے۔ بڑی خاموشی سے اس کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

پھر زمین سال بعد جب خود اس کے ہل حنہ کی بدانتہا ہوئی تو نیاز کی شمالی کو جسے محفل مل گئی وہ اپنا سارا قاسم وقت اس کے ساتھ کھیل کر بٹانے لگا اور حنہ بھی اس کی ملکی ہو گئی تھی۔

وقت بونہی گزرا گیا اور پرائمری کے بعد گاؤں میں مزید تعلیم کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے اس نے

”نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟“ اس کا لہجہ بھی شرارت سے بھرپور تھا۔ حنہ جھپٹ کر سر جھکا گئی۔
 ”چل عجب اجازت دے! ایسا نہ ہو کہ دوست بارات لے کر نکل جائے اور میں راہ نکلتی رہ جاؤں۔“
 اسے کندھوں سے قہقہے ہوئے ہنسنے لگا اور حنہ نے بے آواز آیت الکرسی کے حصار میں دے دیا۔

”انور دھیان رکھنا! آج کل کی کڑیاں بڑی تیز ہو گئی ہیں۔ کہیں کوئی چڑیل ڈیڑھل نہ عاشق کو الیمک“ نیاز دروازے کے قریب چنچ چکا تھا۔ در سے ہی لیوں میں دبی مسکراہٹ بھانپ لی اور بڑی معصومیت سے بولا۔
 ”اپنی طرف سے تو میں پوری کوشش کر رہی ہوں۔ پھر بھی اگر کوئی بے چاری مجبور ہو کے میرے پاس آگئی تو تو جانتی ہے میں کسی کامل نہیں توڑ سکتا۔“
 ”نیاز!“ اس کی زبردست گھوری برق ہنسا ہوا باہر نکل گیا تو وہ بھی مسکراتے ہوئے اپنے کاموں میں لگ گئی۔



اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور صبح کے گئے نیاز کا ابھی تک کچھ بچ نہیں تھا۔ بارات قریبی گاؤں جلی گئی اور نیاز نے کہا تھا کہ حد سے حد بھی پہنچ چھوٹے گھروٹ آئے گا اور اب آٹھ سے بھی اوپر نام ہو چلا تھا۔
 حنہ کا ریشٹلی سے برا حال تھا۔ انور بار بار باب کا نمبر ملا چکا تھا مگر وہ مسلسل بند جا رہا تھا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی نیاز فطرتاً کوئی لاپرواہ انسان تھا۔ پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ خدا انخواستہ کوئی حادثہ۔ اس کا دل جھٹکنے لگا۔

”ای! ابو کب آئیں گے؟“ انور سمجھ دار ہو رہا تھا۔ اس لیے باب کے لیے ابھی فکر مند تھا۔
 تب ہی دروازے پر ایک فھری ہوئی سی دستک ہوئی۔

”لگتا ہے تیرا ابو آگیا۔“ لمبی و نیم کی نکلتش میں

نمن کی رقم سے نیاز نے ایک دکان خرید لی اور گاڑیوں کا کھنک بن گیا۔ ہاتھ میں ہنر تو تھا ہی۔ سونے پہ سنا کہ اس کی محنت ایمان داری اور اچھے اخلاق نے کچھ ہی عرصے میں اس کی دکان کو ایک ورکشاپ میں بدل دیا۔ اچھے علاقے میں گھر بھی خرید لیا اور انور اور گئی نے انہیں والدین کے عہدے پر ناز کر کے ان کی زندگیوں کو بھی کھل کر دیا۔

خوشیاں ان کے آگن میں بہتی تھیں اور محبت آنکھوں میں۔ انور بارہ اور گئی سات سال کی ہو گئی تھی مگر ابھی بھی نیاز کی پُر حدت نظرس حنہ کے رخساروں پر لالی بکھیرتی تھیں جیسے کوئی نیا لونا شلوی شدہ جوڑا ہو۔ انہیں ایک دوسرے کی محبت پر ایسا ہی اندھا اعتماد تھا۔ شاید اس لیے کہ ابھی تک ان کی محبت نے کسی آزمائش کا نہ نہیں دیکھا تھا۔ اور محبتوں کے بھرم قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسا وقت کبھی آئے بھی نہ۔



وہ بڑا منہمک سا آئینے کے سامنے کھڑا اپنے لیے بالوں کو تنگھی سے جمانے میں مصروف تھا اور حنہ اسی انہماک سے ایک ٹک لے دیکھ رہی تھی۔

وہ آج اپنے دوست کی شادی میں مدعو تھا۔ کلف لگے سفید کڑ کڑاتے سوٹ کے ساتھ سیاہ بند جوتی۔ اور سیاہ واسٹ کے ساتھ وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دیگر مردوں کی نسبت کم عمری میں ہی شادی کرنے کے سبب وہ کہیں سے بارہ سالہ بچے کا باب نہیں لگتا تھا۔ ہزاروں نظرس اب بھی اس کی طرف اٹھتی تھیں اور ان میں سب سے جدا نظر حنہ کی تھی۔ جسے وہ کام والے سیاہ دھبوں سے بھرے لباس میں بھی کسی ریاست کا شہزادہ ہی لگتا تھا۔ اور آج تو وہ واقعی عام دنوں سے بہت مختلف لگ رہا تھا تو حنہ کیسے نہ اس کی بلائیں لیتی۔ نیاز نے بھی اس کی محبت ٹوٹ کر لی اور لیوں پر شرر مسکراہٹ ڈال گئی۔

”یہ بھی ہے میری حسد؟“
”کس کی بھی؟“ اس نے غلطی ہوئی

کھلا تو سامنے واقعی نیاز کو کہہ کر اس کی جان میں جلن

”یہ میری بھی ہے حسد میں نے شادی
کی ہے اس سے۔“

”شکر ہے نیاز! تم کہتے۔ قسم سے جان سلی پر
لگی ہوئی تھی۔ عجب عجب خیال آرہے تھے۔ اتنی
پر کھیل لگادی۔ تم نے تو جلدی کرنے کا کہا تھا۔
فلن بھی ہر تھا۔“

”تم اس سے شادی کرنے کے تھے نیاز؟“
مجھ سے جھوٹ بولا تم نے؟“ اسے خود بھی ہنس تھا
کہ کیا بول رہی ہے۔ عجب بے یقینی سی بے یقینی
تھی۔

اطمینان کی سانس نصیب ہوئی تو اس نے سوالات
کی پوچھاڑ کر دی۔ مگر نیاز حیرت انگیز طور پر اس
نے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ انور
خاموش تھا سنجیدہ اور غور سے نظر میں آتا ہوا۔ حسد بھی
شاید نہ تھا ہوا ہے اسی کے ساتھے پر ہاتھ مار کر ایک
طرف ہٹے ہوئے ہوئی۔

”خدا کے لیے حسد اتنی بد گمان نہ ہو۔ بھلا میں
تجھ سے جھوٹ بول سکتا ہوں تو جو چاہے قسم لے لے،
پر میرا یقین کر میری خوشی نہیں مگی اس سب میں۔
بڑا مجبور ہو گیا تھا اور نہ۔“ مجھ میں نہیں آتا تھا کہ
اسے کسے یقین دلائے۔

”میں بھی کتنی جلی ہوں میں! بچائے بھلی پائی
پوچھنے کے پولیس کی طرح تحقیق کرنے بیٹھ گئی۔ پھر
آگے کچھ دیر آرام کر لو۔ میں تان بھلی ڈالتی ہوں“
پر حلق میں میں نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھلیا۔

”خدا کے تمام پاڑ بھی اگر اس پر توڑ دیے جاتے تب
بھی حسد کے لیے قوت کے معنی نہیں بدل سکتے تھے۔
اس کی اپنی ہی کئی بات تھیں چند دنوں میں بولناج
ہو جائے گی۔ آہن ٹوٹا کے کہتے ہیں؟“ وہ لب سمجھ
رہی تھی۔ زمین نہ مہل کے نیچے سے کیسے سرکتی ہے۔
وہ محسوس کر رہی تھی۔ اور جب زمین سرک
جائے تو کھڑے رہنا اتنی دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ لا کھڑا
کر پیچھے دیوار سے ٹکرائی اور دھڑکے دھڑکے زمین پر
پڑھتی چلی گئی۔

وہ دوا نہ کے ایک طرف کھڑی اس کے اندر
آنے کی شکر تھی مگر نیاز نے ایک قدم بھی آگے نہیں
پہنچایا تھا۔ اور اپنے محبوب شوہر کی رگ رگ سے
واقعہ حسد جو کتنے ہی اس کے ہر انداز کو سمجھ
جایا کرتی تھی اب جو کتنے بنا نہ ہو سکی۔ وہ حیران سی
آگے بڑھی تاکہ قریب جا کر اس کے بدلے دے کی
وجہ جان سکے۔ کہ نیاز کی پشت سے لگا سہ چلوں میں
پہنچے جو اس کی غور میں آیا اور وہ ٹھک کر رہ گئی۔



وہ گھٹنوں کے گرد بانڈ لپیٹے گہری خاموشی کے حصار
میں تھی اور نیاز اسی خاموشی کی ہلک لوڑھے اس سے
بات کرنے کے لیے ہمت باجمہ رہا تھا اس کے
ساکت وجود کو کسی غریب ریسہ بچے کی طرح بے جان
دیکھ کر وہی طرح کھیرا گیا تھا گفتگو بچوں کے ساتھ
بیچ کر وہ اس کے کمرے میں لایا۔

ایک نظری عمل کے تحت اس کی سولہ لگا ہیں نیاز
کے چہرے پر جا ٹھہریں۔

”یہ کسی کے گہرے احساس سے متلو بہ ہو کر اس
نے بھلی ہلکوں کے ساتھ اسے خود میں سمجھ لیا۔ اور
پھر وہ یوں ہلک ہلک کر رہی کہ نیاز کے لیے سنبھلنا

”یہ عورت کتنے نیاز؟“ الہ کر اس ساکت
کمرے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ اور کب سے اس نے
سے بھاگتے نیاز کے لیے غریب اٹھنا اور بھی دشوار
ہو گیا۔

”نیاز نیاز۔ کتنے یہ۔“ اس کی مستقل
خاموشی حسد کے گل میں لگی خدشات کو جہم دے رہی
تھی۔

چاہے وہ جتنے بھی حوصلے کا دعوے کر لے۔ حق تو ایک عورت ہی ہیں! جن سے عزیز شوہر کو سو کن کے ساتھ ہانٹنے کا خیال ہی رکول میں کاٹنے پرست کرنے کے لیے کلن تھا۔ دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام کر سلائے ہوئے ہوا۔

”مجھے احساس ہے حنہ! میں نے تجھے بڑی جوت پہنچایا ہے۔ پر یقین مان۔ یہ سب میں نے خوشی سے نہیں کیا۔ تو اور میرے بچے ہی میری کل کائنات ہیں۔ اور میں اب بھی بیان نہ کرنا جو معاملہ کسی کی زندگی برباد ہونے کا نہ ہوتا۔ کسی کو مصیبت میں دیکھ کے ہونہ بھرنے والوں میں سے نہیں ہے تیرا نیاز۔ تو جانتی ہے میں۔“

”تھک کہ رہا تھا۔ حنہ سے زیادہ کسے علم تھا“ اس نے چونک کر نیاز کو دیکھا۔

”بشیر اور اس کی بوہٹی کانٹن خیر خیرت سے ہونے کے بعد ہم لوگ وہاں تک رہے تھے جب اس کڑی کا چالچال سے زبردستی گھسیٹا ہوا موایے میں لے آیا۔ یہ بہت دوری تھی شور بھی مچا رہی تھی لیکن اس کا چالچال اس کی ایک بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ زبردستی اس کا نکاح ایک ستر سالہ لٹنی بڈھے سے کرانے پر ملا ہوا تھا جس سے بچوں ہزار روپے لے کر اس نے کھالے تھے اور اب بدلے میں سگی بیٹی دے کر بن چڑا رہا تھا۔

سب نے اسے حیرا سمجھانے کی کوشش کی۔ پر عملی طور پر مدد کے لیے کوئی بھی آگے نہیں آیا۔ یقین کر حنہ کہہ نہ سکتی تھی وہ سے دوری تھی تا میرا کیجہ نہ کو آ رہا تھا۔ میں بھائی کے چالچال سے کہہ کہ پیسے میں دتا ہوں تو اسے گھر لے جاؤر کسی اچھی جگہ اس کی شادی کر دے۔ پر وہ بھائی نہیں۔ اور اس کی بیوی اب کسی صورت اسے گھر رکھنے کو راضی نہیں تھے۔ اس لیے ان کی شرط تھی کہ جو بھی پیسے دے گا اسے کڑی کو بھی ساتھ ہی لے جا کر لے گا۔

”تو تو ویسے ہی لے آنا۔ ہم کوئی اچھا سا مڑا

دیکھ کر خود ہی اس کا دیا کر دیتے۔ نکاح کرنے کی کیا مجبوری تھی؟ حنہ نے پہلی بار اس پورے معاملے پر اپنی چپ توڑی تھی۔ نیاز احمد ہی احمد اطمینان غسوس کرنا نکاح میں سہلانے لگا۔

”میں نے بھی ان سے یہی کہا تھا حنہ۔ پر اسے لوکل میں اس کے چالچال کی سہلی غیرت اچانک ہی جاگ گئی۔ اور اس نے نکاح کے بغیر اپنی بیٹی کو کسی کے بھی ساتھ بھیجے سے صاف انکار کر دیا۔ میں نے لڑکوں کی بڑی فتنیں کیں۔ ان کے من بچو کو بھی ملایا کہ وہ اس کڑی کو اپنالیں۔ پر ان میں سے کوئی بھی اس کے چالچال سے بے غیرت کوئی سے رشتہ جوڑنے کو تیار نہیں ہوا۔ سب نے اسے قدم پیچھے کر لیے حنہ۔ لیکن میں نہ کر سکا۔ جانتی ہے کیوں؟ کیونکہ میرے سامنے میری سگی کا بہو آ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کی جگہ میری اپنی دھمی ہوئی تو۔“ اس سے اس کے ہاتھ میں نہیں ہوا۔

”نہیں۔“ حنہ سوچ کر ہی کھل اٹھی تھی۔ نیاز اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے دکھ سے سسکا ہوا۔

”میں بھی اس وقت ایسے ہی اندر سے مل گیا تھا حنہ! جب یہ سوچ میرے دلغ میں آئی۔ حلا کہ میں تیرا مقام تیری جگہ کسی دوسری عورت کو دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر بھی میں نے یہ سب کیا۔ صرف اسی لیے کہ شاید آج میں کسی لود کی دھمی کی عزت بچاؤں تو رب سہا بدلے میں میری دھمی کا نصیب بھی کھیل دے۔ تو ہی تھا حنہ۔ کیا میں نے غلط کیا۔ بیش بہر موقع پر تو نے میرا ساتھ دیا ہے۔ تو کیا آج اپنے نیاز کو اکیلا چھوڑ دے گی؟ پتلا حنہ! سارا نہیں دے گی مجھے؟ ساتھ نہیں دے گی میرا؟“ ان سے اس کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے پوچھ رہا تھا لود حنہ۔

اس نے تو کبھی نیاز کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا، کبھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ تو پھر آج کیسے کر گئی۔ آج جبکہ وہ اس سے کچھ مانگ بھی رہا تھا لود نیاز حنہ سے کچھ مانگے لود حنہ نہ دے۔ لیا تو وہی

میں صاف نہ ہو گا میں پرہیزگار کی گریہ کر
 دیکھ کے لیے اس کے پاس صرف بھول تھے۔
 اس کے اہلت میں تھے سر کو دیکھ کر نیاز کے
 کاندھوں سے جیسے کوئی بھاری بوجھ سرک گیا تھا۔ تشکر
 کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے حنہ کے ہاتھ
 کی پشت کو نرمی سے چھو لیا تو وہ بھیگی ہلکوں سے مسکرا
 دی۔

یہ دن دونوں کے لیے مشکل ترین وقت تھا۔ جو
 ایک برس گزرا تو اسے سرے کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ مگر
 اسے خبر نہیں تھی۔

اگلی صبح حنہ معمول کے مطابق اٹھ کر نیاز اور
 بچوں کے لیے ناشتہ تیار کرنے لگی تھی۔ زنگی کی
 داستان میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جسے
 پہلے نظروں کے سامنے دیکھ کر جینا آسان تو نہیں تھا،
 مگر نیاز کی محبت کے سارے وہ یہ پہلے صراط پار کرنے کو
 بھی تیار ہو گئی تھی۔

اس کے زہر دہن کے لیے تو نیک نیاز کا چہرہ ہی جواز
 تھا۔ اور خوشی کے لیے یہ گمان کہ کوئی عورت چاہے
 اس کی زنگی میں جس حیثیت سے بھی داخل ہو۔
 مگر اس کے دل تک رسائی صرف حنہ کی تھی۔
 گزری رات نے اس کے گمان پر یقین کی کئی مہریں
 ثبت کر دی تھیں اور اسی یقین کی طاقت تھی کہ وہ ہر
 طوفان کے خوف سے بے پروا ہو گئی۔ اور کسی اس کی
 سب سے بڑی غلطی تھی۔

کیونکہ اب وہ محبت ہو یا اندھا نہیں۔ ہمیشہ ہماری
 کھائی میں گڑا رہا ہے۔

شام کو نیاز جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔
 "پتا نہیں حنہ کیسے خود کو سنبھال رہی ہوگی؟ مگر
 میں کیا ہو رہا ہوں؟" ایسے متضاد خیالات نے سارا دن
 اسے یوں بے چین رکھا کہ وہ چاہ کر بھی در کشکب کے
 کسی کام میں دلچسپی نہ لے پایا اور جلد ہی گھر کی طرف

دوڑا ہو گیا۔ مگر میں ہر روز کوئی اور چیز چاہتا تھا
 ہو مگر کچھ نہیں تھے اور حنہ۔
 مچن سے آئی کھٹو چڑکی کو آندھل پر وہ اندھ لگاتا
 اسی طرف چلا گیا۔ چہل حسب معمول وہ رات کا کھانا
 بنانے میں مشغول تھی۔

"کیا بیٹا جا رہا ہے؟" اس سے بات کرنے کی غرض
 سے لہجے میں خوشگوار ست بھرتے ہوئے اس نے پوچھا
 تھا۔

"تیری پسند کا گو بھی گوشت۔" اس نے بھی بظاہر
 مسکراتے ہوئے ہلکے ہلکے انداز میں جواب دیا مگر
 مسکراہٹ میں ہمیشہ والی چمک اور بے ساختگی مفقود
 تھی جو نیاز کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس
 نے گہرا سانس بھرتے ہوئے اس کا سر اپنی طرف کیا۔
 "تو کیوں فکر کرتی ہے حنہ۔ میں ہوں میں
 تیرے ساتھ۔" تیری جگہ کبھی کوئی نہیں لے سکتا۔
 یقین کر میرا۔"

"پتا ہے مجھے۔" نیاز کی تسلی نے اس کے چہرے
 پر اعتبار کا اجالا بکھیر دیا اور وہ پہلے سے بہتر نظر آنے
 لگی۔

"تم میری ٹینشن نہ لو۔" ٹھکے ہوئے ہو۔ جاؤ
 نہا کے کپڑے بدل لو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ بچے بھی
 رات دیکھ رہے ہوں گے۔"

اس کے کہنے پر وہ سر ہلاتا مچن سے چلا گیا۔ حنہ
 نے تانہ مٹی پٹیل اور کھانا دسترخون پر لگا دیا۔ مگر اس
 سے پہلے کہ وہ لوگ کھانا شروع کرتے اس نے سنجیدہ
 سی کو آواز میں بیٹے کو پکارا۔

"انور! پتر جا۔" اس کڑی کو بھی بلا لے مٹی کے
 لیے تیرے ساتھ والے کمرے میں ہوگی۔ "نیاز نے
 بے اختیار چونک کر اسے دیکھا تھا مگر وہ جان کر بھی
 انجان بنی رہی۔ کیونکہ اس کے سوا اب اور کوئی چاہ
 نہیں تھا۔ صبح اس نے انور کے ہاتھ اس لڑکی کا ہاتھ
 اس کے کمرے میں بھجوا دیا تھا، لیکن پھر اس نے سوچا
 کہ آخر کب تک۔ اگر اس نے اسے اس گھر اور
 نیاز کی زندگی میں برداشت کرنے کا کڑوا گھونٹ بھر ہی

لیا تھا تو پھر اسے ایک کونے تک محدود رکھنے کا فیصلہ۔
اس گھر کی ہر چیز اور سب سے بڑھ کر خود نیاز پر بھی اس
گھر کے ہر فرد کے برابر حق رکھتی تھی وہ۔ اور حنہ
حق مارنے والوں میں سے نہیں تھی۔

”پرائی۔ وہ لڑکی کون ہے اور ہمارے گھر کیوں
آئی ہے؟“ اور کے سوال پر حنہ چپ رہ گئی۔ نیاز نے
اس کی مشکل آسان کر دی۔

”آئی ہے وہ تیری چڑا چل اب جلدی سے اسے بلا
لا بڑی بھوک لگی ہے سب کو۔“ باپ کے کہنے پر وہ
مزید کوئی سوال کیے اٹھ گیا تھا۔

اس شام دو ستر خوان کا ماحول بڑا کھنچا کھنچا سا رہا ہے بچے
مہمان کی وجہ سے بھیجے ہوئے تھے۔ اور حنہ گھر
والوں کا ساتھ دینے کے لیے صرف کھانے کی کوشش
کر رہی تھی۔ جس کا احساس نیاز کو تھا اس لیے وہ
مسلسل اسے کھانے کے لیے اکسارہا تھا۔ کبھی ساٹن
اس کی پلیٹ میں ڈالتا۔ کبھی لوالہ بنا کر زبردستی کھلاتا۔
کسی کا دھیان بھی اس بچی لڑکی گفتگو کی طرف نہیں
تھا۔

گفتگو۔ جسے سنا فطرت حنہ نے اس کی کم
عمری کے باعث ایک بے ضرر انسان سمجھ کر قبول کر لیا
تھا، مگر نہیں جانتی تھی کہ وہ لاکھ کم عمر سی۔ بے ضرر
ہرگز نہیں تھی۔ بل باپ کے بغیر ہوئی اس کی پرورش
میں کہیں بھی تربیت کا عنصر شامل نہیں ہو سکا تھا۔ اور
سے چچی کی شاطرانہ چالوں کو سمجھتے اور ان کا مقابلہ
کرتے اس کے اندر کی معصوم لڑکی بہت پہلے ایک
گھاگ عورت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک ایسی
گھاگ عورت جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر
طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کا شرجانتی تھی۔

اور اسی گھاگ عورت نے حنہ کے لیے نیاز کی فکر
اور پریشانی اور ایک نئی ٹوٹی پولین سے عدم دلچسپی کا عالم
دیکھ کر لکھوں میں ان کے تعلق کی گہرائی کو بھانپ لیا
تھا۔ جان گئی تھی کہ اگر اسے نیاز کی زندگی میں جگہ
پٹائی ہے تو سب سے پہلے حنہ کو اس کی زندگی سے بھی
بے دخل کرنا ہو گا۔ ورنہ وہ اس گھر میں بھی اپنی

جزیر مضبوط نہیں کر سکے گی۔ یہ سچ تھا کہ وہ نیاز کی
پہلی بیوی تھی۔ مضبوط اور محکم حیثیت کی مالک۔
اور سب سے بڑھ کر اس کے بچوں کی ماں۔ لیکن
گفتگو کے پاس بھی وہ اختیار تھا جو بڑے بڑے اشراف
مردوں کے ہوش و دلوں میں ٹھکانے لگاتا ہے۔

وہ نوجوان بھی خوب صورت اور نئی بھی۔ اور
اسے اچھی طرح پتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ حنہ نے
اسے قہل کرنے کی بے وقوفی کی تھی مگر اس کا ایسا
کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے آئینہ کے
لائنج عمل کو حتمی شکل دی اور مسکراتے ہوئے کھانا
کھانے میں مگن ہو گئی۔ جو واقعی بہت مزے کا تھا۔



وہ رات اس کی زندگی کی سب سے طویل رات تھی،
اور وہ جھل اتنی کہ کالے نہیں کٹ رہی تھی سینے میں
انگلی ٹھن سے گہرا کر وہ اٹھ بیٹھی اور لیے لیے ساٹن
لے کر بے چین دل کو سنبھلا دینے کی کوشش کی۔ مگر
دل نے کیا سلجھا تھا اٹھاد سڑی طرف کا خلل بستر دیکھ کر
اور بے گل ہو گیا۔

اتنے برسوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اس کمرے
میں تھا بھی نیاز کے بغیر۔ اور وہ نہیں تھا اسی گھر میں
وہ کمرے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ۔

اس نے کرب کی شدت سے لب بھیج کر ضبط
کرنے کی کوشش کی۔ مگر اپنے ہی وجود سے پریشان
آنسو بے اختیار گالوں پر لڑھکتے چلے گئے۔ اور وہ ان
کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس درد کے
لیے وہ کسی کو الزام نہیں دے سکتی تھی۔ نیاز کو بھی
نہیں۔ اس نے خود ہی تو اسے اس کمرے میں بھیجا
تھا۔ اپنی رضائے فحشاء سے اس درد کا انتخاب کیا تھا۔
نیاز بے چارہ تو خود اس کا یہ فیصلہ سن کر صحت پر کھانچا گیا تھا۔
حنہ کے لیے اس کی طرف دیکھنا محال ہوا اور بات
کرنے کے لیے دیکھنا ضروری بھی نہیں ہوتا خاص کر
تب جب نظرس لفظ منجمد کرنے لگیں۔

”بات نیت کی نہیں ہے نیاز! اس ذمہ داری کی

ہے جو تم نے اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر سب کے سامنے اس کوڑی کی دیا ہے۔ اس لیے اس کا خیال رکھنا اس کو وقت و سال اور اس کے حقوق پورے کرنا تم پر فرض ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے تم میرے اور بچوں کے لیے کرتے ہو۔ صل کی مرضی نہیں تو مجبوری سمجھ کے ہی سہی۔ جیسے میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔

میں یہ نہیں چاہتی کہ کسی نا انصافی کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو اور تم بے سکون ہو یا اگلے جہان میں اس نوابی کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول نے سامنے مجرم بن جاؤ۔ میں تمہیں کسی مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتی نیاز!

اس کے قبل اور فعل میں صبح اور غلوں نیت کے سوال اور کوئی صبح کا فرض نہیں ہے۔ وہ واقعی نیاز کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ خواہ اس کے لیے اسے خود ہی کیلئے تکلیف اٹھانی پڑتی۔

جب کہ وہ سری طرف اس کی کیفیات اور شدتوں کے بالکل برعکس نیاز سب کچھ بھلائے چہرے پر حسرت تاثرات کا آگ جھوم لے رہے خود سے گفتہ کو سن رہا تھا جو مصوبیت سے بلیں جھیکاتے ہوئے اپنے چچا چچی کے مظالم اور اپنی نام نہاد مظلومیت کی داستان پڑے وقت بھرے لمحے میں سنا کر اس کا دل ٹھیک رہی تھی۔ کیونکہ اس کا ماننا تھا کہ نرم زمین پر پرانے شکن سامنے سے نئے ثبت کرنا کیس ممکن ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہو رہی تھی نیاز کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا جو اس کے لفظ لفظ پر آنکھیں بند کر کے یقین کر رہا تھا۔

محض کچھ ہی دنوں کا کھیل تھا اور گفتہ نے اپنی چلائی اور معنوی بھولن سے نیاز کے دل سے اجنبیت، گفتہ اور جھگ کی تمام دیواریں کو زمین یوں کر کیا۔ اور وہی نیاز جو اس سے بات کرنے سے

بھی کتراتا تھا، کھلم کھلا اس سے مدد و جیسی کا انکار کرنا تھا۔ لب اس کی جھگت سے لطف کشید کرنے لگا۔ حنہ کے ساتھ سے انداز کی نسبت گفتہ کی دلبرانہ اور مستی خیز لہواؤں نے نیاز کو عورت کے ایک نئے روپ سے آشنا کیا تھا جس نے اس کے اندر شوق اور تجسس کی ایک نئی دنیا ابھار دی تھی۔ اس لیے وہ درکشاپ سے آتے ہی جلد سے جلد کمرے میں جانے کی کوشش کرتا۔ زیادہ سے زیادہ وقت گفتہ کے ساتھ گزارنا اس کی باتیں سننا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔

گفتہ کو بھی بخوبی احساس تھا کہ نیاز کا دل حد تک اس کے کنٹرول میں آچکا تھا مگر یہ اس کی منزل نہیں تھی۔ کسی بھی وقت حنہ کے آسوا سے واپس اسی مقام پر لے جاسکتے تھے چل سے وہ چلا تھا۔ اس لیے اس کا نگاہ بدھ حنہ تھی۔ وہ اس کا اور نیاز کا آتما سامنا اور بچا کھپا تعلق بھی اس حد تک ختم کر دیتا چاہتی تھی کہ شکوے شکایات اور رنج جھوٹ کی جانچ پڑتال کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے اور نیاز کے پاس گفتہ کی بات پر یقین کرنے کے سوال اور کوئی چارہ نہ رہے۔

اس مقصد کے لیے اس نے سب سے پہلے ساتھ کھانا کھانے کی روایت توڑنے کی ٹھانی۔ کیونکہ لب صبح و شام کی کھانا کاتوں کے علاوہ نیاز کا حنہ اور بچوں سے لب شام و غلوری سامنا ہوتا تھا۔ اسی لیے رات درکشاپ سے واپسی پر جب نیاز اسے کھانے کے لیے بلانے آیا تو اس نے صبر سے انکار کر دیا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”دن میں زیادہ کھا لیا تھا کیا؟“ اس کے انکار پر وہ پڑھنی سے پوچھتا اس کے قریب چلا گیا تو اس نے سر ہٹا دیا۔

”پھر کیا بات ہے؟ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتا!“ اس کے اصرار پر وہ نظریں جھکا کر جھجکتے ہوئے بولی۔

”وہ دراصل۔۔۔ میں جب بھی آپ کے ساتھ کھانا کھانے جاتی ہوں میں تو حنہ تیار یا بار مجھے اتنی عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں کہ میری بھوک ہی مر جاتی ہے اور پھر مجھ سے کچھ کھایا ہی نہیں جاتا۔“

میں دس دن بھی نہیں لگے تھے میں کے لیے عین کرا
دشوار ہو رہا تھا۔

اگلے کھانے کا وہ عمل پھر صرف ایک رات تک ہی
محدود نہیں رہا تھا بلکہ بار بار دہرائے جانے کے سبب
معمول کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ بچوں کی اپنی ہی روٹن
تھی۔ اور حنہ کھن جس کو چاہی کی ڈور ہانڈ سے رکھنے
کے لیے کھانے کا سارا لینے لگی۔ اور وہ ستر خوں جو
کبھی بڑی شان سے سجا کر آتا تھا وہ دن ہو کے نہ گیا۔
حنہ خاموشی سے دن رات اپنے کام نمٹنے جاتی۔
صبح و شام کا کھانا پانا اس کی زندگی میں وہ کسی کا واحد
سلمان نہ گیا تھا کیونکہ وہ کھانا نیاز کھاتا تھا اور حنہ کی
خوشی کے لیے یہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

حکفہ کلنی دن تک بڑی گہرائی سے اپنی سوکن کی
نظرت کا اندازہ لگاتی رہی۔ حکفہ آہوں بہانوں سے
اسے تنگ کرتی رہی۔ اور جب اسے اچھی طرح
تسل ہو گئی کہ وہ چاہے کچھ بھی کر لے۔ حنہ دن
وہ دنوں کی لڑائی میں نیاز کو گھسیٹ کر پریشان نہیں کرے
گی۔ تو وہ کھل کر میدان میں آئی۔

نیاز کے بستر کے گرد کشاپ کے لیے نکلتے ہی وہ
تن فن کرتی کچن میں آئی اور وہ والے کی لوٹ میں لٹکا
گھر کی چابیوں کا کچا اپنے قبضے میں کر لیا۔ بچوں کی
بجائی دہلی میں سے لقمہ لیتی حنہ نے چونک کر اسے
دیکھا اور وہ نواں ہاتھ کر بر نکلتے طنزیہ نظروں سے
اسے گھور رہی تھی۔

”کیا بات ہے۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس نے
رخ موڑ کر عام سے انداز میں پوچھا تھا مگر حکفہ کا انداز
عام تھا اور نہ ہی الفاظ۔

”دیکھ رہی ہوں کہ بڑے پیش آواز لیے ہیں تمہیں
بچوں نے نیاز کے پیسے پر۔ لیکن اب جب تمہاری
رابد حلقی ختم ہونے والی ہے تو کیسے گزارہ کرو گے تم
لوگ۔؟“ اس کے ذہنی لہجے نے نہ چاہے ہوئے
بھی حنہ کو ٹھکانا تھا وہ اگلا نوالہ لینا بھول گئی۔

”کیا۔ حنہ؟“ نیاز کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا
”نہیں۔ نہیں۔“ تجھے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی
ہے۔ میں وہاں ہوتا ہوں میں نے تو کبھی ایسی کوئی بات
محسوس نہیں کی۔“ حکفہ جانتی تھی کہ وہ اتنی آسانی
سے نہیں مانے گا اس لیے جھٹ سے آنکھوں میں
آنسو بھر لائی۔

”اسی لیے میں آپ کو نہیں بتا رہی تھی۔ ہاتھ بچھے
آپ یقین نہیں کریں گے۔ کیونکہ آپ کے ساتھ تو
وہ مدت ابھی بنی رہتی ہیں میں۔ آپ بوجھیں گے تو
بھی نہیں مانیں گی۔ آپ کو راضی رکھنے کے لیے ہی تو
اتنوں نے مجھے قبول کرنے کا ڈراما کیا ہے۔ ورنہ دن
کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت میں صاف محسوس
کر سکتی ہوں۔ ایک سوکن سے بھلا کسی کو کیا بھر دوی
ہو سکتی ہے۔ میں جیوں یا مریں ان کی بلا سے۔“

اس کی بجلی آنکھوں نے نیکام نیاز کی سوچوں کا
رخ موڑ دیا تھا۔ اور پھر اس کی بات میں وزن بھی
تھا۔ نیاز نے واقعی کبھی کسی عورت کا دل اپنی سوکن
کے لیے اتنا بڑا نہیں دیکھا تھا۔ آخر تھی تو وہ بھی ایک
عورت ہی تھی!

اس وقت وہ یہ بھول گیا کہ حکفہ بھی تو حنہ کی
سوکن ہی تھی غلط وہ بھی ہو سکتی تھی۔ مگر بولا تو فقط
ایک۔

”چل ایسا ہی ہو گا جیسے تو کہہ رہی ہے۔ پر اب
اس بات کے پیچھے تو ساری رات بھوک تو نہیں رہ سکتی
تھی! میں ایسا کرتا ہوں کہ تیرا اور اپنا کھانا کرے میں ہی
لے آتا ہوں۔ دونوں مل کر کھائیں گے میرے
ساتھ تو تجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی نہیں؟“

اس کے محبت سے پوچھنے پر حکفہ نے شہا کر سر
نلی میں ہلا دیا۔ یہی تو وہ چاہتی تھی۔ وہ گھر توڑ رہی تھی
اور حنہ کا دل بھی۔ جو نیاز کو اگلے سے رے میں کھانا
نکالتے دیکھ کر حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

اس کے بغیر کھانا کھانے کے تصور سے نیاز کے لیے
بھوک کا احساس ہی مت جاتا تھا اور کج وہ دوسری
عورت کے ساتھ۔ دس سال کی علوت ختم ہونے

کہا یہ مطلب ہے؟
 ”مطلب یہ کہ جیسے ساگن ”پیا من بھائی“ ہوتی
 ہے ویسے ہی گھر میں حکم بھی تو اسی عورت کا چلنا
 چاہیے۔ میں جو اپنے شوہر کے دل پر راج کرے۔
 جبکہ تمہارا شوہر تو تمہاری طرف دیکھتا بھی نہیں ہے،
 پھر یہ چلیاں تمہارے پاس کیوں؟“ سوالیہ انداز
 میں۔ بھنوس اچکاں وہ عین اس کے چہرے کے سامنے
 رکی اور آنکھوں میں دیکھتے ہوئی بولی۔

”بس اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اب سے یہ
 چلیاں میرے پاس رہیں گی۔ تمہاری حاکمیت ختم۔
 اگر نیاز میرا ہے تو اس کا گھر اور اس میں چلنے والا حکم بھی
 تو میرا ہی ہونا چاہیے۔ میں۔ کیوں میں غلط کہہ رہی
 ہوں کیا؟“

اس کے چہرے پر محفوظ سی مسکراہٹ تھی۔ حنہ
 انہوں سے اسے دیکھے گئی۔ دکھ دھواں بن کر نہ
 چاہتے ہوئے بھی اندر بھرے لگاؤ اور دھکے بغیر نہ دے سکی۔

”چلو اب جلدی سے بچن صاف کر۔ پھر مجھے اسے
 تھلا بھی لگاتا ہے۔ آئندہ بچن ٹاٹے کے بعد بند ہو گا تو پھر
 صرف شام میں ہی کھلا کرے گا اور میری مرضی کے
 علاوہ کچھ نہیں بنے گا اس گھر میں۔ بہت عیاشی کرلی
 تم لوگوں نے اب اور نہیں۔“
 وہ رعوت سے کہہ کر جلنے لگی تھی جب حنہ
 نے فکر مندی سے پکار لیا۔

”لیکن اگر باورچی خانہ دوسرے کو بند ہو گا تو بچے
 اسکول سے آکر کیا کھائیں گے؟ میری تو خیر ہے مگر
 انہیں تو بھوک لگی ہوگی۔“
 ”یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ اور ویسے بھی اتنے
 سالوں میں کچھ نہ کچھ جمع جوڑ تو کیا ہی ہو گا تمہارے۔
 اگر اتنی ہی فکر ہے بچوں کی تو بازار سے منگوالینا کچھ۔“
 — تنفر سے کہہ کر وہ چلتی بنی تھی اور حنہ دوسرے
 لیے پریشان ہوتی رہت سمیٹنے لگی۔



دوسرے میں بچے حسب معمول اسکول سے لوٹے تو
 بھوک، بھوک کا شور مچا کر ماں سے کھانا مانگتے لگے۔
 اب حنہ انہیں کیا بتاتی۔ نیاز ہمیشہ اسے اس کی ذاتی
 ضرورتوں کے لیے الگ سے پیسے دیا کرتا تھا جو بھی
 خرچ کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ مگر شاید
 اسی وقت کے لیے رکھے تھے۔ اس نے تھوڑے
 سے پیسے نکال کر انور کو دیے اور بازار سے کھانا لانے کو
 کہل۔

”کیا اہی۔ آج گھر میں کچھ نہیں پکایا؟ رات کا تو
 رکھا ہو گا“ میں دبی لے کر آتا ہوں۔“ وہ اسکول سے
 تھکا ہوا آیا تھا اسی لیے باہر جانے سے کتراتا بچن کی
 طرف بھاگ۔ حنہ نے بھی نہ روکا۔ جانتی تھی ابھی
 منہ لٹکائے تو آپس آئے گا اور دبی ہو۔

”اہی۔ بچن میں تھلا کیوں لگایا ہے؟“ ماں کے
 پاس آکر اس نے پوچھا۔ پھر ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔
 ”لائیں چلیاں دیں۔ میں فریضے سے کچھ لے کر
 آتا ہوں۔“ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ حنہ کے

”کیوں کر رہی ہے تو یہ سب کچھ؟ اگر میں نیاز
 کی پہلی بیوی اس کے بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی
 دل بڑا کر سکتی ہوں تو تھوڑا سا جگر تو بھی دکھا سکتی ہے۔
 اگر تجھ میں واقعی انسانیت ہے تو اور نہ جس نیاز کا تو
 انسان کر رہی ہے میں! تمہی حرکتیں کے بارے میں بتا
 ہیں تو ایک منٹ میں چہلی سے پکڑ کے باہر کرے گا
 تجھے۔“

”اوہو۔ دھمکی۔“ کلفت نے ایک زوردار قہقہہ
 لگایا اور استہزائیہ نظریں حنہ پر گاندیں۔

”کس خیال میں ہونم حنہ بیگم! نکلنے کی جرات
 وہ اب بھی نہیں کر سکتا لکھ لویہ بات۔ اتنے دن
 تیل نہیں پچا میں نے۔ اور اس سب کے باوجود اگر
 تم اپنا شوق پورا کرنا چاہو تو پاور کھنک۔ کہ ہم دونوں کے
 اس جھگڑے میں نیاز کو پاگل کرنے کے سوا اور کچھ
 حاصل نہیں کر پاؤ گی۔“

اس نے ہنسی چالاک سے حنہ کی دھمکی رگ پر ہاتھ
 رکھا اور لاہولکی سے سیب دھوتے ہوئے بولی۔

ساتھ تھے اور وہ نظریں چرائے رہے۔

”نہیں ہیں میرے پاس کوئی چلیاں۔ اس نے لے لی ہیں اور تمنا بھی اس نے لگایا ہے۔ آج تو تو ایسے چلا گیا تھا آسمان سے لے کر جانا اور اپنے دل سے ہر کھانے کے لیے کچھ لیتے آتا۔ کیونکہ اب وہ ہر میں کچن نہیں کھلا کرے گا۔“

اپنے آنسو چھانے کے لیے وہ رخ موڑ کر جس الٹ پلٹ کرنے لگی تھی۔ اور کے چہرے پر بخیرگی چھا گئی۔ وہ بچہ ضرور تھا، مگر اتنا بچہ بھی نہیں تھا کہ کچھ سمجھ نہ پاتا۔ باپ کا پی پی کی طرف جھکاؤ وہ صاف محسوس کر رہا تھا اور اپنی ماں کی اداسی بھی۔ اور یہ سب کچھ اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اچھے اور برے کی تخصیص اس کے معصوم ذہن میں ایک نئی جنگ چھیڑ چکی تھی جس سے نیو آنا ہوتا وہ خاموشی سے کھانے چلا گیا۔

”سارا دن گاؤں کے ساتھ سفری کرتے ملے چکی ہو گیا۔ ذرا جو سکون آیا ہو۔ سر بھی دھنسنے لگا ہے لب تو۔ ہاں اگر کوئی محبت سے دوا دے تو شاید آرام آجائے۔“ اس نے کن اکھیل سے کہنے سے کہتی گفتہ کی طرف دیکھا تو اس کا مطلب سمجھ کر مسکرائی ہوئی بیڑ پر آئی۔

”آج بہت کام تھا۔ اور کشاپ میں۔ اس لیے رات میں بھی سو رہے آیا تھا اور لب کھانا کھا کر چائے کے بجائے یہ فرمائش۔ وہ گفتہ کا ساتھ چاہ رہا تھا یعنی وہ مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں آچکا تھا۔ گفتہ اپنی اس کالیابی پر اندر ہی اندر خوش ہوتی بظاہر دھیر سا مسکرا رہی تھی۔ نیاز کا سر دباتے دباتے وہ کئی بار اپنی پیشانی بھی مسل چکی تھی۔ جسے بالآخر نیاز نے محسوس کر لی۔

”تیرے سر میں بھی درد ہے کیا؟ کہیں دونوں کے بیچ جنگ تو نہیں ہوئی۔ لڑاؤ کے متاعی گرم کر دیا ہوا ہوا۔“ اس کے شرارت بھرے استفسار پر اس نے

چہرے پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ طاری کر لی۔

”میری کیا اوقات کہ تپا سے جھکڑا کروں۔ میرے نصیب میں تو بس دن رات لون کی بھٹکار سہتا اور دن کے ہاتھوں ذلیل ہونا ہی لکھا ہے۔ یہ سمجھ جی ہوئی اور وہ اس گھر کی مالکین۔ بھلا میں لون سے لڑنے کی ہمت کیسے کر سکتی ہوں؟“

”خیر! لیکن تو لب تو بھی ہے اس گھر کی۔ وہ بھی پورے برابر حق کے ساتھ۔“ وہ اپنی بیوی کی شکل پر دھرا اس کا ہاتھ نرمی سے دلاتے ہوئے بولا۔

”پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حسد کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ بڑی سادہ دل اور احساس کرنے والی فطرت تھی اس کی۔“

”کچھ نہیں ہوا اور نہ ہی کچھ بدلا ہے۔ اپنے شوہر اور بچوں کے لیے تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔ بس فرق یہ پڑا ہے کہ ایک بے سارا لڑکی بن کے رہتی ہے مگر اور ایک کے اندر کی ظالم اور سخت دل عورت کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا۔ اور نہ میں تو وہ ہمیشہ سے ہی ایسی۔ بس آپ ہی نہیں پہچان نہیں پائے۔“

شک کی طرح نفرت کا جھج بھی بس ایک بار بونے کی دیر ہوتی ہے پھر اس کو تنہا درخت بنانے میں زیادہ محنت نہیں لگتی۔ اس کی بڑھتی شائیں محبت، عقل اور بھروسے سمیت سب کچھ سلب کر لیتی ہیں۔ اور انسان اس کے جال میں یوں جکڑا جاتا ہے کہ پھر نکلنے کا کوئی راستہ بچھائی نہیں دیتا۔

نیاز کے ساتھ بھی اس وقت یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اور اس کی مانت پر سوچ نظریں محبت پر لگی تھیں۔

شام گہری ہو کر رات میں ڈھل چکی تھی اور حسد شمالی کی بیج سہلے دھیرے دھیرے کرے کے ساتھ اپنے دل میں بھی اندھیرا اترتے محسوس کر رہی تھی۔

نیاز اس رات جو اس سے چھڑا تو پھر اب تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ چھڑنا صرف نظروں سے اوجھل ہونا ہی تو نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کوئی سامنے ہو کر بھی

قریب ہو کر بھی چمکڑا رہا ہے۔ ایسے چمکڑے کی لذت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

وہ دنوں ایسا ہی کرب جھیل رہی تھی۔ اکثر ساری رات اسی لمبید پر جاتے گزار دیتی کہ کہیں نیاز اس کے دروازے پر آئے اور اسے سوتا کر دیکھیں ہی نہ پلٹ جائے۔ مگر کیا زندگی پر محیط تعلق کو سہاویں سے امرت کی طرح دل سے لپی محبت کو ختم ہونے میں 'مر جانا' میں 'مرنے' میں کھنسا ہی دقت لگتا ہے۔

"نہیں، نہیں۔" اس کا دل ملنے کو تیار نہ ہوتا اور سر بے اختیار نفی میں ہلاتے ایک نئی سوچ دل کے کواٹل میں برقعن ہونے لگتی کہ شاید نیاز بے قصور ہے یہ گفتہ ہی ہے جس نے اپنی عیاری سے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ اور جیسے ہی یہ پٹی اترے گی وہ دیکھیں اس کے اس لوٹ آئے گا کیونکہ نیاز اور حسہ کو بھول جائے نا ممکن۔

اسے اپنی — سوچ پر شرمندگی ہونے لگتی اور کبھی ہنسی آتی۔ یقین کراہونے لگتا اور آنکھوں میں بھجتی، حیرت پھر سے جل اٹھتی۔



دن ہی دنوں حسہ کی خاموشی نے گفتہ کی دیدہ دلیری کو مزید ہوا دی۔ اور وہ جو پہلے ہی اسے کچھ نہیں سمجھتی تھی اب مزید حیر جاتے ہوئے ملازمہ کا سا سلوک کرنے لگی تھی۔

اور کو یہ سب برداشت نہ ہوتا تھا۔ اسی لیے اس دن وہ عام سی بات جو معمول کا حصہ تھی اور کی موجودگی کے سبب چمکڑے کی صورت اختیار کر گئی۔

اور بخار کے سبب حسہ نے اس پر یہی قہر جب دشمن لگنے کی تیاری کرتی حسہ کے سامنے گفتہ نے چہ کپڑے لٹا پھینکے۔

"پورے تین جنورے ہیں، وہیں سے دھوٹا۔ اور دیکھنا! پٹا نازک کپڑا ہے کہیں سے خرابہ نہ ہو۔ اور ہاں، پچھلی بار بھی ایک دو جگہ دلغہ گئے تھے لیکن

میں خاموش رہی، اس لیے کوشش کرنا کہ اس بار شکایت کا موقع نہ ملے تو اچھا ہے۔"

دل کی ایسی عزت انزائی پر اس کے اندر وہ طوفان اٹھا کہ تمام لہجوں کو بھلائے گال بھجھو کا چہرے کے ساتھ وہ ان کے سر پر جا پہنچا اور براہ راست گفتہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ترخ کر پڑا۔

"کیوں دھو نہیں میری اہی تمہارے کپڑے؟ تمہارے ہاتھ لٹے ہوئے ہیں اور نہ ہی ہم تمہارے نوکر۔ پھر کیوں دھوئیں۔"

اس کی آنکھوں میں اشتعل تھا اور نفرت بھی۔ پشت بھر چھو کرے کی ایسی زبان درازی پر وہ بھنا کر رہ گئی۔ اور رکھ کر ایک پھپھر اس کے پھول سے گال پر جڑیا۔

غصے اور تلیف سے بے حل ہوتے اور نے بھی پھر کوئی اوجھار نہیں رکھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی پوری طاقت سے اسے اس زور کا دھکا دیا کہ سینچنے کی کوشش کے باوجود وہ پیچھے دیوار سے جا لگی۔ اس کی کہنی پر کئی خراشیں پڑ گئیں۔

اور کارروائی کرتے ہی گھر سے بھاگ گیا تھا۔ گفتہ بے بسی سے پہلے تو بیچ و تاب کھاتی رہی۔ مگر پھر اس کے شاطر دل نے اسی جھکڑے کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا سوچا۔ اور حسہ اسے خاموشی سے کمرے میں جاتے دیکھ کر ایک اطمینان بھری سانس خارج کر کے رہ گئی۔



نیاز جب سے آیا تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ گفتہ بڑی چپ چپ تھی اور لو اس بھی۔ تب ہی نیاز نے کھانگارتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔

"کیا بات ہے جناب! آج ہماری میٹا بڑی چپ ہے۔ کمرے میں کوئی روٹن ہی نہیں! بندے سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو سزا دے لو، پریوں لو اس رہ کے اپنی ہنسی سی جان پر تو غلہ نہ کرو۔" اس نے جو ہنسی اسے پڑ کر پاس بٹھانا چاہا۔ گفتہ کے لبوں سے سکازی

نکل گئی۔ اس کی "نوحی" کہنی نیاز کے ہاتھ میں تھی اور اس پر لگی خراشیں بھی نہ دیکھ چکا تھا اس لیے ساری شوخی ہوا ہو گئی اور وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔
 "یہ کیا ہوا ہے خلقت؟ اگر گئی تھی کہیں۔ تو ٹھیک تو ہے؟" وہ اس کا بازو الٹ پلٹ کر دیکھتا سوال پر سوال کر رہا تھا اور خلقت بھائے جواب دینے کے ہتھ پھک کر رووی۔ نیاز اور بوکھلا گیا۔

"لو کیا ہو گیا ہے؟ زیادہ درد ہو رہا ہے تو چل ڈاکٹر کے پاس لے چلوں تجھے۔"
 "کیا اس گھر پر اور آپ پر میرا کوئی حق نہیں؟" سکسوں کے درمیان کے گھٹنے اس کے الفاظ نے نیاز پر بہت کچھ عیاں کر دیا تھا۔ سجدہ ہو گیا۔
 "کیا مطلب۔ آج پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے؟ پر اس جھگڑے کا تیرے زخم سے کیا تعلق۔؟"
 "میرے ہر زخم کا تعلق اسی گھر اور اس کے جھگڑوں سے ہے نیاز صاحب۔"

"او کیوں پیلیاں بھواری ہے۔ سیدھی طرح کہیں نہیں بتائی کہ کیا ہوا ہے؟" نیاز سوچ رہا تھا تو بالا آخر دھڑکے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔
 "آج گھر کی منگائی کے بعد میں اپنے کپڑے دھوئے گئی تو آپ کے گندے کپڑے بھی ساتھ رکھ لیے دھونے کے لیے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ کیا اس قدر ریمان جائیں گی۔ انہوں نے مجھے اتنا برا بھلا کہا کہ میری جرات کیسے ہوئی ان کے شوہر کے کپڑوں کو ہاتھ لگانے کی۔ میں صرف ترس کھا کر اس گھر میں رکھی گئی ہوں اس لیے آپ پر یا آپ کی چیزوں پر حق حملے کی کوشش نہ کروں۔"

میں نے جواب میں احترام کے ساتھ صرف اتنا کہا کہ بے شک میں ترس کھا کر لائی گئی ہوں پر ہوں تو ان کی بیوی ہی نہیں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے اپنے شوہر کے کام کروں مگر کا خیال رکھوں۔ اتنی سی بات پر آپ کو اتنا غصہ آیا کہ میں نے ان کے سامنے زبان چلائی ہے اور انہوں نے میرے منہ پر نور کا پتھر ڈرے مارا۔ میں اس پر بھی خاموش رہی کہ چلو تپا ہنی ہیں کوئی

بات نہیں۔ مگر جب آپ کی شہر پارک اور نے مجھے دھکا دیا تو مجھے بہت تکلیف ہوئی نیاز! سر اور بازو پر جوت بھی اسی وجہ سے آئی۔"

اس کی درد بھری سسکیاں مسلسل کمرے میں گونج رہی تھیں اور نیاز کا فشار خون بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔ جھٹکا کھا کر بستر سے نیچے اتر آیا۔

"یقین نہیں آتا مجھے کہ جس عورت کو میں فرشتوں سا معصوم سمجھتا تھا اس حد تک نیچے گر جائے گی۔ ابھی سبق سکھا کے آتا ہوں ان ماں بیٹوں کو۔ لاوارث سمجھ لیا ہے تجھے کہ جو مرضی کرتے پھر س گے اور کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔" وہ غصے میں آگ بگولا جو نشی باہر جانے کو پکا خلقت نے صحت اس کا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں، نہیں۔ خدا کے لیے! میری وجہ سے آپ گھر میں جھگڑا نہ کریں۔ اگر آپ میرے ساتھ ہیں تو میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ یقین مانیے تجھے اور کچھ نہیں چاہے سوائے آپ کے۔"
 اس نے بے مشکل آسے سمجھا تھا کہ لہذا اکیلے کیونکہ ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے اس کا مقصد ہرگز نہیں تھے۔ اسے اس حد تک بھروسہ چاہتی تھی کہ پھر جب وہ بچے تو سب کچھ تس تس کر دے۔ اور اس کی راجد حالی کے لیے خطرو بننے والا کوئی وجود باقی نہ رہے۔

"دکتر پریشان کرتی ہوں میں آپ کو۔ پر میں بھی کس سے کہوں؟ آپ کے سوا میرا ہے ہی کون۔"
 کچھ دیر بعد جب سوختے بجھنے کے قابل ہوا تو اس کا ہاتھ قلعے محبت سے گھم رہی تھی۔ پھر اچانک کچھ یاد آئے پر اتنے رہا تھا مار کر بولی۔

"میں ہوا میں آپ کے لیے چائے بنا تا تو بھول ہی گئی تھیں۔ ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی تو نیاز نے پکڑ کر دوبارہ بٹھالیا۔

"نہر جا۔ کہاں جائے گی تو۔ پہلے ہی جوت لگی ہوئی ہے۔ میں جاتا ہوں چائے بھی بنا لاؤں گا اور تیرے زخم کے لیے کوئی ٹوب بھی لیتا آؤں گا۔ پھر باہر

کوئی حصے لگ گیا تو خواہ مخواہ میں۔ "وہ بیڑا تباہ ہو گیا
تو گفتہ کے لیوں پر کھپاتی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔



گفتہ کی امیدیں شدید مایوسی میں ڈھلتی جا رہی
تھیں کہ اس دن اچانک بغیر کسی منصوبہ بندی کے ہی
وہ سب ہو گیا جس کا انتظار لوہاری وہ چھپنے کی جگہ سے
کر رہی تھی۔

ہوا بکھ پوں کہ اس دن حسد کے پاس محفوظ تمام
رقم خرچ ہو چکی تھی اور ساری جیب بھوک بڑاشت
کرنے کے بعد بچے شدت سے شام کے شکر تھے تاکہ
بچن کھلے اور ان کی ہل کھاتا تیار کر سکے۔ ان کی گفتگو
سے گفتہ پہلے ہی اندازہ لگا چکی تھی۔ اسی لیے جوں ہی
نیاز رات میں گھر آیا اس کی لودھاری شروع ہو گئی۔
نیاز کے لیے کھانا لینے کے بدلے نامی وہ فوراً ہی پکرا
کر گر گئی تھی۔ نیاز کے تشویش سے پوچھنے پر بڑی
مصوبیت سے جواب دیا۔

"کچھ خاص نہیں۔ بس وہ طبیعت کی خرابی کی
وجہ سے صبح کے کام نہیں کر سکی تھیں۔ تو سزا کے طور
پر تپانے پر کھانا ہی بند کر دیا۔ شاید اسی وجہ سے
گھروڑی ہو گئی ہے۔"

نیاز کا ضبط سے بدلا چہرہ دیکھ کر اپنی چالاک پرناز میں
جو نمی باہر نکلی۔ انور کو کھانا لے کر اس کے کمرے کی
طرف جانے دیکھا۔ حالانکہ انہیں گفتہ کے کھانا
نکلنے کے بعد کھانا لینے کی اجازت تھی مگر اس دن
بھوک کی تاب نہ لاتے ہوئے وہاں کے روکنے کے
بلو جو کھانا لینے چلا گیا۔ ایک تو اس کی اس دیکھ دلیری
نے گفتہ کو سخت تپو دلایا تھا لوہر سے اچھی اچھی
پوشوں سے بھری اس کی پلیٹ نے اس کے رے سے
لوہاں بھی خطا کر دیے اور وہ نیاز کی موجودگی کو یکسر
فراموش کر کے اس پر برس پڑی۔

"اتنی جرات تیری کہ میرے کمرے کی کوئی اہمیت ہی
نہیں رہی تیرے نزدیک۔ ساری ہنڈیا خالی کر کے جا
ہا ہے میرے۔ مفت کامل سمجھ لیا ہے کیا۔؟"

شرر بار لگا ہوں سے اسے گھورتے ہوئے گفتہ نے ہٹا
کسی لحاظ کے اس کے ہاتھ میں پکڑی رہے کو ہاتھ مار کر
نہیں پگرا دیا۔

برتن کرنے کی اور دار کو الگ کے ساتھ حسد اور
نیاز بھی کمرے سے نکل آئے اور اسے دیکھتے ہی گفتہ
کو احساس ہو گیا کہ جلد بازی میں وہ کیا کر چکی ہے۔
"خدا کے لیے تپا اپنے معاف کر دیں۔ مجھ سے
غلطی ہو گئی، آئندہ جو آپ کہیں گی وہی کروں گی بس
اس بار معاف کر دیں۔" وہ زار و قطار روتے ہوئے کہہ
رہی تھی اور حسد اس کے ہوں پر سترابہ لے رہا تھا تاکہ
تمنی لیکن نیاز تیزی سے اس کی جانب دھنک۔
"کیا بت ہے گفتہ! تو معافی کیوں مانگ رہی ہے
۔ لوہر یہ روئی سالن؟ آخر کیا تماشا ہو رہا تھا لوہر۔؟"

"کوئی تماشا نہیں ہے نیاز۔ ساری غلطی میری ہی
ہے۔ جب تپانے مجھے ان کے کمرے بغیر کھانا کھانے
سے منع کیا تھا تو مجھے اپنے لیے کھانا نہیں لانا چاہیے
تھا۔ بس اسی بدلتے تپا کو غصہ آ گیا اور انہوں نے ٹرتے
گرادی۔ مگر کوئی بدلت نہیں کیا! آپ ناراض نہ ہوں۔
اب جب آپ کہیں گی میں تب ہی کھانا کھاؤں گی۔
میں بھلا آپ کی حکم عدولی کر سکتی ہوں۔ کبھی
نہیں کبھی بھی نہیں۔"

وہ ڈر کے مارے کنب رہی تھی اور حسد اس کے
جھوٹ اور لودھاری پر ششدر رہ گئی تھی۔

"یہ سراسر جھوٹ بول رہی ہے نیاز۔ تو اس کی
بات کا بالکل یقین نہیں کرنا۔ تو نہیں جانتا اس نے
ہمارے ساتھ کیا کیا کیا ہے۔ تو کروں کی طرح ہم اپنے
ہی گھر میں رہتے ہیں نیاز۔ سارا گھر اس نے اپنے
قبضے میں کر لیا ہے۔ بچوں کو مارتی ہے، دھمکاتی ہے۔
میں تک کہ اس کی مرضی کے بغیر یہ بچے روئی بھی
نہیں کھا سکتے۔ سارا سارا دن بھوکے گزار دیتے ہیں۔
آج بھی یہ نہیں انور کھانے کر آ رہا تھا جو اس نے
ہاتھ مار کر گرا دیا۔ تم میرا یقین کو نیاز۔ یہ وہ نہیں جو
نظر آتی ہے۔ تم نہیں جانتے۔"

”سب کچھ جانتا ہوں میں۔“ اس کی تمام باتوں کے جواب میں نیاز کے ایک جملے نے سارا ماحول ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

”سب جانتے تو نیاز۔ پر کب سے؟“ حنا عیزی سے اس کے قہقہے آئی۔

”میں کتنی بھی بچوں سے کہ جب تمہارے ابو کو کچھ کاہتا لگے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین تھا تم پر اور اپنی محبت پر۔ لیکن معاف کرنا نیاز! میں اب اس عورت کو اور آنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اپنے ساتھ ہوا ہر ظلم میں بھول بھی جاؤں تو اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی نہیں بھلا سکتی۔ اس لیے تم پرانے ماں اور اسے اس کے چاہے کے گھر چھوڑ آ۔ یا کہیں بھی چلی یہ چاہے میں اپنے گھر کا سکون اور روبرو نہیں کر سکتی۔“

وہ اپنی سے نیاز کو دیکھتے ہوئے بالکل ایسے ہی بات کر رہی تھی جیسے کبھی اچھے وقتوں میں کیا کرتی تھی۔ لیکن سامنے بھی کیا وہی نیاز تھا؟

گفتگو کے لمبوں پر طنز و مسکراہٹ تھی جو نیاز کے منہ سے نکلتے الفاظ کے ساتھ گہری ہوتی چلی گئی۔

”ہاں اس گھر سے تو ضرور جائے گی۔ پر یہ نہیں تو۔“

اس کے لفظوں میں سختی زیادہ تھی یا آنکھوں میں سفاکی۔ وہاں کھڑا کوئی شخص اندازہ نہیں لگایا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو نیاز۔؟“ حنا کو ایک بار پھر لگا کہ شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے مگر ایک بار پھر وہ خود ہی غلط ثابت ہو گئی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔“ اس نے حنا کو بانہ سے پکڑ کر دھکا مارا اور زور سے چلا دیا۔

”مجھے ذرا شرم نہیں آئی حنا! یہ سب کرتے ہوئے۔ سب بتائی رہی ہے یہ مجھے، کیسے تم لوگوں نے اس کی مدد کی۔ اور کے ساتھ مل کر اسے مارا۔ سارے گھر کے کام کرائے اتنی زیادتیاں کیں اور اس نے کبھی آف تک نہیں کی۔ ہر بار مجھے کیا سمجھ کے معاف کیا اور اگر کبھی میں نے کچھ کرنا چاہا تو

مجھے بھی روک لیا۔ اس نے اور تو ایسی۔“ وہ اتھالی انیسویں سے لے کر دیکھ رہا تھا اور حنا میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ سر کو نیچی میں ہی جنبش دے لیتی۔ اس کی حالت سے بے خبر نیاز کھتا رہا۔

”ہلے دعوے کر لی تھی میں تو مجھ سے محبت کے۔ میری خاطر ایک چھوڑ ہزار سو گئیں بھی برداشت کرنے کو تیار تھی۔ اور تو اتنی کم طرف لگی کہ یہ مسکین سی لڑکی بھی برداشت نہ کر سکی؟ تو ابھی اور اسی وقت اپنے بچوں کو لے کر میرے گھر سے نکل جا۔ میں اور کچھ نہیں سنا چاہتا۔“ اپنا فیصلہ بنا کر وہ نفرت سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ حنا تڑپ کر اس کے سامنے آئی۔

”رب کی قسم نیاز! میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ مجھے میرے بچوں کی قسم۔ جو تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو بے شک انور سے پوچھ لو۔“ حنا نیاز کے سامنے رو رہی تھی اور اس کے دل کو کچھ نہیں ہو رہا تھا۔

ضروری تو نہیں کہ ایک چوہہ ہمیشہ ہی بیمار لگے۔ ایک آنسو ہمیشہ ہی بااثر ٹھہرے۔ وقت بدل بھی تو جاتا ہے۔ اور وقت بدل چکا تھا کیونکہ وہ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے آگے نہیں بڑھا تھا۔

”اچھا۔ اگر سب کچھ اس نے کیا ہے تو تب تم لوگوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ تم لوگوں کا اصلی چوہ میرے سامنے آچکا ہے۔ اس لیے اب بہتری اسی میں ہے کہ مزید جھوٹ بولنے یا گفتگو پر الزام لگانے کے بجائے فوراً دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔ میں شل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تم لوگوں کی۔“

وہ بڑے چہرے بڑے کبوتر بچے کے ساتھ انہیں باہر کا راستہ دکھا رہا تھا۔ اور وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اٹھا کر رہی تھی۔

”رب دے واسطے نیاز۔ اتنا علم نہ کرو۔ رات کے اس پرہیزم کہیں جائیں گے؟“

وعدہ کر لی ہوں اب تمہیں کوئی شکایت نہیں ہونے والی گی۔“

”اُمی بہت سردی لگ رہی ہے اندر چلیں!“
اسے شدت سے اپنے بچوں کی فکر ہوئی، مگر کچھ
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔
اس کا تو کوئی مسکنہ بھی نہیں تھا۔ تب ہی اس تاریکی
میں خدیجہ پھوپھی کا چہرہ جگمگایا اور خدا نے جیسے اسے
راستہ دکھا دیا۔

خدیجہ پھوپھی اتنی رات گئے ہوں تھا اسے بچوں
کے ساتھ اپنے گھر دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔
پٹری زندہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر حنہ نے کچھ کہنا
چاہا تھا، مگر اندر سے اتنی عدمِ حال ہو چکی تھی کہ ایک
لفظ بھی نہ بول پائی۔ اور وہیں زمین پر ڈھیر ہو گئی۔

جب تک اسے ہوش تھا ”انور۔ ساری بات
تفصیل سے گھر والوں کو بتا چکا تھا۔ گھر کے تمام افراد
اس وقت اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔
حنہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھرنے لگی تھیں۔

”بہت برا ہوا ہے میری بچی تیرے ساتھ۔ اور تو
اتنے وقت سے یہ سب اکیلی برداشت کر رہی تھی۔
ایک بار بھی اپنی پھوپھی کو دل کا حال نہیں بتایا۔

بر تو فکر نہ میری بچی۔ اللہ کے بعد جب تک تیری
پھوپھی زندہ ہے، تجھے کبھی بے آسرا نہیں ہونے دے
گی۔ اور جہاں تک نیاز کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے
کہ وہ بھی جلد ہی سیدھا ہو جائے گا۔ ایسی زبائیاں زیادہ
دن نہیں رہیں کسی کے پاس۔“

اسے خوب سلی دینے کے بعد جب انہوں نے اپنی
بھانجی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس کا ہاتھ چاٹا تو ان
کے کس سے آتی مستکی خوشبو نے اسے اس کی ماں کی
یاد دلادی تھی۔

وقت کا پیرہ اپنی رفتار سے گھوم رہا تھا۔ شروع کے
دو چار دن نیاز کو بچوں کی کمی کُلنی کھلی۔ حالانکہ وہ کئی
مہینوں سے ان سے ملا تک نہیں تھا لیکن گھر میں ان
کی موجودگی کا احساس تو تھا، وہ پل بھر کو اس ہوتا مگر پھر

”میں تیری کوئی بکواس نہیں سننا چاہتا حنہ! جو کچھ
تو نے کیا ہے اس کے بعد بھی میں تجھے صرف گھر سے
نکل رہا ہوں۔ لیکن اگر تو نے ایک بھی لفظ کے بغیر
یہ گھر نہ چھوڑا۔ تو میں تین لفظ بول کر تجھے پیشہ کے
کے چھوڑ دوں گا۔“

اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ جنوری کی بنِ خستہ رات بھی
تھکھڑکی تھی۔ تین لفظوں کے خوف نے جیسے اس
کی چلتی سانسوں کو بھی روک دیا تھا۔ ہر سو گھور اندھیرا
چھا گیا اور کبھی خاموشی۔ صرف باہری نہیں اندر
بھی پھوہ کچھ کہہ ہی نہیں سکی۔ جب چپ اٹھی اور
بچوں کا ہاتھ تمام کر رہا ہر کل گئی۔ پیچھے دروازہ بند ہو
گیا تھا۔

وہ اپنے گھر کے باہر بنی بیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔
رات کا وہ سراپا شروع ہو چکا تھا اور وہ اپنے دو بچوں کو
واپس ملنے بیٹھے بار بار اس بند دروازے کو دیکھ رہی
تھی۔ یہ وہ گھر تھا جسے اس نے پچھلے بار سال اپنا حیات
محبت سے سنوارا تھا، سجایا تھا اور آج بڑی بے دردی
سے کسی لور کو اس کا مالک بنا دیا گیا تھا۔ حنہ آنکشت
بدلتی تھی کہ یہ وہی شخص تھا جو حنہ کی ایک
مسکراہٹ کے بدلے اپنا آپ وارے کو تیار رہتا تھا۔
لور آج اسی حنہ کو اس چند دن کی لگی عورت کے
لے ہوں اپنی زندگی سے بے دخل کر دیا تھا کہ اس کی
شکل دیکھنے کا بھی ردِ لوار نہیں تھا۔

کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟
ریت کی دیواری کی مانند۔

جو ذرا سی تیز ہوا کا بار بھی برداشت نہ کر سکے اور ذرا
دباؤوں بکھر جائے کہ جیسے کبھی بھی نہیں۔

نیاز کا بدلا وہ ایک حقیقت تھا۔ مگر حنہ اس
حقیقت کو قیل میں کپاری تھی سب سے یقین اتنی تھی
کہ اس کا زہن ہی ماؤف ہو گیا تھا اور وہ اتنا کہ دل پہنا
جا رہا تھا تب ہی گئی کی کپکپاتی تواز نے اسے اپنی
جانب متوجہ کیا۔

جیسے ہی گفتہ کا چرو نظر آتا ہر احساس بدل جاتا۔

اب وہ آواز بھی خود مختار۔ اس گھر کے ہر سیاہ سفید کی مالک۔ نیاز تو سارا دن بور کشا رہتا اور وہ جو چاہتی کرتی۔ اس لیے وہ بے پناہ خوش تھی اور نیاز کو بھی خوش رکھ رہی تھی۔

شرع کے کچھ دن خوب مزے کرنے کے بعد اب گفتہ بور ہونے لگی تھی۔ اس لیے اپنی پرانی عادت کے مطابق اس نے گھر سے باہر تانکا جھانگی شروع کر دی۔ اور جیسے ہی سبزی والے کی توازنی ضرورت نہ ہونے کے باوجود باہر کی طرف دوڑ لگادی۔

”بھائی! کو بھی ہے تمہارے پاس؟“ اس نے اپنی پسندیدہ سبزی کے بارے میں پوچھا۔

”نہی باقی ہے؟“

”ٹھیک ہے“ وہ دے دے۔ اور یہ ٹائٹ ”پوچھتے ہوئے پوچھتی اس نے سرسری سی نظر سامنے اٹھائی تو بری طرح چونک گئی۔

سیاہ بنیان پر کھلے بنوں کی شرٹ چھانے وہ منہ میں دبے تنکے کو یہاں سے وہاں گھماتا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ گفتہ نظر انداز کر کے خریدار ہوا

سلان لیے اندر آگئی۔

مگر پھر اگلے کئی روز روزانہ ہی کچھ نہ کچھ خریدتے ہوئے مسلسل اسے گھور رہا ہوتا۔

چاہا چاہی کے گھر بھی وہ کھانے پینے کے بدلے ان جگہوں میں پڑی رہتی۔ اور ایسے معاملات میں اسے کبھی دشواری کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ اس کی خوب صورتی اور ادا میں ہمیشہ ہی اس کا ساتھ بھائی

تھیں۔

لیکن اب وہ کھلے عام ایسا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک شریف آدمی کا نام اس کے نام کے ساتھ جڑ چکا تھا۔ وہ سارا کوئی ٹھکانہ اس کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے وہ کئی چھپی مسکراہٹ سے کام چلاتی۔

لیکن پھر بھی اس شام نیاز گھر لوٹا تو بے بدلے سے اس سے پوچھنے بغیر بھی نہ رہ سکی۔

”ہم گھرے پرے مکے میں رہتے ہیں نیاز! لیکن

کوئی بھی ہمارے گھر نہیں آتا۔ آپ کا میں خیال کہ ہمیں بروسیوں سے تعلقات بنانے چاہئیں؟ میں سوچ رہی تھی کہ کل سامنے والوں کے گھر ہو توں۔

ویسے بھی سارا دن بور ہوتی رہتی ہوں۔“

”او خبردار! ان کے گھر جانے کی تو سوچنا بھی ملے۔“

نیاز تو سنتے ہی ہتھ سے اکھڑ گیا۔

”بڑا آوارہ ہے ان کا چھوٹا لڑکا! بڑے بھائیوں اور بیو کے پیسے پر عیش کرتا ہے سارا دن گلی کے کنارے بیٹھا کڑیاں تان رہا ہے۔ اس لیے گھر میں آرام سے بیٹھ۔“

ایک نمبر کا لنگا سے۔

نیاز کی سختی سے کی گئی تنبیہ پر اس نے بظاہر تو سر اٹھاتے ہیں مگر اندر ہی اندر وہ دل موس کر رہی تھی۔

مجبور گفتہ تھی۔ لیکن اس آواز لڑکے آصف کی ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ اس پر گفتہ کی مسکراہٹ نے بار بار اسے شہ دی تھی جس سے وہ اس کی ”جپ“ کو انچھی طرح پہچان گیا تھا۔ اسی لیے اس دن جب سہر کا وقت تھا اور وہ درخت کی چھائوں میں لیٹی ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی۔ چھوٹے سے پتھر میں لینا ایک کانڈ اس کے قریب آگرا۔

چونک کر لوہرا دھڑکیٹے ہوئے اس نے کانڈ اٹھالیا

تھلے گھول کر دیکھا تو بڑے بڑے ہندسوں میں موبائل نمبر لکھا تھا اور نیچے ”تمہارا آصف“ گفتہ کے لبوں پر ایک جاہل سی مسکراہٹ آگئی وہ جانتی تھی کہ آصف اسی سامنے والے لڑکے کا نام ہے۔

حفظ باقاعدہ کے طور پر نمبر لیٹی کے نام سے موبائل میں محفوظ کیا اور کانڈ پھاڑ کر پھینک دیا۔

وہ دن خدا جانے کس طرح کٹ کر تیسرے دن خود کو اس کا نمبر ملانے سے کہیں روک پائی۔

”سلو آگن بول رہا ہے؟“ سلان سے انداز میں کیے گئے سوال نے اسے آؤ لا رہا۔

”خود ہی نمبر پھینک کر پوچھتے ہو کہ کن بول رہا ہے۔“

SCANNED BY

URDU SOFT BOOKS

اگر بھولنا ہی تھا تو نمبر کیوں پوچھتا؟

تھف کے ذہن میں جھماکا ہوا لورڈ دھیرے سے ہنس رہا۔

”اچھا! تو تم ہو۔ دراصل لورڈ کے شدید انتظار کے بعد میں اتنا ہوس ہو گیا تھا کہ مارغ سے ہی نکل گیا۔“

”اچھا تو کیا سمجھا تھا تم نے مجھے ہوئی آواز لڑکی؟ جو تمہارے ہی نمبر کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ جھٹ سے کل ملا دیتی۔ ایک شریف آدمی کی بیوی ہوں میں شاید تم بھول رہے ہو۔“

”یہ یاد رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اور اگر تم اسے دیانت داری سے بھاری ہو تیں تو کج میرے موبائل پر تمہاری کل نہ آتی۔“

آصف کے دبدبو جواب نے اسے بل میں کمرچی کر چمک کر دیا۔ دیکھو چپ کر گئی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس رہا۔

”اب چپ کیوں ہو گئی ہو؟ اچھا بھئی۔ سوری۔۔۔ دراصل میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ تم بہت خوب

صورت ہو۔ کچھ ایسا خاص ہے تم میں۔ جو میں نے کج تک کسی دوسری لڑکی میں نہیں دیکھا، اسی لیے تمہاری وہ شادی شدہ دلال کو الٹی بھی بھول گیا۔ لیکن میں بھی عام ہرگز نہیں ہوں یہ میں بھی تم سے منواؤں گا اگر تم مجھ سے دوستی کرو تو۔“

اس نے کچھ اس انداز سے بات پلٹی کہ گفتہ کا سارا فضا بھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ خود بخود مسکراتے لگی۔ پہلی بار کسی سے بات کرتے لورڈ بات بولنے میں مزا آ رہا تھا۔

”میں اتنی جلدی کسی راہ چلتے سے دوستی نہیں کرتی۔ سوچ کر بتاؤں گی۔ ایک آواز سے کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔



احسان جلدی ہی شہر کے لیے نکل آیا اور سیدھا نیاز کی درکشپ پر پہنچا۔ نیاز اسے یوں اچانک سامنے دیکھ

کر بہت خوش ہوا اور اٹھ کر گلے سے لگا لیا۔

”لورڈنا احسان۔ کیا حال ہے تیرا؟ یوں اچانک۔ سب خیریت تو ہے میں۔“ اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے اس نے خوش دلی سے پوچھا تو سنجیدہ ہو گیا۔

”بس نیاز بھائی! خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔۔۔ دراصل میں لورڈ اور علی کا اسکول کا سامان لینے آیا تھا۔ ان کے امتحانات ہونے والے ہیں میں!“

وہ صرف نیاز سے بات کرنا چاہتا تھا اسی لیے آتے تھے کی وجہ تلاش۔ تاکہ ڈائریکٹ بات کرنے پر نہ براہ مان جائے۔

”اچھا! تو تم لوگوں کے پاس ہیں۔“ اسے ایک گوند سکون ملا تو دوسری طرف بے زاری بھی ہوئی۔

”خوب شکایتیں لگائی ہوں گی میری۔ بڑھ چھ کے میرے ظلم کے قصے سنائے ہوں گے۔ لیکن اپنی ایک بھی کارستانی نہیں بتائی ہوگی۔

جبائے امن کی خیریت پوچھنے کے وہ ایک دم سے شروع ہو گیا تو احسان نے مجبوسانہ اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”تو غلط سوچ رہا ہے نیاز بھائی۔ حنہ نے آج تک تیرے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ ہمیں جو کچھ پتا چلا وہ لورڈ نے بتایا۔ حنہ نے نہیں۔“

”وہ بھی تو اس کی اولاد ہے میں اور وہی کسے گا جو میں سکھائے گی۔ تو نہیں جانتا احسان۔ ان ماں بیٹے نے مل کر کتنی زیادتی کی ہے گفتہ کے ساتھ۔ ورنہ تو کبھی ان کی حمایت نہ کرنا۔“

”بچے ایسے معاملوں میں کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ نیاز بھائی۔ اور پھر تو کن کا سا گایا ہے۔ کوئی سوتیلا تو نہیں جو وہ تیرے خلاف سازشیں کریں گے، سمجھنے کی کوشش کر بھائی۔ معصوم لڑکی نہیں بلکہ حنہ اور

تیرے بچے ہیں۔ یہ تو اس کی چلائی ہے جو اس نے اس طرح تجھے اپنی باتوں میں پھنسا یا کہ تو صحیح اور غلط میں تمیز ہی بھول گیا۔ ورنہ کیا تو حنہ اور اپنے بچوں کو جانتا نہیں تھا۔“

لنے کو دیکھنے کو بھی بی چاہتا ہے۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔

"دل میرا بھی چاہتا ہے تم سے لنے کو۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ اگر مکے والوں نے دیکھ لیا۔ پانیاز کو ہٹا چل گیا تو کیا ہو گا میرا۔ میرے پاس تو اور کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔"

"اس کے ذہن میں گوندا سا لپکا اور وہ پر جوش ہو گیا۔ "مجھ کو حل مل گیا۔ میں بس ابھی بندوبست کر کے آتا ہوں" تم نون بند کرو۔ اور تین رات ایک زبردستی ملاقات کی تیاری کرو۔"

"مگر آصف سنو تو بیلو۔ بیلو۔"

وہ پکارتی رہ گئی لیکن دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔

تو صبح گھنٹے بعد پتھر کے ساتھ ایک لفافہ ٹپ سے کرا مچن میں۔ گھنٹہ لے جلدی سے لفافے کے اندر جھانکا تو گولیوں کے ڈپے اور ساتھ ایک پرچی نظر آئی۔ جس پر لکھا تھا۔

"یہ نیند کی گولیاں ہیں۔ روزانہ دو ڈپے شوہر کی چائے میں ڈال کر اسے پلا دیا کرنا۔ وہ سو جائے گا۔ تو میں اگر تم سے مل لوں گا۔"

پرچی پھاڑ کر گھنٹہ لے روٹی کی نوکری میں پھینکی اور گولیاں چھپا کر بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگی۔

ہر کام صرف پہلی بار مشکل لگتا ہے اور پھر معمول کا حصہ بن جاتا ہے۔

گھنٹہ لے بھی پہلی بار بہت ڈرتے ڈرتے نیاز کو گولی ملی چائے پلائی تھی۔ اور پھر سب کچھ آسان ہوتا چلا گیا۔ آصف سے ملنا اور گھنٹوں سامنے بیٹھ کر باتیں کرنا اتنا دل آویز تھا کہ اس کا روزانہ دن سانس نہیں لے سکا اور خواہش کا نشہ دہریں کر اسے ہمیشہ کی نیند سلا گیا۔ گھنٹہ کئی دن سے آصف سے جو سوال پوچھتا چاہ رہی تھی آج پوچھ بیٹھی۔

"سب تمہیں تو ان کہتے ہیں۔ بڑھ لکھ بھی نہیں سکے تو کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟" آصف کے

"جانتا ہوتا تو اس طرح جو کا نہ کھاتا۔ اور خوب سبق پڑھا کے بھیجا ہے مجھے حنہ نے۔ اپنی نہیں چلی تو مجھے وکیل بنا کے بھیج دیا۔ ہر ایک بات کلن گھول کے سن لے احسان! اور جا کے اسے بھی بتا دنا۔ کہ اب میرے گھر میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔ میں دوبارہ اسے گھنٹہ پہ ظلم کرنے کا موقع نہیں دینے والا۔ اس لیے تو بھی اپنا نام ضائع نہ کر۔ اور جو کرنے آیا ہے کر کے گھر جا۔" وہ کہتے ہوئے موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا تھا۔ احسان اس کے پیچھے لپکا۔

"تو ایک بار پھر غلط سمجھ رہا ہے نیاز۔ میں تو یہ سب خود ہی۔"

"مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں اس بارے میں اور کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔ چپ کر کے موٹر سائیکل پر بیٹھ لو گھر چل۔ بس۔"

اس نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے موٹر سائیکل اشارت کر دی۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ حنہ اور انور جج کہتے تھے۔ اس کا نہیں اور بھی بچتہ ہو گیا۔

جب گھنٹہ نے یہ جاننے کے بعد کہ وہ حنہ کا رشتہ دار ہے ٹھیک استہزائیہ مسکراہٹ اس کی طرف احوال۔ اور بڑے غر سے گردن اگڑا کر گھر کی چابیوں کا گچھا اسے دکھایا۔ مگر نیاز سے نظر ہٹا کر۔

نیاز کی عقل پر انوس کرنا وہ گھروٹ آیا تھا۔ بچے اپنا سامان دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

ملاقات کے بارے میں وہ حنہ سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دوستی کے رشتے سے کہیں آکے نکل گئی تھی۔

نیاز کی راہ دیکھنے والی گھنٹہ اب اس کے در سے آنے کی دعا میں مانگا کرتی۔

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے گھنٹہ! میرا تم سے

مسکراتے چہرے پر اس کا سوال سنجیدگی کے لگی سائے لہا گیا۔
 ”کیا کام کروں؟ باپ، بھائی کوئی بھی مجھے کامدار کے لیے پیسے دینے کو تیار نہیں ہے۔ اور تو کرسی اس تعلیم کے ساتھ مجھے مل نہیں سکتی۔ ایسے میں مٹی کے ٹکڑ پر بیٹھ کر توارگی کی چھاپ نہ لگو اور خود پر توار کر لیں گی۔“ اس کا لہجہ انتہائی پر مروت تھا جو گفتہ کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

”کیوں فکر کرتے ہو تم۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ محبت کرتی ہوں تم سے اور چاہے دنیا کچھ بھی کہے تمہارے بارے میں۔ کبھی تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔“

”تو پھر بھاگ کیوں نہیں چلتی میرے ساتھ۔ کیا ملے گا تمہیں اس بڑے سے۔ عمر میں دگنے سے بھی زیادہ ہے تم سے بھئی کے برابر ہو تم اس کی۔ اور اس کے لیے ہر بار مجھے انکار کر دیتی ہو جبکہ تم جانتی بھی ہو کہ لب میں مزید تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

اس نے نوٹھے پن سے کہتے ہوئے رخ پھیر لیا تو وہ ہواشت نہیں کر سکی۔

”سب جانتی ہوں میں۔ میرا دل بھی تم سے کچھ مختلف نہیں ہے، پر کیا کروں۔؟ اچھی خاصی سوتی آسای ہے۔ یوں چھوڑ کر چلی گئی تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”ہاتھ تو تمہارے لب بھی شاید کچھ نہ آئے جس طرح لالچ میں پڑی ہوئی ہو تم۔ ذرا سوچو! کہ اگر کل اسے اچانک اپنی پہلی بیوی اور بچے یاد آجائیں اور وہ انہیں واپس لے آئے تو کیا حیثیت رہ جائے گی تمہاری۔؟ الٹا یہ جو لاکھوں کا زیور اور قیمتی سلان ہاتھ آ رہا ہے۔ ان سے بھی جاو گی۔“ بات میں اس کی دم تھلا شگفتہ سوچتے پر مجبور ہوئی اور وہ کہتا رہا۔

”میری مانو تو زمانہ کے لالچ میں تھوڑے کونہ گنواؤ۔ اور پھر جب میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ جتنا ہے، بہت ہو گا ہمارے لیے۔ میں کوئی اچھا عا کا دیوار کر لوں گا اور ہنسی خوشی جی لیں

میں ہم دونوں۔ پر تمہیں تو میرا اعتبار ہی نہیں ہے۔ مجھ سے زیادہ دولت کی بڑی ہوئی ہے۔ بھلے اس کے لیے مجھے ہی گنواؤ۔“ وہ غصے سے بولا تو اس نے جلدی سے ہتھار ڈال دیے۔

”اچھا مگر مجھے تھوڑا سا ٹائم اور دو۔ چند اور چیزیں پور لیں اس بڑے سے تو پھر جو تم کو ملے، دیں گی۔“

اس نے مسکراتے ہوئے تجویز دی۔



وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ عورت سو کن کے نام سے دور کیوں بھاتی ہے اس کا دل اتنا چھوٹا کیوں ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مرد کا طرف چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اسے چار شلوہوں کا حکم رہائی تو یاد ہوتا ہے مگر انصاف کرنا بھول جاتا ہے۔

بچوں کو بھی اپنا باپ، گھر، اسکول اور اسکول کے دوست بری طرح یاد آ رہے تھے اور اب تو ان کے پیچھے بھی ہونے والے تھے نعمان اور عثمان کو تیار کر کے دیکھتے تو ان کے سر ہو جاتے، لیکن وہ بھی کیا کر سکتی تھی۔

پہلے ہی خدیجہ پچھی لور احسان پر جوان کی وجہ سے بوجھ تھا کہ بخولی احساس تھا۔ اب مزید وہ بچوں کی کتابوں کو بیزارم اور اسکول فیس کا بار ان کے سر نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

احسان نے اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان دونوں کا راضیہ نعمان، عثمان کے اسکول میں ہی کروا دیا تھا۔ ان کے احسانوں کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور ساتھ حسن کی شرمندگی بھی۔ اوپر سے سسلی کا رویہ۔ جو اب احسان ان کی ایک اور ذمہ داری اپنے سر لیتا، اس کے ماتھے کی شکنوں میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ شروع شروع کی مسکراہٹ اور نرم گفتاری کی جگہ اب ہمہ وقت چہرے کے بگڑے زاویوں نے لے لی تھی۔

ایسے میں حسن کو شدت سے اپنے گھر کی یاد ستاتی،

وہ مختصر سا پیغام اسے چونکا گیا تھا اور بے اختیار ہی اسے رات ور کشاپ سے لوتے ہوئے سایہ سے ہونے والی ملاقات یاد آگئی۔

رشتہ نساہی اور زیورات کی کسی دکان کا چوکیدار تھا۔ دوسرے چوکیدار کی چھٹی پر کبھی کبھار اسے دیر تک رکنا پڑتا تھا۔ اس رات بھی وہ دیر سے لوٹ رہا تھا جب نیاز کے دروازے سے اسے کسی کے نکلنے کا گھنٹا ہوا، لیکن رات گئے؟ پھر اسے لگا کہ شاید اسے وہم ہوا ہے۔ اور اسی وہم کی تصدیق اس نے نیاز سے چاہی

”نہیں، نہیں سایہ۔۔۔ تجھے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ بھلا اپنی رات کو ہمارے گھر سے کون نکلے گا؟“ اس کے اطمینان دلانے پر سایہ تو مطمئن ہو گیا۔ مگر اب یہ پیغام پڑھ کر وہ خود الجھ گیا تھا۔ اسی لیے شکفتہ آئی پوچھے بنانہ رہ سکا۔

”شکفتہ۔۔۔ یہ لہی کون ہے؟ اس نام کی سسلی کا تو تو نے کبھی ذکر نہیں کیا۔“ نیاز کا حملہ اتنا اچانک تھا کہ اس کے ہاتھوں کے ٹوٹے ہی اڑ گئے۔ مگر دل غ شاطر تھا اس لیے بول کھلا کرتے بناتے بھی بات سن ہی گئی۔

”ہاں وہ میری ریلی سسلی ہے ہاں! چاچا چاچی کے محلے میں ہی رہتی تھی۔ بڑی دوستی تھی ہم دونوں میں۔ پھر میں شادی ہو کر ادھر آگئی تو رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ اب اس نے موبائل لیا ہے تو پھر سے مگ پ شپ ہو جاتی ہے۔ مگر اب کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”پیغام آیا ہے تیرے نمبر پر اس کا۔ کسی کام کے ہونے کا پوچھ رہی تھی اور یہ بھی کہ کب لوں۔“

”او اچھا۔ اچھا اور اصل آئے کا کہہ رہی تھی تو میں نے کہا کہ اب مصروف ہوتے ہیں۔ جب کام کچھ ملکا ہو گا تو بتاؤں گی۔ اسی بارے میں پوچھ رہی ہو گی۔“ اس نے اس خوب صورتی سے وضاحت دی کہ اس کے دل میں ابھرتے تمام شکوک وہیں دم توڑ گئے۔ اور وہ ایک دم ہلکا ہلکا ہو گیا۔

”ہاں تو بلا لے میں کسی بھی دن گھر۔ میں آ جاؤں گا۔ اتنا کام نہیں ہے آج کل۔۔۔ اور ہاں، ایک

پھر خیال آتا کہ اب وہ گھر بھی اس کا مل رہا تھا۔ نیاز کے لیے اس کے دل میں کوئی خوش فہمی بھی تھی اور نہ ہی خوش امید۔

وہ جانتی تھی کہ اب بانی کی زندگی اسے یونہی باہمی اور حل کی دلدوبیہ نکوار پر نکلے پاؤں چلتے گزانی تھی۔ کبھی تشکر اور کبھی ندامت کے احساس سے گردن یونہی جھکائے رکھتی تھی۔ کیونکہ واپسی کے تمام دروازے اس کے لیے بند ہو چکے تھے۔

اس کی مجروح عزت نفس کو کبھی اب کسی مسافر کے پلٹنے کا انتظار نہیں تھا۔



”کمال ہے! پہلے چائے پی کے نیند ہی اڑ جاتی تھی۔ اور اب اس دور سے آئی ہے کہ ہوش ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ آج چائے دیر سے پیوں گا۔ بڑے دن ہو گئے تیرے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

اس دن نیاز نے کھانا کھایا تو اطمینان سے کہتے ہوئے برتن اٹھائی شکفتہ کو پاس ہی بٹھالیا۔ وہ اندر سے جی بھر کر بد مزہ ہوئی، لیکن بظاہر مسکرا کر بولی۔

”کیوں نہیں۔ میرا بھی بہت دل چاہ رہا تھا آپ سے باتیں کرنے کو۔“

”تو کہا کیوں نہیں۔ بندہ ساری رات جاگ سکتا ہے تجھے سننے کے لیے۔“ اس نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو مجبوراً اسے شرمانے کی لواکاری کرنی پڑی۔ اور نیاز اس کی اوپر بھی فدا ہو گیا۔ پھر کیا وجہ گئے اس کی باتیں سنتے سنتے۔ مسکرا مسکرا کر جڑے بھی رکھنے لگے تھے تب کہیں جا کر اس کا چائے منے کا سوز پڑا۔

شکفتہ شکر کرتی کچن کی طرف چلی گئی اس کے چائے ہی اس کے موبائل کی مسیج ٹون بھی۔ نیاز چائے کا انتظار کر رہا تھا موبائل اٹھا کر مسیج پڑھنے لگا۔

”کام ہو گیا کیا۔ کب تک آؤں لہی۔“

لے لی لیں گے تو کیا ہو جائے گا اتنے شوق سے بنا کر لائی ہوں اور آپ منع کر رہے ہیں۔“ اس نے منہ بسور اتوہ سر پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔

”اچھا بابا! لادے۔۔۔ لی لیتا ہوں۔“ اس کے کپ پکڑنے پر وہ خوش خوشی کام نمٹانے کا کہہ کر چلی گئی تو وہ منہ بنا کر چائے سے بھرے کپ کو دیکھنے لگا۔ جیسے پیٹے کا آج واقعی اس کا بالکل موڈ نہیں تھا۔

لیکن اگر نہ پیتا تو کھفتہ کے ناراض ہونے کا خدشہ تھا۔ اور پھر اسے منانے میں نہ جانے کتنا وقت لگ جاتا۔

اچانک ایک ترکیب نے اس کی ساری ٹینشن دور کر دی۔ اس نے ٹپکی دراز سے دو ایسوں کا ڈبا نکالا۔ اور اسے خالی کر کے تمام چائے اس میں اندر ڈال دی اور ڈبا واپس دراز میں رکھ کر وہ اطمینان سے لیٹ گیا اور کھفتہ کے کپ سے پہلے ہی وہ سچ سچ گہری نیند سو چکا تھا۔

”خدا حافظ نیاز علی۔ اپنی بے وقوفی اور مردانہ خصلت سے مجبور۔ بہت سا تھرا تم نے میرا۔ مگر میں تم جتنی بے وقوف ہوں اور نہ ہی کمزور۔ انسانوں کی پرکھ سے مجھے، اس لیے تمہاری طرح گھٹانے کا سودا نہیں کر رہی۔ امید ہے اس خود غرضی کے لیے تم مجھے معاف کر دو گے۔“

اس نے خالی کپ کو دیکھتے ہوئے ایک استہزائیہ نظر اس پر ڈالی۔ اور اپنا بیگ اٹھا کر اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔



رات دیر بھجے کا وقت تھا جب حلق کو خشک کرتی پیاس نے نیاز کو گہری نیند سے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ جب سے گرمیاں شروع ہوئی تھیں کھفتہ اس کی سائڈ ٹیبل پر پانی ضرور رکھتی تھی۔ مگر اس دن اپنے ہی چکر میں بالکل فراموش کر بیٹھی اور ویسے بھی جب سے اس نے اسے چائے میں نیند کی گولی دینا شروع کی تھی وہ رات میں اٹھتا ہی کہاں تھا۔

ضروری بات تو میں تجھے بتا ہی ہوں گی۔“ وہ دھیان آتے پر اٹھا اور لمبا رسی سے کوئی پکٹ نکال لایا۔ ”یہ دو لاکھ روپے ہیں۔ کچھ مہینے پہلے کسی دوست کو لوہار دیے تھے۔ وہی واپس کیے ہیں اس نے“ سنبھل کے رکھ لے۔

نیاز کی تحصیل نے کھفتہ کی آنکھوں میں چمک بھر دی تھی۔ اس کے سوتے ہی اس نے آصف کو مسج کر دیا۔



وہ رات شاید من کی زندگی کی سب سے اہم رات تھی۔ کھفتہ بڑی بے چینی سے نیاز کی آمد کی منتظر تھی۔ مگر خدا اچلے کیا ماجرا تھا کہ اس کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی اور نیاز آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اور سے آصف کے یہاں تھیں۔

”اسے بھی آج جی لیٹ ہوتا تھا۔“ وہ برپا آئی۔ سہل سے وہیں چکر لکھ رہی تھی بلا آخر رات کے پونے بار بجے لوٹ آیا۔

”اتنی دیر کہاں لگا دی۔؟“ اس نے چھوٹے ہی سوال کیا تھا۔ نیاز تھکا ہوا استر پر لیٹے ہوئے بولا تھا۔

”دوست کی گاڑی آگئی تھی۔ کل بار رات جا رہی ہے اس کی۔ اس لیے امیر جیسی میں ٹھیک کرنا پڑی۔“

مختصر سا جواب دے کر اس نے آنکھوں پر ہانڈ رکھ لیا۔ کھفتہ کو اس سے کیا لینا دینا تھا۔ اسے تو اپنی پڑی تھی۔ کھانا وہ کھا کر تھا تھا۔ اس لیے پوچھے بتا ہی جلدی سے چائے بنا لائی۔ نیاز نے دیکھی تو بے زار ہو گیا۔

”تو کہاں والی۔ پوچھ تو لینا تھا کم از کم۔ اب بتا لائی ہے تو خود ہی بی لے۔“ میرا بالکل دل نہیں چاہو رہا اس نام چائے کا۔ ”کہہ کر کوٹ بدل گیا تو وہ دہانسی ہو گئی۔ سارا اہلان چہٹ ہوتا نظر آ رہا تھا اس لیے بے وقت کے لگاؤ کھانا مجبور ہی بن گئی۔

”دو خود پیٹے ہیں اپنی مرضی سے۔ آج میرے

لو کہیں والی۔ پوچھ تو لینا تھا کم از کم۔ اب بتا لائی ہے تو خود ہی بی لے۔“ میرا بالکل دل نہیں چاہو رہا اس نام چائے کا۔ ”کہہ کر کوٹ بدل گیا تو وہ دہانسی ہو گئی۔ سارا اہلان چہٹ ہوتا نظر آ رہا تھا اس لیے بے وقت کے لگاؤ کھانا مجبور ہی بن گئی۔

”دو خود پیٹے ہیں اپنی مرضی سے۔ آج میرے

لو کہیں والی۔ پوچھ تو لینا تھا کم از کم۔ اب بتا لائی ہے تو خود ہی بی لے۔“ میرا بالکل دل نہیں چاہو رہا اس نام چائے کا۔ ”کہہ کر کوٹ بدل گیا تو وہ دہانسی ہو گئی۔ سارا اہلان چہٹ ہوتا نظر آ رہا تھا اس لیے بے وقت کے لگاؤ کھانا مجبور ہی بن گئی۔

سایڈ میل خالی دیکھ کر نیاز خود ہی اٹھ کر بچن کی طرف جا رہا تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ شگفتہ کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب اچانک ہی اس کی نظر بستر پر پڑی۔ وہ سری طرف کاغذی بن اسے چونکنے پر مجبور کر گیا۔ شگفتہ بستر پر نہیں تھی وہ بھی رات کے اس پہرے۔

”اللہ خیر کرے۔ وہ ٹھیک تو ہے میں!“

اسے بل میں نگر بندی نے آکھیر اور پیاس کا شدید احساس پس پشت چلا گیا۔ جلدی سے باہر نکل کر بچن میں جھانکا، پھر ہاتھ روم۔ ایک کمرہ، دسرا کمرہ، چھت۔ غرض کے پورا کھر چھان مارا پریشانی سے نیاز کا برا حل تھا۔ اور عجیب عجیب خیالات جنہیں وہ سوچتا نہیں چاہتا تھا اس کی ذہنی سطح کو براگندہ کر رہے تھے کہ بھی دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔

کسی خوش امیدی کے سائے میں وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ مگر دروازہ پہلے سے کھلا یا کر اس کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین ہی سرک گئی۔ کھوئے کھوئے انداز میں اس نے دھڑے سے دروازہ کھول دیا۔

”نیاز بھائی۔ وہ بھابھی!“ بو کھلائے ہوئے ساجد نے اسے ہوش کی دنیا میں واپس بٹھاتا تھا۔

”کیا ہوا ساجد! اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟“

”وہ نیاز بھائی۔ میں نے ابھی شگفتہ بھابھی کو بس لٹوے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ میں ابھی دوکھن سے آ رہا تھا، بڑی مشکل سے سائیکل دوڑاتے آپ تک پہنچا ہوں۔ ان کے ساتھ وہ لفنگا آصف بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے چادر میں منہ چھپا لیا۔“

ساجد نے نیچکتے ہوئے اسے بتایا تھا کیونکہ آخر وہ اس کی بیوی تھی۔ اور ساجد کوئی بچہ تو نہیں تھا جو رات کے اس پر ایک شادی شدہ عورت کا کسی غیر مرد کے ساتھ ہونے کا مطلب نہ سمجھتا۔ فیسے اور ذلت کے حساس سے اس کی پیشی کی رگیں پھرنے لگی تھیں اور آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”مجھے پکا یقین ہے ساجد! کہ وہ شگفتہ اور آصف ہی

تھے؟“ ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتے اس نے پوچھا تھا۔

”بالکل نیاز بھائی، میں انہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں!“

نیاز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کیا کرالے۔

بسی اڑے پر پہنچ کر انہیں زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑی تھی۔ ٹکٹ کاؤنٹر کے پاس ہی وہ دونوں انہیں مل گئے تھے۔ شگفتہ کو دیکھ کر نیاز گب سے خود پر کیا ضبط کھو بیٹھا۔ اور اسے بالوں سے پکڑ کر یوں جھٹک دیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہی۔ اس کا اشارہ خون خطرناک حد تک بلند تھا اور جڑے یوں تھے ہوئے تھے کہ اسے دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ شگفتہ بھی اسے یوں آنتناگیلانی کی طرح سر پر کھڑا دیکھ کر زرد پڑ گئی۔ وہ تو بے فکر تھی کہ لب و لہج سے پہلے نہیں لگے گا۔ اسے یوں اچانک سامنے پا کر جیسے اس کے جسم کا سارا خون ہی پھڑ گیا تھا۔

”تم۔ تم تو سو رہے تھے۔ میں نے خود تمہیں

چائے میں نیند کی گولی دی تھی پھر اتنی جلدی کیسے۔“

”شدید خوف کے زیر اثر وہ بے حسیالی میں اپنی راز افشا کر گئی تھی۔ اور نیاز پر جیسے ایک اور ہمارا ٹوٹ پڑا۔“

”تو روز مجھے چائے میں نیند کی گولی دیتی تھی؟ تاکہ

میں سوتا رہوں اور تو بے فکر ہو کر۔ کس حد تک

گرے گی تو شگفتہ۔ کس حد تک؟“

وہ نفی میں سر ملاتا نفرت سے اس کے کم عمر خوب

صورت چہرے کو دیکھ رہا تھا جس پر اس نے جان لٹائی تھی لوہہ لے میں۔!

”کیا کچھ نہیں کیا میں نے تیرے لیے شگفتہ۔!

کس چیز کی کمی رہی تیری زندگی میں؟ اس بڑھے

نشانی سے بچا ہوا تھے۔ یہاں تک کہ تیرے لیے اپنی

بیوی بچوں تک کو بھی چھوڑ دیا۔ پر تو پھر بھی میری نہ

ہو سکی۔ وہ تنفر سے اسے دیکھتا پھٹکا رہا تھا۔ لوگوں

کا ایک وسیع ہجوم ان کے گرد جمع ہو چکا تھا۔ اور

— مگر گفتہ کی آنکھوں میں آنسو سرخ تھا کہ اسے لگا
جیسے اس نے گفتہ پر نہیں۔ بلکہ خود اپنے آپ پر ہی
تھوکر دیا ہو۔



ہجوم چھٹ چکا تھا اور اکا دکا مسافروں کے سوا اب
وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ دونوں طوفان کے بعد کی سی خاموشی میں بیچ پر
تھا بیٹھے تھے۔ آصف کی حالت اس لئے بڑے مبالغہ کی
سی تھی کہ جس کا احتمالی قیمتی سلان بین منٹل کے
قرب پہنچ کر چھین گیا ہو اور وہ بالکل خالی ہاتھ رہ گیا ہو۔
الوس تو گفتہ کو بھی بہت تھا۔ لیکن اس سے
زراہ خوشی اس بات کی تھی کہ نیاز سے اس کی جان
ہیشہ کے لیے چھوٹ گئی تھی۔ اور اب آصف اور
اس کے درمیان کبھی کوئی نہیں آئے والا تھا۔ یہ بات
اس نے اس بیٹھے آصف کو بھی سمجھانے کی کوشش
کی۔

”چھوڑ آصف۔ جو ہونا تھا وہ گیا۔ الوس
مجھے بھی ہے ان زبورات اور پیسوں کے جانے کا۔
اتنی محنت سے پلاننگ کے میں نے سب کچھ حاصل
کیا تھا۔ پر تم میرے ساتھ ہو تو ہر چیز میرے لیے بے
مستی ہے۔ کیا تمہارے لیے میری موجودگی۔ میرا
ساتھ کل نہیں ہے؟“

ابن بھری نظروں سے اسے دیکھتی پوچھ رہی تھی۔
مگر حیران رہ گئی جب اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنے
کے بجائے اسے جھٹک کر رو کر جا کھڑا ہوا۔

”دلخ شک ہے حیرا؟ تو کہاں کی مس بورڈ ہے کہ
تیرے لیے میں گمراہوں کو دکھ دوں۔ ارے تجھے جیسی
کے پھل کی طرح جھولی میں آکر نے والیوں کو تو میں
منہ لگا پائندہ کر دوں۔ مگر کی عزت بنانا تو دور کی بات
ہے تو کیا سمجھی تھی کہ میں تیرے پیچھے ہوں۔؟“

وہ اس کی خوش فہمی پر قہر لگا کر نہایا۔ بالکل
وہی جیسے کچھ دیر قبل وہ نیاز پر فہمی تھی اس کی
سامنے رکنے لگیں۔

آصف بھی اس کے ساتھ تھا۔ نیاز اسے کوئی نقصان
نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس کا کھوپا ہوا حوصلہ جمل ہونے
لگا اور وہ تن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”لو رہم خود کیسے۔ ہو نیاز علی! میرا تمہارا تو
صرف چہرہ ہیجیل کا ساتھ تھا وہ بھی مجبوری کا۔ اور
اس پر تمہیں اتنا الوس ہو رہا ہے۔ جبکہ تمہارے تو اس
عورت کے ساتھ بے وفائی کی۔ کوئی رات کو ذلیل
و رسوا کر کے گھر سے نکل دیا۔ جس نے ساری عمر
تمہاری خدمت کی تمہارے محبت کی۔ اور تمہارے
سکون کے لیے میری زیادتیاں بھی چپ چاپ برداشت
کرتی رہی۔ اور تم نے تو اسے سزا سناتے ہوئے
صفائی کا ایک موقع بھی نہیں دیا۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ
سب تمہارے لیے کیا؟“ اس کا استہزائیہ فقرہ
ایک بلند تھا کہ تمام ساتھیوں میں دیر تک گونجتا رہا۔

”یہ سب تمہارے لیے نہیں بلکہ صرف اپنے
لے کیا ہے۔ اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔
تم مجھے کیڑہ کہہ رہے ہو جبکہ تمہارے زراہ کیڑہ اور بے
خیرت تو میں نے اس دنیا میں نہیں دیکھا۔“

اسے اب نیاز سے کچھ لینا وٹنا نہیں تھا اس لیے
سستی سکھانے کے لیے سب کچھ بول دیا اور نیاز اس سے کمر
بدلی ہوئی گفتہ کو حیرت سے دیکھ رہا تھا جس کی زبان کا
شہد اچانک زہر میں بدل گیا تھا اور اس پر اس کے
اکثر شگفتہ لگے۔

”تو کیا۔ جو تو نے حسد کے بارے میں کہا سب
جھوٹ تھا؟“

”مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ جب تم اتنے ساتھیوں میں
بھی اپنی بیوی کو نہیں جان سکتے۔“ اور نیاز کے منہ پر
جیسے کسی نے رکھ کے طمانچہ دے مارا تھا۔ کہ وہ اپنی
جگہ سے مل نہ سکتا تھا۔ ساجد نے آصف سے اس
کا ایک جھین کر چیک کیا جو نقدی اور زبورات سے بھرا
ہوا تھا۔

آصف بے بس کھڑا رہا کیونکہ کہانی کھل چکی تھی
اور لوگوں کے ہجوم میں اس کا فراہ کا کوئی راستہ نہیں بچا
تھا نیاز نے وہیں کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی

تھی کہ وہ قدم چل کر اسے روکنے کی کوشش ہی کر لیتی
اور نہ ہی زبان میں اتنی طاقت۔ کہ آخری بار اسے
توازی دے گی۔
اس نے سہم کر ارد گرد دیکھا کہ کسی کو مدد کے لیے
پکار سکے۔ لیکن ہر بار کی نیاز فرشتہ بن کر پہنچ جائے،
’ضروری نہیں‘ ❖ ❖ ❖

اپنی زبان سے ادا ہوا لفظ لفظ۔ حسد کی التجائیں
سروں سے کپکپاتی رات اور اس کے بھوکے بچے۔
کون سا لمحہ تھا جب وہ رات اپنی تمام تر جزئیات کے
ساتھ اس کی یادداشت پر دستک نہ دیتی۔ اور اس کا تکی
چاہتا کہ وہ اپنا سرو پور میں دے مارے۔
محبت تو حسد نے کی تھی مگر اور انمول۔ جس
نے خود تکلیف سہہ کر نیاز کو منکھ دینے کی کوشش کی
تھی۔
وہ جلتی جاتی آنکھوں سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔
صبح جسے اس کے مقدر کا فیصلہ کرنا تھا۔
”انور پڑا تو نہیں آئے گا اپنے ابو کے پاس؟ ایک

ادارہ طہارین ڈاٹ کام کی طرف
سے بچوں کے لیے خصوصی ماحول

سچی سچی باتیں

بکری کی کہانی

نیت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈاٹ کام
37، بلاک ۸، کراچی

فون نمبر:
32735021

”ویسے تو بڑی چلاک جی ہے اور لٹا بھی نہیں
کبھی کہ ایک شادی شدہ عورت سے میرا کیا لینا دینا
۔ ٹھیک ہے کہ تو خوب صورت ہے۔ پر اتنی بھی
نہیں کہ۔ وہ تو تیرے شوہر کے دل پر نظر تھی اس
لئے تجھے بھنسا مارا۔ اور ٹھیک نہیں کیا کبھی۔ خود
بڑا دل کو الو بنا چکی ہے پھر بھی تجھ سے لمبے میں بات نہ
کے گی۔“

اس کا انداز غلبہ ہی نہیں بلکہ وہ خود بھی سر پٹا
بل چکا تھا، گفتہ کے اسے جاننے کے تمام دعوے
دھرے کے دھرے رہ گئے۔ پھر بھی یقین تھا کہ آ
کے ہی نہیں رہے رہا تھا۔ وہ پٹی پٹی آنکھوں سے
اسے دیکھ رہی تھی۔

”دیکھ گفتہ۔ میرے ساتھ لوریہ ڈرائے نہ کر
میں پہلے ہی تجھ پر اپنا بڑا وقت برباد کر چکا ہوں۔ وہ دن
بعد بھی کی ہو گا تھا تو ابھی سہی۔ چلتا ہوں۔“
اس نے بڑے ہی اطمینان سے جیسے اس پر کھولتا
ہو لپٹی اندر مل دیا تھا۔ وہ ترپ کر اس کے قریب آگئی۔
”خدا کے لیے آصف! تم جانتے ہو میں! تمہارے
سوا میرا کوئی نہیں ہے نہ گھر۔ نہ ٹھکانہ۔ میں وعدہ
کرتی ہوں تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کر لوں گی۔
جہیں پیسے چاہیں ہیں۔ جتنے کہو گے کما کر لاؤں گی
۔ بس مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ۔ ایک احسان کرو مجھ پر۔“

وہ اس کا ہاتھ تھامے رو رہی تھی۔ مگر خدا جانے
آصف زبان پتھر بن گیا تھا اس کے کرموں کا پھل۔ کہ
وہ ذرا بھی نہیں بکھلا۔
ارے چھوٹ۔ بلا کی طرح چٹ ہی گئی ہے جان کو۔
اس نے ارد گرد کے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ
ہوتے دیکھا تو چو کتا ہو گیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ
سب خدائی فوج دایر بن کر ان کے معاملے میں ٹانگ
اڑاتے نہ اپنا ہاتھ چمڑا کر سر ہٹا ڈکھڑا ہوا۔ گفتہ
پہلی پٹی آنکھوں سے اسے خود سے دلا رہت دلا جاتا
دیکھتی رہی۔
اس کے اوروہ موئے وجود میں اتنی اہمیت بھی نہیں

پہر آ کے مل تو سی یا رہے اس کی شہر نگاہوں نے
خستہ انور تک کا سفر کیا۔

انور ابھی تک اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ وہ گلی کی طرح نا سمجھ نہیں تھا۔ سب کچھ اس نے خود اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھا تھا۔ اس لیے وہاں کو جو جھوڑ کر پپ کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کا دل پپ سے ملنے کے لیے ہرگز ہاتھ تھا۔

”میں نے امید بھری نظروں سے اس کو دیکھا اور
حسنہ شکل تو کبھی بھی نہیں دیکھی جو اسے مزید
آنا کش مینڈالتی۔“

سر کی جنبش سے انور کو اس کا سانس لینا پوچھا کہ تھکے
 قدموں سے اپنے کمرے کی طرف پیچھ گئی تھی۔ اور
 بیٹے کو سینے سے لگانے نیاز کو اس کی چھکن اپنی رگوں
 میں اترتی محسوس ہوئی۔

مجبور ہو کر صرف اپنے بچوں سے ملنے آیا ہے اسے

لپے سامنے چھٹی کری پر بیٹھنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔
 ”تیرا محبوب نہ سی۔“ خالدہ قواب بھی ہوں گی تو
 مجھے ایک بار محفل مانگنے کا موقع بھی نہیں دے گی؟“

اس کے لفظوں سے چھلکتی ہے۔ کسی نے جیسے حنت کی ساری ہستی نچوڑ لیا۔ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ بلند چھڑا سکی۔

”میں جانتا ہوں حسنہ! تو مجھ سے بہت خفا ہے۔ اور یہ تیرا ظرف ہے حسنہ۔ ورنہ اگر ساری عمر کے ساتھ کے بعد بھی کوئی مجھے یوں ذلیل و رسوا کرتا تو شاید میں ساری زندگی اس انسان کی شکل بھی نہ دیکھتا۔“

عُرف میں اور محبت میں تو میں کبھی جیسے چھوٹی
نہیں پایا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تھی اور
چہرے پر استغنائیہ مسکراہٹ۔ وہ جیسے آج اپنے
آپ پر دُش کر اپنا ہی مذاق اڑا کر۔ خود سے انتقام
لینے رہا ہوا تھا۔

”کتنی راتوں سے میں ایک پل نہیں سوچا۔
نہ سنے جیسے میرے قدموں میں انگارے بچھا دیے

ہیں۔
میں اسی لائق ہوں کہ مجھ پر تم کو کاجائے اور مجھے چھوڑ
دیا جائے۔"

نیاز ہے بس اس کے قدموں میں آ بیٹھا اور
بجگے چرے کے ساتھ دلوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ
لیے۔

”میں ماما ہوں بہت مشکل ہے، مجھے ایک موقع دے۔ اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا، اپنے جرم کی حلائی کا۔ اور تیرا دامن خوشیوں سے بھرنے کا، بس ایک موقع۔ ورنہ ساری زندگی تجھے دیے زخموں کی تکلیف مجھے جینے نہیں دے گی۔“ وہ امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اور وہ اس کے بندھے ہاتھوں پر چوٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

— اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی تھی۔

تھیں۔ اس لیے بھی نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو باپ کے

ساتھ میں کاپیاء بھی منسلک ہوتی تھیں۔

بلکہ اس لیے کہ وہ آج بھی اس سے محبت کرتی تھی
 'اتنی ہی شدت سے۔ اور یہ یہ واحد کلمہ تھا جو وہ
 صرف اپنی ذات کے لیے کرتی تھی۔ لیکن اس
 سب کے باوجود اب کبھی اس پر پہلے کی طرح اعتبار
 نہیں کیا جائے گی۔ یہ اس کا خیال تھا۔ مگر کون جانے
 کہ آنے والے چند مہینوں یا سالوں میں اس پر پہلے
 سے بھی زیادہ اندھا اعتماد کرنے لگے۔ کیونکہ وہ حسرت
 تھی۔

جس کی محبت کو دقت کے منصف نے کندن ثابت کیا تھا۔ وہ کوئی رست کی دیوار تھوڑی تھی، جو ذرا سی حیر ہوا کا بار بھی برداشت نہ کر سکتے اور ذرا ذہنیوں کو بکھ جاتے کہ جیسے بھی تھی ہی۔



قصہ کی

مادر امر قسطنطنیہ عاقیدہ بیگم کی انگوٹھی بی بی ہے۔ قارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عاقیدہ بیگم اس کا انا سیلیوں سے زیادہ ملنا جتنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ مادر خود اعتماد اور انہی کی ہے۔ عاقیدہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی بی کل اس کی ساتھی ہیں۔

قارہ اپنی ٹیبلٹ خالہ کے بیٹے اتفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دس سال پہلے یہ نسبت اتفاق کی پسند سے لھرالی تھی جسی مگر اب بعد قارہ سے قطعی لا تعلق ہے۔

خوشنہ اور خیر کے بھائی رضا حیدر کے لائیک ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس میں ہے اور بے حد شان دار رہنمائی کا مالک ہے۔ ولید و خیر اس کا بیٹا فرزند ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹینس مائل نہیں ہے۔ خیر کے بیٹے قارہ کی بہن حمنہ بی بی ہوگی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں ہم دم تھا ہونے دیکھ کر اپنے خواہش کو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب نکلتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرنا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ عارضاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کمال کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ہل مٹھل سے کام لے رہا تھا۔

اتفاق فون کر کے قارہ سے شادی کرنے سے انکار کرتا ہے۔ قارہ روٹی ہے۔ اشتیاق یزدانی اتفاق سے مدد دیتے تھا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ اتفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ قارہ دل سے خوش نہیں ہو پالی۔

رضا حیدر تیمور کو قارہ کی شادی کے سلسلے میں فیمل آباد بھیجتے ہیں۔ قارہ اپنی تارخ میں مادر کو بعد اصرار دھوکہ دے رہی ہے۔

تیسویں قسط





اس کے چہرے پر خراشیں نظر آ رہی تھیں جیسے کسی نے اس کا ہر انچ جڈا لیا ہو۔
 ”یہ کیا ہوا ہے ماورا۔“ تیمور دیکھ کر ہی تڑپ گیا تھا اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔
 لیکن ماورا اس کے اس قدر تشویش زدہ سوال کا جواب دینے کے بجائے سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی تھی۔
 ”اور۔! میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا۔“ تیمور کی پریشانی ہر برصیہ سیکنڈ کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔

”ہاں۔! ہوا ہے جھگڑا۔“ اس نے بے حدود ٹوک سے لہجے میں جواب دیا تھا۔
 ”کس کے ساتھ۔“ تیمور کا سوال بڑا بے ساختہ اور حسب توقع تھا۔
 ”اپنے آپ کے ساتھ۔“ ماورا کا جواب البتہ غیر متوقع تھا۔
 ”واحد؟“ اپنے آپ کے ساتھ۔“ تیمور کو اچنبھا ہوا تھا۔ اور اس کی بات اس کی کچھ ہی نہیں آ رہی تھی۔
 ”ہاں۔! اپنے آپ کے ساتھ۔ دراصل میرے چہرے پہ کسی اور کا ہر انظر آنے لگا تھا مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے فوج جڈا لیا۔“

اس کے جواب پر تیمور کو اس کی ذہنی حالت پہ شک گزرا تھا۔
 ”چھو فوج جڈا لیا؟ مگر کہاں۔“ اس کی الجھن سلجھ ہی نہیں رہی تھی۔
 ”جیسا تو ہے۔ میرے چہرے پہ کسی اور کا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔“ وہ ہنوز اسی طرح تھی۔
 ”لیکن کس کا۔“ پھر زبان سے سوال پھسلا تھا۔
 ”آپ کا۔“ ماورا نے یک دم سر اٹھا کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔
 ”میرا چہرہ؟ آپ کے چہرے۔“ تیمور مزید الجھن کا شکار ہوا تھا۔
 ”ہاں۔! اس نے سر سے لہجے میں ہاں کہا۔
 ”ماورا۔! مجھے لگتا ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ تیمور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتحال کو کس طرح سنبھالے اور کیا کرے؟

”طبیعت ٹھیک ہی تو کرنے آئی ہوں۔“ اس کی ہلکی ہلکی باتیں ہنوز تھیں۔
 ”میں سمجھا نہیں۔“ اس نے ماورا کی آنکھوں میں دیکھا وہ نظریں جھکا گئی تھیں۔
 ”میں واپس فیصل آباد جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے یونہی نظریں جھکائے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔
 ”واپس فیصل آباد؟ مگر کہاں ماورا۔“ آپ تو یہاں جاب کے لیے۔“
 ”میں جاب چھوڑ کر ہی جا رہی ہوں۔“ اس نے تمام فیصلے پہلے سے ہی کر رکھے تھے۔
 ”مگر آپ کے یہاں آنے کا کوئی مقصد تھا۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا؟“ تیمور نے اسے جیسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

”میں اپنے ہر مقصد سے دست بردار ہونا چاہتی ہوں میں ہر چیز کو یہاں ہی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ ماورا جیسے جیسے کچھ چھوڑنے کی بات کر رہی تھی تیمور بے سوچے شیش کے گھبرے میں آتا جا رہا تھا۔
 ”آخر کیوں؟ یہ تو تمہارے۔“ تیمور جھنجھلا رہا تھا مگر پریشانی دینی تھی۔
 ”آپ کے اس کیل کا جواب میرے چہرے پہ لکھا ہے۔“ وہ بے حد آہستگی سے بولی تھی۔
 ”آپ کے چہرے پہ زخم تحریر ہیں ماورا۔ اور میں یہ زخم یہ تحریر پڑھ نہیں سکتا۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔“
 ”تیمور بے بسی سے بولا تھا۔

”بالکل اسی طرح میں بھی اپنے چہرے پہ آپ کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھ میں بھی اتنا حوصلہ نہیں تھا۔“

لکل کر اور ا کے قریب آگیا تھا۔ نمبل کے پاس ہی کھڑی تھی ایک ہاتھ نمبل پر ہی رکھا ہوا تھا۔
”نمک!“ اور انے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”اب اگر تم کچھ بھی نہیں مس مادر امرتھی۔ یہ میرا دل ہے۔ مٹی کا کوئی کھلونا نہیں ہے کہ جب دل چاہا
کھیل لیا اور جب دل چاہا اٹھا کر پھینکا اور توڑ دیا۔ اسے ہاتھ میں بیچ کر دے۔ ابھی زندہ ہے اور خوب دھڑکتا
ہے۔ جس روز چپ ہو گیا پھر بے شک چلی جاتا۔ سمجھ لینا کہ مر گیا۔“
تیمور نے اس کے بے حد قریب آکر کچھ اس طرح کہا تھا کہ مادر اپنی جگہ پر جم سی گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے
تیمور اس پہ حاوی ہو رہا ہو۔

اور یہ احساس ہی اس کی نڈپ اور بے بسی کے لیے بہت تھا۔

اس نے بے اختیار تیمور کے چہرے کی مست دیکھا تھا۔

”جایے۔ گھر جایے۔ اور آرام کیجیے۔ زخم دھم کرنے کی کوشش کریں، دونوں کے چہرے صاف ہی اچھے
لگتے ہیں۔“

تیمور جیسے اپنے قدموں پہ اور اپنے نپلے پہ جم چکا تھا اور اب چاہ کر بھی اسے اس نپلے سے پیچھے نہیں ہٹا
سکتی تھی۔ وہ اپنے مردہ قدموں سے چلتی اس کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی مگر بہت سی سوچیں۔ بہت سی بے
چہنماں اور بہت سی بے بسی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ بڑی لاچار حالت میں گھر پہنچی تھی۔



”ای۔ ای۔ ای۔ ایکس کون آیا ہے؟“ ولید نے گھر میں داخل ہوتے ہی شور مچا دیا تھا اور عزت اس کے
ایسے شور۔ اندر ہی اندر شرمندہ سی ہو گئی تھی کہ آنٹی کیا سوچیں گی؟
”کون آیا ہے بھی؟“ زبیدہ خاتون دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کمرے سے باہر نکلیں، لیکن عزت پہ نظر پڑتے ہی
خوشی کے مارے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”ارے میری دھو آئی ہے۔“ ان کا لہجہ بھی خوشی کے باعث چمک اٹھا تھا اور وہ لپک کے عزت کے قریب آئی
تھیں۔

”اسلام علیکم!“ عزت نے بڑے دھم سے انداز میں انہیں سلام کیا تھا مگر انہوں نے اسے گلے لگا لیا تھا۔
”صرف سلام سے کام نہیں چلے گا۔ یہاں تو بڑی شدتیں ہیں۔“ ولید بال کھجاتے ہوئے کہہ کر برآمدے کی
طرف بڑھ گیا تھا اور زبیدہ خاتون کے گلے ملتی عزت اس کی پشت دیکھ کر رہ گئی۔
”ای۔ آپ کے بچے کہاں ہیں؟“ ولید کن بڑے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

”کمرے میں ہوں گے آؤ بیٹا۔ تم بھی اندر ہی آ جاؤ۔“ زبیدہ خاتون ولید سے کہہ کر عزت کی طرف متوجہ
ہوئی تھیں اور اسے ساتھ لے کر کمرے کی طرف بڑھیں، اتفاقاً ولید بھی ان کے ساتھ ہی کمرے کی طرف بڑھ
آیا تھا اور اندر قدم رکھتے ہی ایک دم شور مچ گیا تھا، وحید اور لکھو نے پھولوں کی پتیاں پھمار کر تے ہوئے بڑے
پر زور اور بھرپور انداز میں عزت کا استقبال کیا تھا، جس پہ ولید اور عزت دونوں ہی بہت زیادہ خوش ہوئے تھے،
انہوں نے ان دونوں کو سر راز دیا تھا۔

”اسلام علیکم بھابھی!“ لکھو بے اختیار آگے بڑھی تھی اور عزت نے اس کے گلے پہ پیار کرتے ہوئے
اسے گلے لگا لیا تھا۔

پھوجید آگے بڑھا۔

”السلام علیکم!“ وہ تھوڑا جھک رہا تھا۔

”یاس آف۔“ عزت نے شرارت سے کہا۔

”کیوں؟ کیا مجھے بھی گلے لگائیں گی۔؟“ اس نے شرارت کا جواب شرارت سے دیا تھا اور وہ سب بے ساختہ جس بڑے تھے۔

”شریف! تمہیں تمہاری وہ گلے لگائے گی۔“ عزت نے مسکراتے ہوئے اس کے بال نکھیرنے تھے اور وحید نے توپوں کا سرخ ولید کی طرف موڑ دیا تھا۔

”بھائی۔! کیا بتائیں۔ کیا ایسا ہوتا ہے۔؟“ وحید نے بے حد ہستکی سے سرگوشی کی تھی۔

”ہمارے ساتھ تو ابھی تک ایسا ہوا نہیں۔ جب ہو گا تب ہی کچھ بتاؤں گا۔“

ولید نے کہتے ہوئے جھک کر نیبل پر رکھی پلیٹ سے گلاب جاسن اٹھا کر منہ میں رکھ لیا تھا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے ذمہ معنی نظروں سے عزت کو دکھاؤا اسے گھور کر سرخ موڑ گئی تھی جس پر وحید بے ساختہ ہنسنے لگا کر ہنسا تھا۔

”بھابھی! بیٹھیں نا۔!“ ککو نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہیں کہاں بیٹھوں۔؟“ ولید نے ادھر ادھر دکھاؤاں انہوں نے صرف ایک کرسی رکھی ہوئی تھی یعنی صرف عزت کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔

”ہمیں کوئی ٹیگ دیں۔ کوئی ٹیٹ دیں۔ کوئی پارٹی دیں تو ابھی بیٹھنے کی جگہ مل جائے گی۔“ وحید آج پیش پیش تھا۔

”وحید! تم بھی بار۔ کمال کر رہے ہو آج۔ یہ لڑکوں والے کام تم نے کب سے شروع کر دیے؟“ ولید بڑے آرام سے کتا آگے بڑھ کے کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور وہ سب منہ دیکھتے نہ گئے تھے کیوں کہ کرسی اس نے سنبھال لی تھی۔

”بھائی پلیز۔! یہ بھابھی کی جگہ ہے۔“ ککو منہ ہی منہ میں مستزائی تھی۔

”ارے میری جان۔! بھائی ہو گا تو بھابھی ہو گی نا۔؟ اس لیے پہلے میری جگہ پھر اس کی جگہ۔ مجھے کرسی مل گئی ہے۔ اب اس کے لیے آف۔“

وہ بڑے مزے سے کرسی پر براجمان ان کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زبیدہ بیگم مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔

”بھائی یہ چیٹنگ ہے۔“ ککو پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اس کے ساتھ وحید بھی۔ اور عزت کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”ارے۔ اس سے اچھا موقع اور کہاں ملے گا۔؟ دروازہ بند کر دوں۔؟“ ولید بے ساختہ لپک کے اٹھا تھا۔

”ولید! عزت یکدم ہدک گئی تھی اور ولید کے قدم رک گئے تھے۔

”حکم میری جان۔؟“ وہ بڑے دلبرانہ انداز میں اس کی طرف پلٹا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔؟“ وہ دبے لہجے میں بولی۔

”موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں بس۔ اور تو کچھ نہیں۔“ اس کا انداز ہنوز لاپرواہی تھا۔

”پلیز۔! میں اس سے چلی جاؤں گی۔“ اس نے ولید کو دھمکی دی۔

”میری اجازت کے بغیر اب تم کیس بھی جاسکتیں۔! کمرے سے اس کمرے تک بھی نہیں۔“ ولید نے رعب جانے کی کوشش کی۔

”کیوں؟ میں کیوں نہیں جاسکتی۔“ اس نے تنک کر پوچھا۔
 ”کیوں کہ تم میری بیوی ہو اور میں تمہارا شوہر۔ تم نے میرا حکم ماننا ہے۔ ہر حال میں۔“ ولید اس کے قریب آ کر ہاتھ اُڑتے ہوئے قدم پیچھے ہٹ گئی۔
 ”اوہ تو بڑی جلدی شوہروں والی اصلیت سامنے آگئی۔“ عزت بڑے اسہٹزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”ابھی کہاں؟ ابھی تو دروازہ کھلا ہوا ہے۔“ ولید کا لہجہ اور بات معنی خیز تھی۔ عزت کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ جان بوجھ کر پٹری بدل رہا ہے۔

”میں چلتی ہوں۔ میری ساس کے بچے ناراض ہو کر گئے ہیں۔“ وہ جانے کے لیے پلٹی۔ ولید نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔

”یہ بچہ بھی آپ کی ساس کا ہی ہے۔ پہلے اسے تو راضی کر لو۔“ وہ اس کے کھینچنے پہ بمشکل توازن قائم رکھ پائی تھی ورنہ سیدھی اس کے سینے سے ٹکرا جاتی۔

”ولید! میرے باہر آؤ اور بچہ۔“ عزت نے اسے باز رکھنے کے لیے کچھ کہنا چاہا تھا۔
 ”میں ہیٹا ہے اندر دونوں میاں بیوی ہیں۔“ اس نے اس کی کلائی مزید دبائی تھی۔

”آہستہ میں آؤں گی۔“ اس نے منہ سورا۔

”میں اٹھا کر لے آؤں گا۔“ وہ اسے ہاتھوں میں بھرنا چاہتا تھا، لیکن عزت نے ایک دم اسے پرے دھکیل دیا تھا۔

”تو آسمان نہیں ہے اٹھا کر لے آتا۔ سمجھے آپ۔“ وہ اسے پرے دھکیل کر کہتی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔ اور پیچھے ولید ایک زوردار قدم لگا کر بٹا تھا۔

عزت کے قدم دروازے کے پتھروں پر آکر ٹھک گئے تھے اس نے پلٹ کر دیکھا وہ بڑے مزے سے کھڑا ہوا تھا۔

”میں اتنی سی خود اعتمادی تھی؟“ وہ منٹ میں گھبرا گئیں۔؟ تمہیں ہتا بھی ہے میں ایسی کوئی حرکت کر سکتا ہوں کیا۔“ ولید بڑے سکون سے کھڑا پوچھ رہا تھا اور عزت اپنی بوکھلاہٹ بے اختیار جھپٹ گئی تھی۔

”تو بیٹھو۔ میں ان دونوں کو بھی بلا کے لاتا ہوں۔“ ولید کرسی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا تھا اور عزت سر جھٹک کر مسکراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔!



پھر یوں ہوا کہ تیمور کے اگلے چند روز سکون سے گزرے تھے۔
 نہ کوئی رضا حیدر کی طرف سے ایسا کھڑا ہوا تھا اور نہ ہی ماورا مرتضیٰ کی طرف سے۔ اسی لیے اس کے چند دن سکون اور آزادی سے گزر گئے تھے۔

مگر آج گھر آتے ہی وہ ٹھک گیا تھا کیونکہ عزت اس کے انتظار میں ایک نئے لیے بیٹھی تھی۔
 ”خیریت۔؟ تم کال کیوں کر رہی تھیں؟“ تیمور پکڑے تبدیل کر کے سیدھا اس کے کمرے میں آیا تھا۔
 ”بلا جان آئے تھے میرے پاس۔“ عزت چہرے سے کچھ پریشان لگ رہی تھی۔
 ”تو پھر۔؟“ تیمور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”دینی کے گٹ لیے ہیں انہوں نے۔ ان کے دوست احمد شیرازی کی بیٹی کی شادی ہے۔“ وہ کہتے ہیں تم بھی

ساتھ چلو۔" عزت نے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

"حمہ شیرازی کی بیٹی کی شادی۔؟" تیمور نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں شادی تو ہے۔ میں نے بھی چند روز پہلے ذکر کیا ہے۔"

"لیکن بھائی ایک ہفتے کے لیے۔؟" عزت کسی طور بھی جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"ارے میری جان ڈونشوری۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب کچھ بھی نہیں کر سکتے تم بے لگ ہو کر جاسکتی ہو۔ ویسے بھی مام بھی تو ساتھ ہوں گی۔" تیمور بڑے پرسکون انداز سے کہتا اس کے برابر ہی صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"مام کیا کر سکتی ہیں بھلا۔؟ انہیں تو گھر میں بھی خبر نہیں ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں۔؟ وہاں کیا ہوگی۔" عزت منہ ماری ہی تھی۔

"مسلو ساتھ تو ہیں ناں۔؟ تمہیں کچھ تو سہارا ہوگا۔" واسے تسل ہو رہا تھا۔

"لیکن بھائی! میرا جانا ضروری تو نہیں ہے۔ میں بابا کو انکار کروں گی شام کو۔" عزت مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔

"دیکھو عزت۔! چریات۔! انکار بھی اچھا نہیں ہوتا۔ ہم پہلے ہی جو قدم اٹھا چکے ہیں وہ بہت بڑا ہے۔ اب اپنے

اس قدم کے لیے بابا جان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ موقع اچھا ہے۔ اگر وہ کہہ رہے ہیں تو تم چلی

جاؤ۔ تمہیں وہاں کوئی بھی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا اور میرا ایک خاص کوئی تمہاری

ہیلپ کے لیے تمہارے ساتھ ساتھ ہوگا مگر اس کا کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا سوائے تمہارے۔ ویسے بھی وہاں

جا کے وہ لوگ تمہارے ساتھ کوئی نو دو زبردستی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ کام یہاں ہی ہو سکتے ہیں وہاں نہیں۔ ماس تم

بابا جان کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔"

تیمور نے اسے ہر طرح سے مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

"مگر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کیونکہ قیام مرزا کی فیملی بھی جاری ہے۔" اسے ہر طرف سے خدشہ تھا۔

"ارے پاگل۔! ڈر کس بات کا۔؟ میں ہوں ناں۔؟" تیمور نے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے

بھائی ہونے کا مان بٹھا تھا اور چند سیکنڈز کے لیے عزت صحیح مطمئن اور بے فکر ہو گئی تھی۔

"تھنک یو بھائی! وہ آہستگی سے مسکرائی۔

"ولید کو ساتھ بھیج دوں۔؟" تیمور نے اسے چھیڑا تھا اور عزت جھینپ گئی تھی۔

"پلیز! اس کے گال گلابی ہو گئے تھے اور تیمور یک دم قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

"اچھا۔ یہ بتاؤ جانا کب ہے۔؟" تیمور نے اس کا کندھا تھپکا۔

"مرسل جانا ہے۔" اسے مطمئن تھی۔

"تو شادی کے لیے کوئی شاپنگ وغیرہ؟ اس کا کیا کرو گی۔؟" تیمور کو اب اس کی شاپنگ کا خیال آیا تھا۔

"وہ بھی وہیں سے کرنی ہے۔ بابا جان نے کہا ہے۔" وہ منہ پھلا کے بولی تھی۔

"چلو۔ اچھی بات ہے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔ اور ہاں ولید کو بھی فون کر کے بتاؤ تاکہ تمہاری جارہی

ہو۔"

تیمور نے صوفے سے اٹھتے ہوئے اسے تاکید کی تھی۔

"جی اچھا! اس نے اثبات میں سر ہلادیا تھا اور تیمور کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

ولید توجہ دے ایک کہیں کی رپورٹ تیار کرنے کے سلسلے میں مختلف چپٹا خول کے چکر کاٹ رہا تھا۔ اسے ایک بارٹ اسپیشلسٹ سے ملنا تھا اور اس ملاقات کے لیے اس نے پہلے ہی ٹائم لے رکھا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ وہاں پہنچا اس کے قدم ڈاکٹر کے کمرے کے باہر ہی ٹھک کر روک گئے تھے۔ اندر ڈاکٹر کی کسی کے ساتھ مینٹگ چل رہی تھی اور جس کے ساتھ مینٹگ چل رہی تھی وہ ولید سے دیکھ کر ہی ہلکا ہوا تھا۔

لیکن اندر نہیں گیا تھا بلکہ ایک طرف ہو گیا تھا اور تقریباً نو سو منٹ بعد یہ مینٹگ ختم ہو گئی تھی۔ ولید اس کی پشت کو دیکھ کر ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ بجا کر اندر آیا تھا۔

”اسلام علیکم“ ڈاکٹر شاہنواز صاحب ”ولید نے بڑے بے حوش انداز میں سلام کیا تھا۔ ڈاکٹر شاہنواز اسے دیکھ کر کمرے سے نکلے تھے۔

”ولیکم السلام“ ولید صاحب! اچھے ہیں سنا ڈاکٹر شاہنواز رو کر اس کے حوالے سے اسے بہت سزا دے رہے تھے۔

”موت کا برا کرم ہے۔ آپ سنا میں ٹی بی کیس مینٹگ چل رہی تھی۔“ ولید نے کریدنے کی کوشش کی کہ جانتا چاہتا تھا کہ مسئلہ کیا ہے؟

”ہاں۔“ کہیں ہی کچھ ایسا ہے کہ نہ کھل کے ٹوٹ نہ ہو رہی ہے اور نہ ہی مسئلہ حل ہو رہا ہے۔“ ڈاکٹر شاہنواز اپنی بے حوصلگی میں کہہ رہے تھے۔

”کیا مطلب؟“ ولید الجھتا۔

”مطلب کہ آکسیجن رونا کی کھل میں سوراخ ہے اور اب مسئلہ بڑھ چکا ہے۔ اس لیے ابھی پریشان ہے اور ہم بھی۔“ ڈاکٹر شاہنواز جھپٹتا ہوا چرخان لگ رہے تھے جبکہ ولید کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔

”آکسیجن رونا کی کھل میں سوراخ ہے؟“ وہ آنکلی سے پوچھ رہا تھا۔

”ہوں بہت سی باتیں آئی ہے۔ مگر تکلف سے سمجھنا پڑتا ہے۔“

”کب سے ہے یہ تکلف؟“ ولید کو دل بکھ چکا تھا۔

”تین سال سے۔“ ڈاکٹر شاہنواز نا اعلیٰ کھولے لگے۔

”تین سال سے۔“ ولید کو حیرت ہوئی۔

”ہاں۔“ اور ان کی فطرت میں کسی کو خبر بھی نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ ڈاکٹر شاہنواز کی اور کھولنے والے انجان؟“ حیرت و حیرت تھی۔

”کیونکہ آفاق پرزائی کے پھولنے بجائی انہیں پرزائی کی فضا بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی اس کے دل میں بھی سوراخ تھا۔ یہ بھی میرا ہی باعث تھا۔ اس کی فضا سے اس کے دل باپ بہت ٹوٹ گئے تھے۔ اور آفاق ہاں ہے کہ ان کو اب اس کا پتا نہ چلے۔ کیونکہ اس کی ماں جیتے ہی مر چکی تھی۔“ ڈاکٹر شاہنواز کی بات پر ولید کے کانوں سے حواس ہٹ گئے۔ کیا تھا جیسے تم صدمہ سا ہو گیا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے آفاق پرزائی کا چہرہ نمودار ہوا۔

اور اس کے بعد فاقہ کا چہرہ جس کی زندگی آفاق کی زندگی سے جڑی تھی!

(ایک آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

زری کی کہانی

نے زری کی کر کے ذرا بھرم رکھ لیا ہے۔ بلوڑ میں
دیکھو! کتنے پیارے نام ہوتے ہیں۔ فرشتے، علیزے،
عقیدہ، اشترزے۔

”بس بس۔“ زری نے اس کی بات کاٹی۔ ”ہم
ایسے ہی ٹھیک ہیں اور خوب صورت نام تو واقعی اچھے
لگتے ہیں۔ مگر ایسے بھی نہ ہوں کہ چار بار تکرار کرے۔“
اچانک وردانہ نے رکھنا ہوا تو وردانہ اچھلی اور فنا
فٹ کرے میں گھس گئی۔ اسی سوا لے کر دلہن آگئی
تھیں۔ وردانہ کپڑے بدلنے لگی اور زری نے بھی اپنی
رقار بدھادی۔ کچھ ہی دیر میں ابو آفس سے اور رضا
مینٹر سے آئے والے تھے۔

”چلو زری! یہ پلاؤ سامنے والے کرائے داروں کے
ہل میں تلو ہے۔“

وردانہ نے چادر لیتے ہوئے کمرہ رخسانہ بیگم ہر سنتے
کسی نہ کسی بیوی کے ہل کھانا بھجواتی تھیں۔ زری
بھی چادر لیتے لگی۔

”تمہیں پتا ہے وہاں ایک اسمارٹ سالہا کا بھی نظر
آیا ہے۔“ وردانہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”وہ تو اسی کو
بس اس کی سوتیلی لال اور چھوٹے چار بچے نظر آئے
وردانہ ہمیں بھی نہ بھیجتیں۔“

”چلو! آج ہم بھی دیکھ لیتے ہیں کہ یہ اسمارٹ کیا بلا
ہے۔“ زری بھی لڑجھوڑ میں تھی۔

وردانہ کھٹکھٹایا تو وہ دستک کا بوجھ نہ سہہ سکا اور
کھٹکھٹایا گیا۔ سامنے والے کمرے میں بچوں کے

”زری!“ ایسی ہی کیاری کے گلاب والے حصے
کے پاس سب سے پہلے برکتی مہذاری۔

”کیا ہے؟“ وہ چار کھانے والے انداز میں بولی۔ کلو
بھنڈی سے بھرا قحل جو اسی اس کے سر ٹھوپ گئی
تھیں۔

”مگر میرے لیے بالوں میں یہ گلاب لگ جائے تو
کیسا لگے اور ہاتھ بھی کسی پنڈ سم کا ہو تو؟“

وہ ایک ہاتھ اپنے بالوں پر رکھے مسکراتی گئی
بولی۔ زری نے ایک نظر اوپر سے نیچے تک اس پر ڈالی
جو سفید چوڑی دار پاجاما اور کبھی کبھار فرائڈ میں اترا
ہوئی کھڑی تھی۔

”میں یہ قحل اٹھا کر تمہارے سر پر دے سادوں گی۔
پھر سرخ گلاب تو نہیں سرخ گوشت ضرور چنے گل۔

شرافت سے آکر صفحہ یاں کٹاؤ۔“ اس نے بری طرح
ڈانڈیا۔

”کیا ہے یار؟“ برا سامنے بنا کر بولی۔ ”اور یہ جو اتنی
فتیں کر کر کے اسی سے کپڑے بنوائے ہیں نا! ان کے
آنے سے پہلے انارو و وردانہ عصر کے وقت تمہیں سفید
کپڑوں میں کھلے بالوں کے ساتھ کیاری کے پاس
چھپیں کرتے دیکھ کر جو حشر ہو گا تمہارا“ وہ تمہیں پتا
ہے۔“

زری نہ سر جھٹکتے ہوئے وہاں بھنڈی کاٹنے لگی۔ وہ
لوں سنی کرتے ہوئے تخت پر بیٹھ کر سرخ بڑے بڑے
گلابوں کو دیکھنے لگی۔

”زری! ہمارے نام بھی کتنے عجیب سے ہیں
پرانے گھسے بیٹے۔ میرا وردانہ تمہارا زری نہ۔“ وہ تو میں



کھلونے بکھرے ہوئے تھے۔ ربر کی پٹی اندرون کے پیر نے جلدی سے اسے پکڑ لیا اور والے کمرے میں
 تلے آگئی۔ لیٹو جو دیو کھلا کر باہر نکلا تو دونوں نے بے ساختہ ایک
 ”پہوں۔“ گواہ اندر وار تھی۔ وہ لڑکھرائی تو زربہ دوسرے کو دکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ بیابان لور ہاتھ

پینٹ میں لمبوس لڑکا آگے کیا۔
 ”ہم سامنے والے گھر سے آئے ہیں۔“ زری نے

پلیٹ تمام کردوانہ کی طرف دیکھا تو اسے جھٹکا سا لگا۔
 پلیٹ خالی کر کے اس نے دردانہ کے ہاتھ میں تھمائی
 اور بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ دونوں کو دیکھ کر بولا۔
 ”در اصل میں خالہ کے ہاں گئی ہیں۔“ وہ دونوں

سہلائی والیں آگئیں۔ کرے میں اگر زری نے چادر
 کا گولایا کر بیچ کا اور چارپائی پر دہری ہو گئی۔
 ”ہاں! اسارٹ! وری تیرے ساتھ نیچے گایا راکھریہ
 سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے پسند کون آیا۔“ وہ ہنس ہنس

کر بے حال تھی۔ دردانہ غصے میں بھری ہوئی کھڑی
 تھی۔
 ”کیسے سمجھ میں آتا ہے اس کی ایک آنکھ تیری طرف
 ایک دوسری طرف تھی۔“ وہ بھی ہنسنے لگی تو دردانہ کی

بھی ہنسی چھوٹ گئی۔
 ”ویسے بار! ہے بہت اسارٹ کیا ہوا جو ذرا سا بیچ کا
 اور دانت پیلے ہیں۔ اس کی ہنسی کا فوانہ پھر چھوٹا تو
 دردانہ بھی ہنسنے لگی اس سے پٹ کر کے مارنے لگی۔

☆ ☆ ☆
 رخسانہ بیگم تخت پر بیٹھی پان ہٹانے میں مصروف
 تھیں۔ حنون کے پاس بیٹھا ہوا مورک کر رہا تھا۔ شام
 کی ٹھنڈی خوشبودار ہوا سرسرا رہی تھی۔ دردانہ نے
 سب کے لیے گرم گرم چائے لاکر بیچ میں رکھی اور خود
 اپنا کپلے کر قرب پڑی کر سی پر بیٹھ گئی۔
 ”بیٹا! تمہارا بی کام ہونے والا ہے۔ ابھی سے
 تمہارے لیے کچھ تیاری شروع کرتی ہوں۔“ وہ پان
 منہ میں رکھتے ہوئے بولیں۔
 ”میں نہیں ائی! مجھے ماسٹرز کرنا ہے۔“ دردانہ نے
 برا منہ دیا۔
 ”بیٹا! اتنے وسائل نہیں ہیں۔ رضا ابھی میٹرک
 اور حنو انھوں میں ہے۔ جتنی جلدی تم لوگوں کے
 فرض سے قانع ہو جاؤ تو بہتر ہے۔“ انہوں نے

دردانہ سے سمجھایا۔ دردانہ چپ سی ہو گئی۔ زری نے
 آراپنا کپ اٹھایا اور تخت کے کنارے ٹک گئی۔
 ”چھا! اگر میری مرضی کے بغیر کسی کو قائل نہ کیجئے
 گد۔“ وہ بدلتی سے بولی۔
 ”وہ تو ظاہر ہے، کوئی زبردستی تھوڑی ہوگی۔“
 رخسانہ بیگم نے کہا اور حنو کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے
 لگیں جو ان کی چھائیہ نکلی رہا تھا۔ وہ بے رحمانی میں
 نگاہ کے پھولوں کو نکتے لگی۔ زری نے مسکراہٹ جوابی
 اٹھ گئی۔
 وہ پورچی خانے میں گئی تو زری نے آٹا کو گدھ ری
 تھی۔ گوشت دھونے لگی۔
 ”ہاں! اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔“ وہ اسے
 چھیڑنے لگی۔
 ”چپ کر تو تم میں بھی کسی ایسے دیسے رشتے پر ہیں
 نہیں کھول گئی۔ تمہیں اندازہ تو ہے میں کیا چاہتی
 ہوں۔“ وہ اور رگڑ کر دھونے لگی۔
 ”وری! ایسا رشتہ آٹا آسٹن بات نہیں۔ ہمیں اپنے
 مطابق سوچنا چاہیے۔“ وہ آٹے کو مکمل مارنے
 مارتے رکی۔
 ”مجھے نہیں پتا۔ ماسٹرز بھی نہیں کروں تو کم از کم
 رشتہ تو چھوٹے۔“ وہ ضدی انداز میں بولی۔
 ”چھا! جو ہوگا، فائدہ بہتر کرے گا۔“ وہ بات ختم
 کرتے ہوئے آٹا کو گدھنے لگی۔
 ☆ ☆ ☆

”یار! میں اتنے دنوں سے اس لڑکے کو دیکھ رہی
 ہوں۔ کتنا پینڈ سم ہے۔“ دردانہ کلج کی دیوار کے
 ساتھ چلتے ہوئے زری سے بولی۔ زری نے کن
 اکھیوں سے اوھر دیکھا۔ لڑکا بھی اوھر ہی متوجہ تھا۔
 ”ہاں! کار بھی زبردست ہے۔“ وہ اس کی لمبی سیاہ
 گاڑی کو دیکھتی کلج کا گیت پھلانگ کر اندر آ گئی۔
 ”مجھے لگتا ہے، جیسے وہ ہمارا انتظار کرنا ہے۔“
 دردانہ شخ لہجے میں بولی۔

☆ ☆ ☆
 ”بیٹا! اتنے وسائل نہیں ہیں۔ رضا ابھی میٹرک
 اور حنو انھوں میں ہے۔ جتنی جلدی تم لوگوں کے
 فرض سے قانع ہو جاؤ تو بہتر ہے۔“ انہوں نے

انجھے نصیب کی دعا کی۔

وہ بولوں کو خوب سارا اپنی ازل کر مزی اور تخت پر بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ دونوں سے پانی نہیں آ رہا تھا اور پورے دھلے بھی نہیں تھے۔ بے رونق سے ہو رہے تھے۔ زندگی بھی تو ایسی ہی ہے۔ اس "اسٹون" کا بالی نہ ملے تو مر جھلی سی گئی ہے۔ بے رونق ہے۔ وہ اپنے پھیکے شب دروز پر غور کرنے لگی۔ کلج سے گھر گھر سے کلج۔ کلج پر اسے رشک آیا۔

"ہینڈ سٹم دولت مند چاہئے ولا لا نفس پار نر اور کیا چاہیے۔" وہ بولی سے پاؤں ہلانے لگی۔ "دروانہ!" اسی کی آواز پر وہ چونکی اور اندر کمرے میں آگئی۔ وہ مسری پر ہاتھ میں ایک تصویر لے بیٹھی تھیں۔ اس نے تصویر دیکھی اور امیدوں پر لوس پڑ گئی۔ اتالی عام سی شکل و صورت۔ موصوف کللی حد تک قاصد البلب بھی تھے۔

"تمہارے ابو کے جنرل اسٹور سے ہی تھوڑی اور اس کی ریڈی میڈ کپڑوں کی دو کٹن ہے؟" وہ آرام سے بتا رہی تھیں۔

"انجھے نہیں پسند۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"رے ایک دم ایسے کہے نہیں پسند۔" وہ حیران ہوتے ہوئے کچھ غصے سے بولیں۔

"سرو کھائے؟ ہر چیز پھسل جائے گی۔" وہ غصے سے بولی تو خندانہ بیگم فیس پڑیں۔

"بہری پلٹ وری بیٹا! یہ خاکی چیرس خاک میں مل جاتی ہیں۔ تمہیں سکون اس کی عادات اور کوارڈے گلہ انجھی سیرت ہوگی تو خوش رہو گی۔" وہ سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"سیرت کا بھی مجھے کیا پتا۔" وہ بدستور منہ پھلائے ہوئے تھیں۔

"تمہارے ابو نے پتا کروایا ہے۔ کچھ ہی دن پہلے دکان کھول ہے۔ مختی اور شریف ہے۔ اتر ہے۔"

"تمہارا تو دل خراب ہو گیا ہے۔ کسی ٹیلی کی ایسٹن نہیں ہو تم باز آ جاؤ۔" وہ اسے جھانسنے لگی۔ دروازہ آگیا۔ کلج ان دونوں کو دیکھ کر لپک کر ان کے پاس آئی۔

"آج میں اپنی منگنی کی تصویریں لے کر آئی ہوں۔ اسبلی ہو جائے پھر رکھاؤں گی۔" دونوں نے خوش دلی سے سر ہلادیا۔ اسبلی کے بعد مس فرہین کا پہلا پیڑ تھا مگر وہ آئی نہیں تھیں۔ وہ تینوں سیم کے درخت کے نیچے جا بیٹھیں اور تصویریں دیکھنے لگیں۔

"رے! ان دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ یہ تو وہ ہے۔"

"کون؟" کلج حیرت سے بولی۔

"نہ! ابھی باہر دیکھا تھا۔" زینہ جلدی سے بولی۔

"ہاں! کامران مجھے لینے اور چھوڑنے آتا ہے۔" وہ غصہ سے بولی۔

"چھا! دروازہ کچھ حسرت، بھرے انداز میں بولی۔ "جھا خالصا بڑا بس ہے کامران کے والد کا۔ میں اپنی پچھو گئی بیٹے احمد بھائی کی شادی میں گئی تھی تاہم کچھ دنوں وہیں کامران نے مجھے دیکھا۔ بس پھر منگنی کر کے ہی چھوڑا۔"

کلج اپنی دھن میں بہرے کی انگوٹھی سے سجا ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ کلج کسی امیر قبیلے سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ پچھلے دنوں ہی اس کے والد نے سیکنڈ ہینڈ مہر لال بھی لور وہ خود کسی پرائیویٹ کلج میں بیکچرار تھے۔

"بس! اپنا اپنا نصیب۔" دروازہ رشک کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ جبکہ کلج لور زینہ تصویریں دیکھنے میں مگن تھیں۔ وہ بھی تصویروں پر جھک گئی۔ کسی مشہور یوتھ کی پیش قیمت کام داری گرین فرائڈ اپنے کلج کے چہرے سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کا سسرال بھی بہت پر دھا لکھا اور مہذب لگ رہا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس کے

ابھی اور بتا کر دانا ہے اچھی طرح تسلی کے بعد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔" رخسانہ بیگم تصویر دیکھتے ہوئے بولیں۔

"جس مجھے نہیں پتا۔" وہ دھپ دھپ کرتی چلی گئی۔ رخسانہ بیگم نے فکر مندی سے اسے جاتے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر اٹھ گئیں۔

ابصار صاحب برائی کھاتے میں مشغول تھے۔ وہ لوگ کچھ دیر پہلے رات کا کھانا کھا چکے تھے۔ ابصار صاحب کو آج دیر ہو گئی تھی۔ رخسانہ بیگم قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ بھی آواز میں خبریں چل رہی تھیں۔ "میں نے آج اور معلومات کر لیں ہیں۔" کور سے اپنی نکالتے دروازہ کھاتے تھے۔

"پھر کیا ہوا؟" رخسانہ بیگم اشتیاق سے بولیں۔ "کڑکے کی فیملی بہت بڑی ہے۔ وہ سب سے نمبر پر ہے۔ چھ لور چھوٹے بسن بھائی ہیں۔ دکن بھی گئی ہوئی نہیں تھی۔" وہ ہر سوچ انداز میں بولے۔ "مگر مجھے تو شریف اور اچھے لوگ لگے۔" رخسانہ بیگم کی آواز ہلکی پڑ گئی۔

"ہاں! مگر ابھی دروازہ کی کوئی خاص عمر نہیں گزری۔ میرے خیال میں ہمیں اور انتظار کر لینا چاہیے۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے بولے۔

"میں ہوں۔" رخسانہ بیگم چپ ہو گئیں۔ دروازہ کا دل چاہائی ڈالے۔ وہ مسکراتے ہوئے گھونٹ گھونٹ پیتے لگی۔ پھر اپنے لور زینہ کے کمرے میں آکر بولی۔ "خیر میاں سے جان چھوٹ گئی۔ ابو کے دل کو لگا نہیں۔" وہ لگتے ہوئے بولی۔

"چھا! زینہ جنرل پر ڈائیکٹرام ہٹانے میں غرق تھی۔ وہ سیکنڈ ایئر میں تھی لور اس کے پیپر ذمہ بھی قریب تھے۔

"یہ تو کوئی خوشی بلکہ خوشی نہیں۔" اس کی عدم توجہ پر بھٹکتے ہوئے باہر نکل گئی۔

میلاد سے واپسی پر دروازہ کے رانت ہی اندر نہیں جا رہے تھے۔ جبکہ زینہ بھائی پھر رہی تھی۔ رخسانہ بیگم بھی خوش لگ رہی تھیں۔ ان کی سہیلی صبیحہ نے اپنا گھر بنوانے کے بعد وہاں میلاد رکھا تھا۔ انہوں نے زینہ کو کالی عرصے بعد دیکھا تو انہیں اپنی بہو کے روپ میں بھائی مغلانی آنکھیں درمیانہ قد گول سے چہرے کے ساتھ مسکراتی سمجھ دار سی زینہ پر انہیں پیار آگیا اور اسی وقت رخسانہ بیگم سے بات کر ڈالی۔ فن کے بڑے بیٹے کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹا بیٹا زین بیگم میں ملازمت کرتا تھا۔ قبول صورت ڈسے دار تھا۔ دیکھے بھالے لوگ تھے۔ رخسانہ بیگم مطمئن تھیں۔ مگر زینہ آرام سے پرہنا چاہتی تھی۔

"پی! پہلے درمی کا نمبر ہے نا؟" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"ہاں! تو اللہ نے چاہا تو اس کا بھی جلد ہو جائے گا۔" تھیں کون سا کل ہی رخصت کر رہے ہیں۔" رخسانہ بیگم کا مطمئن قائل دید تھا۔

"میری باری میں تو کسی نصیحت بیگم بنی پھرتی تھیں۔ اب خود پر بڑی تو پڑھتا ہے۔" دروازہ اس کی نقل اتارنے ہوئے بولی۔

"پی! ابھی تو ابو سے بھی نہیں پوچھا۔" اس نے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی۔

"میں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لور ابھی میں بات کر رہی ہوں۔" کس بات کی اتنی بے چینی ہے؟" وہ کچھ خفا ہوتے بولیں۔

"مگر ای! انہیں درمی کے لیے کتنا چاہیے تھا۔ وہ بڑی ہے۔" اسے ایک اور نکتہ موجد۔

"دروازہ تو زین کی ہم عمر ہی ہے۔ جوڑ تمہارا بننا ہے۔" یہ کہہ کر وضو کے لیے اٹھ گئیں۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔" وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ "یہ ہی تو بات ہے مائی ڈیر سسر۔" دروازہ شوخی

سے بولی۔
 ”تم بہت خوش ہو رہی ہو۔“ وہ چڑ کر بولی۔ دردانہ
 ہنسنے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ وہ منہ ہٹائے بیٹھی رہی۔



دردانہ پھنگی ملا اپنی مسائل پر لگا رہی تھی۔ ایک
 مہینے بعد زرنہ کی گھر میں ہی چھوٹی سی رسم بولی تھی۔
 مگر ایک دودا لے تنگ کر رہے تھے۔ زرنہ اطمینان
 سے رہا لگانے میں مشغول تھی۔ ابو نے بھی ”ہاں“
 کر دی تھی۔ اس نے ماں باپ کو خوش رکھا تو راضی بہ
 رضا ہو گئی۔ رخسانہ بیگم کا پروگرام ابھی صرف رسم کا
 تھا۔ پھر ایک سہل بعد دونوں بیٹیوں کو ساتھ رخصت
 کرنے کا ارادہ تھا۔ کچھ دن بعد دردانہ بھی بی کام سے
 فارغ ہو جاتی۔ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔
 ”یار! تم تو بڑی جلدی ہار لی گئیں۔“ وہ زرنہ کے
 سامنے کتب لے کر بیٹھ گئی۔

”ہاں! تو تمہاری طرح امی ابو کو پریشان نہیں دیکھنا
 چاہتی۔“ وہ صحت سے بول کر پھر ٹانگ لگانے لگی۔
 ”جھا! بس اچھا خاصا ڈھنگ کا رشتہ مل گیا نا۔ میری
 طرح آنا کوئی فارغ البل۔ تب پوچھتی۔“ وہ منہ
 ہٹاتے ہوئے بولی۔

”میں تب بھی ہاں ہی بھر لیتی۔ اور زین کا بھی کیا
 بھروسہ۔ شادی کے بعد منجے ہو جائیں گے۔ آخر کل
 ان کے والد کی مثل سامنے ہے۔“ وہ مزے سے بولی۔
 ”جھا! مجھے نیند آرہی ہے۔“ دردانہ کتب رکھ کر
 لائٹ بند کر کے لیٹ گئی۔

زرنہ باہر جا چکی تھی۔ گھر وہ کلن دیر تک اپنے
 بارے میں سوچتی رہی۔ سرکئی رات اور بوجھل
 سوچوں نے پلکیں بھی بوجھل کر دیں اور نیند نے
 سوچوں کی جگہ قبضہ کر لیا۔



”بہت مبارک ہو زرنہ! مگر دردانہ بڑی ہے تم
 سے۔“ کلن مبارک ہلو دیتے ہوئے بولی۔ دردانہ کو

کچھ ضروری نوٹس لائبریری سے ہٹائے تھے۔ زرنہ
 بھی اس کے ساتھ کالج آئی تھی۔ وہاں نکل سے بھی
 ٹکراؤ ہو گیا۔ دردانہ کی مسکراہٹ پھلکی سی ہو گئی۔
 ”رے یار! کیا سہل دوسیل کا فرق بھی کوئی فرق
 ہے اور میں تو اس سے بڑی نکلتی ہوں۔“

شادی ساتھ ہو گی ان شاء
 اللہ۔“ زرنہ نے فوراً بات سنبھالی۔
 ”بھلا! اچھی بات ہے۔“ کلن شینچ پر بیٹھتے ہوئے
 بولی۔

”میرا تو بھتی کا مرلن نے لی کام کرنا دھمک کیا ہوا
 ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا، کل رخصتی کرا لے
 بمشکل پیچہ تک رکے ہیں سب۔“ وہ سوئچ پھلکی کا
 دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ساتھ ان دونوں کو بھی
 پیش کش کر دی۔ زرنہ نے ایک دانہ منہ میں ڈال لیا۔
 مگر دردانہ کلن براہور ہا تھا۔

”تم لوگ کھاؤ یار۔ میں لائبریری سے ہو کر آئی
 ہوں۔“ وہ چل پڑی۔ زرنہ نے اسے دیکھا۔ پھر ابھی
 آئی کہہ کر اس کے پیچھے بھاگی۔
 ”کیا ہے دو! انا کل پھلکیوں لے رہی ہو؟“ وہ مجھے
 سے بولی۔

”مجھے نوٹس ہٹانے ہیں۔“ وہ سیدھا دیکھتے ہوئے
 بولی۔

”میں ری ایکٹ کر دی تو کام نہیں چلے گا۔“ زرنہ
 پھر بڑبڑائی۔ ”میں منع کر دیتی ہوں۔ ہماری رسم بھی
 ساتھ ہی ہوگی۔“ دردانہ مڑی۔

”نہیں پاگل! میں تو بہت خوش ہوں۔ تم سے زیادہ
 تیاری کر رہی ہوں۔ بس لوگوں کی باتوں پر کچھ عجیب
 لگا۔ مگر اب خوش ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
 ”جھوٹ مت بولو۔“ زرنہ غصا سی بولی۔

”جی یار! میری پاکٹ میں بچے آخری سوکے نوٹ
 کی قسم۔“ وہ شوخی سے بولی تو زرنہ ہنس پڑی۔ پھر
 دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لائبریری میں گھس گئیں۔



پہرے کے بعد وہ فراغت سے تیل کا سانچ کرتے بیٹھی تھیں۔
 بیگم تک پہنچ چکی تھی۔ وہ ضبط کر کے رہ گئیں۔



”دری!“ وہ اپنے گلاب کے پودوں کے پاس تخت پر ساکت بیٹھی تھی۔ زرینہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
 رخسانہ بیگم درزی کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں دو لوں اکیلی تھیں۔ کل سے وہ اس سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر وہ تو سب سے خفا تھی۔ وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ابو نے چھان چنک کر کے نواز کے لیے ہاں کر دی تھی۔ دینی میں ان کے ایک جاننے والے تھے۔ انہوں نے سب معلومات کیں۔ اب اگلے ہفتے زرینہ کی رسم کے ساتھ اس کا نکاح تھا۔ کیونکہ کاغذات بنوانے تھے۔ پھر نواز تین چار ماہ بعد لمبی چٹیاں لے کر آتا اور رخصتی ہو جاتی۔ زرینہ کی ہونے والی ساس صبیحہ اتنی جلدی شادی کر نہیں سکتی تھیں۔ حل ہی میں ان کا گھر بنا تھا۔ لہذا طے یہ پایا کہ فی الحال وروانہ کی رخصتی کر دی جائے۔ بعد میں زرینہ کی شادی آراہ سے ہوتی رہے گی۔

”تھیں تو خوش ہونا چاہیے مجھ سے پہلے شادی ہو رہی ہے۔“ وہ اس کا چو اپنی طرف موڑتے ہوئے بولی۔

”ہاں! ہاں۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے پھٹ پڑی۔ ”تم تو کہو گی۔ جس کے ساتھ ہونا ہے وہی جانتا ہے۔ زین ایسا ہوتا تب پوچھتی۔ میری شادی کہاں کروا رہے ہیں۔ ایک الیکٹریشن سے۔ نام دیکھو نواز۔ اتنا پرانا۔ عمر دیکھو۔ کچھ ہے خوش ہونے کے لیے؟“

اس کے آنسو تو اترا بہہ رہے تھے۔ زرینہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔

”نہیں دری!“ وہ بہت پیار سے بولی۔ ”اے ابو نے تمہارا اچھا ہی سوچا ہے۔ نواز بھائی بی اے کر چکے ہیں۔

”سرسوں کے تیل میں مٹیسی بولہ پس کر رکھاؤ۔ پھر نمٹنے سے پہلے لٹکھو۔ مگر نہیں تو یہ بھی گوارا نہیں۔“
 رخسانہ بیگم نے اسے جھازا۔

”چلو! یہ بھی کر کے دیکھ لوں گی۔ مگر میرا تیل تو ختم ہو۔ اتنا رنگا منگوا تھا۔“ وہ جھڑنے والے بالوں کو انگلی میں لپیٹتے ہوئے بولی۔

”چھا! اوھر آؤ۔“ رخسانہ بیگم نے مسہری پر سے کپڑے ہٹا کر اس کی جگہ بتائی۔ وہ فرش پر سے اٹھنے لگی۔

”بلکہ پہلے ہاتھ دھو آؤ۔“ وہ اس کے چکنے ہاتھوں کو دیکھ کر بولیں۔

”گف! یہ سہنس۔“ وہ ہاتھ دھو کر آئی۔
 ”مجھے پتا تھا۔“ وہ ان کے ہاتھ میں تصویر دیکھ کر بولی۔ رخسانہ بیگم نے گھورا تو اس نے تصویر لے کر ایک نظر ڈالی۔ سر پہ تو بالوں کا گھٹا جنگل تھا۔ مگر عمر زیادہ لگ رہی تھی۔ جسم بھی تدرے بھرا بھرا تھا۔ درمیانہ قد قامت تھا۔

”تمہارے ابو کے دوست کی۔ سن کا بیٹا ہے۔ چھوٹی تھیں۔ بہنوں کی شادی کر دی۔ چھوٹا بھائی بڑھ رہا ہے۔ ساتھ جاب بھی کرتا ہے۔ والد فوت ہو چکے ہیں۔ یہ دینی میں ہونا ہے۔“ انہوں نے تفصیل سے بتایا۔
 ”مگر ای! یہ تو میرے اٹکل لگ رہے ہیں۔“ وہ نہ بٹا کر بولی۔

”تفصیل بات مت کرو وروانہ!“ رخسانہ بیگم سختی سے بولیں۔ ”ہر شے میں آراہ سے کپڑے نکال دیتی ہو۔ اتنی زبان عمر بھی نہیں۔ بیس سال کا ہے۔ دس بارہ سال کا فرق ہو گا تو اتنا فرق چلنا ہے۔ زمرہ وار ہے۔ پہلے بہنوں کی شادی کی۔ ورنہ خود غرضی سے سوچنا تو

کب کا شادی کر چکا ہوتا۔“ انہوں نے اچھی طرح جھاڑ دیا۔ آنسو جیتی اٹھ گئی۔

”کر لیتا۔ میری جان چھوٹی۔“ ہیرا ہٹ رخسانہ

مزید پڑھنا چاہتے ہیں۔ تمہارے پڑھنے پر بھی پابندی نہیں۔ رہی بات الیکٹریشن کی۔ تو ان کی جانب بہت اچھی کمپنی میں ہے۔ اچھی خاصی آمدنی ہے۔ کم عمری میں ذمہ داریاں سنبھالنا پڑیں تو اور کیا کرتے ہے چارے؟ مجھے بڑھے گا کو الیکٹریشن بڑھے گی تو کوئی اور جاب کر لیں گے۔ وہ ٹھہر جائے والوں میں سے نہیں آتے۔ اور رہی بات تو تمہارا نام بھی کوئی نیا نہیں۔ جس طرح تمہیں اپنا نام رکھنے کا اختیار نہیں ملا۔ انہیں بھی نہیں ملا ہوگا۔ تم رکھ لینا کوئی اچھا سا تک نیم۔ وہ اسے بھلاتے ہوئے بولی۔ مگر وہ بے زاری سے رات کی رانی پر نظریں گاڑے بیٹھی رہی۔ زینہ لٹھندی سانس بھرتے ہوئے اٹھ گئی۔ اب وہ ہونٹ کٹ رہی تھی۔



”رخسانہ!“ دروازے پہ کھڑے ابصار صاحب کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ کپاری سے دھنیا تو زنی رخسانہ بیگم کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے کانپ سا گیا۔ ”توازن کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ چلنے کی تیاری کرو۔“ وہ نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں بولے۔ ”والدہ کا انتقال۔“ وہ بے یقینی سے بولیں۔ ”مگر کب؟ اچانک کیسے؟“ بے ربط سے جملے گھبراہٹ میں لہو ہو رہے تھے۔ ”کل رات ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اب جلدی چلو۔ دروند کو بھی لے لو۔“ وہ غلٹ میں کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔

کچھ دیر میں وہ ان کے گھر پہنچ چکے تھے۔ ابصار صاحب یا ہر مردوں میں رک گئے۔ رخسانہ بیگم دروند کو لیے اندر بڑھ گئیں۔ دروند کے ذہن میں دھیمی لہجے میں بولتی وہ شفیق سی خاتون آرہی تھیں جو اسے نکاح والے دن ساتھ لپٹائے بیٹھی تھیں۔ مگر اس نے جب یہ سب محسوس ہی نہ کیا تھا۔ اسے بھی دکھ ہو رہا تھا۔ اندر بڑے سے ہل نما کمرے میں خواتین جمع تھیں۔ رخسانہ بیگم اس کی میزوں مندوں کو دلاسا دیتے بڑھیں۔ اس کی بڑی مند عفت چھوٹی دونوں مندوں کے بیچ میں

گہرے میک اپ میں اس کے چہرے کا سپاٹ پن نمایاں تھا۔ میوٹن لپ اسٹک سے بچے خوب صورت ہونٹ تختی سے پیوست تھے۔ آنکھوں میں جمالی بھی محسوس ہو رہا تھا۔ سلور گرے شرارے میں میوٹن بارڈر کا استخراج بہت کھل رہا تھا۔ مگر دل مر رہا ہو جھلا گیا اچھا لگتا ہے۔ ساگی میں بھی وہ زینہ سے زیادہ نمایاں ہوتی تھی۔ کمر تک آتے رہتی بال، ستواں ٹاک، شرارتی آنکھیں، کھٹا گندی رنگ، ہونٹوں میں خم اور دائیں رخسار پر سجادہ کا سیاہ دل۔

ابھی بھی وہ زینہ کے برابر بیٹھی اس سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ مگر واضح فرق دونوں کے تاثرات کا تھا۔ گلابی ٹخنوں کو چھوٹی گھیردار فراک میں ہلکا سا میک اپ کے دھیمادھیماسکرائی زینہ کے چہرے پر بے حد رنگ بکھرے تھے۔ نکاح کے بعد نواز کو دروند کے برابر لا کر بٹھایا گیا تو اس چہرے پر سختی چھا گئی۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ لب زینہ کی سانس اس کی رسم کر رہی تھیں۔

مانول بے حد خوش گوار تھا۔ رخسانہ بیگم لور ابصار

بڑھ چلی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دردانہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے مہری چمک لہرائی۔

”تم؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کیوں آئی ہو۔“ وہ بلند آواز میں بولی۔ رخسانہ بیگم پریشانی سے اسے دیکھنے لگیں۔ دردانہ ہکا بکا کھڑی تھی۔

”دور کس کو کھانا ہے؟ میری ماں کو تو کھا گئی۔“ وہ وحشت زدہ آواز میں چلائی۔ اس کے بل کلب سے نکل کر بکھر رہے تھے۔ آنکھیں سرخ آنکا رہ گئیں۔ دردانہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اسے وہ کوئی بد روح لگی۔ وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

”دردانہ نہیں ہوئے اور میری ماں مر گئی۔ سب تیری نخوت ہے۔ جس دن سے گھر میں تیرا ہم لیا خوشی روٹھ گئی ہے۔“

وہ اب مٹھیاں بچھ کر چیخ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی دونوں منڈیں بمشکل اسے کھینچ کر اندر کمرے میں لے گئیں۔ اندر سے بھی اس کے چیخنے کی آواز آتی رہی۔ دردانہ کے لیے کمرے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے بے اختیار کچلی سی جڑھ گئی۔ اتنی عورتوں کی نظرس ایک ساتھ اس پر تھیں۔ بے رحم مسخرانہ ترس کھاتی، جلنے کیسی کیسی نظریں۔ زندگی میں اس کا ایسا تماشا کبھی نہیں بنا تھا۔ رخسانہ بیگم نے اسے تھلا اور باہر سے ابھار صاحب کو لے کر گھر آ گئیں۔

”ہیوں؟“ گھڑی کے لیے تعزیت کی جاتی ہے؟“ اصل معاملے سے بے خبر ابھار غصے سے بولے۔ ”یہ تو اس سے پوچھو۔“ رخسانہ بیگم نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ جس دن سے نواز کا رشتہ آیا ہے وہ دو کر نخوت ڈالی ہوئی ہے۔ یہ سب تو ہوتا ہی تھا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے رخ بجے میں بولیں۔

اس نے ڈیڈ پائی نٹوں سے ماں کو دیکھا۔ پھر لیٹ کر کمرے میں چلی گئی۔ اس کا دل غم من ہو رہا تھا۔ مسی پر لیٹ کر وہ کم مسمی روتی چلی گئی۔ اتنی ذلت ایسی بخند دی اور مٹی میں بھی جل دل بکھنے کے بجائے اسی کو دوش دے رہی تھی۔ اس کے دل میں ابل اٹھنے

لگے۔

”ہاں! میں ہوں منحوس۔“ وہ زور سے چلائی۔ ”یا اللہ! میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟“ وہ بے قراری سے ہاتھ سرانے پر پٹخ رہی تھی۔ ہاتھوں میں ہنسی چوڑیاں زخم دیتی اسی کی طرح بکھرتی جا رہی تھیں۔



پورا چاند اپنی دھبی روشنی بکھیر رہا تھا۔ دو حیا سی چادر چھت پہ چھٹی تھی۔ خشک ہوا جسم سرد کر رہی تھی۔ گھریل سنگ رہا ہو تو وہ پیش سرد موسم سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے۔ دردانہ نے دونوں ہاتھ دوبارہ گھٹنوں کے گرد لپیٹے اور سر اٹھا کر چاند کو دیکھا۔ مماثلت تو تھی۔ وہ آسمان پر تھا اور یہ زمین پر۔ آنسو پھر بنے گئے جبکہ اسے لگ اٹھا کہ اب آنسو نہ آسکیں گے۔ کس کس بات کو سوچے روتے روتے سر اٹھا کر اس نے خود پر ترس کھایا۔

اس دن ہونے والے قماشے پر گھروالوں کی بے مہری پر پرسوں ہونے والی رخصتی پر مستقبل کے اندیشوں پر یوں سلوگی سے بادل کا گھر چھوڑ دینے پر آخر وہ کس کس پر آنسو بہائے کیا کیا نہ سوچا تھا۔ سب خاک ہو گیا۔ پاؤں والے دن ایسا جوڑا بنائے گی۔ سچیلیں ڈھو کی رتھیں گی وہ پھولوں سے لد جائے گی گھروالے اپنے ارمان نکالیں گے۔ مگر سب دھواں ہو کر تحلیل ہو گیا۔ اور باقی بچے بس اندیشے خوف، وابہ جیسے تاریکی میں سفر کیا جائے اور نہ منزل کا نشان ہو نہ رستے کا پتا۔ جس گھر میں اس کا یوں تماشا بن چکا ہے وہاں اس کو بھلا کیا عزت ملے گی؟ اس نے سردنوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

رخسانہ بیگم نے کچھ دن پہلے اسے بتایا تھا کہ نواز نے ساہی سے جلدی رخصتی پر زور دیا ہے اور اگلے ہفتے رخصتی ہے۔ اب وہ اس کے ساتھ ہی رہی جائے گا۔ وہ اسی کا بنہ نکلتی رہ گئی۔

پھر وہ اور ابو اس کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ زور نہ

کے میٹ چل رہے تھے۔ وہ اسے لٹتی تھی جو ہوتا ہے بہتری کے لیے ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کے ساتھ ہوتا تو پوچھتی۔ اس کے ساتھ تو ابھی تک سب اچھا ہوا تھا تو وہ کیسے اس کا رکھ سمجھ سکتی ہے وہ خود سے بھی خفا پانا تم متا رہی تھی۔ مذہب حال ہوتے ہوئے اس نے دیوار سے سر ٹکادیا۔

”آہ! آجائیں۔“ باہر سے رضائے آواز لگائی۔ اس نے ایک نظر اپنے گلاب کے پھولوں کو دیکھا۔ ایک گلاب بیچے گرا ہوا تھا۔ رات کی رانی انسرہ سی کھڑی تھی۔ چپ چاپ مریحائی ہوئی۔ اسے ایک دم بے تحاشا رہا آیا۔ اسے لگا اس کے پودے بھی اس کے ساتھ در رہے ہیں۔ جیسے وہ اس کا کٹھ بکھتے ہوں۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے ضبط کیا۔ زہر نہ ڈیڈ بانی آنکھیں لپے کرے کے دروازے پہ کھڑی تھی۔

ایصار

صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کے آنسو چٹک گئے۔ رخسانہ بیگم اسے تھکتے ہوئے ایک ہاتھ میں سالن لیے دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ اس کے ہاتھ پیرن ہو رہے تھے جیسے دھیرے دھیرے جان سرکتی ہو۔ اللہ کو یاد کرتے ہوئے اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ جیسے کوئی بیچ سندھ طوفانی لہروں کے سامنے ہار مان جائے۔

گلاب کی پتیاں بید پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ لگدستے بھی دائیں بائیں موجود تھے۔ کمرے میں منک کا قبضہ تھا۔ گولڈن میروں غرارے میں اس کے دکتے حسن نے ملکتی روپ دھار لیا تھا۔ مگر وہ گہری چپ کے زیر اثر تھی۔ نواز آکر اس کے برابر بیٹھ گئے۔ بے حس بیٹھی رہی۔ سلام کا جواب بھی نہ دیا۔

”دردانہ! ہماری شادی ذرا مختلف حالات میں ہوئی

تھے جیسا ہم نے سوچا“ اس سے بہت غلط ہے۔“ کھنکھار کر بولنا شروع ہوئے۔ دردانہ نے سر جھٹکا۔ اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ چپ بیٹھی رہی۔ ”عفت شروع سے ہی خدی مزاج کی ہے۔ سرسری پر دھاگ۔ جمانے کے لیے اپنی منہ کی شادی سمجھ سے کروانا چاہتی تھی۔ مگر میں نے بے کا قائل نہیں ہوں۔ اہل کو بھی اس کی منہ بند نہ تھی۔ انکار پہ وہ پھر گئی۔ ہمارے نکاح میں بھی اس نے شرکت نہ کی۔ اہل نے اس کی طبیعت خرابی کا بہانہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ جلد اسے منالوں لگ کر پھر اچانک اہل کا انتقال ہو گیا اور اس پہ اس نے جو تمنا کیا وہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ میں نہ دل سے معذرت خواہ ہوں۔“ وہ تھوڑی دیر کو چپ ہوئے۔ دردانہ ماؤنٹ داغ کے ساتھ سب سن رہی تھی۔

”میرے دینی جانے کے بعد عفت مزید مشکلات پیدا نہ کرے“ اس خیال سے میں نے جلدی رکھتی پہ زور دیا۔ اہل کے بعد تو ویسے ہی رسومات اور دھوم دھام کا دل ہی نہ تھا۔“ وہ رنجیدہ ہو گئے۔

”مجھے پتا ہے دردانہ! حالات نے آپ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ لڑکیوں کے بہت اہل ہوتے ہیں اور پھر عفت کا سلوک۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ دردانہ نے کوفت سے ہاتھ چھڑا دیا۔ مگر نواز نے اس کا ہاتھ آنکھوں سے لٹکایا۔

”دردانہ! سب باتیں بھول جاؤ۔ درگزر کرو۔ اللہ درگزر کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ وہ ہمارا دامن خوشیوں سے بھر دے گا۔“ اس کے ہاتھ کی پشت نم ہونے لگی۔ اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑنا چلا گیا۔

”صاف کرو۔“ انہوں نے اس کا سر سینے سے لگا کر اپنی تھوڑی ہاس کے ساتھ پر نکادی۔

”آج اہل ہوئیں تو ایسا نہ ہوتا۔ وہ ہمیں دعاؤں کے حصار میں رکھتیں۔“

وہ مضبوط مرد آنسوؤں سے مدہا تھا۔ خوشی کے سب سے بڑے موقع پر اپنی چھاؤں کھودی تھی۔ کئی

دونوں کا ضبط ٹوٹ گیا تھا۔ وہ تھک گئے تھے۔ آج اپنی شریک حیات سے اپنا غم بانٹنا چاہتے تھے۔ دردناک نواز کے سینے میں چھپ کر ایسا لگا جیسے شل ہوتے جسم کو سستانے کو وہ گھڑی مل جائے۔

اس کا دل تھیلنے لگا۔ نواز کے آنسو بہتے ہوئے اب اس کے آنسوؤں میں مدغم ہو رہے تھے۔

”رحمت مبارک ہو۔“ نواز اس کے قریب آکر دھبے سے بولے۔ پھر بے قراری سے گلابی گل کو تھنی بچی کو گود میں لے لیا اور اسے جوسنے لگا۔

”اما! یہ کون ہے؟“ فہد انگلی اٹھائے بہن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ انداز میں کچھ فاصلہ تھا۔ آج بابا کسی طور کو پیار کر رہے تھے۔

”بیٹا! یہ آپ کی چھوٹی بہن ہے۔“ وہ بولی۔ آواز میں کچھ غماز تھا۔ نواز اب فہد کو تنگی گڑا دکھا رہے تھے۔ وہ اب سب خفگی بھول کر بڑے اشتیاق سے بھی اس کے گلابی گل چھوٹا بھی منہ میں انگلی ڈالے۔

”نہیں! بری بات بیٹا!“ نواز نے ٹوک۔ بچی کسمسا کر رونے لگی۔ دھیمی نواز میں دردناک کو خوب کھلنے پینے کی تلقین بھی کر رہے تھے۔ دردناک کیے کے سارے جیسے ہوئے انہیں محبت سے دیکھنے لگی۔ اپنی تصویر کی نسبت وہ کل کم عمر لگتے تھے۔

نواز اس کے نور سے دیکھنے پر مسکرانے لگے۔ وہ بھی مسکرا دی۔ وہ اس کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ کبھی تو انہیں چھٹی لگی کہ آپ تو ماؤں کی طرح میرے غرے اٹھاتے ہیں وہ ہنس دیتے۔ وہ گزرتے وقت کو سوچتی تو اسے لگتا کہ نواز نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اس نے مبرا کیا تو اللہ نے بہت مٹھا پھل دیا۔ اس کی رخصتی میں بھی عفت شریک نہ ہوئی تھی۔ نواز نے اب سب بھلا کر ملنا شروع کر دیا تھا۔ مگر عفت اجنبیت رکھتی۔

نواز کی محبت نے اسے اتنا تحفظ دیا تھا کہ وہ ذرا برداشت کرتی۔ ساتھ عفت کا دل بھی جیسے کی کوشش کر لے۔ ان دونوں نے کافی رقم بچت کر کے جمع کر لی تھی اور کچھ نواز نے پہلے سے جمع کی ہوئی تھی۔ ان کا ارادہ پاکستان جا کر چھوٹے پیمانے پر الیکٹرونکس اشیاء کا بزنس شروع کرنے کا تھا۔ زرینہ کی شادی پر وہ پاکستان گئی تھی اور اب جب نواز نے کہا کہ اپنی گڑیا کا عقیدہ پاکستان میں کریں گے اور مستقل پاکستان میں شفٹ ہو کر بزنس شروع کریں گے تو خوشی سے اس کی آنکھیں جھلکانے لگیں۔ نواز اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرا رہے۔

”ارے امی! آپ نے تو میرے پوچھوں کا بہت خیال رکھا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں دھبہ آنسو آگئے۔

وہ لوگ ابھی رونے دھونے کے سیشن سے فارغ ہوئے تھے کہ اس کی نظر اپنے پوچھوں پر گئی۔ رخسانہ بیگم مسکرانے لگیں۔ رات کی رانی تو مانہ مہک رہی تھی۔ بڑا کافی گھٹا ہو گیا تھا۔ گلاب کے پودے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ آٹھی، سرخ اور زرد گلاب اپنی بہادر دکھا رہے تھے۔ فہد نے صحت سرخ گلاب توڑ لیا۔

”اما! اتنی باری خوشبو۔“ وہ پھول سونگھنے لگا۔ پھر اس کی ناک کے قریب کر دیا۔ رخسانہ بیگم نواز سے کی حرکتوں پر جسنے لگیں۔ حمزہ زرینہ کو ساتھ لے آ رہا تھا۔ ساتھ زین بھی تھاز زرینہ نے اسے لپٹا لیا۔ ”صوفی! ہو گئی ہو۔“ زرینہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

وہ بھی بھکی ہلکوں سے مسکرا دی۔ وہ بچوں کے بعد اس کا جسم خالصا بھر گیا تھا۔ جبکہ نواز ویسے ہی تھے۔ جیسے شادی کے وقت تھے۔ بلکہ اب اور جاذب نظر ہو گئے تھے۔ ان کا جوڑ بہت اچھا تھا۔ نواز کو اس کے فریہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اسی شدت سے اسے چاہتے تھے۔ وہ اب اپنے شادی سے پہلے کے خیالات پر شرمندہ ہوتی رہتی۔

جانے انسان کس بل بوتے پر غور کرتا ہے۔ اس نے

تو بولی۔
”کتنی بدل گئی ہو۔“ مسکراتے گئے۔

وردانہ ہنس پڑی۔ ہر نئی بات اس کے دل میں شکر کے جذبے کو برعادت بنی تھی۔ وہ اپنے رب کی بے حد شکر گزار تھی۔ یہی تو ہی خوشیاں تھیں۔

باورچی خانے سے آئی بیروانی کی خوشبو سب جگہ چکرائی پھر رہی تھی۔ ابصار صاحبہ نواز کے ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے۔ اپنی مٹی سی نواسی کو انہوں نے گود میں لے رکھا تھا۔ فمد پودوں پر اڑتے ٹڈوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس نے اپنی رات کی رانی کو پیار سے دیکھا۔ پھر گلابوں کو نفلوں میں بھر کر مسکراتے گئے۔ ممبرو شکر کے رنگ بھر چکے تھے اور اب منظر عمل تھا۔

زین کو سلام کیا۔ وہ اسے کمزور لگا۔ بل بھی کافی جھڑ گئے تھے۔ کچھ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اس نے سوچتے ہوئے زینہ کے بیٹے کو گود میں لے لیا۔ زین کچھ دیر بعد چلا گیا۔ نواز بھی ابصار صاحبہ کے ساتھ باہر تھے۔ اب رات کے کھانے پر سب اکٹھا ہوتے۔

وعدہ نون میٹیں بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کرنے لگیں۔
”دوری! کچل یاد ہے نہیں؟“ رخسانہ بیگم اٹھ کر گئیں تو زینہ نے پوچھا۔

”ہاں! اسے کیسے بھول سکتی ہوں۔“ وردانہ ہنسنے ہوئے بولی۔

”ہس کے شوہر کامران نے دو سری شادی کر لی ہے۔ ایک ٹاپ مائل اس کی خوب صورتی اور دولت پر فدا ہو گئی تھی۔ زبردست ایئر کے بعد شادی ہوئی ہے۔ کچل بے چاری خون کے آنسو روتی ہے۔“

زینہ نے بتایا۔

”اے! وردانہ! کدو! افسوس ہوا۔“

”یہ مرد بھی بس۔“ زینہ متدنا کر بولی۔

”اب ایسے بھی نہ کہو۔ ہمارے شوہروں کی مثال سامنے ہے۔ کامران تو لگتا ہی ایسا تھا۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

”گور زین کی جلب کہاں ہے؟“ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

”بس... زینہ پھکی سی ہنسی دی۔ ”وہ بینک کی جانب تو شادی کے چھ مہینے بعد ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے کوئی ڈھنگ کی نوکری مل نہیں پائی۔ تمہو عا کرنا۔“ اب وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

”ہیں زری! مشکل وقت کے بعد زندگی میں پرسکون دور بھی آتا ہے۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم ممبرو گر کے اس کے پسندیدہ بندے بن جائیں یا بے مبری اور ناشکری کرتے ہوئے وہ دور گزاریں۔“

وہ زینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بولتی جا رہی تھی۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جب چپ ہوئی

امین انشاء کی شخصیت اور ملی وادنی خدمات پر

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض کا تحریر کردہ مقالہ

امین انشاء

احوال و آثار



قیمت: 1200/- روپے
ڈاک خرچ: 50/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
فون نمبر: 32735021
37، 44، 45، کراچی

زندگی

جب ایک دشت کو خوش خبریاں سنائی گئیں
پھر اس زمین سے نصیص نئی اُگائی گئیں

میں جانتا ہوں اس ایک شخص کی خاطر
کہاں کہاں سے یہ آسانیاں تھیں لائی گئیں

خدا کے نام پہ ہم نے بسائی جو بستی
خدا کے نام پہ وہاں بستیاں بٹائی گئیں

بنائے کشتیاں کاغذ کی شاہ زادوں نے
ہمدے واسطے طغیانوں میں لائی گئیں

مجھے تو یاد نہیں شکل اپنے منصف کی
مجھے تو یاد ہیں سزائیں جو سنائی گئیں

ہماری دنیا کو دوزخ بنا دیا اور پھر
زمین پہ اپنے لیے جنتیں بسائی گئیں

حقیقتوں کو چھپانے کی کاوشوں میں عطا
کہانیاں ہمیں کیا کیا نہیں سنائی گئیں
عطاء الحق قاسمی

زندگی باگیشری، سارنگ، دیپک، سوہنی
بیت تراشی، رقص، موسیقی، خطبات، شاعری

چنگیزی، تسلی، صنوبر، دوب، نسریں، چاندنی
لاہوردی، شریتی، دھانی، گلابی، چھٹی

زعفرانی، آسانی، ارغوانی، زندگی
لاجوتی، مدد بھری، کومل، سہانی، زندگی

ہر نفس موتی پر دتی، پھول برساتی، زندگی
خیمہ زربفت میں پازیب جنکائی ہوئی

نرکیاں لیتی، ٹھکتی، ناچتی، گاتی ہوئی
دھڑکتی، بڑھتی، ٹھکتی، جھومتی، گاتی ہوئی

اک سہری تان کی ترنجیر بل کھاتی ہوئی
اک انگڑائی دھنک کے پل پہ لہراتی ہوئی

زندگی ٹڑتے ہوئے پتوں پہ بوندھنی کی کھنک
صبح سرما کی کرن، شام بہاراں کی دھک

شہرِ حق میں پھول والوں کی گل ہے زندگی
گردِ آفتاب میں چپا کی ہے زندگی
جوشِ صبح آبادی



اعتراف،

تیرے میرے درمیاں اب رہا کچھ بھی نہیں
میری جاں! تیرے لیے تو ہوا کچھ بھی نہیں

اک بھرم ہی رہ گیا تھا اپنے رشتے کی بنا
یہ جو ٹوٹا تو سمجھو پھر بس کچھ بھی نہیں

کس قدر ادا اس تھا چپ رہا جب بھی ملا
آنکھیں کہہ رہی تھیں، منہ سے کہا کچھ بھی نہیں

بن کچھ کہے سنا دیا فیصلہ اس نے مجھے
کیا خطا ہوئی تھی؟ اس نے کہا کچھ بھی نہیں

ساتھ بھی وبال تھا، چھوڑنا بھی تھا محال
کیوں نہ ہے جلتے تھے ہم، پتا کچھ بھی نہیں

نائلہ باوید قریشی

نوشی گیلان

بھولتا کون ہے
وقت کے گھاؤ کو
ہجر کے شد طوفان کی
وصل کے خواب کی ڈوبتی ناؤ کو
بھولتا کون ہے
بھولتا کون ہے
اپنے قاتل کے قاتل خدو خال کو
دکھ اٹھاتے دلیں اور سر و سال کو
بھولتا کون ہے
بھولتا کون ہے
عمر کی شاخ پر کھٹنے والی اس اک اولین
شام کو
بے سبب جوں گاہے اس الزام کو
پھر تیرے نام کو
بھولتا کون ہے



تجربہ کار

ہل روڈ کی ایک اراکار جو قیسری شادی کر رہی تھی شادی کی رسمات سے فارغ ہوئی تو روایت کے مطابق اس کے نئے شوہر نے اس کا بازو تھام لیا۔
”تم نے میرا ہاتھ غلط طریقے سے پکڑا ہوا ہے۔“
اراکار نے اعتراض کیا۔ ”میرا ہاتھ چھوڑ دو۔“
”میں نے ٹھیک طریقے سے ہاتھ پکڑا ہے۔“ دوسرا نے اصرار کیا۔
اراکار چ کر بولی۔ ”میرا تجربہ زیادہ ہے یا تمہارا؟“
عظمیٰ امین

تبدیلی

شوہر ”بیگم! تمہیں یاد ہے میڈیکل کالج میں ایک لڑکا کثیف دھاری کلاس میں رہتا تھا۔ یونین کا صدر بھی تھا سو ہی جو تم سے شادی کرنا چاہتا تھا؟“
بیوی ”ہاں یاد ہے۔ یہ تقریباً“ میں سل پہلے کی بات ہے۔“
شوہر ”آج اس سے ملاقات ہوئی وہ تو اتنا سونا گنجا اور بددینت ہو گیا ہے کہ اس نے مجھے پہچان ہی نہیں۔“
نمو آفرا

پہچان

دو سیلیوں کی کافی عرصے بعد ایک بازار میں ملاقات ہوئی۔ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے ایک نے کہا۔
”ارے ایلا! تم نے اتنی جلدی مجھے کیسے پہچان لیا۔ حالانکہ میں تو کافی بدل گئی ہوں؟“
”میں تو شاید پہچان بھی نہ پائی، لیکن تمہیں وہی سوٹ پہنے دیکھ کر جو آج سے نو سال قبل میں باڈ

مارکیٹ سے سائڑے بارہ سو کالائی تھی اور تمہارے بار بار مانگنے پر ایک بار خود پہن کر میں نے تمہیں دے دیا تھا۔ میں نے فوراً ”تمہیں پہچان لیا۔“
پہلی والی یہ سن کر۔ شرمندہ ہو گئی۔
”اب یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟“

دوسری نے پھر جوت کی۔
”ہاں شاید میں بھی تمہیں اتنی آسانی سے نہ پہچان پاتی، لیکن تمہیں آج وہی دستانے پہنے دیکھ کر جو ایک دن اچانک میرے گھر سے چوری ہو گئے تھے میں نے تمہیں فوراً ”پہچان لیا۔“ پہلی والی صحت بولی۔
نوریدہ قدیر نداء۔ اسلام آباد

غلطی

بازار سے واپسی پر بیوی نے شوہر کو بتایا۔
”گاڑی کے بونٹ پر ذرا سی خراش آگئی ہے۔ اگر تم رکھنا چاہو تو ایک نظر دیکھ لو۔ بونٹ ڈکی میں رکھا ہے۔“

افشاں رحمان۔ کراچی

اظہار مسرت

پروفیسر صاحب کے گھر کی کھل تیل بجی تو انہوں نے اپنی خوبصورت بیوی سے کہا۔
”اگر باہر پروفیسر راجیل ہوں تو اس سے کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔“
کچھ دیر بعد بیگم دلہن آئیں تو پروفیسر صاحب نے پوچھا۔
”کون تھا۔؟“

”پروفیسر راجیل ہی تھا اور اس نے یہ سن کر بہت خوشی کا اظہار کیا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔“ بیگم نے

مسرت الطاف احمد۔ میٹریڈل کراچی

فائل دید

مرغا بانگ دیتے دیتے عاجز آچکا تھا کیونکہ اس کی بانگ سے ہر شکل و بیا تمین نمازی ہی نماز کے لیے اٹھتے تھے ایک دن مرغے نے بانگ دیتے دیتے چننا شروع کر دیا۔

”آج تو اٹھ جاؤ ہڈ حراسوں! فجر کی نماز کلوقت ہو گیا ہے۔“

”فورا“ ہی کلنی تعداد میں لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکلے نماز پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ اس مرغے کو دعوئے نے لے لیے۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی
خوب گزرے گی!

طالب میاں سجدہ کو بچپن ہی سے پسند کرتے تھے اور اس کے ساتھ مگنی ہو جانے پر بے حد خوش تھے ایک روز ترک میں طالب میاں نے سجدہ سے پوچھا۔

”تمہیں کچھ کھانا وغیرہ بھی پکانا آتا ہے یا نہیں؟“
”کھانا پکانا میں نے کبھی کیا تو نہیں۔“ سجدہ نے شرمیلے لہجے میں کہا۔ ”لیکن بچپن کے کھانے پکانے کے طریقے مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ تمہیں یاد نہیں جب ہم بچپن میں گھر گھر اور مسمان مسمان کھیلا کرتے تھے تو مٹی کے بیگن آلو جو ہڑ کے پانی میں دھو کر جھوٹ موٹ کے چوہے پر کتنا اچھا پکائی تھی۔“

مسرت الطاف احمد۔ کراچی
موسم

کراہیہ دار نے مالک مکان سے کہا۔ ”آپ کے گھر کی چھت چھتی ہے اس لیے مرغیاں بھگ رہی ہیں۔“
”پھر آپ موسم کا خیال کرتے ہوئے کچھ دلوں کے لیے مرغیوں کے بجائے بلیاں کیوں نہیں پال لیتے۔“
فاکہہ سہیل۔ کراچی

کسی ملک کے وزیر خزانہ بے تکلف احباب کے حلقے میں چمک رہے تھے۔ ”بچپن کا زمانہ بھی کیا نہانہ ہوتا ہے۔“ ان دنوں میری تناسلی کہ بڑا ہو کر وہ کو بھول گیا۔

”مبارک ہو۔“ کسی ستم طریف نے کہا۔
”آپ کی خواہش پوری ہو گئی۔“

نوزیہ سرور۔ اہم ایہ عمران۔ مہجرات

ایمر جنسی

جنگ عظیم دوم کے دوران مجھے بطور جیپ ڈرائیور ایک شیطان قسم کے مہجر کے ساتھ لگا دیا گیا۔ ایک دن میں اسے لیے ایک بڑے ہی مصروف بازار سے گزر رہا تھا کہ سڑک کے دائرے کنارے پر اسے ایک خوب صورت لڑکی مخالف سمت میں جالی دکھائی دی تو وہ تیزی سے بولا۔

”سار جنٹ! فورا اس گاڑی کو روکو جلدی۔“
میں نے یکایک چوتھے ہوئے گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ اس نے مجھے رکھنے کا حکم دیا ہے اور پھر جب میں نے انجن اشارت کیا تو لڑکی تباہ نے کہا گم ہو گئی تھی۔

”ایمر جنسی کے وقت تم انتہائی نقصان دہ ثابت ہو گے سار جنٹ۔“ مہجر کر جلا۔
”میرے خیال میں میں نے بالکل ٹھیک کیا ہے سر۔“ میں نے کہا۔ ”وہ لڑکی دراصل میری دست تھی۔“

فائدہ

جعفر صاحب نے اپنی بیگم سے مشورہ طلب انداز میں پوچھا۔

”اگر ہم وجاہت کو سائیکل لے دیں تو تمہارے خیال میں اس کی شرارتیں کم ہو جائیں گی؟“
”یقیناً۔“ بیگم جعفر نے جواب دیا۔ ”کیوں کہ پھر وہ زیادہ بڑے رقبے پر پھیل جائیں گی۔“

حکومتِ اسلامیہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
جس نے جو خواب بیان کیا، اسے جو کے دو دانوں
کو ایک دوسرے سے گرہ لگانے کا حکم دیا جائے گا اور
(وہ ایسا نہیں کرے گا، چنانچہ) اسے اس وجہ سے مذہب
دیاجائے گا۔ (بخاری)

بھی ہیں۔
(امام شافعیؒ)
مذہبِ نویرین مہک۔ برتالی

اجہی حکومت کی نشانی،

ایک بار قدیم چین کے عظیم فلسفی کنفیوشس سے
ایک رائل ریاست نے دریافت کیا تھا۔
”آقا! یہ بتاؤ کہ اجہی حکومت کی نشانی کیلئے؟“
کنفیوشس نے جواب دیا۔
”احزابِ حکومت کی کمی یا
مذرا نامر۔ اگلی ناصہ۔ کراچی

اقوالِ لعلمان،

ہندو جسد نہ کرنا محتاجی کا باعث ہوتا ہے اور
محتاجی دین کو تنگ، عقل کو خفیف اور مروت کو
ناائل کرتی ہے۔
فائزہ۔ گوہر

عقل و حکمت،

عقل و حکمت حاصل کرنے کے لیے فرزدی ہے۔
نظرِ بچی دکھنا سر
زبان کو بے عمل نہ کھولنا۔
لالا عقدا کھانا۔
سچ بولنا۔
جسد کو ہلکا کرنا
مہمان کی عزت کرنا۔
ہر دہی کی حمایت کرنا۔

اور
جس بات سے کوئی فائدہ نہ ہو اسے ترک کر دینا۔

- 1۔ جن شخصوں نے خواب نہیں دیکھا، اپنے ہی پاس سے
بنا کر بیان کر دیتا ہے۔ اس کا یہ جھوٹ بہت بڑا
گناہ ہے۔
- 2۔ جو خواب بیان کرنا اس لیے زیادہ بڑے کہ
اس کی کسی طرح تحقیق نہیں کی جاسکتی کہ اس
نے خواب دیکھا ہے یا نہیں۔
- 3۔ بعض افراد نے اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی اور اہم
شخصیت کے خواب میں نظر کرنے کا دعوا کرتے ہیں۔
عام لوگ اسے ان کی بزرگی کی علامت سمجھ کر محبت و
احترام کا اظہار شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اصل
شرف نیک اعمال کا انجام دینا ہے ورنہ کافر
اور منافق تو حقیقی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو دیکھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ کسی احتیاط
کے مستحق نہیں گردنے لگے۔
- 4۔ خواب کسی کے جائز یا ناجائز کا ثبوت نہیں۔
شرعی مسائل کے لیے شرعی دلائل فرزدی ہیں
کسی کا یہ دھوکا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فلاں کام کی اجازت دیا ہے۔ قابلِ قبول
نہیں۔

زبان،

اپنی زبان کو دوسروں کے جہول سے آلودہ نہ کرو
کیونکہ غیبِ ظہر بھی ہوا وہ زبان والے دوسرے لوگ

جارج ہر اتلا باقاعدگی سے اپنی دہری بھول کے ساتھ چرج مانتا تھا۔ لیکن آج عید کے کاٹل کی وجہ سے چرج کا نام نکل گیا۔

بہن تک لڑ کر ہادی چپ ہو گیا۔ ہال میں سب بہت غصہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ اس کے خاموش ہونے پر ایک ہندو بول اٹھا۔
"آپ نے ہمیں کیغور کر دیا ہے۔ جارج مسلمان ہے یا کرکٹ؟"

ہادی نے جواب دیا: جارج کرکٹ ہے۔ وہ اللہ کو نہیں مانتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لغو و بطلان

خدا کا بیٹا مانتا ہے۔

یہ سن کر ہال میں چھ بیگوناں شروع ہو گئیں۔ آخر ایک شخص کہنے لگا۔

"ہادی! وہ کرکٹ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر وہ کرکٹ ہو تو مسلمانوں کا تہوار اتنے جوش اور حیدت سے کیوں مناتا۔ عید کی تاریخ کا خیال رکھنا، پیسہ خرچ کر کے بھیر خریدنا، اسے اسلامی طریقے پر ذبح کرنا۔"

ہادی نے سن کر مسکرایا اور بولا۔

"میرے بھائی! آپ کو یہ کہانی اتنی ناقابل یقین نہ لگ رہی ہے، آپ کو یقین نہیں آتا کہ ایسی کرکٹ بھی

موجود ہو سکتی ہے؟ کیا کبھی ہم مسلمانوں میں سے کوئی عید اتر

کوئی خالد، کوئی خدیجہ، کوئی فاطمہ نہیں دیکھی جو کرکٹ کے

تہوار مناتے ہوں؟ اپنے مسلمان بھائیوں کو کرکٹ میں بہت

دیلنا، ڈالو، برقعہ ڈالنے وغیرہ مناتے نہیں دیکھا؟

اگر وہ سب حیران کن نہیں تو آپ کو یہ بات کیوں حیران

کر رہی ہے کہ غیر مسلم ہمارے تہوار منائیں؟

جارج کا کرکٹ ہر کرید منانا ہمیں عجیب لگ رہا

ہے لیکن تمام غیر اسلامی تہواروں میں بڑھ کر عید

میں تو کسی کرکٹ نہیں لگتا۔ بعد میں دس سال امریکہ

میں رہا۔ کبھی کسی یہودی یا عیسائی کو مسلمانوں کا تہوار

مناتے نہیں دیکھا۔ لیکن جب میں واپس اپنے مسلمان

عک آتا تو مسلمانوں کو ان کے تہوار بہت جوش و خروش

سے مناتے دیکھا۔"

ہال میں سب خاموش تھے۔ ہادی کی بات میں

ڈرا سوچے،
جارج کی عمر پچاس سال سے کچھ زیادہ ہے۔
وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ فاسٹنگ میں رہتا ہے۔
عید الاضحیٰ قریب آ رہی تھی۔ جارج اوداس کے

گھر ولے ٹی وی آرڈیو ایڈیو ایڈ انٹرنیٹ پر دیکھ رہے تھے کہ عید کی تاریخ کو تو کسی نے عید اسلامی عرب سائنس پر جبکہ کر رہے تھے۔ سب کو عید کا بے مبری سے انتہا آ رہا۔ جیسے ہی ڈی ایچ شروع ہوا۔ ان لوگوں نے عید کی تیاریاں شروع کر دیں۔ گھر کے قریب ایک فارم اڈس تھا۔ وہاں سے انہوں نے ایک بھیر خریدی۔ جس کے جنازہ میں تمام اسلامی اصولوں کو مد نظر رکھا۔ بھیر کو گاڑی میں رکھا اور گھر کی راہ لی۔

بچوں کا خوشی کے مارے کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ جارج کی بیوی بھی نے گھر جا کر اسی کو بتایا۔

"اس بھیر کے تین حصے کریں گے۔ ایک حصہ عزیزوں

میں بانٹ دیں گے۔ ایک حصہ اپنے ہمالیہ ڈیوڈ، لینزا

اور مارک کو بھیج دیں گے۔ باقی ایک حصہ اپنے لیے

رکھیں گے۔"

یہ تمام معلومات اسے اسلامی ویب سائٹس سے

ملی تھیں۔

کتنے دن کے اشتیاق کے بعد عید کا دن آ ہی گیا۔

بچے خوش خوشی صبح سویرے جاگے اور تیار ہو گئے۔ اب

بھیر کو ذبح کرنے کا مرحلہ آیا۔

انہیں نعل کی سمیت کہا تا نہیں تھا لیکن انڈیا

ملک کی طرف رخ کر کے جارج نے بھیر ذبح کر لی۔ یقینی

گوشت کو زمین حنوں میں تقسیم کر رہی تھی کہ اچانک جارج

کی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ وہ کبھی کی طرف منہ کر کے ہلایا۔

"ہم چرج کے لیے لیٹ ہو گئے۔ آج منہ ہے

اور میں چرج مانتا تھا؟"

ایک کڑوی سچائی تھی۔
ماٹھے، تحریم۔ گھر

امیر اسماعیل نے جواب دیا: میں نے اُس کے علم
کی وجہ سے اُس کی عزت کی ہے کیونکہ علم سب سے
بڑا ثمر ہے۔

اسی رات امیر اسماعیل نے خواب میں دیکھا کہ
پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

”میری امت کے ایک عالم کی تونے عزت کی اور
اُسے لینے کے لیے تو سات قدم اُس کے درجہ۔ میں اللہ تعالیٰ
سے درخواست کرتا ہوں کہ تیرا نام اور نسل زندہ رہے۔
اور تیرے بعد تیرے سات فرزند بادشاہی کو پہنچیں۔
تیرے بھائی کی نسل منقطع ہو جائے تاکہ اُس کی اولاد میں
سے کسی کو بادشاہی نصیب نہ ہو۔“
ماٹھے جس کراچی

قیامت اور معافی،

ایک مرتبہ امیر المومنین مامون نے احمد کو ولایت
سے معزول کر کے دوبار خلافت میں ماضی ہونے کا حکم
دیا۔ جب وہ ماضی ہوا تو مامون نے سخت سخت
کہنا شروع کیا۔ اور اُس نے جو خطائیں کی تھیں، ایک
ایک کر کے گنوانے لگا۔
جب تمام جرائم کی فہرست دہرا چکا تو احمد نے
پوچھا۔

”نیک قیامت کے دن امیر المومنین سے بھی اسی طرح
حساب لیا جائے گا اور ایک ایک جرم بتا کر جواب طلب
کیا جائے گا۔ اُس وقت امیر المومنین کس چیز کو پسند
فرمائیں گے؟“

مامون نے جواب دیا: مجھے معافی کا حکم پسند
ہے۔

احمد نے جواب دیا: تو میرے حق میں بھی معافی
ہی پسند فرمائیے۔

اُس پر مامون نے اُس کے تمام جرم معاف کر دیے۔
نہا، نفعہ۔ فیصل آباد



لفظ لولتے ہیں،

۱۔ جن لوگوں کے دلوں میں محبت کی کوئلیں بکیر کسی
میلے یا تمنا کے پھڑپھڑتے ہوئے ہیں انہیں بے رحم
کہتے ہیں۔

۲۔ دل کی بلیٹ پر کھنکھنے سے پہلے سوچ لیں کہ فتنہ
مٹانے نہیں چاہتے۔

۳۔ اہم بات یہ نہیں کہ آپ ہار گئے۔ اہم بات
یہ ہے کہ ہارنے کے بعد آپ ہمت تو ہیں
ہار گئے۔

(منتر حسین تابد)
قذیہ ٹریٹ۔ بکرات

آپ بھی نہیں،

۱۔ جنہیں عداوت میں مزدور ملے کیونکہ وہاں فیصلے
قذیہ نہیں ہوتے۔

۲۔ جرمیں سلامت ہوں تو تھوڑے تھوڑے دھڑکن پر بھی
موم جڑتے ہی پھول آجاتے ہیں۔

عیمرا نوشین۔ منڈی بہاؤالدین

عالموں کی عزت،

امیر اسماعیل بن احمد سلمانی، خراسان کا بادشاہ
تھا۔ اس کا سب سے بڑا بھائی امیر اسحاق بھی اس کے
درباروں میں شامل تھا۔

ایک دن بھائی کا کوئی عالم کسی ضرورت سے
امیر اسماعیل سے ملاقات کے لیے آیا۔ اس نے ادب
اور احترام کے طور پر سات قدم بڑھ کر اُس کا استقبال
کیا۔

امیر اسحاق کو یہ ناگوار گنا اور اُس نے اسماعیل
کو سمجھایا۔

اس قسم کی تعظیم بادشاہوں کے شاہان شان نہیں۔
بلکہ شخص کے حق پر تربت کی ایک حد ہوتی ہے اور
اس سے آگے بڑھنے کی نہیں ضرورت۔ مگر

مخالہ جیلانی

شعور پرورد

نہم نہد
لازم نہیں کہ اس کو بھی میرا خیال ہو
جو میرا حال ہے وہی اس کا بھی حال ہو

راہد اقبال
تو شاد دل کا کوئی ایسی نئی بات نہیں
تو نے دالے تیری خیر پریشان کیوں ہے

نہم نہد
حیات بیچ دیں تھوڑے سے پیار کے بدلے
یہ کاہد بلو بھی تیرے غلام کرتے ہیں
آمنہ عائشہ

بھول بھی جاؤ بیٹی باتیں
ان باتوں میں کیا رکھا ہے
چپ چپ کیوں رہتے ہر نامر
یہ کیا روگ لگا رکھا ہے

مہوش
تو بھی شیراب بھرے جہاں میں مل کر ہنس لگو
باہر ہے تو دیکھ لیا اب اندہ جا کر دیکھ

ماروی ہوش
دل کے سر کیل میں ہوتا ہے بہتہ ہلا کا زیل
عشق کو عشق سمجھ، مشغلہ دل نہ بنا

صوفیہ
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ خیمہ، وہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو

ماروی
میں بھی عرض تمنا کا ڈھب نہیں آتا
مزلج بار بھی مآدہ ہے کیا کیا جلتے

398

نمرہ اقرأ
آج ٹوٹ کر اس کی یاد آئی ترا حاس ہوا

آج تریا میں جودل میں بھلائے نہیں جاتے
شنا عبد التیرم
عہت کے سفر میں کوئی بھی راستہ نہیں دیتا

زہیں واقف نہیں بنتی فلک سایہ نہیں دیتا
خوشی اند دیکھ کے موسم کے اپنے اپنے ہوتے ہیں
کسی کو اپنے منہ کا کوئی لمحہ نہیں دیتا

فوال افضل گھن
کیا پوچھتے ہر میری زیست کی کتاب کا

سرفردق ہے لپٹا ہوا درد و غم میں
سکھتی فرمت ملے تو موجنا اے دوست
یہ سال بھی گزر گیا تیرے ہجر و فراق میں

نخبہ اکرم
چادر سو بھیلی تو مشبو کی حفاظت کرنا
اتنا آسان بھی نہیں تجھ سے محبت کرنا

عندنا ناصر، افعی ناصر
دیکھا مجھے تو ترک تعلق کے باوجود
وہ مسکرا دیا، یہ ہنر بھی اسی کا تھا

پاکیزہ انجمی
راقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

فریدہ لاکھو
خوش نہ تھا مجھ سے پھر کہ وہ بھی
اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو

صائمہ آصف
اسلام آباد
ہمیں خبر ہے ہوا کا مزاج رکھتے ہو
مگر یہ کیا کہ ذرا دیر کوڑے بھی نہیں

بہت شکریہ فرماتا ہے ہماری قاری بہن کے سوال کا جواب دیا۔ آپ کا جواب ہم عائد جمیل تک پہنچا رہے ہیں۔

سلاطین جزائروں سے کوثر خالہ کا ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔

میا علی کا نام اور زندگی کا "ماتا" پسند آیا۔ "توبہ و جدا امی" نا "کوٹ اسپنڈنگ رہا۔" "داف" "ہور لڑائی کرو گندے بچہ۔" "نعت و حمد میں تو" "خوب پھول" کی قبولیت سند ہے۔ "دین کی باتیں" "کلرے توبہ ہے ورنہ کچھ نہیں۔" اور "صدقے سے بڑھ کر تو کچھ نہیں ہے۔" "دیا آرزو کا" "سب نے میرے دل کی باتیں لکھ دیں" خاص کر عائشہ جمیل نے۔ تاریخ کے جھوٹے اور کتابوں پر تبصرہ اس کی انفرادیت کا ثبوت ہے اور معیار توبہ سے بلند ہے۔ اگر مجھے مصنفین ملیں تو بس ان کو سکتی رہوں گی۔ سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی تحریروں سے انہیں جان لیتی ہوں۔ بھی تو ناموں سے بھی پہچان لیتی ہوں کہ شخصیت پر نام کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ "بندھن" "تاجکھ دار" ہے اور ٹھیک پیغام دیا۔ "ایک تھی مثال" حسب توقع جاری ہے۔ "اٹلی ہو گئیں تدبیریں" دلچسپ و سبق آموز رہی۔ احساس ملکیت صرف اللہ کو سجتا ہے۔ "شانزہ کی ساس" تم میرے باقی سب تمہارا۔ انعامی کمائی میری عمر کی جمع پونجی بھی بس ایسی ہی عبارت ہے اور ہم بھی نظروں سے گزر رہے ہیں۔ "وہ اک لمحہ" ایک قطعوں سمندر بنانے میں کوشاں ہیں۔ "وہ اک لمحہ" ایک طویل اور ذہین داستان۔ تالیف جی اللہ نہ کرے کسی کی زندگی میں بدکردار کو آئے۔ ہم تو خوشبودار لمحوں سے بچھیل کی دعا مانگیں گے۔ ام طیفور کلیدی و نرجس کی خاص ملک۔ بہترین تحریر "بہترین گانا" چلو دلدار چلو چاند کے پار چلو ہم ہیں تیار چلو ذرا اس پر لکھیے نا۔ آج ہم اپنی دعاؤں کا اثر دیکھیں گے۔ میری بی بی نے ان کا "قصائی ہر جاتی" دوبار پڑھا تھا۔ اس کے پاس وقت نہیں پڑھنے کا۔ وہ میرے گھر کی مود ہے نا۔ مگر ہم اسے عورت بنانے کا چکر چلا رہے ہیں۔ اللہ کرے جلد۔ جمہوری نند مسازاجی ہاں یقیناً "خدا کے سوا کسی سے مدد نہیں مانگنی چاہیے۔" نند تو دور کی بات سگی ماں سے بھی ہم مدد نہیں مانگتے "اللہ ہے نا۔" "تعوذ حب" دل نکال کر لے گیا۔ اہمل رضا کا تمام پڑھ کر ہی دل نے گواہی دے دی تھی کہ زبردست ہوگی اور



خط بھجوانے کے لیے ہمارا شمارہ شعاا - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Emails: info@shuaatradingpost.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی غایت اور خوشیوں کے لیے دعا ہے۔
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ دامن میں رکھے اور پاکستان کا برا بھلا بننے والوں کو ان کے ارادوں میں ناکام بن سکے چوں کہ بے غلب اور ان کو دنیا میں بدترین انجام سے دوچار کرے۔ (آمین)
پچھلے ماہ سالگرہ گھر میں سوئے "ایک دیا آرزو کا" دیا گیا تھا۔ جس میں قارئین کے وہ سوالات شائع کیے گئے تھے جو وہ مصنفین سے کرنا چاہتی ہیں۔
بہن عائشہ جمیل نے فرح بخاری سواہل کیا تھا کہ عازم حیدر حقی کو دار ہے یا فرضی؟
بہن فرح بخاری نے اس کا مہج کے ذریعے جواب دیا ہے۔ جواب ہے کہ "عازم کا کردار یوں تو فرضی ہے لیکن اسے آپ کچھ حقیقی کرداروں کا مجموعہ کہہ سکتی ہیں۔"

MONTHLY SHUAATRADINGPOST.COM

تجربوں اور "چاند کے پار چلو" بہت سبق آموز غزلیں تھیں۔ نایاب جیلانی کا "آک لکھ" بھی بس ٹھیک رہی۔ اگست کا مہینہ تھا اور ساجدہ حبیب کی آزادی کے حوالے سے کوئی تحریر دیکھنے کو نہیں ملی۔

ج - پیاری شام! بڑے عرصے بعد ہمارا ساجدہ حبیب سے رابطہ ہوا ہے ہم نے ان تک قارئین کی فرمائشیں پہنچا دی ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد شعل اور خواجین کے لیے لکھیں گی۔

"شعل کی پسندیدگی کے لیے = دل سے شکر ہے۔"

ایم اسرار نے مروان سے لکھا ہے

شعل جیسے ذاتِ جست نے "حیر کال: جنت کے پتے" اور "یارم" جیسے شاہکار ناول ہمیں دیے۔ کافی سیالاب سے زیرِ مطالعہ ہے شعل "مگر یہ خط خاص طور پر رقصِ بک کے لیے لکھ رہی ہوں۔ شعل کے تیس سالہ سفر میں اس جیسا ناول کبھی شائع نہیں ہوا۔ (معذرت کے ساتھ) کمالی آگے بڑھنے کا نام نہیں لے رہی اور اوپر سے ہر دو ماہ بعد غائب۔ تیس دن بہت ہوتے ہیں پانچ صفحات لکھنے کو مگر یوں لگتا ہے نیلے پتے نجد حار میں پھنس گئی ہیں۔ ان کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیا لکھیں۔ خدا را کہ تو سوچیں شعل کے معیار کو اتانت گرا نہیں۔ "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم بہت خوب صورتی سے کمالی کی گریں کھول رہی ہیں۔ بخور عرفِ ڈیڑی ہی حالہ کیا ہیں۔ نایاب جیلانی عرصے بعد آئیں اور خوب لکھا مگر اتنی شدت کیوں ہوئی ہے نایاب کے گداڑوں میں۔

ج - پیاری امین! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ شعل کے ناول آپ کو پسند نہیں آ رہے ہیں۔ ہمیں خود احساس ہے کہ رقصِ بک کے صفحات بہت کم ہوتے ہیں اور کمالی آگے نہیں بڑھ پا رہی ہے۔ نیلے بہت اچھی مہنت ہیں مگر اس وقت پریشان کن حالات کا شکار ہیں۔ اس کے باعث

لکھ نہیں پا رہی ہیں۔ آپ دعا کریں کہ ان کی پریشانی دور ہو جائے تاکہ وہ بیکوسی سے لکھ سکیں۔

انص مریحہ مغلانی مسعود مریحہ مغلانی۔ کاسی اسٹریٹ کوئٹہ سے شریکِ محفل ہیں لکھا ہے

اگست کے شمارے سے شعل ایک نیا سلسلہ شروع کر چکا ہے۔ "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میری ناقص رائے

جس سے باقی قاری بہنوں کا منتظر ہوا ضروری نہیں کہ یہ کہ اس سلسلے میں بہت سے ایسے سوالات ہیں جو کہ کسی بھی شادی شدہ قاری بہن کی پرائیویٹ لائف اور پرائیویسی کو بڑی بری طرح سے ڈسٹرب کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے کے جوابات کو ہی لے لیجئے میا علی کے ان جوابات کی روشنی میں اگر کچھ کہا جائے تو میں کہہ سکتی ہوں کہ اس قسم کے جوابات بڑھ لینے کے بعد میا علی کی خوب درگت بنی ہوگی۔ اچھے یا برے ذاتی زندگی کے تجربات کو کسی ایسے رسالے کی زینت بنانا جس کی پہنچ محدود رہے ہو انتہائی غلط بات ہے۔ لہذا اس سلسلے کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہیے۔ باقی قارئین اپنی آراء سے ضرور آگاہ کریں اور میا علی بھی کہ آیا ان کے جوابات کی اشاعت کے بعد ان کے ساتھ کیا کچھ ہوا۔ اب آئیے تبصرے کی جانب شعل اس ماہ بھی سو سو رہا۔ نایاب جیلانی کو مبارکباد! اچھا ناول تھا۔ نیمہ ناز اور سعدیہ عزیز آفریدی "صبا حمران" تمام راسخز کی ماؤں کے لیے ذخیرہ ساری دعائے مغفرت کرتی ہوں! افسانے سارے اچھے تھے۔

ج - پیاری انص اور اسوہ قارئین کی زندگی کے اچھے یا برے تجربات سامنے لانے کا مقصد یہ ہے کہ سسرال والوں کو احساس دلایا جائے کہ ایک لڑکی اپنے گھر کے ماحول سے نکل کر بالکل مختلف ماحول میں آتی ہے تو سسرال والوں کے رویوں سے اس پر کیا گزرتی ہے۔ والدین کو بھی یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ اپنے بچے کے گھڑوں کو فیروں کے حوالے کرتے ہوئے اچھی طرح دیکھ بھال کے اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔

جہاں تک درگت بننے کا تعلق ہے تو ضروری نہیں ہے کہ اپنا اصلی نام لکھا جائے۔ قارئین اس سلسلے کے لیے فرضی نام بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

قارئین کی اس سلسلے میں گیارہ آئے ہیں۔ آیا یہ سلسلہ جاری رکھا جائے یا بند کر دیا جائے یہ فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑ رہے ہیں۔

شعل آپ کو پسند نہیں آیا۔ معذرت خواہ ہیں۔ مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

اقرا اشتیاق نے طورِ جہلم سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اللہ کا شکر ہے اس بار شعل دو تاج کو ہی مل گیا، لیکن

یہ کون سی رائے تھی یا قارئین میں سے تھی۔ خط آپ کے میں قارئین ہمیں بہت سی عمدہ خطوط لکھتی ہیں۔ انٹرویو سب کے اچھے تھے۔ اشعار بالکل بھی پسند نہیں آئے۔

ج۔ پیاری حیر! اشعار کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکر ہے۔ میا علی ہماری ایک قاری ہیں لیکن ان کی تحریر کی روانی دیکھ کر ہم نے بھی انہیں افسانے لکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ بہت اچھے افسانے لکھ سکتی ہیں۔

علاج یوسف نے کراچی سے لکھا ہے

آج کا خط لکھنے کی خاص وجہ ”جب تمھ سے ناتا جوڑا ہے“ اسود کیوں شروع کروا یہ سلسلہ۔ 100 میں 99.9 پر سینٹ شادی شدہ آپس کے ٹکے کو چھڑ کر رکھ دیے آپ نے۔ ام الگ ہوں گے مگر احساسات سب کے ایک سے ہوں گے کس کس کے زخموں پر مرہم رکھیں گی آپ۔ آئی آج T-20 فتح دیکھتے ہوئے ایک بات ذہن میں آئی تو سوچا آپ سے اور اپنی بہنوں سے ڈسکس کرتی ہوں کہ وہ اس بارے میں کیا کہتی ہیں اور پلیز اسے ایڈٹ نہ کیجئے گا بھلے ایڈٹ قسم کا لگے آپ کو۔ ایک شادی شدہ لڑکی عورت اور اس کا سسرال بھی کرکٹ گراؤنڈ میں ہونے والے بیچ کی طرح ہیں۔ ایک طرف وہ عورت اور دوسری طرف سسرال ’وہی مخالف ٹیم‘ وہی امپائر وہی قہرؤ امپائر حتیٰ کہ تماشائی بھی وہ۔ بے چاری عورت تھارکٹ کو بچانے کی تنگ دود میں رہتی ہے۔ (مصحح الحق کی طرح) اور کبھی تو یوں ہی عمر بیت جاتی ہے اور کبھی بلکہ نراناہ تراسی باڈل کے ہاتھوں اس کی ساری رکنیں اڑ جاتی ہیں جو اتفاق سے اس کے مجازی خدا کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ پوئیسرر بلوئیسرارتے رہتے ہیں اور بالآخر ایک نئے قریشی گھلاڑی کو (دوسری بیوی) وگٹ کے سامنے ٹاکر کر کے ہیں اور وہ پہلا گھلاڑی ٹاکام اپنی کوششوں پر آنسو بہاتا پوئیسرر لوٹ جاتا ہے۔ (یہ پوئیسرر کسی تو ماں باپ کا گھر ہوتا ہے اور کبھی ابدی گھر آف۔ کیا خیال ہے؟ پلیز ضرور بتائیے گا ایسا ہی ہے؟ میں اپنی دوستوں کی رائے بھی جانتا چاہتی ہوں اور ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ نہیں پوچھوں گی کیونکہ اس کا جواب آپ سمیت کسی کے پاس نہیں

خواتین نہیں ملا۔ سہوق تو بہت خوب صورت ہے۔ میک اپ بھی اچھا ہے اور مندی تو کمال ہے۔ نازلی کا احساس ہوتا ہے۔ ”سیاہ حاشیہ“ اور ”تعویذ حب“ کی تعریف کے لیے الفاظ بھی کم پڑ گئے ہیں۔ ٹایپ جیلانی کا نام ہی بتاتا ہے کہ ناول کمال کا ہو گا۔ نیا سلسلہ ”جب تمھ سے ناتا“ اچھا ہے۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کو سیکھنے کا موقع ملے گا۔ توبہ وجد الیٰ نا! سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تارخ کے جھوکے میرا سب سے پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آپ کے تمام پرجوں سے اسلامی معلومات اور اچھی باتیں میں نہ صرف نوٹ کرتی ہوں بلکہ عمل کرنے کی بھی کوشش کرتی ہوں۔ آپ کے پرجوں سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ پلیز شاہین رشید سے میری درخواست ہے کہ وہ مشہور صحافی اور اینکرو سیمپلڈی کا انٹرویو کریں۔

ج۔ پیاری اقرا! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ہمارے جنوں پرجوں کی باتقہہ قاری ہیں۔ اشعار کی پسندیدگی کے لیے شکر ہے۔ مغلطہ معتنین تنگ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

حیر! نوشین نے مندی بلوئیسرر سے لکھا ہے

ایک ماہ کے طویل اور مبرآنا انتظار کے بعد اشعار مل جانے کی خوشی دیدنی تھی اور اس خوشی میں میرا ساتھ دینے کے لیے لادہ اہل لیل کر نیچے فرش پر خوب لوٹنیاں لگا رہا تھا۔ ساتھ ہی دوسرے چوہے پر چڑھا کوشت کا ساں اپنے سے میری بے توجہی برداشت نہ کر سکا اور وہ جل کر کباب ہو گیا۔ سیاں اور بچے پس منکر میں چلے گئے اور میں ”سیاہ حاشیہ“ میں غوطہ زن ہو گئی۔ اہمل رضا کے ناول سے زیادہ مجھے ناول کا نام پسند ہے۔ میں اس کو درمیان درمیان سے پڑھتی ہوں اور اہمل کی منظر نگاری کی دل سے قائل ہو جاتی ہوں۔ ام طبخو کی تحریر شروع میں مزاح کا عنصر لیے ہوئے تھی اور اینڈر بنار۔ لیے ایک سبق بھی تھا۔ ”بھولتی مند“ پڑھ کر ہائیک کی چلا کی پر بے حد غصہ آیا اتنی

اچھی بھابی کو اتنا عرصہ بریشان کیے رکھا۔ ایسے مندوں کو تو سبق ملنا چاہیے۔ قرۃ العین خرم ہاشمی کی کہانی کے اینڈر پر عامر اور ثانیہ کے جملے پسندیدگی کی شد حاصل کر گئے تھے سلسلے میں میا علی کی ازدواجی زندگی کے رازوں سے واقفیت ہونے پر ان کے لیے دل سے دھجوں دعائیں نکلیں۔ دیے

ج۔ پیاری مومن کہتے ہیں جب کوئی عازد ہوتا ہے تو صرف ایک طرف کی کمانی تن کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک طرف کی کمانی کڑے سے نیچی ہوتی ہے اگر نہیں سو کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو کہیں ماس نمنوں کے ساتھ بھی برا ہوتا ہے کیا آپ نے ان ماؤں کو نہیں دیکھا جن کے بچے شادی کے بعد بوی اور ماں کے جھگڑوں سے تنگ آکر ماں کو گھر سے نکل دیتے ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ ہمارے ہاں زیادہ تر بھوکے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ لیکن سو فیصد والی بات بالکل غلط ہے۔

نئی ابھرتی یا اصلاح متصفہ قرہ چاک جن سے شریک محفل ہیں شکلا ہے

خوب صورت ماہ اکت کے انتہائی حسین بائٹل سے لطف اندوز ہو کر فرست تک پہنچے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں حرف حرف سننے میں آنا کر "ایک دیا آؤد کا" میں ہر قسم کی رائے پر وہ گرم تو جیسے نہ شریک ہو کر بھی شریک رہے وجہ ہر دست کے ہر دانشور سے سوالات وی تھے تو خود ہمارے دل میں بھی تھے "بند من" کا سلسلہ بند ہے مگر شاہ سے الگ ہوئے کی بنا پر اس ماہ گول کر گئے۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" انتہائی یونیک آئیڈیا جس کسی کے بھی دماغ میں تیا گملاں کا ہے سوالات جتنے متفرق اور مزے کے تھے میاہ علی کے جوابات بھی انتہائی برکت اور رواں لک۔ الحمد للہ ہم اس سلسلے میں اپنے 15 سالہ تجربے کی بنا پر شرکت کرنے لائق ہیں اگر اجازت میرا ہو تو سلسلے دار بنو کر میں "ایک نئی مثال" سے ہمیں لاکھ شکایات سی مگر خسانہ نگار کی تحریر پڑھے یا ہم آگے بڑھ نہیں سکتے۔

"تعوذ حب" کی تینوں اقسام نکال کر کے مطالعہ کریں۔ لاندلن تحریر ایک ایک نقطہ صوفی جزا ہوا ایسی تحریر بڑھ کر ہم خود کو طفل کتب کھلانے لائق بھی نہیں پاتے۔ ایمل رضا کہیں لیں تو "تعوذ حب" ہم بھی ان کے گلے میں ڈالیں۔

"سیاہ حشر" میں بارش کی نظم اور سطر نگاری نے لطف دیا۔ پاک جن میں بارش بیش بزمی کے رکھی ہے سوچنے والوں کی طرح انھوں سے برفوں کا مزہ لیتے رہے۔

اس ماہ تین اسٹوریز میں شانزے نام استہلال ہوا۔ "شانزے کی ماس" شمس فیصل کی مختصر اور جامع تحریر اگرچہ میری ماس میری سبکی فلم کی یاد آگئی مگر اچھی بات جتنی بار دہرائی جائے کم ہے "انٹی مدحیں" ایک اور شانزے کا کامیاب پلان "قلبی اسٹوری" بھی یقیناً "کسی نہ کسی گھر میں ایسا ہوتا ہو گا" گرم کی بارش "قرۃ العین خرم باغی کے بارے میں بتادیں کہ یہ ایک ہی نام ہے کہ دو الگ الگ کیونکہ قرۃ العین اور خرم باغی کے درمیان کومر ہے۔ عجیب سا لگا۔

"کھل ناول" کا آخر میں سکون سے مطالعہ کیا نایاب

جیلانی کا نام تو فرست میں دیکھ کر ہی بلوں اچھل پڑے۔ میری بے حد لیورٹ رائٹر یا میر عالم کے بعد تو ہم ان کے دیوانے ہی ہو گئے ہیں۔ شعاع میں گزشتہ کچھ عرصے سے اسٹوریز کے موضوعات اور اسلوب میں بہت فرق آیا ہے ایسے میں فیہر ناز اور نایاب جیلانی کے روایتی انداز تحریر اور موضوع نے خوشگواریت کا احساس فراہم کیا ہے۔ اعلیٰ بات یہ کہ نایاب جی کی تحریر میں کوئی کردار بھی فرشتہ یا دیوتا نہیں تھا عام انسان تھے جس کی خوبیاں اور خامیاں سب تحریر میں نظر آئیں۔ فیہر ناز جی کی تحریر "اپنے مارے رنگوں سمیت ہمارے دل میں اتر گئی۔" اس ماہ کی مسکراہٹیں "میں" بے قصور "بہت یونیک اور" معنی خیز انتخاب تھا۔ "باتوں سے خوشبو آئے" "میں صدقے کی برکت" نے دماغ کی گریں کھول دیں۔

"خط آپ کے" میں اس بار خطوط کی تہہ ابرکم کی اور جو شامل تھے انہیں کافی کات چھانٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ صاف لگ رہا تھا۔ مسرت لطاف کے بارے میں پہلی بار جانا کہ ان میو ہیں۔ ان کے خطوط کافی سورتا ہر کرتے تھے (سورتے ہماری مراد ایجنڈ بھی)۔

میرا ایس کے حسین کی بات سے ہم اتفاق نہیں کرتے اندین پاکستانیوں سے زیادہ محب وطن نہیں وہاں ہندوستان سے محبت بھی پاکستان سے نفرت جمانے کے لیے کی جاتی ہے وہاں کے قلمی کوجوں کی معلومات ہمیں بھی ہیں مگر ارا مختلف رائے ہے آپ سے بہر مل اپنی اپنی آبرورہن

اس سال اللہ نے دو خوشیوں سے نوازا ایک مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں احکاف کی سعادت نصیب فرمائی

اور دوسرے خواتین ڈانچٹ اور شعاع کا دلی ماحصل
پایا۔

پیاری فریدہ سب سے پہلے عمرت کی مبارک باد۔ مسجد
نبوی میں انکاف بہت بڑی سعادت ہے کہ اللہ تعالیٰ قبولت
عطا فرمائے۔ اپنی دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیے گا۔ فریدہ
آپ جتنا چاہا لکھتی ہیں یا بیورو بھی اتنا ہی عمدہ ہے۔ بہت
جامع اور خوب صورت الفاظ ہر تحریر اور سلسلے پر نظر۔
بلاشبہ ایک اچھا معتمد اچھا قاری بھی ہوتا ہے۔

اب تک آپ نے مختصر تحریریں لکھی ہیں۔ باقاعدہ
کمانی کا پلاٹ ترتیب دے کر ٹول یا ڈانچٹ لکھیں۔ اور
سلسلہ میں لکھنے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ ضرور

لکھیں ہم آپ کے پندرہ سالہ تجربے سے مستفید ہونے کے
خاطر ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہارے ممنون ہیں آپ
لوگوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ شعاع اس وقت بہتوں کا
پسندیدہ ترین پرچہ ہے۔

کراچی سے شبنم اکرم لکھتی ہیں

ساگرہ کا سروے "ایک دیا آرزو کا" جو قارئین کے
بہترین جوابات پر مشتمل ہے بہت پسند آیا۔ اس میں اپنے
شریک نہ ہونے کا دل میں رنج ہوا۔ نیا مستقل سلسلہ "جب
تجھ سے نا آجوزا ہے" مباحثی کے حقیقت سے قریب تر
جوابات میں کو بھائے واقعی شادی شدہ زندگی "اک آگ
کا دریا ہے اور تیر کر جاتا ہے" کے مصداق ہوتی ہے جبکہ
اچھی بیٹیاں اپنے والدین کی تربیت پر حرف نہیں کھینچتے
دیتیں۔ یہ سلسلہ بہت خوب ہے مگر جن کے سسرال میں
بھی شعاع پڑھا جاتا ہو۔ (سیری طرح) وہ قارئین کیا
کریں؟ کیونکہ اس طرح اپنے بچات اور آپ جی نوک
قلم لانے میں سسرال والوں کی ناراضی کا بھی خدشہ ہے۔ نا۔
پھر آئینہ دکھانا کون پسند کرے گی۔ "ایک بھی مثل"
مثلاً ذاتی کو ملتے پھرتے ہوئی۔ افسانے اس بار سب
بہترین لکے مکمل ٹول "وہ ایک لمحہ" نایاب جیلانی کالی
عرصہ بعد جلوہ افروز ہو جس۔ فرحت بی اور وکیل صاحب
کی نوک جو ہم دیکھ گئی اور اس بلی پھلکی مزاحیہ تحریر
سے کچھ تو نیشن ریمیز ہو گئی ہے۔ اس طرح کی
دیکھ کر میں پیراہ شال ہوتی جا نہیں۔

محل ٹائل "تغیرِ حب" (ایمل رضا) کی قارئین میں
دعوم مچی ہوئی ہے مگر اب تک میں ایک قسط بھی نہ پڑھ
پائی۔ اس ٹائل میں کرداروں کے مشکل مشکل نام سب اس کا
فلسفہ زبان بیان انداز تحریر سب کچھ میری عقل و فہم سے
اوپر کی چیزیں ہیں لہذا بہت قسطی توجہ اور دھیان کی محتاج
ہے یہ تحریر۔ اور مجھے وقت فرصت ملے تو کچھ بات بنے۔

سب سے زیادہ مجھے نجر ناز کا ٹائل "رنگ اور خوشبو"
پسند آیا۔ کمانی پلاٹ اور کردار سب جاندار تھے۔

صائمہ اکرم چوہدری میری پسندیدہ رائٹرز ہیں اور "سیاہ
حاشیہ" ٹائل قسط سے ہی دل میں گھر کر گئی ہے۔ عبداللہ اگر
زندہ ہے تو میرے کو مل جائے ورنہ یہ لڑکی تو شگیتر کی نہ ملنے کا
بدلہ ہر ایک سے لے گی۔ اس قدر باقی لڑکی ہے مرنے کے
خدا کی پناہ۔

"توبہ و جدائی نا" آمنہ مفتی کا کیا یہ سفر نامہ ہے؟
ایلیویرا کا ہوا تک سے گھر میں لگا ہوا ہے مگر ایلیویرا کے
فائدے شعاع کے توسط سے معلوم ہوئے۔ آپ کا بہت
بہت شکریہ۔

ج۔ نیپار کی شبنم اکرم کوثر خالد اس راہ شال ہیں۔ یہ بتائیں
کلیں مانتے ہیں۔ بہت سی قارئین کے ساتھ ساتھ ہم
نے بھی آپ کی کی شدت سے محسوس کی۔ یقین کریں کہ
آپ کے خط نہ لکھنے سے ہمیں تشویش لاحق ہو گئی تھی اور
ہم دعا کر رہے تھے کہ آپ خیریت سے ہوں۔ آئندہ خط
میں اپنا فون نمبر ضرور لکھیں تاکہ ہم آپ سے رابطہ
کر سکیں۔

جب "تجھ سے نا آجوزا ہے" یہ نیا سلسلہ ہم نے ایک
خاص مقصد کے تحت شروع کیا ہے۔ وہ لوگ جو بہت چاڑ
سے ایک لڑکی کو سو بیوی بنا کر گھر میں لاتے ہیں لیکن اسے
وہ عزت اور مقام نہیں دیتے جس کی وہ مستحق ہے۔ ہم ان
تک یہ احساسات پہنچانا چاہتے ہیں کہ ایک لڑکی جب سب
کچھ چھوڑ کر ایک نئے گھر میں قدم رکھتی ہے تو اسے ان
مددوں سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں ہم اصل نام شائع نہیں کریں گے۔ فرضی
نام دیں گے۔ آپ بھی اس میں شرکت کر کے قارئین
تک اسے تجربات پہنچائیں۔ اپنا اصلی نام نہ لکھیں کوئی بھی
فرضی نام لکھ سکتی ہیں۔

"توبہ و جدائی نا" آمنہ مفتی کا سفر نامہ ہے۔

صائسہ اکرم کے باہل میں عدتہ باقی نہیں ہے لیکن اس کی ماں کی سخت گیر طبیعت نے اس میں خیر پیدا کر دیا ہے۔

مرتبہ الطائفہ احمدی نے کراچی سے شرکت کی

اس بار شعاع کا نام نعل بہت ہی متاثر کن اور دل کو چھو لینے والا تھا سب سے زیادہ مندی نے ہمیں کھائل ہی کر دیا البتہ سالگرہ نمبر کے حوالے سے اگست کا شمارہ کچھ اور بہتر ہو سکتا تھا افسانوں کی بھر مار تھی اور مکمل ہائر قابل تعریف ضرور تھے لیکن انٹر سٹنگ اور انٹر کنسٹیو نہیں تھے ڈپر رنگ تلخ حقیقت پر مبنی اسٹوری تھی۔ ”سیا ماشیہ“ میں شہزے کا کردار میرا مومٹ فیورٹ لکچر اور بہت ہی انٹر کنسٹیو بھی اور یہ اور اور صم کا کردار ایک آنکھ نہیں بھانڈ۔ ”وہ ایک لمحہ“ اسٹوری بہت ہی اسٹونگ اور حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی تیمور اور فرحت مائی کی تو قومیں میں اور ان کے ڈائیلاگز بہت ہی دلچسپ تھے۔ ”مرنگ اور خوشبو“ نیچے ناز نے اپنی سے جڑے رشتوں کی تلخ حقیقتوں اور مظاہروں کو عیاں کیا۔ افسانوں میں حنا مبین کا ”الٹی تدبیریں“ بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ ذہیر آبی مزے کی بات بتاؤں میں اور صائمہ جڑواں سسز ہیں ہمارے عادات و اطوار ایک دوسرے سے نوکلی ڈفرنٹ ہیں۔ بہنوں میں رواجی نوک جھونک بھی ہوتی ہے لیکن ایک دوسرے کی چیزوں کے لیے کبھی بھی کھینچا مائی نہیں ہوتی۔

پیارے سرستہ ہمیں افسوس ہے کہ سالگرہ نمبر آپ کی پسند کے معیار پر پورا نہیں اتر سکا جبکہ سالگرہ نمبر میں وہ مصنفین شامل نہیں جو ہماری قارئین کے پسندیدہ ہیں۔
 نفیرہ ناز، نایاب بیگانی، صائبہ اکرم، حنا یا سمین، ام طہر اور قرۃ العین خرم ہاشمی قارئین کی پسندیدہ مصنفین ہیں وہ نام البتہ نئے تھے مناز یوسف اور ٹینہ لیصل۔ نئے سلسلے کو بھی ہماری قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔ آپ کے پیارے بھانجے لیصل کو سالگرہ کی مبارکباد اور دعاؤں میں۔ قاتمبر کا دن پاکستان کی تاریخ میں بھی یادگار دن ہے۔

آسیہ ارم کراچی سے لکھتی ہیں

میں شعاع کی 30 سال برائی قاری ہوں۔ عمر میری 38 سال ہے۔ بچپن سے ہی شعاع کا چسکا لگا ہوا ہے اس ماہ میرے دوست کی سالگرہ ہے۔ اسی لیے اپنی ناراضی کو لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔

”سیاہ حاشیہ“ نامیہ انکرم چوہدری کا یہ ناول مجھے بہت پسند ہے اس لیے اسے ہی پڑھا ہے ابھی تک۔
پاری آسیہ معذرت خواہ ہیں۔ آپ کے پچھلے خطوط شامل نہ ہو سکے۔ آپ شعاع کی ابتدا سے قاری ہیں۔
آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ لکھیں۔

قارئین متوجہ ہوں!

- 1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام مصلے ایک عورت نے میں بھجوائے
ہاں تھے ہیں، تمام برسلے کے لیے ایک کاغذ استعمال کریں۔
2- افسانے، ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے
ہیں۔
3- ایک سطر چھوڑ کر غرضی خط لکھیں اور مصلے کی پشت پر دہشتی سٹکی
دوسری طرف برگزدہ لکھیں۔
4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر پانچ
کھلے ہائڈرکس اور نوٹا خبر ضرور لکھیں۔
5- سدا کے ایک کاپی اپنے اس ضرور لکھیں، ناقابل اشاعت
کی صورت میں تحریر واپس مگن نہیں ہوگی۔
6- تحریر روانہ کرنے کے بعد، بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی
کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، غلاطیسوں کے لیے
انتخاب، اشعار وغیرہ اور ناولیہ پتے پر رجسٹری کروائیگی۔

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

[illegible]

شاہین رشید

میں کئی رہوں گی ان شاء اللہ !
”ان شاء اللہ۔۔۔ کسی نے بتایا کہ آپ اپنی لائف
ہسٹری لکھنا چاہتی ہیں؟“
”جی میں اپنے سوانح عمری لکھنا چاہتی ہوں اور
میری سوانح عمری کی خاص بات یہ ہوگی کہ اس میں میں
اپنی دو ہجرتوں کے بارے میں لکھوں گی۔“
”دو ہجرتیں؟ کیا مطلب؟“

”جی میں نے دو ہجرتیں کی ہیں اور اس کے بارے
میں بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں تو کوئی کو بہت کچھ بتانا
چاہتی ہوں۔ پہلی ہجرت میں نے ڈھاکہ سے کراچی کی
اور دوسری ہجرت کراچی سے امریکہ کی۔“
”دو ہجرتوں کی کوئی خاص وجہ؟“

”پہلی ہجرت کی تو کوئی خاص وجہ نہیں تھی بس
پاکستان سے محبت تھی اس لیے کی اور دوسری ہجرت
غجوری کے تحت کی کیونکہ یہاں پاکستان میں وہ کمر
اپنے بچوں کی کفالت ٹھیک طرح سے نہیں کر پارہی
تھی میرے مالی حالات بہت اچھے نہیں تھے چنانچہ
امریکہ جانا پڑا اور شکر ہے کہ وہاں جا کر بہت حد تک
حالات بہتر ہو گئے۔“

”بہت کم عمری سے آپ اس فیلڈ میں ہیں۔ آواز
کی چاشنی ابھی تک برقرار ہے۔ کس طرح حفاظت
کرتی ہیں؟“

”میں نوسال کی عمر سے اس فیلڈ سے وابستہ ہوں
اور نہ صرف اپنی آواز کی بلکہ اپنی صحت کی بھی بہت
حفاظت کرتی ہوں۔ بقی اللہ پہ چھوڑ دیتی ہوں مگر اپنی
صحت کی دعا میں بہت مانگتی ہوں کھانے پینے کے
معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں ایسی چیزوں
سے پرہیز کرتی ہوں جس سے گلا خراب ہونے کا ڈر ہو،



منی بیگم

منی بیگم سے پہلی ملاقات ان کے گھر پر ہوئی تھی۔
اس کے بعد پہلے ہوائے ہوتی رہی۔ پھر یہ امریکہ شفٹ
ہو گئیں۔ ان کا آنا جانا لگا رہا۔ مگر ہماری ملاقات نہیں
ہوئی۔ کچھ دنوں پہلے ایک محفل میں ان سے
ملاقات ہوئی تو کچھ باتیں ہوئیں۔

”جی کیسی ہیں آپ؟“

”الحمد للہ۔ بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی آپ
سے۔“

”بس لائق ہے۔ اتنے برس بیت گئے آپ کے
گلے کا سر اشاء اللہ برقرار ہے؟ کیا راز ہے؟“

”قتبہ۔“ راز کچھ بھی نہیں تو کوئی کی محبت نے
میرے گلے کے سڑ کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ جب تک
لوگ پسند کرتے رہیں گے۔ دعائیں دیتے رہیں گے،

بائی نندہ حفاظت کرنے والا ہے۔"

"منی بیگم۔ سب سے یونیک نام۔ مکر اصل نام
نادر بیگم تھا۔ شخصیت یہ کوئی اثر پڑا؟"

"جب منی بیگم نام رکھا گیا تب واقعی یہ نام مجھ پر
سوٹ کرنا تھا اور نادر بیگم میری شخصیت کے حساب
سے ایک بڑا نام تھا۔ اب نادر سوٹ کرتا ہے منی
نہیں مگر شہرت اور میری پہچان بن گیا ہے یہ نام تو
شخصیت یہ ہی اثر پڑا کہ اس نام کو میں اپنے لیے منی نام
سمجھتی ہوں کہ اس نام سے میں مشہور ہوئی۔"

"منی بیگم نام رکھا کس نے تھا؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں پانچویں کلاس کی
طالبہ تھی تو میری کلاس میں شیخ نجیب الرحمن کا بیٹا مکمل
بھی تھا اور ہماری بڑی اچھی دوستی بھی تھی اسے بھی
گلانے کا شوق تھا اور مجھے بھی تو اکثر اوقات ہم دونوں
مل کر گایا کرتے تھے۔ ایک دن ہمارے پرنسپل نے
ہمیں گلانے دیکھا تو کہا کہ آپ تو بہت اچھا گاتی ہیں۔ کیا
نام ہے آپ کا؟ ہم نے بتایا کہ نادر بیگم تو کہنے لگے کہ
اتنی سی بچی کا اتنا بڑا نام۔ آپ کا نام تو منی ہونا چاہیے
بس پھر اس کے بعد تو جیسے یہ نام سب کی زبانوں پر
چڑھ گیا۔"

"ہوں۔ اچھا۔ آپ تقریباً پندرہ سولہ سال
قبل امریکہ چلی گئی تھیں۔ آنا جانا تو لگائی رہتا ہو گا۔
کچھ تبدیلیاں آپ پاکستان میں؟"

"میں جب آئی گراچی میں ہی تکی اس بار پٹنڈی اور
اسلام آباد اور پھر لاہور جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ تو لاہور
میں مجھے زبان ترقی نظر آئی کہ نئی سڑکیں بنی ہیں۔ نئے
پل۔ میٹرو بس اور بھی بہت کچھ۔ تو اچھا لگا اپنے
ملک میں ترقی دیکھ کر۔ مگر ترقی پورے ملک میں ہونی
چاہیے۔"

"آج کل تو کوئی سنگر تھوڑی سی بھی شہرت حاصل
کرتا ہے تو انڈیا اور جاتا ہے یا پھر وہاں سے آنرز آجاتی
ہیں۔ آپ کی توازن میں تو جلد ہے آپ انڈیا نہیں
گئیں؟"

"یہ بہت اچھا سوال کیا آپ نے مجھے یاد ہے کہ
جنرل ضیاء الحق کے دور میں میں نے ایک بار انڈیا میں
اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا اور مجھے پذیرائی بھی بہت ملی
تھی مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ہمارے ملک میں
باندی ہے کہ کوئی انڈیا میں اپنے فن کا مظاہرہ نہیں
کرے گا۔ چنانچہ جب حکومت رقت کو اس بات کی خبر
ہوئی تو انہوں نے تقریباً چار سال کے لیے مجھ پر گلانے
گلانے کی پابندی لگا دی۔ جو میرے لیے دکھ کی بات بھی
تھی۔"

"تو کس کس کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی
تھیں؟"

"میں۔ میں بھارت کے تین وزیر اعظموں کے
سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہوں۔ ان میں ایک
اٹل بھاری داجپائی ہیں۔ اٹل کے ایڈولٹی اور نرما
راؤ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تانسیک شکر اور ولیم کمار
کے سامنے بھی میں نے ان کی پسندیدہ غزلیں گائی
ہیں۔"

"نخر ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں اور شاید ان کو بھی ہوتا ہو گا کہ ہم
نے منی بیگم کو لائیو گاتے سنا ہے۔"

"بالکل ہوتا ہو گا۔ آج کل کے گلوکاروں کے
بارے میں کیا کہیں گی؟"

"کچھ فنکار تو بہت اچھا گارہے ہیں اور خوب نام بھی
کمارہے ہیں مجھے شفقت امانت علی اور زراحت علی علی
نے بہت متاثر کیا۔ ان کی گلوکاری میں ان کے اباؤ
اجداد کا خون ہے اس لیے ان کی گلوکاری بہت متاثر
کرتا ہے۔"

"اپنے گلانے غزلیں گیت وغیرہ سنتی ہیں تو کیسا
لگتا ہے؟"

"بہت اچھا اور اپنی ہی چیزیں زیادہ سنتی ہوں۔ اس
وقت جب میں ڈرامو کر رہی ہوتی ہوں۔ دوستوں کو
بھی سنتی ہوں مگر اپنے آپ کو زیادہ سنتی ہوں اور اکثر تو
خود ہی گاتی چلی جا رہی ہوتی ہوں۔"

زندگی کے لڑکیوں خواب دیکھتی ہیں اور مجھے ان کی تعبیر ملی۔ جب پاؤں میں بیڑیاں ڈالوں گی کیونکہ یہ بھی بست ضروری ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ ان شاء اللہ چار یا پانچ سال تک۔ کیونکہ کچھ پائیس کہ شادی کے بعد کی زندگی کیسی ہو۔ ہماری سوچ کے مطابق ہو یا بالکل ہی مختلف۔ ابھی اور مشہور ہونا چاہتی ہوں، نام نکلتا چاہتی ہوں اور پیسہ بھی۔“



ملورا حسین

”ویسے کوئی آئیڈیل تو ہو گا؟“
”آئیڈیل تو خیر نہیں بنایا۔ کہ آئیڈیل کبھی ملے نہیں ہیں۔ ہاں خواہش ضرور ہے کہ میرے والد کی طرح پیار محبت کرنے والا ہو، آزاد خیال ہو اور بہت زیادہ روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔“
”آج کل تو انڈین فلمیں بھی سائن کی ہیں آپ؟“

”جی۔ بالکل ہیں، اچھی آفرز تھیں، مجھے کردار تھے تو ہائی بھری۔ بس اب آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ کامیابی دے۔“

”پرائیویٹ لائف متاثر ہوتی ہے؟“
”بہت ہوتی ہے۔ بے شک چکا چوند کر دینے والی لائف بھی بہت اچھی ہے۔ پیسہ ملتا ہے، شہرت ملتی ہے۔ لوگوں کی نظروں میں ہم معروف شخصیت بن جاتے ہیں۔ اس کے لیے میں اپنے رب کی بہت شکر گزار ہوں۔ مگر رب اپنی نیلی کو اپنے دوستوں کو ٹائم نہیں دے پاتی تو پھر افسوس ہوتا ہے۔“

”مگر یہ سچی تو آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ آپ انکا کام ہی نہ لیں کہ آپ کی ذاتی زندگی متاثر ہو؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مریج میں اب ہماری پوزیشن ایسی بھی نہیں رہی کہ ہم کسی کو انکار کر دیں۔ پھر آپ کو پتا ہے تاکہ مضور کا لیبیل تو ہمہ گئے گا ہی۔ پھر وہ باتیں بھی سنائی دیں گی جو ہم نے کسی بھی نہ ہوں گی۔ تو بس ڈرتی ہوں اس دن سے۔“

”ملک سے باہر جانے کا اتفاق تو ہوتا ہی ہو گا، اگلیں رہنے کو مل چاہتا ہے۔ اور واپس آکر ملک کا مستقبل

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آہی جاتی ہے۔ میں حال اب ان دنوں سنوں کا ہے۔ شہرت کی بلندیوں کو چھونے والی اب ان دنوں کے پاس صحابیوں کے لیے بہت کم دقت ہوتا ہے۔“

”مریم میرکل میں بہت پیاری لگ رہی ہو کیا رسپانس آ رہا ہے؟“

”جج میں آ رہا ہے۔ بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ سب کو مجھ سے اور میرے کردار سے بہت ہمدردی ہو گئی ہے، ڈراما اصل آج کل ڈرامے کچھ ایسے بن رہے ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم جج جج دیتی دھوتی لڑکیاں ہیں۔“

”عام لائف میں کیسی ہو؟“

”قل آف لائف ہوں۔ زندگی کو انجوائے کرتی ہوں۔ گھومتی ہوں پھرتی ہوں۔ بہت مزے کی زندگی گزار رہی ہوں۔“

”یادیں میں بیڑیاں نہیں ڈالنی کیا؟ آزادی میں زیادہ مزہ ہے کیا؟“

”آزادی میں جو مزہ ہے، جج میں کسی چیز میں مزہ نہیں ہے۔ جو زندگی میں ابھی گزار رہی ہوں۔ ایسی

کیسا دیکھتی ہیں؟

ہوتی ہوں گی۔

"یا کتنی قلم میں کام کرنے کی چیلنج ہوئی؟"
"جی آفر تو بہت ہے۔ مگر میں نے ابھی کوئی جواب
نہیں دیا۔ میں اس قلم میں کام کرنا پسند کروں گی جو
معاہدہ ہوگی اور میرا کردار اشتراک ہو گا اور جس کو
دیکھ کر میری فیملی بھی مجھ پر فخر کر سکے"
"کبھی اسکیڈلز کا سامنا کرنا پڑا؟"

"اسکیڈلز کا تو نہیں اسکیڈنڈل کا سامنا کرنا پڑا اور
مزے کی بات یہ کہ جن کے ساتھ میرا اسکیڈنڈل بنا۔ وہ
میرے بڑے بھائیوں اور میرے لیے استو جیسے ہیں۔"



"بہت جانا ہوتا ہے ملک سے باہر۔ بہت اچھا بھی
لگتا ہے، مزہ بھی آتا ہے اور سچ پوچھیں تو مجھے آسٹریلیا
بہت اچھا لگتا ہے۔ اور واپس آکر کیا سوچتی ہوں اور
کیسا مستقبل دیکھتی ہوں تو میں ویسے تو کچھ نہیں کر
سکتی کہ میں یاد میں نہیں ہوں۔ ہاں انفرادی طور پر
میں اچھی ہونے کی ضرورت کو شش کرتی ہوں اور
حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسان خود اچھا ہو جائے تو سب
کچھ اچھا ہو جائے بس خود اچھا ہونے کی دیر ہے۔ ہمارا
ملک بھی اچھا ہو جائے گا۔"

"پہلی بار کب سے کامنا کرتے وقت ہاتھ پاؤں
پکپکاتے تھے؟"

"پہلی بار کب سے کامنا بہت کم عمری میں کیا تھا،
میں کوئی بارہ سال کی عمر میں شاید۔ اس وقت اتنا
سینس نہیں تھا اس لیے آسانی سے فیس کر لیا ہوں
جب 2012ء میں کب سے کامنا کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ
تو بڑے مزے کی چیز ہے۔ پھر سوچا کہ اداکاری کی طرف
آ جاؤں تو زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے پھر اس جانب توجہ
دی۔ اور اللہ نے کامیابی دی۔"

"انڈیا میں جا کر سنی کی شریلی لڑکیاں بھی بہت
کھل جاتی ہیں۔ اپنے بارے میں کیا کہیں گی؟"
"اب مجھ سے تو یہ امید نہ رکھیں کہ میں بھارتی
قلم میں کام کر کے اپنے سے باہر ہو جاؤں گی۔ بلکہ میں
اپنی روایات کو برقرار رکھوں گی اور کوئی ایسا کام نہیں
کروں گی کہ میری فیملی کو یا میرے لہجہ کو شرمندگی
اٹھانی پڑے اور مجھے نہیں لگنا کہ میں آئٹم سونگ کر
پاؤں گی۔"

"کس انڈین اشار کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیں
گی؟"

"رہبر کور کو اور اس کی مدد خواہت ہیں ایک تو یہ کہ
وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی
اور میری تلمیذ پیدائش بھی ایک ہی ہے۔ اس لیے
میرا خیال ہے کہ ہمارے مزاج اور عادات میں بھی ملتی جلتی

مشہور و حراج کار اور شمار

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفٹ طاقت، مضبوط جلد، خوبصورت گروپش

~~~~~

| کتاب نام             | بہت   |
|----------------------|-------|
| آمار گرد کی لاری     | 450/- |
| دیا کول ہے           | 450/- |
| این ہلوٹ کے نقاب میں | 450/- |
| چلے ہو تو میں کو چلے | 275/- |
| میری مری پھر اسان    | 225/- |
| غلام محمد            | 225/- |
| اندکی آخری کتاب      | 225/- |
| اس پہن کے کو ہے میں  | 300/- |

~~~~~




بتائیے پھر غوث علی شاہ صاحب نے بھی نہیں کہا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر شکر یہ ادا کیا اور کہا کہ اگر کراچی جگہ پورے سندھ کے میرے اوپر بے شمار احسانات ہیں۔ ایک آخری احسان اور چاہوں گا۔ آپ کے تمام سہارے کے طور پر کوئٹہ میں ملک کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ کراچی میں مرنے چاہتا ہوں صرف سات فٹ زمین کی درخواست ہے۔ یہ میرے لیے ضرور رکھیے گا۔ رٹائرمنٹ کے بعد اس مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔

غوث علی شاہ اور جنرل جہاندار کا راز ممکنہ (شاید) انہیں یہ توقع ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب کسی بڑے پلاٹ وغیرہ کی درخواست کریں گے لیکن۔

سفارش

ان دنوں شہزاد شیخ بہت خوش ہیں (بھئی ان کی کراچی سے لاہور جو پسند کی جا رہی ہے) کہتے ہیں کہ یہ میری



پرانی

ڈاکٹر عبد القدیر خان کا تعلق کراچی سے ہے ڈاکٹر صاحب کو کراچی سے بے حد لگاؤ ہے۔ وہ اس سرزمین کے شکر گزار ہیں جس نے انہیں سر چھانے کی جگہ دی اور جس نے اس قاتل ہوئے کے اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک جاسکے۔ کراچی سے ان کی محبت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔

ایک دن جہاندار میں وہ اسلام آباد سے کراچی جا رہے تھے اس جہاز میں سابق گورنر سندھ جہاندار خان اور وزیر اعلا غوث علی شاہ بھی موجود تھے۔ جنرل جہاں داو خان انہیں بلا کر اپنے پاس لے گئے وہیں کراچی کے ایک تاجر بھی بیٹھے تھے۔ ان کے مطابق وہ دران وقت جنرل صاحب نے ڈاکٹر صاحب نے کہا "میرے لائق کئی خدمت ہو تو بتائیں۔ کراچی میں اب جو چاہیں



کام کر چکے ہیں اور پھر برائی بھی حاصل کر رہے ہیں۔ لیکن عائدہ شلوی کے بعد سے شویز سے دور ہیں جب کہ ان کے پرستار اس انتظار میں ہیں کہ وہ کبلی وی اسکرین پر دوبارہ اداکاری کا آغاز کریں گی۔ خبر ہے کہ عائدہ خان نے بچی کی پیدائش کے بعد اب نوٹوٹوٹوٹو کر دے شروع کر دیے ہیں تو یقیناً ”اداکاری بھی جلد ہی شروع کر دیں گی۔“

کچھ ادھر ادھر سے

☆ محمد علی جناح بالکل ٹھیک تھے اگر ہمارے بزرگوں نے پاکستان بننے کی مخالفت نہ کی ہوتی تو شاید آج پاکستان رقبہ میں بڑا اور زیادہ طاقت ور ہوتا۔ مجھے اپنے ہندوستانی ہونے پر شرمندگی ہے۔ میں کشمیری مسلمانوں کو سلام پیش کرتا ہوں۔
(چاکی چڑھنے سے پہلے ہندوستانی مسلمان یعقوب میمن کا بیان)

☆ سوشل میڈیا پر جو غم و غلو دانش ور بھارت بھارت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ دراصل یہ بالکل وہی معاملہ ہے کہ جس طرح اختلاف احمد فرما کرتے تھے کہ کچھ لوگ اسلام کو گھل و تھاپتے ہیں لیکن خوف خلق کے باعث اسلام کے بجائے مولوی کو لعن طعن کرتے رہتے ہیں۔ یہ دانش ور افغانستان میں پہلے روس اور اب امریکہ کی مجاہدین کے ہاتھوں شہید اور تاریخی چھتروں بضم نہیں کیا رہے۔
(مصور اصغر راجہ بے غلام)

جنرل حمید گل کو سی آئی اے نے دنیا کے سانچ بڑے دانتوں میں سے ایک قرار دیا۔ ان کے دشمن بھی ان کی صلاحیتوں کا لوبا مانتے تھے۔ جنرل حمید گل شخصیت سے زیادہ ایک عہد کا نام ہے۔ مسلمانوں کی رزمیہ (جنگی) تاریخ کا چلتا پھرتا عہد۔

(روزنامہ امت) ۱۰/۱۰/۱۵

پہلی فلم ہے۔ اور اس فلم سے میری بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ میرے والد نے مجھے کہا تھا کہ جیٹا! اندھ شری میں خود سے کام کرنا پڑتا ہے (ارے۔ پاپاز بوائے) یہاں پر سفارش زیادہ عرصے نہیں چلتی۔ (ارے بھئی چلتی تھی جب سی توانہ شری۔؟) میں کوشش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ضرور ہوں گا۔ (گے رہو۔ بھئی کام میں۔)

خوابش

بھارتی رائٹر اور ڈائریکٹر خالد اعظمی نے اداکار امیرا کی فلم بغیر معاوضے کے ڈائریکٹ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ خالد اعظمی سے میرا نے امریکہ سے رابطہ کر کے کہا کہ وہ ان کی فلم کی ڈائریکشن دیں لیکن ان کو معاوضہ فلم کی ریلیز کے بعد دیا جائے گا۔ (یہ میرا کا ہی حوصلہ ہے کہ وہ اس طرح کی فراٹیش کر لی ہیں۔) خالد اعظمی نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان ڈائریکٹرز میں سے نہیں ہیں جو بلا معاوضہ فلمیں بناتے ہیں (کچھ تو معاوضہ لے کر بھی نہیں بناتے۔ بھئی فلم اور کیا۔؟) خالد اعظمی کا کہنا ہے کہ میرا نے ان سے کہا کہ وہ اپنی ایک ذاتی فلم بھی بطور رائٹر ان سے لکھواتا چاہتی ہیں (کیا وہ بھی بلا معاوضہ؟) میرا نے ان سے مزید کہا کہ وہ جلد ہی ان معاملات کو حتمی شکل دینے انڈیا آ رہی ہیں۔ (پہلے پاکستان تو آجائیں میرا! یہاں کوئی آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ بھئی عدالت اور کون۔)

مبارک

خوب صورت اداکارہ عائدہ خان اور خوبو، ہیرو دانش تیمور گزشتہ سال رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور اب خیر سے ایک عرصہ عیاری بی بی بھی ان کے ہاں آچکی ہے۔ انہوں نے اپنی بھی پری کاہم منورین تیمور رکھا ہے (ہماری طرف سے رحمت مبارک ہو) دانش تیمور تو شلوی کے بعد دلولی دوو فلموں میں



خوش نصیب

یونانی میں ایک شخص سولن مقرر ہے۔ یہ ایک ماہر
ہوا متفنن فلسفی اور شاعر تھا۔ ایک بار قبرص کے بادشاہ
کری سس نے سولن کو اپنے ملک مدعو کیا۔ سولن نے
دعوت قبول کرنا ملاقات کے دن بادشاہ اپنے پیش
قیمت لباس اور ہیرے جواہر زیب تن کر کے تخت پر
جلوس افروز ہوا اور پورے شاہانہ طعنان سے سولن کا
انتظار کرنے لگا۔ سولن آیا اور اطمینان دے نیازی
ہے بادشاہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے بادشاہ کے جلد
خشم اور صفوت و شرکت پر کوئی توجہ نہ دی۔ بادشاہ نے
چمن ہو گیا۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ سولن کو
ہمارے خزانے دکھائے جائیں۔ وزیر نے سولن کے
سامنے سونے چاندی اور فصل و زمرد کا ڈھیر لگوا دیا۔ یہ
چمک دیکھ بھی سولن کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ بے پروا بیٹھا
رہا۔ بادشاہ سے نہ رہا گیا۔ اس نے بلند آواز سولن کو
مکالمہ کیا۔

”سولن! تم یونان کے نامور فلسفی ہو۔ ہمارے تمہارے
نزدیک دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی کون ہے؟“
سولن نے بڑا وقار لیجے میں کہا۔ ”بادشاہ! میرے
ملک میں ٹیلسن نامی ایک آدمی بہت خوش نصیب تھا۔
وہ ہر اور نیک صاحب نصاب اور اچھے بچوں کا باپ تھا۔
اس نے اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دے
دی۔“

”اس کے بعد وہ مرا خوش نصیب کون ہے؟“
بادشاہ نے دریافت کیا۔

سولن نے جواب دیا۔ ”وہ بھائی سب سے زیادہ
خوش نصیب ہیں۔ انہوں نے ہم کی خدمت کرتے
کہتے جان دے دی۔“

بادشاہ آگ بگولا ہو گیا۔ ”کیا تم ہمیں خوش نصیب
نہیں سمجھتے؟“

”خوش نصیب وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ خوش
نصیبی زندگی کے آخری لمحے تک رہے۔“ سولن
نے وضاحت کی۔ ”جس کی زندگی ابھی ختم نہ ہوئی ہو۔“

اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔ انسان کی
زندگی ہمیشہ ایک حالت پر برقرار نہیں رہتی۔“

بادشاہ مشتعل ہو گیا۔ اس نے سولن کے ساتھ
انتہائی نفرت و حقارت کا سلوک کیا۔

بعد میں شہنشاہ سائرس نے قبرص فتح کر لیا اور بادشاہ
کری سس کو زندہ جلا دیئے کا حکم دیا۔ کری سس کو
جلانے کے لیے لکڑیوں پر بٹھایا گیا۔ اس کے منہ سے
ایک دیر دھاک چیخ بلند ہوئی۔ ”ہائے سولن۔“

فلاح بادشاہ نے ہاتھ اٹھا کے کارروائی اچانک رکوا
دی اور کری سس کے قریب جا کر سولن کیا۔

”ہائے سولن سے تمہاری کیا مراد ہے؟“
کری سس نے پورا واقعہ سنا دیا۔ فلاح بادشاہ یہ واقعہ

من کر مغلوب ہو گیا۔ اس نے کری سس کی جان بخش
دی اور اس کے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آیا۔

رفتہ رفتہ کراچی

توزک جہا نکیری سے

جہا نکیری رقم طراز ہے۔

سلطان نصیر الدین اپنے مزاج کی گرمی دور کرنے
کے لیے بسا اوقات پانی میں بیٹھا رہتا۔ ایک دن وہ ایک
گہرے حوض میں ڈوبنے لگا۔ چند خادموں نے اسے
بچالیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے ایک خادم کے
ہاتھ قطع کرادیے۔ اس خادم نے اسے سر کے بالوں
سے پکڑ کے پانی سے باہر نکالا تھا۔ سلطان نے اسے
سوئے ادب سمجھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ ڈوبنے لگا تو
کسی نے پانی سے باہر نہیں نکالا۔ وہ ڈوب کے مر گیا۔
اس کی موت کے ایک سو دس برس بعد ہم نے اس کی
حلی سڑی نعش کو جلا دیئے کا حکم دیا۔ پھر سوچا کہ اس کی
ٹپاک نعش جلا کر آگ کی لطافت کیوں کم کی جائے۔



خواتین اور وہ شہزادوں کیلئے اپنی طرف سے پہنچا رہا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ

ستمبر 2015ء

کے شمارے کی ایک جھلک

● "فیصلہ سامنے تھا" آریذاتی کا مکمل ناول،

● "شہر آشوب" آغا حشر کمال کا مکمل ناول،

● نرہ احمد کا مکمل ناول "نمل"،

● میرہ احمد کا ناول "آپ حیات"،

● حفصہ عظمیٰ کا ناول "بین مانگی دُعا"،

● لاغرہ جبین، فرح بخاری اور صف آصف کے ناول،

● قرآن الہم رائے، بشری احمد، میراجید، فروغ خان

اور نازہ جمال کے افسانے،

● بچائی دی کے ہنر "لوسلان خالد" سے ملاقات،

● "ڈاکٹر نازیہ حسین" سے بات،

● "حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ" مصنفین سے سروے،

● کرن کرن روشنی انقیادی از دواچی الجھنیں مدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

ضروری اشیا :
گوشت (ایڈز کٹ) 1/2 کلو
(اہل کر نکولے کٹ لیں)

نودلز 1 پکٹ
ہری پیاز 3-4 عدد
(لمبائی میں کٹ لیں)
سویا ساس 1/4 کپ
سفید سرکہ 2 کھانے کے چمچے
چلی گارلک ساس 1 کھانے کا چمچ
دو شڑ شڑ ساس 1 کھانے کا چمچ
ہٹ چلی ساس 1 کھانے کا چمچ
نمک حسب ذائقہ
تیل 4 کھانے کے چمچے
ترکیب :

کڑائی میں تیل گرم کر کے ابلے ہوئے نودلز ہلکے سے فرائی کر کے نکال لیں۔ اسی تیل میں گوشت ڈال کر فرائی کریں اور ہری پیاز ڈال کر دو منٹ فرائی کریں۔ سویا ساس، دو شڑ شڑ ساس، سفید سرکہ، چلی گارلک ساس، ہٹ چلی ساس اور نمک ڈال کر فرائی کریں نودلز شامل کر دیں۔
ڈش میں نکال کر کچھپ کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

کلاسک ڈرائی چکن

ضروری اشیا :
مرغی کا گوشت 1/2 کلو
نمٹ 5-6 عدد
(بیج نکال کر کٹ لیں)
لال مرچ پاؤڈر 1 چائے کا چمچ
ٹماٹو کچھپ 1/4 کپ
لورک ٹمسن (پسا ہوا) 1 چائے کا چمچ
کارن فلوور 2 کھانے کے چمچے

بلوچی کشمش تورمہ

ضروری اشیا :
مرغی کا گوشت 1 کلو
پیاز (ایک کٹ لیں) 3 عدد
لورک (ایک کٹی ہوئی) 1 چائے کا چمچ
لسن پیٹ 1 کھانے کا چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر 1 کھانے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر 1/2 چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر 1 کھانے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر 1 چائے کا چمچ
دہی 1 کپ
کشمش (دھو کر بھگو دیں) 1/4 کپ
نمک تیل حسب ضرورت
ترکیب :

ماس چین میں تیل گرم کر کے اس میں گوشت شہرہ رنگ آنے تک بھون کر۔ نکال لیں اور اسی تیل میں پیاز سلتے کر لیں۔
پیانے میں دہی، سرخ مرچ پاؤڈر، لسن پیٹ، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح پھیٹ لیں۔ گوشت اس میں ڈال کر دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔
ساتے کی ہوئی پیاز میں مسالا ملا گوشت معہ آمیزے کے ڈال کر آتا بھونیں کہ روغن اوپر آجائے گوشت گلانے کے لیے تھوڑا پانی ڈال دیں۔ گوشت گل جائے تو کشمش، لورک اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر باج منٹ کے لیے ہلکی آگ پر دم پر رکھ دیں۔

مزید بلوچی کشمش تورمہ ڈش میں نکال کر بین یا آٹا لٹن کے ساتھ سرو کریں۔

دہی نمک تیل
ہری پاؤ (باریک مٹی ہوئی) 2 کھانے کے چمچے
ترکیب :

سائیں چین میں تیل گرم کر کے گوشت، نمائز کلال
مرچ پاؤڈر، کھجور، اورک، لہسن دہی اور نمک ڈال
کر بھون لیں اور گوشت میں تھوڑا سا پانی ڈال کر گھلا
لیں۔ گوشت گھل جائے تو ہری پاؤڈر شامل کر کے تین
سے چار منٹ تک بکائیں۔ گوشت کو ٹھنڈا کر کے اس
پر کارن لٹور چھڑک کر گھرے تیل میں قل لیں۔ ڈش
میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

چاکلیٹ فوج کیک

ضروری اشیا :

میدہ 175 گرام
2 کھانے کے چمچے
1 چائے کا چمچ
150 گرام
2 عدد
3/4 کپ
3/4 کپ
تیل
دودھ (غیر مالائی کا)
کوئنگ اور فلنگ کے اجزاء :

پیکا مکھن 5 کھانے کے چمچے
پسی ہوئی چینی 175 گرام
کو کو پاؤڈر 3 کھانے کے چمچے
دودھ 1 کھانے کا چمچ

ترکیب :

ایک باؤل میں میدہ، پیکا مکھن پاؤڈر اور کو کو پاؤڈر
ڈال کر ملا لیں اور چھلتی میں ڈال کر ان تمام اجزاء کو چھان
لیں اس کے بعد اس میں پسی ہوئی چینی شامل کر کے
اچھی طرح ملا لیں۔ میدے کے آمیزے میں اندھے
تیل، دودھ شامل کر کے خوب اچھی طرح پھینٹ
لیں۔ جب تک آمیزہ بالکل ہموار نہ ہو جائے اس

آمیزے کو مکھن یا تیل سے چھنے کیے ہوئے کیک چین
میں ڈال کر پہلے سے گرم ادون میں 180 پر رکھ کر
پچیس سے تین منٹ تک بیک کریں تیار ہو جانے پر
ادون سے نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔ ادون نہ ہونے کی
صورت میں یہ کیک دھچکی میں بھی بنایا جاسکتا ہے۔
آنسنگ کے لیے :

کسی برتن میں نمکین ڈال کر نرم ہونے تک
پھینٹیں۔ پور ساتھ ساتھ اس میں پسی ہوئی چینی
اور کو کو پاؤڈر شامل کر کے مزید پھینٹیں۔ اس کے بعد
اس میں تھوڑا دودھ شامل کر لیں تیار کیے ہوئے کیک
کے درمیان میں سے سلائس کاٹ لیں۔ اور کیک کے
سلائس پر دودھ کے چمچے دودھ کے پھیلا کر ڈال دیں۔
آنسنگ، ہموار شکل اختیار کر لے تو کیک کی دونوں
حصوں کو آنسنگ سے کور کر دیں اور ٹھنڈا کر کے
پیش کریں۔

نان خطائی

اجزاء :

میدہ 2 کپ
تھوڑا کپ
چینی (باریک پسی لیں) 2 کپ
اندھے کی زردی
پیکا مکھن پاؤڈر 1 چائے کا چمچ
ترکیب :

سب سے پہلے تھی کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔
اب اس میں چینی ڈال کر مزید پھینٹ لیں۔ اس کے
بعد اس میں میدہ اور پیکا مکھن پاؤڈر ڈال کر گھولنے کی
طرح گوندھ لیں۔ اب اس کی گولی گول اپنی پسند کی
شکل بنالیں۔ ادون کو دس منٹ قبل 180 پر گرم
کر لیں۔ اب گولیوں کو پندرہ سے بیس منٹ تک بیک
کر لیں۔ ادون میں رکھتے وقت تمام گولیوں پر اندھے کی
زردی کی معمولی مقدار لگاتے جائیں۔ مزید ارٹائی
خطائی تیار ہے۔



موٹاپا ایک عذاب

وزن کم کرنے کے لیے پہلے ان باتوں کا خیال رکھیں۔
 وزن کم کرنے کی سب سے زیادہ بات جو بڑی اہم اور ضروری ہے وہ ارادہ ہے۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں لیکن یقین کے ساتھ کوشش کرنا ضروری ہے۔ کامیابی ایک دم نہیں آتے آتے حاصل ہوتی ہے۔
 درمیانی عمر کی ایک موٹی عورت اگر وزن کم کرنا چاہتی ہے تو اس کو صرف ایک ہزار کیلو ریڈوالی خوراک حاصل کرنی چاہیے۔ موٹاپے سے نجات پانے اور اس کے اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ خوراک میں پروٹین کا استعمال زیادہ ہو۔ غذا میں پروٹین کی موجودگی سے جسم کی حرارت و قوت کے استعمال میں تیزی آجاتی ہے جس کی وجہ سے قوت کا زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً خشک میوہ ایک پلاؤ پیٹری بریڈائی، حلوا، پنک اور دیگر میٹھی اشیاء سے پرہیز کریں۔ خوراک پر کنٹرول کے دوران ورزش جاری رکھنی چاہیے اور ورزش میں آہستہ آہستہ اضافہ کرتے چلیے جس سے نہ صرف وزن میں کمی ہوگی بلکہ جتنا وزن کم کیا جائے گا اسے قائم بھی رکھا جاسکے گا۔ موٹاپے کا علاج دواؤں کے ذریعے اتنا کارگر ثابت نہیں ہوا۔ موٹاپے کو کم کرنے کے لیے عادت میں نظم و ضبط مخصوص خوراک پر کنٹرول کرنا لازمی ہے اور یہ انسان کو خود کرنا پڑتا ہے۔

ورزش

پیدل چلنا بہترین ورزش ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ کھانا یا اچھی طرح ہضم ہو جائے بلکہ وزن کم ہو میں رہتا ہے اگر آپ ورزش نہیں کرتے اور کھانسی یا قیاح سے وزن گھٹانے کی فکر میں ہیں تو اس کے نتیجے میں آپ بے شک جسم تو گھٹائیں گے لیکن دکان کا کھانا کھانے پر جان جسم چھوڑ دے وقت سے پہلے جھٹکیں آپ کا مقدمہ بن جائیں گی۔ جبکہ جلی پھٹکی پندرہ منٹ اور تھوڑی دیر کی چل قدمی آپ کے دھیلے ہوتے ہوئے غفلت کو برقرار رکھے گی۔

وزن گھٹانے والی دوائیں

وزن گھٹانے والی اکثر دوائیں مسلک اثرات بھی رکھتی ہیں۔

وزن کم کرنے کے لیے چند نسخے اور گھریلو نوکے درج ذیل ہیں۔

ہیٹ صبح و شام ایک عدد لیٹوں ایک گلاس پانی میں پھوڑ کر فارمہ استعمال کریں۔

ہیٹ ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچ شد گھول کر نماز سے استعمال کریں۔

ہیٹ تاج کل سلٹنگ سینٹر میں وزن کم کرنے کے لیے سینکڑوں روپے کے بدلے میں جو سفید پاؤڈر دیا جاتا ہے وہ درحقیقت پسلی ہوئی اسپنول کی بھوسی ہوتی ہے۔ دو چمچ اسپنول کی بھوسی صبح و شام آپ بھی استعمال کریں۔

ہیٹ پیل کے دس عدد پھل (پہلی) رات کو توڑھا ٹھوڑھ میں جھگو کر رکھ دیں۔ صبح فارمہ دودھ میں چینی ملا کر اچھی طرح بلا کر پندرہ دن تک استعمال کریں۔ بادی اور متعل اشیاء سے سخت پرہیز کریں۔

بوہا ہوا پیٹ کم کیجیے

بوہا ہوا پیٹ ایک مصیبت اور عذاب سے کم نہ ہو کہ دس برس قبل بری سانس بچا

پیشے رہنے یا چھٹی اور پیشی چیزوں کی کہ

جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لیجیے۔ رات کے بعد کم از کم ایک گھنٹے تک پانی نہیں پینا چاہیے۔ دوسری تدبیر کے سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ غذا میں کمی کر دی جائے اور زیادہ کھانے کی عادت ترک کر دی جائے۔

بڑھے ہوئے پیٹ کو کم کرنے کے لیے لیٹوں اور شد کا استعمال مفید ہے۔ اسپنول کی بھوسی بھی آپ کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ آبلی پنک تلاش کر کے لیٹ سے حاصل کریں اور اسے علی میں اچھی طرح بھون میں۔ جب پنک کا رنگ تبدیل ہونے لگے تو تھی چھان کر الگ کر لیں۔ اب اس تھی کو کسی شیش میں محفوظ کر لیں اور روزانہ رات کو سوتے وقت ناف کی جگہ مالش کریں۔ پیٹ کم کرنے میں یہ نسخہ خاصا مفید پایا گیا ہے۔